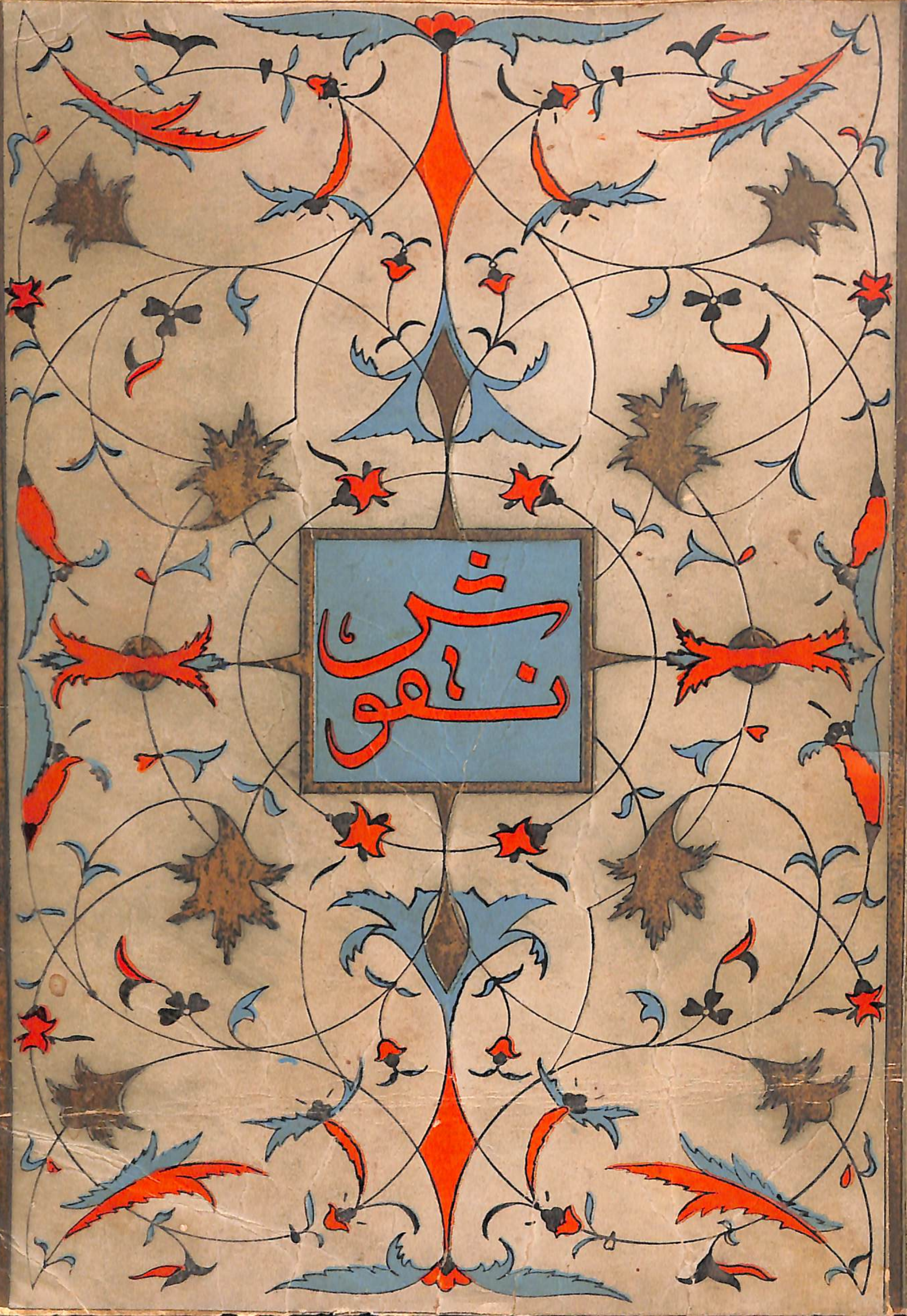

نقوش

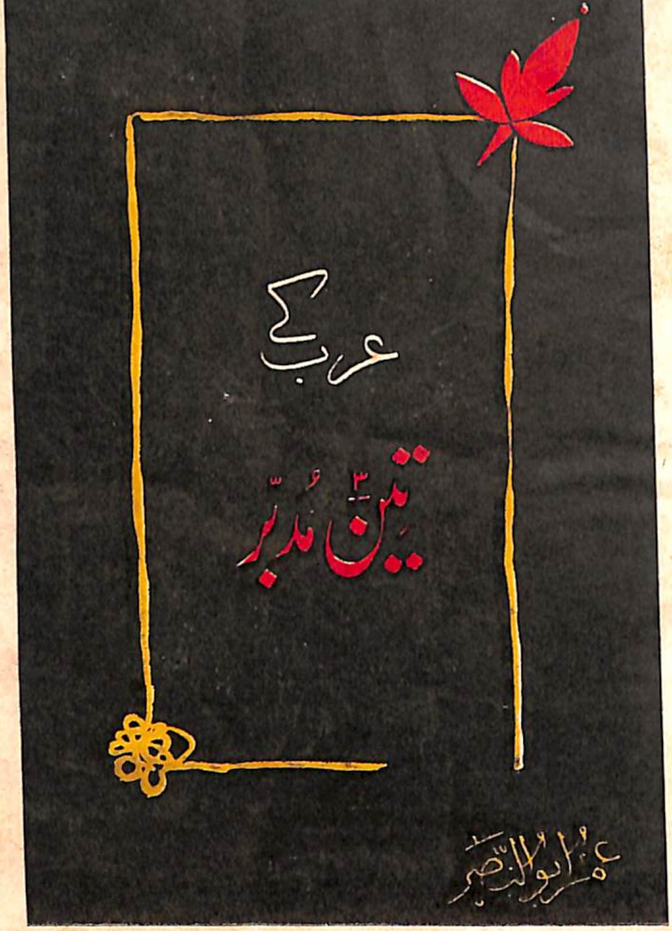

اسلام نے کئی صاحب تدبیر شخصیتیں پیدا کیں مگر مغیرہ بن شعبہ، زیاد بن ابیہہ، عمرو بن العاص ایسے مدبر اسلام پوری تاریخ میں کم ملیں گے۔ یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ کیسے کیسے کٹھن موقعوں پر ان صاحبان تدبیر نے وقت کی نبضوں پر ھاتھ رکھ دیا۔ یہ عمرابوالنصر کی تصنیف ھے۔ جس کے قلم کا لوھا اردودان طبقہ بھی مان چکا ھے۔

قیمت تین روپے

ادارہ فروغ اردو۔ ایبک روڈ لاھور

رجسٹرڈ ایل نمبر
۵۳۱۲

ٹیلیفون نمبر
۳۵۲۵

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

(خاص نمبر)

۷۷، ۷۸

دسمبر ۱۹۵۹ء

مدیر

محمد طفیل

سالانہ چندہ
۲۰ روپے

قیمت
موجودہ شمارہ
۵ روپے

ادارۂ فروغِ اردو * لاہور

نقوش

نے

دس برس میں بڑے بڑے معرکے کی چیزیں پیش کی ہیں

اب اُن معرکے کی چیزوں کا بھی انتخاب

ادبِ عالیہ

کے نام سے

نقوش کے آئندہ شمارہ کی صورت میں پیش کیا جارہا ہے !

(ادارہ)

کوئی چیز بلا اجازت نقل نہ کی جائے

فہرست

— طلوع — محمد طفیل — ۶

افسانے

۱ — مسکرانے والیاں — کرشن چندر — ۹
۲ — ہٰذا من فضلِ ربی — احمد ندیم قاسمی — ۲۷۳
۳ — کالی گھٹا — خواجہ احمد عباس — ۱۴
۴ — رات، چور اور چاند — بلونت سنگھ — ۲۸
۵ — ایک بار اور صرف آخری بار — مہندر ناتھ — ۳۷
۶ — گلاب کے پھول — کشمیری لال ذاکر — ۴۶
۷ — نہیے روانی عمرے کہ درسفر گذرد — ڈاکٹر مختار الدین احمد — ۵۷
۸ — اندھیری گلیاں — ابو سعید قریشی — ۷۹
۹ — ڈینگ ڈینگ اسمبلی — فکر تونسوی — ۸۸
۱۰ — لجنا — شکیلہ اختر — ۹۶
۱۱ — گھاؤ — واجدہ تبسم — ۱۰۶
۱۲ — ڈیڈی اور قصہ لیلیٰ مجنوں — دیوندر اسّر — ۱۱۴
۱۳ — بابِ عفت — اختر جمال — ۱۱۹
۱۴ — ارے — طاہرہ — ۱۴۴
۱۵ — سپیڈو میٹر — ایوب جاوید — ۱۴۸
۱۶ — جنابِ سالک — محمد طفیل — ۳۸۴

نظمیں، غزلیں

۱ — نوحۂ فکر — جوش ملیح آبادی — ۱۵۵
۲ — حمد — فیض احمد فیض — ۱۵۷
۳ — نغمہ ہے مے ہے مستی ہے — فراق گورکھپوری — ۱۵۸
۴ — قطعہ ہمطرح غزل — اثر لکھنوی — ۱۵۹
۵ — کچھ دل سے نگاہ بدگماں ہے — احمد ندیم قاسمی — ۱۶۰
۶ — بارش — احمد ندیم قاسمی — ۱۶۱
۷ — پُرکیف ضیائیں ہوتی ہیں، پُرنور اجالے ہوتے ہیں — اختر انصاری — ۱۶۲
۸ — اہلِ طوفاں آؤ دل والوں کا افسانہ کہیں — مجروح سلطان پوری — ۱۶۳
۹ — بشر کے ساتھ غم ہی غم نہیں ہے — تلوک چند محروم — ۱۶۴
۱۰ — درمنع شکار — تلوک چند محروم — ۱۶۵
۱۱ — جو تیرے راز داں تھے بڑے معتبر ملے — عدم — ۱۶۶
۱۲ — ساقی کے گیسوؤں کی ہوا کھا رہا ہوں میں — عدم — ۱۶۷
۱۳ — ذکر میرا ابھی آیا بھی نہیں — فضا — ۱۶۸
۱۴ — مجھے چمن میں جو آتی ہے عمرِ رفتہ یاد — میکش اکبرآبادی — ۱۶۹
۱۵ — موجِ صبا — مجید امجد — ۱۷۰
۱۶ — مغرب کی اذاں — ابن انشا — ۱۷۱
۱۷ — دکن میں چند روز — جگن ناتھ آزاد — ۱۷۳
۱۸ — جنوں کے نقشِ قدم بے نمود گھر کے لیے — غلام ربانی تاباں — ۱۷۵
۱۹ — کس نے ان کا شباب دیکھا ہے — عبدالمجید حیرت — ۱۷۶
۲۰ — جنم جنم کے ساتھی — نور بجنوری — ۱۷۷
۲۱ — خود کو اب پوچھ رہا ہوں شاید — سلام مچھلی شہری — ۱۷۸

۲۲۔ شکستِ تخیل سلام مچھلی شہری ۱۸۰
۲۳۔ عشق جاگ اٹھتا ہے یادِ لب و رخسار کے بعد شاعر لکھنوی ۱۸۲
۲۴۔ اب کے اس رنگ سے پھر یادِ چمن آئی ہے شاعر لکھنوی ۱۸۲
۲۵۔ دوسری ملاقات خلیل الرحمٰن اعظمی ۱۸۳
۲۶۔ سکوتِ مضطرب حمایت علی شاعر ۱۸۴
۲۷۔ ہمزاد سید فارغ بخاری ۱۸۵
۲۸۔ دیکھ کر حسن گلعذاروں کا رفعت سلطان ۱۸۶
۲۹۔ نادان دل، فریبِ محبت نہ کھا کبھی رفعت سلطان ۱۸۶
۳۰۔ تری جستجو میں نکلے تو عجیب سراب دیکھے جمیل ملک ۱۸۷
۳۱۔ سینا کو ہے غرور ذرا سامنے تو آ آغا صادق ۱۸۸
۳۲۔ ہو گئی بت شکنی عام صنم خانوں میں مظہر امام ۱۸۹
۳۳۔ اب کیا ہوگی آس کوثر نیازی ۱۹۰
۳۴۔ اب تیری جفا باعث آزار نہ ہوگی کوثر نیازی ۱۹۰
۳۵۔ ہمیں بھولا نہیں افسانہ دل کا انور معظم ۱۹۱
۳۶۔ قدم سے آگے آگے چل رہی ہے بشیر بدر ۱۹۲
۳۷۔ ادھر جا کر کوئی واپس نہ آیا بشیر بدر ۱۹۲
۳۸۔ شکست ساز جلیل حشمی ۱۹۳
۳۹۔ جنونِ عشقِ جاناں عقل کے ماروں سے کیا کہتا خالد مینائی ۱۹۵

آنند نرائن مُلا

۱۔ جنوں کا دور ہے کس کس کو جائیں سمجھانے ۱۹۶
۲۔ دل کی دل کو خبر نہیں ملتی ۱۹۷
۳۔ وہ چارۂ ستمِ روزگار کر نہ سکے ۱۹۸
۴۔ کیوں نہ ہو ذکرِ محبت کا مرے نام کے ساتھ ۱۹۹
۵۔ دشتِ ظلمت میں ہے وہیں پہ ابھی ۲۰۰
۶۔ ہموار کیا یوں گلشن بھی ویرانے بنا کر چھوڑ دے ۲۰۱
۷۔ شب کی تاریکی تو ہاں کم ہے مگر کافی نہیں ۲۰۲
۸۔ گل کام نہ دے گی تری ناکردہ گناہی ۲۰۳
۹۔ طوفانِ دل ہے اب آرمیدہ ۲۰۴
۱۰۔ ساحل نہ سزا دے مجھ کو کہ میں آسودۂ طوفاں ہو بھی چکا ۲۰۵
۱۱۔ ترک ہر رسم کرو وجہ یہ کافی تو نہ تھی ۲۰۶
۱۲۔ پھر ان گرد دل نشینوں کو زمیں کی بات کہنے دے ۲۰۷

ساغر نظامی

۱۔ پھر فصلِ جنوں کو دعوت دے پھر جشنِ بہاراں ہونے دے ۲۰۸
۲۔ ان سے پھر کچھ معاہدات ہوئے ۲۰۹
۳۔ صدیوں کی شبِ غم کو سحر ہم نے بنایا ۲۱۰
۴۔ جو رہیں تغیرات نہیں ۲۱۱
۵۔ وہ دردِ عشق دے کہ ظرفِ ہستی آزماتے ہیں ۲۱۲
۶۔ مدد کہ ہمتِ بے چارگی نہیں ہوتی ۲۱۳
۷۔ سبو و جام تو کیا ڈوب جائیں مے خانے ۲۱۴
۸۔ بے مایہ عہدِ سیاست تھے جو حاشیہ برداروں میں نہیں ۲۱۵
۹۔ دادِ بے چارگاں ملے نہ ملے ۲۱۶

مضامین

۱۔ اردو کے تاریخی ناول عبدالماجد دریابادی ۲۱۷
۲۔ کیا میر کی شاعری میں فکر و نظر کی ہے اثر لکھنوی ۲۲۰

۳ — مسلمانوں کے ادب میں مزاح کے تنوعات ڈاکٹر سید عبداللہ ۲۳۲
۴ — آنسوؤں کا ہار علی عباس حسینی ۲۴۰
۵ — تلامذۂ غالب پر ایک نظر نثار احمد فاروقی ۲۴۶
۶ — زرد و بنفشیات کمری منہاس ۲۵۸
۷ — سید سجاد حیدر پطرس، ترجمہ قرۃ العین ۲۸۱

سمپوزیم،

کیا موجودہ ادب رو بہ تنزل ہے؟

افسانہ

۱ — قرۃ العین حیدر ۲۸۰
۲ — کرشن چندر ۲۹۶
۳ — عصمت چغتائی ۲۹۷
۴ — خواجہ احمد عباس ۲۹۹
۵ — خدیجہ مستور ۳۰۴
۶ — کشمیری لال ذاکر ۳۰۰
۷ — صالحہ عابد حسین ۳۰۶
۸ — ابو سعید قریشی ۳۰۲
۹ — عشرت رحمانی ۳۱۱
۱۰ — واجدہ تبسم ۳۰۲

شاعری

۱ — جوش ملیح آبادی ۳۱۴
۲ — فراق گورکھپوری ۳۳۰
۳ — میکش اکبر آبادی ۳۳۱
۴ — عبدالحمید عدم ۳۳۴
۵ — مجید امجد ۳۳۵
۶ — جگن ناتھ آزاد ۳۳۶
۷ — سلام مچھلی شہری ۳۳۹

تنقید

۱ — ڈاکٹر نذیر احمد ۳۴۲
۲ — نیاز فتحپوری ۳۵۲
۳ — عبدالماجد دریا بادی ۳۵۵
۴ — ڈاکٹر محی الدین زور ۲۵۵
۵ — ڈاکٹر محمد حسن ۳۶۴
۶ — ڈاکٹر احسن فاروقی ۲۵۶
۷ — مظفر علی سید ۳۵۹
۸ — نصیر الدین ہاشمی ۳۶۳

طنز و مزاح

۱ — شوکت تھانوی ۳۶۸
۲ — کنہیا لال کپور ۳۶۹
۳ — فکر تونسوی ۳۷۰

تبصرے

محمد طفیل پرنٹر، پبلشر اور ایڈیٹر نے نقوش پریس سے چھپوا کر ادارہ فروغ اردو لاہور سے شائع کیا

طلوع

محمد طفیل

میں آج آپ سے لمبی چوڑی باتیں نہ کروں گا۔ کی بھی کب ہیں۔ باتیں کرنا بھی تو ایک آرٹ ہے۔ جو مجھے نہیں آتا۔ پہلے آپ کی ایک ضروری مسئلہ کی طرف توجہ دلانی چاہتا ہوں اور وہ مسئلہ ہے انتخابی پرچوں کا۔ میری مراد اُن رسائل سے ہے جو اِدھر اُدھر سے مطبوعہ چیزیں ڈھونڈھا کر اپنا اُلو سیدھا کرتے رہتے ہیں اور دوسروں کے لیے پریشانی کا باعث بنتے رہتے ہیں۔

ذرا یوں سوچیں کہ میں کرشن چندر یا عصمت چغتائی سے —— نیاز فتحپوری یا رشید احمد صدیقی سے —— جوش ملیح آبادی یا جگر مراد آبادی سے ہزار جتنوں سے ایک چیز لکھواتا ہوں اور اُسے پیش کیے ابھی چند دن ہی گزرتے ہیں کہ دھڑا دھڑ وہی مضمون انتخابی پرچوں میں چھپ جاتے ہیں۔ یہ لوگ نہ مضمون نگار سے اجازت لیتے ہیں اور نہ چھاپنے والوں سے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ وہ رسالے جو پوری تندہی کے ساتھ ادیبوں سے نئی چیزیں لکھواتے ہیں۔ ایسے پے بہ پے حملوں سے پریشان ہو جاتے ہیں۔ ادبی پرچے جو پہلے ہی سسک رہے ہیں۔ وہ اس دھاندلی کی وجہ سے بھی دم توڑے دے رہے ہیں۔ محنت کوئی کرے۔ فائدہ کوئی اٹھائے —— یہ مسئلہ صرف میرا نہیں ہے (بلکہ میرا تو کسی حد تک ہے ہی نہیں) بلکہ اُن تمام ادبی رسائل کا ہے۔ جنھوں نے ماضی میں بڑا کام کیا۔ مگر آج نڈھال ہیں۔ اور کوئی پرسانِ حال نہیں یا اُن پرچوں کا، جن کی اٹھان اچھی ہے۔ مگر انھیں یہ قینچی پرچے ختم کیے دے رہے ہیں۔

میرا قارئین سے یہ مطالبہ ہے کہ وہ ایسے چوری کے مضامین چھاپنے والے پرچوں کی قطعاً حوصلہ افزائی نہ کریں اور ادیبوں سے یہ درخواست ہے کہ وہ ایسے پرچوں سے کسی قسم کا تعاون نہ کریں۔ ورنہ آج نہیں تو کل انتخابی پرچے نتائج کے اعتبار سے مہلک ہی ثابت ہوں گے۔

یہ اعتراض ادارہ نقوش پر بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے بھی تو چھپی ہوئی چیزوں سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ تسلیم، مگر ہمارے ہاں کاتا اور لے دوڑی والی بات نہیں ہے۔ ہم نے اگر استفادہ کیا بھی ہے تو حال کی چیزوں سے زیادہ ماضی کی تخلیقات سے کیا ہے اور ایسی چیزوں کا حصول نئی چیزوں کے حصول سے کچھ زیادہ ہی مشکل ہے۔ پھر ہمارے سامنے ایک پروگرام ہوتا ہے۔ ایک موضوع ہوتا ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ متعلقہ موضوع پر ادب کی دو ڈھائی سو سالہ تاریخ مرتب ہو جائے

اگر انتخابی پرچوں کو چھپی ہوئی چیزیں ہی چھاپنے کا شوق ہے تو وہ آئیں اور ہماری طرح اپنے آپ کو انگاروں پر لوٹنا سکھائیں۔ ابھی ادب کے بڑے موضوعات تشنہ ہیں اور ان موضوعات کو ہمارے خون کی ضرورت ہے۔ ہماری دیدہ وری کی ضرورت ہے۔

(۲)

پطرس نمبر کے بعد، میرا ذرا سستانے کا ارادہ تھا۔ کام کی زیادتی سے آدمی تنگ بھی تو آجاتا ہے۔ کولھو کے بیل کی طرح جُتے رہنا معقولیت بھی تو نہیں۔

میں نے کرشن چندر کو ایک خط لکھا اور یہ رونا رویا کہ اردو افسانہ کا جنازہ نکل رہا ہے۔ مگر آپ چُپ ہیں، ذرا مجھے بتائیں تو ماجرا کیا ہے؟ میری شامتِ اعمال کہ انھوں نے کام کی باتیں لکھ کر بھیج دیں۔ اب مجھے یہ ہُمک کہ یہ خط چھپ جائے سوچتا رہا۔ سوچتا رہا ـــــ کہ یہ خط کس انداز سے چھاپوں۔ ذہن نے کئی رستے سجھائے۔ بالآخر یہ طے پایا کہ صرف افسانہ ہی تو روبہ زوال نہیں ہے۔ پورے ادب ہی کا یہ حال ہے۔ اس لیے کیوں نہ اس موضوع پر ایک سمپوزیم ہو جائے۔ چنانچہ صاحب! کرشن چندر کا جواب میرے اس خاص نمبر کا محرک ہے۔ ورنہ بخدا میرا ارادہ ایک عام نمبر ہی نکالنے کا تھا۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ اگر آپ اسے بھی عام نمبر ہی سمجھیں۔ ہر چند کہ ٹائیٹل پر خاص نمبر لکھا ہوا ہے۔

سمپوزیم کے سلسلے میں، میں نے اہتمام یہ کیا ہے کہ جو ادیب جس صنفِ ادب پر لکھنے میں نام پا چکا ہے۔ وہ اگر رائے دے تو صرف اپنے ہی موضوع پر تاکہ فنکار کے بھی جذبات و خیالات کا علم ہو۔ اس ضمن میں ہر صنفِ ادب پر ایک ایک تفصیلی مضمون ہے اور باقی آراء۔ افسانہ پر تفصیلی مضمون قرۃ العین حیدر کا ہے۔ شاعری پر جوش ملیح آبادی کا اور تنقید و تحقیق پر ڈاکٹر نذیر احمد کا ـــــ اس "ایج" پر میں تو مطمئن ہوں کہ میں نے وقت کے ایک ضروری مسئلہ پر (غور و فکر کے لیے) کام کا مواد پیش کیا ہے ـــــ اور اپنی رائے سے قصداً گریز کیا ہے۔ سُنی سب کی ہیں۔ کہی کوئی نہیں کچھ کہوں گا تو دوستوں کی گھُرکی کا ڈر ہے۔

(۳)

کرشن چندر نے جہاں مجھے اس نمبر کے سلسلے میں "غلط راستے" پر ڈالا۔ وہاں ایک مصیبت اور بھی کھڑی کر دی وہ یہ کہ ایڈیٹر لوگ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے۔ میرا خیال ہے کہ میرے سوا یہ کام سارے ایڈیٹر کرتے ہیں۔ مگر میں نے اس سے قصداً پہلوتہی کی اور یہ چاہا کہ نقوش کا معیار ہی اتنا بلند ہو کہ جو کوئی نیا لکھنے والا اس میں نظر آئے۔ اس کے بارے میں یہ سمجھا جا سکے کہ اس میں ضرور کوئی نہ کوئی بات ہوگی۔ مدعا دونوں کا ایک ہے توصیفی جملے لکھنے والوں کا بھی اور میرا بھی، کوئی لکھ کر اس کا اظہار کر دیتا ہے اور کوئی نہ لکھ کر اس کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔

اگر تعارفی جملوں سے نئے لکھنے والے کل کلاں کو بڑے ادیب بن سکتے ہوں، تو لیجیے میں آج ہی سے توصیفی جملے بانٹنے کی بسم اللہ کیے دیتا ہوں۔ بخل کیسا! مگر مجھے کوئی جاندار لکھنے والا نظر آئے۔ جو چونکا دے۔ اپنی طرف متوجہ کرے

—— میں نے ہر شمارہ میں تین چار نئے لکھنے والوں کو پیش کیا ہے۔ بے شک نقوش کا کوئی سا پرچہ اٹھا کے دیکھ لیں۔ افسانوی حصہ میں اب کے پھر دو نئے لکھنے والوں کو لایا ہوں۔ پہلی ہیں طاہرہ، بنگال کی رہنے والی، انھوں نے مجھے بڑا معصوم سا خط لکھا۔ ساتھ ہی افسانہ بھیجا۔ میں دونوں ہی پیش کر رہا ہوں۔ خط نہ پیش کرتا تو افسانے کا بھی اتنا لطف نہ آتا۔ خیر افسانہ تو کوئی بڑا افسانہ نہیں ہے مگر اُن کا اردو زبان سے جو لگاؤ ہے۔ وہ ہے قابلِ قدر۔ بنگلہ زبان میں لکھے ہوئے ناول اور افسانے اُردو کے ناولوں اور افسانوں سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں۔ بلکہ ناول تو اُردو سے کچھ آگے ہی ہیں۔ اگر طاہرہ بھی ہمیں بنگال کی زندگی کے بارے میں کہانیاں لکھ کر دیں اور محنت سے لکھ کر دیں تو عجب نہیں۔ ان کا نام بھلایا نہ جا سکے۔

دوسرے ایوّب جاوید ہیں۔ انھوں نے جو افسانہ لکھا ہے۔ وہ واقعی افسانہ ہے اور ایسا افسانہ ہے جسے مانے ہوئے افسانہ نویس بھی پڑھیں تو چونکیں ضرور، ٹمٹماتا کا تو ذکر ہی کیا۔ ان کا مشاہدہ پختہ اور تشبیہات نادر ہیں اور ایسی نادر کہ بڑے بڑوں سے پانی بھروالیں۔ پھر افسانوی تکنیک پر بھی دسترس، قیافہ ہے اگر انھوں نے سنجیدگی کے ساتھ افسانے لکھے تو چوٹی کے افسانہ نویس ثابت ہوں گے —— میں نے انھیں ایک خط میں لکھا تھا کہ جنسی موضوعات سے اپنے آپ کو جتنی جلد ممکن ہو بچا لیں۔ مگر یہ تو نفسیاتی افسانہ ہے۔ لاحول ولا قوۃ!

مضمون نگاروں میں ایک صاحب ہیں نثار احمد فاروقی، پہلے انھوں نے نقوش میں شخصیت نگاری پر ایک مضمون لکھا تھا۔ دوسرا مضمون یہ ہے۔ بلکہ نہیں یہ تیسرا مضمون ہے۔ جس نے پہلے دو مضمون پڑھے ہیں۔ وہ میری بات کی تصدیق کریں گے کہ ان کے لب و لہجہ میں مٹھاس ہے۔ مواد کی تہ میں ورک ہے۔ جو آج کئی لکھنے والوں کو نصیب نہیں۔ آپ حضرات میری بات لکھ لیں کہ فاروقی صاحب اپنی ریاضت سے، اپنے جنون سے، ایک نہ ایک دن اپنا لوہا ضرور منوا لیں گے —— میں چاہتا ہوں ایمان لانے والوں میں میرا نام سرِ فہرست آئے۔

(۴)

پطرس نمبر پر حسبِ معمول واہ واہ ہوئی۔ جی تو چاہتا ہے کہ اس ضمن میں آئے ہوئے ڈھیروں خط چھاپ دوں۔ پھر سوچتا ہوں بات ذرا ہلکی رہ جائے گی۔ چلیے صرف ایک خط آپ پڑھ لیں۔ باقیوں کو میں خود دوبارہ پڑھتا ہوں۔ کیا کروں۔ انا کو کسی طرح تو تسکین ملے۔

> "طفیل صاحب، لارڈ کرزن جب تاج محل دیکھنے آگرہ گئے تو ان کی بیوی بھی ساتھ تھیں۔ انھوں نے تاج دیکھ کر اپنے شوہر سے کہا "اگر مجھے یہ یقین ہو جائے کہ میں یہاں دفن ہو سکتی ہوں تو اسی وقت مرنے کے لیے تیار ہوں"
>
> پطرس نمبر دیکھ کر میں نے بھی دل میں کہا کہ اگر طفیل صاحب میرے لیے بھی کوئی ایسا ہی خصوصی نمبر نکالنے پر آمادہ ہو جائیں تو میں اسی وقت مرنے کے لیے آمادہ ہوں
>
> نیاز فتحپوری"

مسکرانے والیاں

کرشن چندر

دیکھو! دیکھو وہ مسکرا رہی ہے۔

ہم لوگ کافے پاری میں بیٹھے تھے۔ راجہ بھائی ٹاور کے بالمقابل سڑک کے اس پار۔ کافے پاری ان دنوں بہت چلتا تھا میزوں کے ارد گرد لوگ کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ طالب علم، ملاح، ادیب، بزنس مین، بے کار، ٹائپسٹ لڑکیاں پھولدار سکرٹ اور بے داغ بلاؤز پہنے ہوئے، اپنی پونی ٹیل کو اک ادا سے جھلاتی ہوئیں، ہونٹوں پر لپ سٹک ٹھیک کرتی ہوئیں کیونکہ چائے کا گھونٹ مرد کے بوسے کی طرح ہے۔ لپ سٹک کو پھیلا دیتا ہے!

ہمارے سامنے کی میز والی لڑکی مسکرائی، اس کے سیاہ بلاؤز میں چھوٹے چھوٹے سفید سفید امی ٹیشن موتی ٹکے ہوئے تھے اور قریب پڑے ہوئے برقی شمعدان کی روشنی میں یوں جھلملا اٹھتے تھے جیسے اس لڑکی نے ایک بلاؤز نہیں ستاروں بھری رات کا ایک ٹکڑا پہن لیا ہے اور لپ سٹک خطرناک حد تک گہرا دکھائی دیتا تھا۔

"دیکھو! دیکھو وہ مسکرا رہی ہے!" میں نے گلشن سے کہا۔

گلشن نے چور نگاہ سے اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ پھر کرسی کھسکا کر اس لڑکی کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گیا اور ذرا درشتی سے کہنے لگا

"چھوڑو، چھوڑو! اُدھر مت دیکھو"

"مگر یہ وہی ہے مسکرانے والی!" میں نے احتجاجاً گلشن سے کہا۔

گلشن نیوی میں لفٹیننٹ تھا۔ اس نے دنیا دیکھی تھی، میں نے دنیا دیکھی تھی۔ ہم دونوں کی ملاقات پہلی بار لندن میں ہوئی تھی۔ سوہو کی مشتبہ گلیوں میں گھومتے ہوئے لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے ہم دونوں ایک دوسرے کے دوست بن گئے تھے اور جب سے ایک دوسرے کے دوست تھے سوہو کی گلیوں میں ہمیں بڑی پیاری پیاری لڑکیاں ملیں مگر سب سے پیاری لڑکیاں تو وہ تھیں جنھیں لندن والے SMILIES کہتے ہیں مسکرانے والیاں۔ یہ لڑکیاں دو دو کی تعداد میں باہر نکلتی ہیں۔ چہرے پر گہرا غازہ، ہونٹوں پر گہرا لپ سٹک، کولھوں کا گہرا گھماؤ، دیکھو تو جواب میں یوں خفیف سی مسکراہٹ چہرے پر آتی ہے۔ خفیف اور ہلکی اور نازک سی مسکراہٹ، اپنی بات بھی بن جائے اور عزت بھی رہ جائے۔ اگر بات بن گئی تو وہ کھسک گئیں، ورنہ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر آپ کے ساتھ ہو لیں اور نہ بنی تو انھوں نے بھی اک مغرور ادا سے منہ پھیر لیا اور ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے یوں چلی گئیں جیسے وہ سوہو کی گلیوں میں گھومنے والی شکاری عورتیں نہ ہوں، پارک لین کے اونچے فلیٹوں میں رہنے والی

شریف زادیاں ہوں۔

یہ ہلکی لطیف مگر پیشہ ور مسکراہٹ کس قدر دلچسپ ہوتی ہے۔ اس دعوت کا اشارہ کس قدر بلیغ ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے لڑکی مسکرا نہیں رہی ہے، ہونٹوں سے آنکھ مار رہی ہے۔ ہمیں لندن کی SMILIES بہت پسند آئیں مگر ایک لندن ہی پر کیا موقوف ہے۔ لندن میں، پیرس میں، بمبئی میں، دہلی میں جہاں جہاں ہوس سر اٹھاتی ہے اپنے بالمقابل اس تبسم کو موجود پاتی ہے۔ اس تبسم میں رنگ، نسل، قوم اور ملک کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ اسی لیے تو مجھے کافے پارلر کی مسکرانے والی اس قدر پسند آئی تھی، اسی لیے تو میں نے گلشن سے کہا۔

"ارے بالکل وہی ہے گلشن! وہی ہے۔"

گلشن نے اور بھی مضبوطی سے اپنی کرسی میرے سامنے کھسکا لی تاکہ میں بھی اسے نہ دیکھ سکوں۔ میں نے ذرا خفا ہو کے کہا —

"یہ کیا حرکت ہے؟ تم کب سے صوفی ہو گئے؟"

گلشن سے میں چند ماہ کے بعد ملا تھا۔ بمبئی سے باہر گیا ہوا تھا اس لیے اس کی تبدیلی پر ذرا حیرت بھی ہوئی۔

گلشن نے کافی کی پیالی کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس کی طرف بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کہا —— "ایک کہانی سنو گے؟"

"کہانی ——؟" میں نے حیرت سے کہا۔

اس نے میرے استعجاب کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "ایک روز میں کافے برٹی میں بیٹھا تھا ......"

"اور ہاں! میں تو تم سے پوچھنا ہی بھول گیا۔" میں نے اس سے پوچھا "تم تو اکثر مجھے شام کو کافے برٹی میں مل جایا کرتے تھے، آج تمھیں کافے پارلر میں کیسے دیکھ رہا ہوں؟"

کافے برٹی گلشن کا خاص اڈہ تھا، سمندر کے کنارے میرین ڈرائیو کے سامنے ہم لوگ کافی کے چسکے لیتے ہوئے برآمدے میں بیٹھ جایا کرتے تھے اور میرین ڈرائیو پر چہل قدمی کرنے والے خوش پوش جوڑوں کو دیکھتے تھے۔ برٹی کافے میں بھی خاصی رونق ہوتی تھی۔ جوک باکس میں چار آنے ڈال کر آپ کوئی بھی چلتا ہوا مغربی گیت سن سکتے تھے۔ "میمی ...... میمی۔ تم ایک بطخ ہو!" یہ گیت گلشن کو خاص طور پر پسند تھا۔ کافے پارلر میں تو کوئی جوک باکس بھی نہ تھا!

"پھر ——؟"

گلشن نے میرے سوال کو بھی نظر انداز کر دیا۔ کافی کی پیالی پر نظریں جماتے ہوئے بولا "وہ مون سون کی ایک رنگین شام تھی۔ بادل برس کر بکھر گئے تھے اور شفق نے انھیں چھو کر سنہرا اور نارنجی اور قرمزی کر دیا تھا۔ بے قرار سمندر کی بے تاب لہریں کبھی کبھی میرین ڈرائیو کے بند سے ٹکرا کر اتنی بلند ہو کر لوٹتیں کہ چہل قدمی کرتی ہوئی خوبصورت عورتیں اپنے چہرے پر سمندری جھاگ کی پھوار کو محسوس کر لیتیں اور چیخ کر فٹ پاتھ سے سڑک پر آ جاتیں۔ ان کے تھرکتے ہوئے بدن گھبراہٹ میں بہت ہی دلکش ہو جاتے ہیں۔ تم تو جانتے ہی ہو؟"

"جی نہیں۔ مجھے تو کچھ معلوم نہیں ہے۔ میں ایک شریف ہندوستانی نوجوان ہوں۔"

گلشن ذرا مسکرایا، بولا "خیر، تو وہ ایسی ہی رنگین شام تھی جو ہر شریف زادے کے دل کو کسی شریف زادی کے لیے بے قرار کر دیتی ہے، اس روز میں اکیلا تھا اور کچھ اکتایا ہوا کچھ جھنجھلایا ہوا، موسم کی خوبصورتی اور اپنی مجبوری پر جھلایا ہوا خاموشی سے کافی پی رہا تھا کہ میرے

سامنے کی میز پر ایک سانولے رنگ کا معمر آدمی آکر بیٹھا۔ اس کے سر کے بال بالکل سفید تھے اور اس کی فراخ پیشانی پر بہت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ اس کا سر بیچ میں سے گنجا تھا اور اس کی کنپٹیوں کے الجھے ہوئے بال بالکل سفید ہو چکے تھے اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ایک عجیب سی گھبراہٹ تھی اور وہ بار بار اپنے ارد گرد اس طرح دیکھ لیتا جیسے کسی گاہک کو تلاش کر رہا ہو۔"

"گاہک کو؟ —— " میری سمجھ میں کچھ نہ آیا اس لیے میں نے پوچھ لیا۔

"ہاں!" گلشن بولا۔ "اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ سترہ اٹھارہ برس اس کی عمر ہو گی۔ اس نے گجراتی وضع کی ایک ساڑھی پہن رکھی تھی۔ باریک دھاریوں والی سلیٹی رنگ کی ساڑھی تھی۔ جوڑے میں چمپئی وینی تھی اور اس کا کھلتا ہوا گندمی رنگ کندن کی طرح دمکتا تھا۔ وہ متجسس نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ لیتی تھی۔ کبھی تو اس کی نگاہ سیدھی اور سپاٹ ہوتی جیسے اس نگاہ کو کسی سے کچھ واسطہ ہی نہیں ہے، کسی سے کوئی سروکار ہی نہیں ہے جیسے وہ نگاہ اپنے آپ ہی تکتی ہو لیکن کبھی کبھی لہروں کی اچھال کی طرح اس کی نگاہ کسی ایک چہرے کو چھو لیتی، کوئی چہرہ اسے دلچسپ معلوم ہوتا اور وہ مسکرا اٹھتی ...... بالکل وہی مسکراہٹ! پھر وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی، وہی خفیف ہلکی سی مسکراہٹ جیسے کسی کو جاننے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ ہیلو! تم کون ہو اور کیا ارادہ ہے تمہارا؟

جب وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی تو میں اس کی ادا ہی سے سمجھ گیا کہ یہ کون ہے؟ —— پرانا تجربہ میرے کام آیا اور میں بھی جواب میں مسکرا دیا، اسی پیشہ ور مشاقی سے، میں تو وہی ہوں جس کی تمہیں تلاش ہے۔ کنوارا اور اوباش، اور دیکھو یہ شام کس قدر رنگین ہے کیا ہم اسے رنگین تر نہیں بنا سکتے؟ حیرت ہے کبھی کبھی ایک نگاہ اتنا کچھ کیسے کہہ دیتی ہے جو ایک پوری کتاب بھی نہیں کہہ سکتی؟

دوسرے لمحے لڑکی نے منہ پھیر لیا۔ اب اس کی نگاہ سیدھی اور سپاٹ تھی اور اس کے اندر میرے لیے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ آخر میں اتنا برا تو نہیں ہوں۔ لڑکیوں کی رائے میرے بارے میں ہمیشہ اچھی رہی ہے۔

میں نے اس کے باپ کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ بوکھلا سا گیا تھا۔ آدمی اناڑی معلوم ہوتا ہے معلوم ہوتا ہے اس مہذب کافے میں پہلی بار آیا ہے۔ سودا کرنے کے ڈھنگ سے پوری طرح واقف نہیں ہے۔ بڈھے کے چہرے پر ایک معذرت خواہ تبسم تھا گویا کہہ رہا ہو، کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ تم اس کا ذرا خیال نہ کرنا، شاید وہ نگاہ کہہ رہی تھی، یہ تو مجبوری ہے ورنہ میں شریف آدمی ہوں اور اس دھندے کے لیے پہلی بار باہر نکلا ہوں۔ تم نے مجھے پہچان لیا اچھا نہ کیا۔

کچھ بھی ہو، وہ میری تیز نگاہ کے بھانپنے کے انداز سے گھبرا گیا تھا۔ جلدی جلدی میں ان دونوں نے اپنی کافی ختم کی، بیرے کو بل ادا کیا اور جلدی سے وہ دونوں کافے سے باہر نکل گئے۔ چلتے چلتے میں نے دیکھا لڑکی سرو قامت ہے اور جسم کے خطوط کہہ رہے ہیں کہ بھرپور جوانی میں ہے!"

"بے وقوف!" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"تم سنو تو!" گلشن تلخی سے بولا۔ "اس کے چند دنوں بعد پھر اسی کافے میں میری ان سے ملاقات ہو گئی۔ وہ مجھ سے پہلے ہی ایک میز پر بیٹھے تھے۔ وہی دونوں، وہی سانولے رنگ کا معمر آدمی وہی جوان خوبصورت حسینہ! میں ان کے قریب کی میز پر آکے بیٹھ گیا۔ وہ لڑکی میری طرف دیکھ کر مسکرائی جیسے برسوں کی شناسا ہو۔ جواب میں میں بھی مسکرایا۔ وہ بدن چرا کر اپنی کرسی پر الگ ہو کے بیٹھ گئی۔ دوسری بار جب اس نے پھر میری طرف دیکھا تو اس کی نگاہ بالکل سیدھی اور سپاٹ تھی، جیسے کچھ جانتی ہی نہ ہو۔

حرافہ ہے۔ میں نے دل میں سوچا، اپنے آپ کو مہنگا ثابت کرنا چاہتی ہے۔ یوں بھی ہوتا ہے مگر میں بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوں ——

میں نے بھی اس کی طرف سے نگاہ ہٹالی اور اطمینان سے چکن سینڈوچ کھانے میں مصروف ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جو مجھے یہ سب کچھ معلوم ہوا، میں نے جب بھی اس کی طرف دیکھا تو وہ متجسس نگاہوں سے میرا جائزہ لے رہی تھی۔ اب میں نے اس کی نگاہ پکڑلی تھی اب کے وہ بھی بے باکانہ مسکرائی۔ میں اپنی میز سے اٹھ کر اس کی میز پر چلا گیا اور ایک کرسی کھسکا کر بڑے اطمینان سے اس کے پاس بیٹھ گیا۔ لڑکی برابر میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس کی نگاہ میں کسی قسم کا خوف اور ڈر نہ تھا۔ بڈھے کے چہرے پر البتہ ایک عجیب سی خفت تھی اور اس کے چہرے پر وہی گھبرایا ہوا معذرت خواہ تبسم تھا!

میں نے اس کی گھبراہٹ کو دور کرنے کے لیے کہا، "گھبرائیے نہیں، میں ایک شریف آدمی ہوں۔ آپ کا راز ہمیشہ میرے سینے میں محفوظ رہے گا۔"

پھر میں نے لڑکی کی طرف متوجہ ہو کے اس سے پوچھا، "آپ کا نام کیا ہے؟"

"کملا!" وہ بڑی بے باکی سے بولی۔

میں کملا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینے ہی والا تھا کہ بڈھے نے بے حد پریشان لہجے میں کہا، "آپ سمجھے نہیں!"

"میں سب سمجھتا ہوں!" میں نے اسے آنکھ مار کر کہا۔

وہ اور بھی گھبرا گیا۔ بولا، "آپ بالکل نہیں سمجھے۔ یہ میری بیٹی ہے!"

میں اب بھی نہیں سمجھا۔ میں نے اس سے کہا، "ہر خوبصورت لڑکی کسی نہ کسی کی بیٹی ہوتی ہے۔" پھر میں نے اسے قابلِ اعتنا نہ سمجھ کر کملا سے کہا، "ڈانس کرلیتی ہو؟"

"ہاں!"

بڈھا بے حد گھبرا کر بولا، "آپ نہیں جانتے، میں کون ہوں۔" وہ میز پر جھک گیا۔ "میں اس شہر کا ایک معزز شہری ہوں۔ یہ میری بیٹی ہے کملا۔ مجھے معاف کیجیے اس کی مسکراہٹ کا کوئی مطلب نہ تھا۔ یہ تو —— یہ تو ——" وہ رک رک کر بولا، "یہ پاگل ہو چکی ہے۔"

بڈھے کا چہرہ میز پر جھک گیا تھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ رندھے ہوئے گلے سے بولا، "میں اسے اس لیے یہاں لاتا ہوں کیونکہ ڈاکٹروں نے کہا ہے اسے اکیلا گھر میں نہ رہنے دو۔ اسے مجمعوں میں لے جاؤ۔ ہنگاموں میں لے جاؤ، اسے بھیڑ بھاڑ سے شناسا ہونے دو۔"

میں نے بڈھے کی طرف دیکھا، پھر چونک کر کملا کی طرف دیکھا۔ اب اس کی نگاہوں میں کسی کے لیے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ نگاہ سیدھی اور سپاٹ تھی اور کافے کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کے سروں سے پھسلتی ہوئی کہیں اوپر جا رہی تھی۔ وہ نگاہ جیسے کہہ رہی ہو، میں کوئی نہیں ہوں اور کوئی میرا نہیں ہے اور جہاں میں ہوں وہاں کوئی نہیں آ سکتا۔ میری روح کبھی کسی سے محبت نہ کر سکے گی اور میں کسی کا ہاتھ تھام کے سمندر کے کنارے کنارے نہ چل سکوں گی اور میری جوانی کی بہاروں کے پھول اسی طرح گر گر کر مرجھا جائیں گے اور کسی پر میں اپنا حق نہ جتا سکوں گی، کسی کی بانہوں میں رو نہ سکوں گی اور کوئی بچہ میری کوکھ سے پیدا نہ ہوگا اور کسی کے معصوم ہونٹوں کے لیے میری چھاتیوں کا دودھ بے قرار ہو کر نہ ابل سکے گا۔ سمندر کی لہر، رات کے تارے، گلگوں شفق کے سنہری جال، ایک سسکی، ایک آنسو، ایک بوسہ، ان سب سے محروم رہ کر میں اپنے

مریض دماغ کی تاریک پہنائیوں میں بھٹکتی ہوئی مر جاؤں گی اور میری کوئی چیخ، کوئی فریاد، کوئی درد کسی کے دل کو نہ ہلا سکے گا!

یکایک میں نے کملا کو دیکھ کر سر جھکا لیا۔

پتہ نہیں کتنی دیر تک میں سر جھکائے ان کے ٹیبل پر بیٹھا رہا۔ میں نے دیکھا تو نہیں لیکن محسوس ضرور کیا کہ وہ بڈھا اٹھا، اس کے ساتھ وہ لڑکی بھی اٹھی، اور وہ دونوں آہستہ آہستہ وہاں سے اُٹھ کر چلے گئے۔ پھر بھی میں نے پلٹ کر ان کی طرف نہیں دیکھا۔ شام گہری ہو گئی، بادل گھر آگئے، ٹپا ٹپ بوندیں برسنے لگیں۔ بارش کی بوچھاڑ تیز ہو گئی، یکایک میں ٹیبل سے اٹھا اور ٹیکسی کرایے پر لے کر میرین ڈرائیو کی طرف چلا گیا۔ میں نے ٹیکسی والے سے کہا کہ وہ ٹیکسی آہستہ آہستہ چلائے کیونکہ مجھے شدید دھچکا لگا تھا اور میں آج بہت جلد اپنے کوارٹر میں واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔

تھوڑی دور جانے کے بعد پھر میں نے اسی بڈھے اور اس کی بیٹی کو میرین ڈرائیو کے بند پر بارش میں بھیگتے ہوئے دیکھا۔ لڑکی ننگے پاؤں چل رہی تھی اور بارش میں بھیگ رہی تھی۔ اس کے ساتھ اس کا بڈھا باپ اس کے سینڈل ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے چل رہا تھا اور اس کے کپڑے سر سے پاؤں تک پانی میں بھیگ چکے تھے۔

میں نے ٹیکسی روکی اور پٹ کھول کر اس سے کہا: ”مجھے معاف کیجیے، مجھ سے غلطی ہوئی۔ آپ کو کہاں جانا ہے۔ میں پہنچا دوں گا ——“

بڈھا بولا: ”کہیں جانا نہیں ہے۔ ڈاکٹروں نے کہا ہے مون سون کی برستی بارش میں اسے سیر کرایا کرو، اس سے دماغ کو ٹھنڈک پہنچتی ہے، اس لیے ....“

وہ چپ ہو گیا۔ لڑکی میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اسے مسکراتے دیکھ کر میں بھی مسکرا دیا کیونکہ اگر نہ مسکراتا تو شاید رو پڑتا۔ پھر میں نے جلدی سے ٹیکسی کا پٹ بند کر لیا اور ٹیکسی والے کو جلدی سے چلنے کا اشارہ کیا۔ ہم دور جا رہے تھے۔ وہ بڈھا اور اس کی لڑکی بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ اس گدلے برستے ہوئے آسمان کے نیچے دو اُداس پیکر کھوئے ہوئے اس گونگی گناہ گار عقل والی دنیا میں دھیرے دھیرے سر جھکائے چل رہے تھے ....“

گلشن نے کافی کے پیالے سے اپنے ہاتھ الگ کر لیے۔ کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اس نے اُداس لہجے میں مجھ سے کہا: ”آؤ چلیں!“

ہم دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے اور اس مسکرانے والی لڑکی کی طرف دیکھے بغیر کافے سے باہر نکل گئے۔

کالی گھٹا

خواجہ احمد عباس

ٹیکسی روانہ ہوئی تو بملا نے سوچا، یہ سین بالکل ایسا ہے جیسا فلموں میں ہوتا ہے۔ سامنے اس کے اپنے مادھو کے چہرے کا کلوز اپ ہے۔ اتنے قریب کہ وہ اس کے ہلکے سانولے گالوں پر خوب اچھی طرح گھٹی ہوئی داڑھی کی نیلاہٹ کو دیکھ سکتی ہے، اس کے ریشمی سفید قمیص اور ریشمی نیلی ٹائی کے نیچے کالر کے گرد پسینے کے نشان کو دیکھ سکتی ہے، اس کے گھنے چمکیلے سیاہ بالوں کے گچھوں کے نشیب و فراز کا معائنہ کر سکتی ہے، اور اکتوبر کی گرمی میں مادھو کے بدن سے پھوٹتی ہوئی اس بو کو بھی سونگھ سکتی ہے جو بیک وقت خوشبو بھی ہے اور بدبو بھی اور جس میں مادھو کے مردانہ جسم کے جوان پسینے کے علاوہ ہیئر ڈریسنگ سیلون میں مفت لگایا ہوا لوشن بھی شامل ہے، اور ایک گھٹیا قسم کا فرانسیسی تیز خوشبو دار سینٹ بھی ہے اور مادھو کے اس فلمی کلوز اپ کے پیچھے ٹیکسی کی کھڑکی میں سے بمبئی کی سڑکوں اور بازاروں کا پس منظر دوڑتا ہوا نظر آ رہا ہے۔

پریل کی چالیں —— جن میں سے ایک میں وہ اپنے ماں باپ بھائی بہنوں کے ساتھ ایک کھولی میں رہتی ہے اور ان چالوں کے پیچھے دھواں اگلتی ہوئی اونچی اونچی ملوں کی چمنیاں اور ان کے پیچھے نیلے آسمان پر دوڑتے ہوئے بھورے بھورے بادل، سفید بگلوں کی ایک قطار جو غیر معمولی خاموشی سے پرواز کر رہی ہے اور ایک چاندی کی طرح چمکتا ہوا مچھلی کی شکل کا ہوائی جہاز جو فضا میں معلق معلوم ہوتا ہے۔ نہ جانے کس دیس سے آیا ہے اور کس دیس جانے والا ہے۔ اس کی نظر آسمان سے زمین پر آئی تو دیکھا فٹ پاتھ پر بیکار ٹوکری ڈھونے والے اور فقیر دھوپ میں پڑے سو رہے ہیں، اور کچرے کے ڈرم کے پاس ایک مریل میلی کچیلی بلی کوڑے کے ڈھیر میں کرید رہی ہے، مگر اسی وقت اس نے دیکھا کہ گل مہر کے پیڑوں میں شعلوں کی طرح لال لال پھول کھلے ہوئے ہیں اور وہی پیڑ جو چند دن پہلے تک سوکھے ویران ٹھنڈ بے کھڑے تھے جن کی سوکھی ٹہنیوں میں ایک ہری پتی تک نہیں تھی آج اپنے پھولوں کے بوجھ سے جھکے جا رہے ہیں۔ دفعتاً اسے محسوس ہوا کہ دنیا میں اور اس کے اپنے جیون میں بہار آ گئی ہے۔ بہار آ گئی کیونکہ مادھو آ گیا ہے۔ اب زندگی کی سب کلفتیں اور محرومیاں دور ہو جائیں گی، اب ہر طرف پھول کھلیں گے اور ان پر بھونرے منڈلائیں گے، خوش رنگ پرندے چہچہائیں گے، اور ساری فضا میٹھے اور سُریلے نغموں سے گونج اُٹھے گی۔

مادھو نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور بملا کے تن بدن میں ایک جھرجھری سی کوند گئی اور گو وہ اس سے دور اپنے کونے میں دبکی ہوئی بیٹھی تھی اور ان کی انگلیوں نے بھی ایک دوسرے کو نہیں چھوا تھا، پھر بھی ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے دفعتاً ایک بجلی کے تار کو چھو لیا ہو اور اس برقی جھٹکے سے اس کی رگ رگ میں ایک میٹھا میٹھا درد دوڑنے لگا۔

"بمبئی میں آئے ہوئے اتنے دن ہو گئے تمہیں پھر بھی دیہاتی لڑکیوں کی طرح اتنا شرماتی ہو؟ سر کو آنچل سے ایسے ڈھانکا ہوا ہے کہ بالکل گھونگھٹ معلوم ہوتا ہے۔" مادھو نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بملا نے سوچا اب تمہیں کیسے بتاؤں کہ سر پر آنچل کیوں ڈالا ہوا ہے، ارے ظالم میں جو کچھ ہوں، جو کچھ میں نے کیا ہے جو کچھ میں سوچتی ہوں وہ تیرے اور صرف تیرے خیال سے ہوتا ہے، اگر نہیں اس کے بارے میں کچھ کہتا تو چھچھوراپن ہوگا بے شرمی ہوگی اور یہ سوچ کر اس نے آنچل کو ایک انچ، ور آگے سرکا لیا اور ایک کھسیانی سی مگر محبت بھری مسکراہٹ مسکرا کر دوسری طرف کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔

اب ان کی ٹیکسی لال باغ سے ہو کر بائکلہ کے علاقے سے گزر رہی تھی، انگلو انڈین اور کرسچین لڑکیاں اونچے فراک اور اونچی ایڑی کی سینڈل پہنے بس اسٹینڈ کے کیو میں کھڑی تھیں۔ مکان کے چھجوں سے پارسی عورتیں اپنے گھروں کا کچرا فٹ پاتھ پر پھینک رہی تھیں۔ پیلس سینما پر "دل دے کے دیکھو" کے بڑے بڑے پوسٹر لگے ہوئے تھے۔ جس میں خوبرو شمی کپور نئی نویلی آشا پاریکھ کے ساتھ ناک سے ناک ملا کر انگریزی ڈانس کر رہا تھا، اور بملا نے سوچا اگر یہ زندگی نہ ہوتی ایک فلم ہوتا، اگر میں سوا سو روپے ماہوار پانے والے ٹرام کنڈکٹر جنبسی لال کی بیٹی بملا نہ ہوتی بلکہ ایک فلم کی ہیروئن ہوتی۔ اور مادھو، مادھو نہ ہوتا شمی کپور ہوتا، راج کپور ہوتا، دلیپ کمار یا اشوک کمار ہوتا، اور کسی اچھے ڈائیلاگ رائٹر نے مجھے یہ سین لکھ کر دیا ہوتا تو آج میں کتنے خوبصورت الفاظ میں اپنے دل کی کیفیت اسے سناتی اور راستے بھر سناتی جاتی اور یہ بھی پرواہ نہ کرتی کہ ٹیکسی ڈرائیور ہماری باتیں سن رہا ہے اور کن انکھیوں سے اپنے سامنے لگے ہوئے شیشے میں دیکھتا جا رہا ہے کہ پیچھے والی سیٹ پر یہ نوجوان لڑکا اور لڑکی کوئی گڑبڑ گھوٹالا تو نہیں کر رہے ہیں، مگر زندگی زندگی ہے اور فلم فلم ہے، وہ بملا ہے مدھوبالا نہیں بن سکتی نہ مادھو دیوانند بن سکتا ہے، ٹیکسی ڈرائیور بھی اصلی ٹیکسی ڈرائیور ہے، فلم کمپنی کا ایکسٹرا نہیں ہے کہ ہیروئن کو رومانس کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دے اور ٹیکسی کسی اسٹوڈیو میں بیک پروجکشن کے پردے کے سامنے کھڑی نقلی حرکت نہیں کر رہی بلکہ سچ مچ جے جے ہسپتال سے گزر کر بھنڈی بازار کی طرف جا رہی ہے۔

بوری اور فربہ عورتیں لمبے لمبے کرتے پہنے فٹ پاتھ پر لگی ہوئی دکانوں سے پھل ترکاری خرید رہی تھیں، تین برقعہ پوش لڑکیاں نقابیں الٹے اپنے رنگین آنچلوں اور پاؤڈر اور لپ اسٹک لگے چہروں کی نمائش کرتی ہوئی زور زور سے باتیں کرتی چلی جا رہی تھیں، پٹرول پمپ کے پاس گٹر کے کنارے ایک سفید داڑھی والے بزرگ بیٹھے اطمینان سے پیشاب کر رہے تھے، بملا نے بے اختیار شرما کر منہ پھیرا تو مادھو کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا،

"بملا یاد ہے یہ ریکارڈ؟"

ان کی ٹیکسی چوراہے پر ماشاء اللہ ہوٹل کے برابر کھڑی تھی، کیونکہ ٹریفک کانسٹبل نے ہاتھ دکھا کر راستہ روکا ہوا تھا، ہوٹل میں ریڈیو چالو تھا، اور ریڈیو پر ایک بہت پرانا ریکارڈ بج رہا تھا،

"کالی گھٹا چھائی ہو راجہ کالی گھٹا چھائی"

"بملا یاد ہے نا یہ ریکارڈ؟" مادھو نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

اور جواب دینے سے پہلے ایک لمحے کے وقفے میں بملا کے دماغ میں نہ جانے کتنی یادیں ابھر آئیں اور اس کا ذہن وقت اور مکان دونوں کے فاصلوں کو پھلانگتا ہوا دور دور ہو کر اسی لمحے میں لوٹ آیا۔

"اسے کبھی بھول سکتی ہوں کیا؟" اور اسی دم سپاہی نے اپنا سگنل تبدیل کیا، اور ایک جھٹکے کے ساتھ ٹیکسی آگے روانہ ہو گئی اور بملا

کا ذہن ماضی کی طرف چل پڑا ....

....

جاڑوں کے دن تھے۔ وہ نہا کر آنگن میں بیٹھی اپنے لمبے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی کہ دروازے پر کسی نے کنڈی کھٹکھٹائی، اس کے چھوٹے بھائی بہن اسکول گئے ہوئے تھے، (بملا نے خود اسی سال سکول جانا چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ اس کی ماں کا خیال تھا کہ چودہ برس کے بعد لڑکیوں کا اسکول جانا ان کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے اور اس لیے اس نے بملا سے کہا تھا کہ پرائیویٹ امتحان کی تیاری کرے) باپ تو جب بھی بمبئی میں کام کرتے تھے، سال میں صرف دس پندرہ دن کو کبھی آتے تھے، ماں اس وقت پڑوسن کے ہاں گئی ہوئی تھی، بملا نے سوچا نہ جانے کون آیا ہے اس سمے۔

"کون ہے؟" اس نے کسی قدر چڑ کر کہا کیونکہ کنگھی بالوں میں الجھ گئی تھی، اور زور لگانے سے کتنے ہی بال ٹوٹ کر نکل آئے تھے۔

"میں ہوں مادھو، کرایہ دینے آیا ہوں۔"

بملا کے باپ بنسی لال نے عمر بھر کی جمع جوڑ سے یہ ایک چھوٹا سا مکان بنایا تھا جس میں وہ لوگ رہتے تھے۔ بنسی لال خود بمبئی میں ٹراموے کمپنی میں کام کرتا تھا۔ وہاں جگہ نہ ملنے سے گھر والوں کو جھانسی ہی میں چھوڑا ہوا تھا، ہر مہینے پچاس روپے بیوی کو بھیجتا مگر اس مہنگائی کے زمانے میں چار بچوں کے ساتھ اتنے میں گزارہ کیسے ہوتا۔ سو بملا کی ماں نے گھر کے دو کمرے پانچ پانچ روپے ماہوار میں کرائے پر اٹھا دیئے تھے، ایک میں میونسپلٹی کا ایک بوڑھا چپراسی رہتا تھا۔ اور دوسرے میں ایک کالج کا اسٹوڈنٹ، وہ امتحان پاس کر کے گیا تو اس نے اپنا کمرہ اپنے ایک دوست کو دے دیا تھا جو کسی گاؤں کا رہنے والا تھا اور جھانسی میں نیا نیا ہی آیا تھا۔

مگر بملا کو نہیں معلوم تھا کہ اس کا نام مادھو ہے سو بے اختیار اس کے منہ سے نکلا "آجاؤ اندر دیکھوں مٹی کے مادھو ہو یا....."

اس نے دیکھا کہ سترہ اٹھارہ برس کا ایک گنوار سا چھوکرا سامنے کھڑا ہے، پاؤں میں گزارہ چمرودھے جوتے موٹے کھدر کی دھوتی، آدھی آستینوں کی بنڈی، گلے میں کنٹھا اور گھٹے ہوئے سر پر لمبی چوٹی۔

دفعتاً ایک جوان لڑکی کو اس طرح سامنے دیکھ کر وہ گھبرا سا گیا اور آنکھیں جھکا کر بولا "دیوی جی آپ نے کچھ کہا؟"

اور بملا جو اپنی الھڑ زبان درازی کے لیے محلے بھر میں مشہور تھی بولی۔ "میں کہہ رہی تھی کہ دیکھوں کیا تم سچ مچ مٹی کے مادھو ہو مگر تم تو نکلے تانبے کے۔"

بے اختیار مادھو کا ہاتھ اپنے گھٹے ہوئے سر پر گیا اور گھبراہٹ میں چوٹی میں گرہ باندھتے ہوئے بولا "میرا نام مادھو رام ہے، آپ کا نیا کرایہ دار ہوں۔ کرایہ آپ کو دے دوں؟"

"وہاں رکھ دو، کھاٹ پہ، پان کی پٹاری میں۔"

نوٹ کو پٹاری میں رکھ کے جاتے جاتے اس نے ایک بار پھر اس چنچل لڑکی کی طرف دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

"کیا گھور رہے ہو؟ کیا پہلے کبھی کسی لڑکی کو کنگھی کرتے نہیں دیکھا؟"

"دیکھا ہے دیوی جی پر آج تک کبھی اتنے لمبے بال نہیں دیکھے۔"

بملا کے بال سچ مچ بہت ہی لمبے اور گھنے، چمکیلے اور ملائم تھے۔ پڑوسنیں اکثر پوچھتیں "بملا کی ماں اپنی بیٹی کے سر میں کونسا تیل ڈالو ہو۔ ہمیں بھی بتا دو۔" اور بملا کی ماں کہتی "اری بہن وہی کڑوا تیل جو تم ڈالو ہو، پر نگوڑے بڑھتے ہی جاویں ہیں اور گھنے بھی تو کتنے

ہیں۔ میں تو کنگھی چوٹی کرتی کرتی تنگ آگئی ہوں۔ میں نے تو بملا سے کہہ دیا ہے۔ "بیٹی اب تو بڑی ہو گئی ہے، اپنے بالوں میں خود کنگھی کیا کر۔"

بملا کو خود اپنے لمبے بالوں پر بڑا گھمنڈ تھا، اسکول میں وہ دوسری لڑکیوں کے بالوں کی لمبائی سے ان کا مقابلہ کرتی رہتی، سب کے سامنے فٹ رول لے کر اپنی چوٹی کو ناپتی اور اپنی سہیلیوں سے ہنس کر کہتی۔

"ارے نگوڑیوں یہ بال میرے قد سے بھی لمبے ہو گئے تو کیا کروں گی۔ پھر تم میں سے ایک کو میری چوٹی سنبھالنے کے لیے میرے پیچھے پیچھے گھومنا ہوگا جیسے کسی ملکہ یا مہارانی کا شاہی لباس سنبھالنے کے لیے داسیاں چلتی ہیں۔"

مگر اس وقت اس گنوار چھوکرے کو چڑانے کے لیے اس نے کہا۔ "میں تو ان نگوڑے بالوں سے تنگ آگئی ہوں۔ جی میں آتا ہے ایک دن قینچی لے کر جڑ سے کاٹ دوں۔"

جیسے یہ خطرناک عمل اسی وقت سچ مچ ہونے والا ہے، مادھو نے گھبرا کر کہا۔ "ہائیں، ہائیں، ایسا نہ کرنا دیوی جی۔"

"اچھا جاؤ معاف کیا، نہیں کروں گی، پر ایک شرط پر، خبردار جو مجھے کبھی دیوی جی کہا، ایسا لگتا ہے جیسے میں سفید بالوں والی بڑھیا ہوں یا مندر میں رکھی ہوئی کالی کی مورتی۔ میرا نام ہے بملا۔"

اگلے مہینے جب مادھو کرایہ دینے آیا تو ماں گھر میں موجود تھی، بملا سے اس کی کوئی بات نہیں ہوئی۔ مگر بملا نے دیکھا کہ مادھو کے گھٹے ہوئے سر پہ بال اُگ آئے ہیں اور چوٹی چھوٹی ہو گئی ہے۔

اس سے اگلے مہینے جب وہ آیا تو ماں مندر گئی ہوئی تھی۔ اور چھوٹے بہن بھائی چھت پر کھیل رہے تھے۔ بملا نے دیکھا کہ مادھو کے سر سے چوٹی غائب ہو گئی ہے۔ اور نئے اُگے ہوئے بالوں میں انگریزی ڈھنگ کی حجامت کرائی گئی ہے، دھوتی کے بجائے پائجامہ اور اونچے کالر کا کھدر کا کرتا پاؤں میں نئے چپل۔

"ارے مادھو تمہاری چوٹی کیا ہوئی؟"

"کالج میں لڑکے ہنستے تھے دیو...... میرا مطلب ہے بملا۔" اور پھر جھینپ مٹانے کے لیے جلدی سے بولا۔ "تمہارے بال تو اور بھی لمبے ہو گئے ہوں گے؟"

"ہاں کمبخت بڑھتے ہی رہتے ہیں۔ ساڑھے تین فٹ ہو گئے ہیں۔"

اور اب ہر مہینے کا یہ معمول ہو گیا کہ جب کبھی ان کو الگ بات کرنے کا موقعہ ملتا تو مادھو بالوں کی لمبائی کے بارے میں ہی سوال کرتا اور بملا بھی جواب دینے کے لیے فٹوں اور انچوں کا پورا حساب تیار رکھتی۔ اور اس طرح وقت گزرتا گیا، بملا کے بال بڑھتے گئے اور مادھو اب قمیض پتلون میں مٹی کے مادھو کے بجائے مسٹر مادھو رام دکھائی دینے لگا۔

ایک دن ماں نے بملا سے کہا۔ "اری بھوشن کے امتحان میں اب دو ہی مہینے رہ گئے ہیں۔ میں تو تجھے کبھی پڑھتے دیکھتی نہیں، پاس کیسے ہو گی اور پاس نہیں ہو گی تو تیرا بیاہ کیسے ہوگا؟ پرائمری پاس لڑکوں کو تو آج کل پٹواری بھی نہیں جڑتا۔"

اور بملا نے کہا۔ "ماں پڑھوں کیسے کوئی پڑھانے سمجھانے والا بھی تو ہونا چاہیے۔ اسکول تم جانے نہیں دیتیں۔ اپنے آپ سے پڑھتی ہوں۔ تو کتاب میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

اتنے میں دروازے پہ کنڈی کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔

"کون ہے؟" بملا کی ماں نے اپنی گرجدار آواز میں پکارا۔

"ماں جی! میں ہوں، مادھو کرایہ لایا ہوں۔"

عام طور سے بملا کی ماں کرایہ داروں سے بڑی سختی سے پیش آتی تھی۔ ایک دن کی بھی دیر ہو جائے تو خوب ڈانٹ پلاتی تھی۔ آج مادھو ڈرتا ڈرتا آیا تھا۔ کیونکہ اس بار اسے کرایہ دینے میں پورے سات دن کی دیر ہو گئی تھی۔ سو جب اسے اندر آنے کو کہا گیا تو اس نے ماں جی کو نہایت ادب سے نمستے کر کے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ "چھما کرنا ماں جی اس مہینے اتنی دیر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

لیکن بملا کی ماں نے بڑی ملائمت سے کہا۔ "کوئی بات نہیں بیٹا۔ دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔" اور پانچ کا نوٹ پٹاری میں رکھتے ہوئے بولی۔ "کیوں رے مادھو تو کون سے درجے میں پڑھتا ہے؟"

"میں ایف۔ اے میں ہوں ماں جی۔"

"اچھا، بھلا کیا کیا پڑھتا ہے تو کالج میں؟"

مادھو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ماں جی کو آج دفعتاً اس کی تعلیم میں اتنی دلچسپی کیسے ہو گئی ہے۔

"جی۔ انگریزی پڑھتا ہوں، اکنامکس، اِتہاس۔"

"اور ہندی؟ ہندی نہیں پڑھتا؟"

"وہ بھی پڑھتا ہوں۔ پر اس میں مجھے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی، میں کالج میں آنے سے پہلے ہی پربھاکر کا امتحان پاس کر چکا ہوں۔"

"پربھاکر پاس کر چکا ہے! تب تو بیٹا تو بہت ہندی پڑھا ہوا ہے، بھوشن جیسے چھوٹے امتحان کے واسطے تو تو اسکول میں ماسٹر بھی ہو سکتا ہے۔"

"جی ہاں مگر میں آگے پڑھنا چاہتا ہوں، ابھی نوکری نہیں کرنا چاہتا۔"

"نوکری کی بات نہیں بیٹا، میں کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔"

اور سو یہ ہوا کہ اگلے دن سے مادھو نے بملا کو ہندی پڑھانا شروع کر دیا۔ پہلے تو جب وہ پڑھانے آتا بملا کی ماں سارے وقت وہیں بیٹھی رہتی لیکن اس کو دیکھ کر یہ اطمینان ہو گیا کہ مادھو اس کی بیٹی کی طرف نظر بازی نہیں کرتا، جلدی جلدی سبق پڑھا کر چلا جاتا ہے۔ بملا بھی مادھو میں کوئی خاص دلچسپی نہ لیتی اور کبھی ذکر بھی کرتی تو اس انداز میں کہ "ماں وہ تمہارا مٹی کا مادھو آج اب تک نہیں آیا۔" اور ماں کو کہنا پڑتا۔ "بیٹی ماسٹر کا نام ادب سے لیا کر۔ گرو کا استھان بہت اونچا ہوتا ہے۔"

وقت گزرتا گیا۔ بملا کے قد کے ساتھ اس کے بال بھی اور بڑھتے گئے اور اس کا چنچل مزاج دھیما اور شانت ہوتا گیا۔ مادھو نے اب قمیص کے کالر پر ٹائی لگانی اور بالوں میں ٹیڑھی مانگ نکالنی شروع کر دی، بملا امتحان میں بیٹھی اور ڈیڑھ مہینے بعد خط ملا کہ وہ تیسرے درجے میں پاس ہو گئی، ماں نے خوش ہو کر بانٹنے کے لیے مٹھائی منگائی اور بملا سے کہا "بیٹی سب سے پہلے مادھو کو مٹھائی کھلا کر آ۔ امتحان میں تو اس بیچارے کی محنت کی وجہ ہی سے پاس ہوئی ہے۔"

بملا آج تک مادھو کے کمرے میں نہیں گئی تھی، ہاتھ میں مٹھائی کا دونا لیے سر پر پلو ڈالے دروازے پر جا کر دھیرے سے کھٹکھٹایا، اندر سے آواز آئی "کون ہے؟ آ جاؤ۔" اندر گئی تو دیکھا مادھو پلنگ پر پڑا سگرٹ پی رہا ہے، بملا کو دیکھتے ہی بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور سگرٹ کھڑکی

میں سے پھینک دی جیسے چھوٹا سا بچہ بیڑی پیتے ہوئے پکڑا گیا ہو۔

"تم سگرٹ پیتے ہو؟" بملا کو یہ دیکھ کر اتنا تعجب ہوا کہ وہ امتحان کی خبر بتانا اور مٹھائی دینا بھی بھول گئی۔

"ہمیشہ نہیں۔ کبھی کبھی...... مگر تم یہاں کیسے؟ ماں جی کیا کہیں گی؟"

"ماں جی ہی نے بھیجا ہے یہ مٹھائی دینے کے لیے۔ میں امتحان میں پاس ہو گئی ہوں۔"

"اور میں ــــ؟" وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر رک گیا اور بات بدل کر بولا۔

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے بملا، لاؤ مٹھائی کھلاؤ۔"

"یہ لو۔" بملا نے دونا بڑھایا۔

"یوں نہیں اپنے ہاتھ سے کھلاؤ۔"

بملا نے ادھر ادھر دیکھا، وہ لمحہ اور اس کی تمام تفصیلات بملا کی یاد میں ہمیشہ کے لیے منجمد ہو گئیں، دروازے پر پردہ پڑا ہوا تھا، کھڑکی کے باہر نیم کے پیڑ پر کبوتروں کی ایک جوڑی بیٹھی غٹرغوں غٹرغوں کر رہی تھی، پڑوس میں کہیں گراموفون پر کوئی گھسا ہوا ریکارڈ بج رہا تھا، اور کتابوں سے لدی ہوئی میز کے گرد ایک چمکیلے نیلے پروں والی شہد کی مکھی بھنبھنا رہی تھی۔

ہاتھ میں پیڑا لیے ہوئے وہ آہستہ آہستہ مادھو کی طرف بڑھی...... قریب۔ اور قریب۔ اور قریب یہاں تک کہ وہ اس کے گرم گرم سانس کا لمس اپنے گالوں پر محسوس کرنے لگی، اس نے پیڑا مادھو کے منہ کی طرف بڑھایا اور کہا۔ "منہ کھولو۔" مادھو نے منہ کھولا اور آنکھیں بند کر لیں۔ بملا نے پیڑا منہ میں رکھا تو مادھو نے اس کی انگلی کاٹ لی، بملا کو دانت کاٹنے سے کوئی تکلیف نہیں محسوس ہوئی مگر اسے مادھو کے ہونٹ جلتے ہوئے لگے اور اس نے جلدی سے انگلی کھینچ لی۔ جیسے آگ میں جھلس گئی ہو۔

اور پھر نہ جانے یہ کیسے ہوا کہ وہ آنکھیں بند کر کے مادھو کی آغوش میں گر گئی اور اسے معلوم ہوا کہ دہکتے ہوئے ہونٹوں پر دہکتے ہوئے ہونٹ رکھ دیئے جائیں تو اس لمحے میں انسان زندگی کی تمام اذیتوں اور زندگی کی تمام راحتوں سے آشنا ہو جاتا ہے، دنیا گھومتے گھومتے رک گئی، میز پر رکھی ہوئی ٹائم پیس کی ٹک ٹک جو وقت کی آواز تھی۔ نہ جانے کس سناٹے میں گم ہو گئی۔ صرف نیم کے پیڑ پر کبوتر غٹرغوں غٹرغوں کرتے رہے، شہد کی مکھی کی بھنبھناہٹ ایک لاہوتی موسیقی میں تبدیل ہو گئی اور پڑوس کے گراموفون کی سوئی جو "کالی گھٹا چھائی ہو راجہ کالی گھٹا چھائی"، کا فلمی ریکارڈ بیٹھی ہوئی آواز میں سنا رہی تھی ایک مقام پر پہنچ کر اٹک گئی اور اب صرف دو بولوں کا لامتناہی سلسلہ سنائی دیتا رہا۔ "کالی گھٹا۔ــ کالی گھٹا، کالی گھٹا، کالی گھٹا، کالی گھٹا۔"

اور پھر ایک جھٹکے کے ساتھ گراموفون بند ہو گیا، کبوتروں کی جوڑی پھُر کر کے ہوا میں اڑ گئی اور دوپہر کے سناٹے میں ٹائم پیس کی ٹک ٹک دفعتاً ایسی سنائی دی جیسے وقت دماغ پر ہتھوڑے مار مار کر اپنی اہمیت کو منوا رہا ہو، بملا تڑپ کر مادھو کی آغوش سے نکل گئی اور اس کے بال جو سویرے نہانے کے بعد اس نے جلدی جلدی جوڑے میں باندھ لیے تھے۔ اب کھل کر اس کے شانوں پر لہرا گئے، اس نے گھبرا کر گھڑی کی طرف دیکھا۔ کمرے میں آئے ہوئے اسے تین منٹ بھی نہ ہوئے تھے۔ مگر اتنے سے عرصے میں دنیا ہی بدل گئی تھی،

"کالی گھٹا۔" مادھو نے کھسیانی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"کیا؟ وہ ریکارڈ۔" بملا نے جلدی سے پوچھا۔

"نہیں ریکارڈ نہیں یہ تمہارے بال، یہ بھی تو کالی گھٹا سے کم نہیں۔"

اور بملا نے شرما کر اپنے بالوں کو آنچل میں چھپا لیا اور بولی "چلو چلو مذاق چھوڑو اور مٹھائی کھاؤ۔"

"بملا تم تو پاس ہوگئیں۔ مگر میں — فیل ہوگیا۔"

"تم فیل ہوگئے! مگر کیوں؟ کیسے؟؟ تم تو ہر وقت کتاب پڑھتے رہتے تھے۔"

"پڑھتا تو تھا بملا۔ پر میرا من ان کتابوں میں نہیں لگتا تھا کچھ اور ہی سوچتا رہتا تھا۔"

"کیا سوچتے تھے؟"

"سچ بتا دوں؟ — تمہارے اور اپنے بارے میں سوچتا تھا۔"

بملا شرما کر خاموش ہوگئی، مادھو بولتا رہا "بملا اگر مجھے تمہاری طرف سے ذرا بھی آشا ہو تو میں بہت جی لگا کر پڑھوں گا۔ اگلے برس ضرور پاس ہوں گا۔ ہم گھر کے بہت غریب ہیں مگر میں بی۔ اے کر لوں گا تو مجھے ضرور اچھی سی نوکری مل جائے گی۔ پھر تو شاید ماں جی کو انکار نہیں ہوگا؟ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

بملا نے ساڑھی کا پلو ٹھیک کرتے ہوئے کہا "میں کیا جانوں، جب وقت آئے گا تو ماں جی سے پوچھنا" مگر جس انداز میں اس نے یہ کہا، اور جس انداز سے اس نے مادھو کی طرف دیکھا۔ اس میں اقرار ہی اقرار تھا اور پھر وہ وہاں سے چلی آئی۔

گھر آئی تو ماں نے کہا "ارے کہاں رہ گئی تھی اتنی دیر کر دی" مگر اس سے پہلے کہ بملا کوئی بہانہ بنا سکے۔ ماں نے ایک خط اس کے سامنے کر دیا۔

"ذرا یہ تو پڑھ تیرے بابا کی چٹھی آئی ہے بمبئی سے، میرا تو ڈاکیے کو دیکھ کر ہی دل دھکڑ پکڑ کرنے لگتا ہے۔ ہاں تو کیا لکھا ہے؟"

"ماں بابا نے لکھا ہے کہ مجھے رہنے کو اچھا کمرہ مل گیا ہے۔ کوئی جگہ ہے پریل وہاں۔ سو وہ کہتے ہیں۔ تم لوگ گھر کو کرایہ پر چڑھا کر یہاں آجاؤ۔"

سو بملا اور اس کی ماں اور اس کے بھائی بہن سب بمبئی چلے آئے اور اپنے جھانسی والے تین کمروں ایک برآمدے اور ایک چھوٹے سے آنگن والے مکان کے بجائے پریل کی ایک چال کی ایک کھولی میں رہنے لگے۔ یہ کھولی اتنی چھوٹی تھی کہ رات کو بنسی لال اور دونوں لڑکوں کو باہر بالکنی ہی میں سونا پڑتا تھا۔ مگر اس کے لیے بھی چار سو روپے پگڑی کے دینے پڑے تھے اور بیس روپے ماہوار کرایہ تب ہی تو ہزاروں بیچارے ہر رات کو فٹ پاتھ پر سو کر ہی زندگی گزار دیتے تھے، بملا نے ایک دن اپنے باپ سے پوچھا "بابا ان لوگوں کو اس پتھریلے فٹ پاتھ پر کیسے نیند آتی ہوگی؟" اور اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا "بیٹی نیند کہیں بھی آسکتی ہے۔" بملا نے جھجکتے ہوئے پوچھا "بابا کبھی تم بھی فٹ پاتھ پر سوئے ہو؟" اور اس کا جواب سن کر وہ حیرت میں رہ گئی۔ "ایک دو دن نہیں بملا، مہینوں، گیارہ برس پہلے جب میں بمبئی آیا تھا، تو ٹرام کمپنی میں نوکری ملنے سے پہلے بیکاری کے دن فٹ پاتھ پر ہی سو کر گزارے ہیں۔"

کھولی چھوٹی تھی مگر بمبئی شہر بہت بڑا تھا، اور جلد ہی بمبئی کی رنگین گہما گہمی میں بملا کھولی کی زندگی کی مشکلات کو بھول گئی، بالکنی ہی میں کھڑے کھڑے وہ گھنٹوں سیر کرتی رہتی، کالی، نیلی، لال، پیلی، سفید ہر رنگ اور ہر سائز کی موٹریں ہر وقت دوڑتی رہتیں، دو منزلہ بسیں، اور دو منزلہ ٹرامیں مست ہاتھیوں کی طرح جھومتی ہوئی گزرتیں اور لوگوں کا تانتا تو کبھی ٹوٹتا ہی نہیں تھا، رات کے بارہ بجے بھی جب قریب کے مل میں شفٹ

بدلتا تو سڑک پر میلا لگ جاتا، سامنے مختلف فلموں کے بڑے بڑے رنگین پوسٹر لگے ہوتے جن پر فلم اسٹاروں کی بڑی بڑی خوبصورت تصویریں ہوتیں، ہر روز ان میں سے کوئی نہ کوئی پوسٹر غائب ہو جاتا اور اس کی جگہ کسی نئے فلم کا پوسٹر آجاتا اور پھر بنسی لال مہینے میں دو بار اپنے گھر والوں کے ساتھ ان ہی میں سے کوئی فلم دیکھنے جاتا۔ اور پانچ آنے کا ٹکٹ لے کر ببلا ایک محل جیسے عالیشان سینما ہال میں بیٹھ کر فلم دیکھتی اور حسن و عشق ناچ اور گانے کی روپہلی دنیا میں کھو جاتی مگر پھر کوئی ہیرو کسی ہیروئن سے کہتا "تم مجھے بھول جاؤ کملا، ہمارے لیے یہی بہتر ہے"، تو ببلا سوچتی بھلا یہ کیسے ممکن ہے کوئی کیسے کسی کو بھلا سکتا ہے کیا میں مادھو کو بھلا سکتی ہوں؟ اور مادھو کی یاد اس کے دل میں چٹکیاں لینے لگتی اور اس کے ہونٹ دو جلتے ہوئے ہونٹوں کے خیال سے دہکنے لگتے۔

ان کو بمبئی آئے ایک مہینہ ہی گزرا تھا۔ کہ جھانسی سے ایک رجسٹری لفافہ آیا جس میں پانچ روپے کا نوٹ تھا اور ساتھ میں ایک خط، خط ماں جی کے نام تھا، مگر پڑھ کر سنایا ببلا نے، اور دو سطریں پڑھ کر ہی وہ سمجھ گئی کہ مضمون دراصل اسی کے لیے ہے، لکھا تھا، "ماں جی نمستے جب سے آپ لوگ گئے ہیں، گھر میں سب کرائے دار آپ سب کو بہت یاد کرتے ہیں، پڑوس میں منشی کرامت علی بھی کل یہی کہہ رہے تھے کہ بنسی لال کا پریوار جب سے گیا ہے اپنی گلی میں رونق ہی نہیں رہی اور ہاں وہ وکیل صاحب جن کو آپ نے مکان کرائے پر دیا ہے۔ کہہ رہے تھے کہ انھوں نے آپ کے کہنے کے مطابق سفیدی کروائی ہے۔ اس کے ساڑھے پانچ روپے پہلے مہینے کے کرائے میں کاٹ لیں گے اور ہاں یہ بھی کہہ رہے تھے کہ گھر کی صفائی ہو رہی تھی تو سامنے والے کمرے کی الماری میں ایک کالی کنگھی ملی ہے وہ انھوں نے مجھے رکھنے کو دے دی ہے، یہ شاید ببلا بی کی ہو گی کیونکہ جو بال اس میں اُلجھے ہوئے تھے وہ بڑے لمبے لمبے تھے، سو وہ اگر کہیں تو ڈاک سے بھیج دوں نہیں تو جب آپ لوگ ادھر آئیں گے تو لے لیجئے گا۔ باقی سب خیریت ہے، شری بنسی لال جی کو نمستے اور ہاں اس لفافے میں پانچ روپے کا نوٹ بھیج رہا ہوں اس مہینے کا کرایہ، کرپا کر کے اس کی رسید ضرور بھجوا دیں، کیونکہ آج کل ڈاک کا انتظام کچھ ٹھیک نہیں۔"

خط پڑھ کر ببلا کے گالوں پر ایک تمتماتی ہوئی لالی دوڑ گئی۔ "کتنا ڈھیٹ ہے یہ مادھو، کنگھی کی کہانی کیسی گھڑی ہے حالانکہ یہ کنگھی آتے ہوئے خود ببلا نے اسے نشانی کے طور پر دی تھی اور مادھو نے اصرار کیا تھا۔ مجھے کنگھی کے ساتھ اس میں الجھے ہوئے تمہارے سر کے بال بھی چاہئیں، کتنا مکار ہے یہ مادھو، روپے منی آرڈر کرنے کے بجائے رجسٹری سے بھیج کر ان کی رسید کے بہانے جواب منگوانے کا انتظام بھی کر لیا۔ سو ایسا ہی ہوا۔ بنسی لال کام پر جانے لگا تو بیوی نے چلا کر کہا "اجی او، ایک پوسٹ کارڈ لیتے آنا، مادھو کو جواب لکھنا ہے اور روپے جو بچارے نے بھیجے ہیں۔ ان کی رسید بھی بھیجنی ہے، بڑا ہی اچھا چھوکرا ہے، کرائے کے ساتھ خط بھی بھیجا ہے، نہیں تو آج کل آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل، کون کسی کو پوچھتا ہے۔" ببلا نے سوچا کارڈ پر میں بھی دو چار شبد اپنی طرف سے لکھ دوں گی مگر جب اس کی ماں لکھوانے بیٹھی تو اتنا کچھ بولا کر دونوں طرف سے کارڈ بھر گیا، اور آخیر میں وہ اپنی طرف سے صرف اتنا لکھ پائی۔

"ببلا تمہیں یاد کرتی ہے۔"

ہفتہ کے دن بنسی لال نے کہا آج سینما نہیں اپالو بندر کی سیر کو چلیں گے، ٹرام میں بیٹھ کر میوزیم اترے، پہلے تو عجائب گھر دیکھا ببلا کو ایسے لگا جیسے اس کی اسکول کی ساری کتابیں زندہ ہو گئی ہوں، ایسی سندر مورتیاں تو جھانسی کے کسی مندر میں بھی نہیں۔ یہ بڑی بڑی تصویریں اور بھس بھرے ہوئے جانور، شیر، چیتے، جنگلی بھینسے شیشوں کے پیچھے نقلی جنگل میں کھڑے بالکل اصلی لگتے تھے، پھر عجائب گھر سے نکل کر وہ سمندر کے کنارے گئے جہاں بڑے بڑے جہاز جناتی کچھوؤں کی طرح دوڑتے پھر رہے تھے۔ گیٹ وے آف انڈیا کے سائے میں

بچے کھیل رہے تھے۔ پاس ہی چاٹ بک رہی تھی۔ سب نے دو دو آنے کی چاٹ کھائی پھر بچے دوڑنے بھاگنے لگے۔ بنسی لال نے کہا "میں تو تھک گیا۔" اور مملا کی ماں بولی "مملا تو ان شیطانوں کا خیال رکھیو۔ کہیں پانی میں نہ جا گریں۔"

بچے پہلے تو گیٹ وے آف انڈیا میں کھیلتے رہے۔ پھر وہ تاج محل ہوٹل کی طرف دوڑے کہ شیشوں میں سے ہوٹل کی رونق دیکھیں گے اور مملا ان کے پیچھے دوڑی کہ کہیں سڑک پار کرتے ہوئے کسی موٹر کے نیچے نہ آجائیں۔ ایک شیشے ہی سے جھانکا تو اندر ہوٹل میں امیر لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ بینڈ بج رہا تھا، اور ایک میم کچھ گا رہی تھی لیکن اس کی آواز شیشے کی دیواروں میں قید تھی اور ان کو ایسا لگا جیسے وہ صرف ہونٹ ہلا رہی ہے اور ہاتھوں کے اشارے کر رہی ہے۔ اگلے شیشے میں جھانکا تو دیکھا کہ لمبی گدے دار کرسیوں پر سفید کفن اوڑھے مردے پڑے ہیں اور سفید کوٹ پہنے ہوئے لوگ لمبے لمبے دھاردار چاقو لیے ان مردوں کے گلے کاٹ رہے ہیں۔ چھوٹا موہن ڈر کے مارے بہن کو چپک گیا۔ "دیدی یہ قصائی ہیں کیا؟" تب مملا نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ سفید کوٹوں والے باربر ہیں جو صاحب لوگوں کی داڑھیاں مونڈ رہے ہیں۔ اگلے شیشے میں بے جان میمیں ریشمی فراک پہنے کھڑی تھیں۔ اس سے آگے کے شیشے کے پیچھے میموں کے کٹے ہوئے سر سجے ہوئے تھے، کسی کے سر پر سنہری بال، کسی کے کالے، کسی کے بھورے کسی کے گھونگریالے۔ کسی کے بالکل مردوں کی طرح کٹے ہوئے، کسی کی لمبی چوٹیاں، اور ان کے قریب ہی بالوں کی نقلی چوٹیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ مملا نے سوچا ان نقلی چوٹیوں کا کیا ہوتا ہوگا اور دل ہی دل میں ان کی لمبائی کا اپنے بالوں کی لمبائی سے مقابلہ کیا اور یہ سوچ کر مسکرا دی کہ بھلا میرے بالوں کی لمبائی کا کون مقابلہ کر سکتا ہے۔

اندر سے ایک کالی میم نکل کر باہر جا رہی تھی، مملا نے ہمت کر کے اس سے پوچھا۔ "میم صاحب یہ بال یہاں بکتے ہیں کیا؟"

میم بولی "ہاں ہاں، ادھر ان کا سیل ہوتا ہے۔"

"مگر میم صاحب یہ آتے کہاں سے ہیں کیا مردوں کے بال کاٹ لیتے ہیں؟"

"نو نو" میم ہنس کر بولی۔ "بندہ لوگوں کا بال ادھر آتا ہے۔" اور پھر جیسے ہی اس کی نظر مملا کی ناگن کی طرح لہراتی ہوئی لمبی چوٹی پر پڑی اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ "چھوکری تمہارا یہ بال اصلی ہے یا نقلی؟"

"بالکل اصلی ہے میم صاحب۔"

"ویری گڈ" ان بالوں کا ہم تم کو بہت دام دے سکتا ہے، ٹو روپیز این انچ۔ تم کو کوئی سو روپیہ مل سکتا ہے۔"

"ہی کیا کہا میم صاحب؟ تم چاہتی ہو میں اپنے بال کٹوا دوں۔ نہیں جی مجھے شما کرو۔"

اور پھر بچوں کو گھسیٹتے ہوئے "چلو چلو یہاں سے بھاگ چلیں کہیں یہ میم صاحب بالوں کے بعد میرا سر بھی نہ کاٹنے لگیں۔"

سو وقت گزرتا گیا۔ ہر مہینے مادھو کا خط آتا رہا اور ماں کی طرف سے مملا جواب لکھتی رہی مگر ایک مہینے مادھو کا خط جو آیا وہ رجسٹری نہیں تھا، سادے لفافے میں تھا اور جب وہ کھولا گیا تو اس میں پانچ کا نوٹ بھی نہیں تھا۔ لکھا تھا "ماں جی مجھے بڑی شرمندگی ہے کہ اس بار وقت پر آپ کو کرایہ نہیں بھیج پایا امتحان قریب آگیا ہے۔ اس کے لیے ایک کتاب خریدنی تھی۔ کرائے کے روپوں سے وہ خرید لی۔ پندرہ دن میں امتحان کی فیس بھرنی ہے۔ لگ بھگ سو روپے چاہئیں مگر میرے پتا جی کی حالت خراب ہے۔ اس برس فصل خراب ہوئی ہے۔ جانوروں کی بیماری میں دو بیل بھی مر گئے۔ اس لیے انھوں نے صاف لکھ دیا ہے۔ میں تو کوئی انتظام نہیں کر سکتا۔ اس وجہ سے

میں بہت پریشان ہوں، سب رشتہ داروں، دوستوں کو مدد کے لیے لکھ رہا ہوں۔ دیکھئے کسی نے وقت پر روپے بھیج دیئے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ ایک سال اور بیکار رہ جائے گا۔ ایک سال تو پہلے ہی فیل ہو کر کھو چکا ہوں، ایشور سے پرارتھنا کیجئے کہ کوئی بندوبست ہو جائے۔ شری بنسی لال جی کو نمستے ببلا سے کہیئے گا اگر مجھے یہ گھر چھوڑنا پڑا تو اس کی کنگھی ڈاک سے بھیج دوں گا۔"

ببلا نے سوچا سو روپے کہاں سے لاؤں یہ تو بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔ بابا مہینے بھر آٹھ گھنٹے روز ٹرام چلاتے ہیں تب سب کچھ کٹ کٹا کر سو روپے ملتے ہیں۔ اس کے پاس تو کوئی سونے کا زیور بھی نہیں کہ وہ ہی بیچ ڈالے، چاندی کے دو تین گہنے ہیں، ایک ہنسلی ایک چھاگل، ہاتھوں کی چار چوڑیاں، نہ جانے چاندی کا کیا بھاؤ ہے؟ اس نے سوچا اگلے دن ماں کی نظر بچا کر اس نے گہنوں کو اپنی ساڑی کے پلو میں باندھا اور قریب کے ایک سنار کے ہاں پہنچی اس نے آنگ کر سب گہنوں کی اٹھارہ روپے قیمت لگائی مگر ساتھ میں یہ بھی کہا کہ بیچنے والے کو نام پتہ بھی رجسٹر میں لکھوانا پڑے گا، ببلا ڈری کہ ماں باپ کو معلوم ہو گیا تو پٹائی ہو جائے گی۔ جلدی سے بولی، میں اپنا نام نہیں لکھوانا چاہتی۔ سنار نے اسے ایسی نظر سے دیکھا جیسے وہ یہ گہنے چرا کر لائی ہو۔ "اچھا ایسا ہے تب تو میں پندرہ روپے سے زیادہ نہیں دے سکتا" مگر پندرہ روپے سے سو روپے کا کام کیسے چلے گا، یہ سوچ کر وہ چلی آئی۔

کئی دن تک وہ اسی سوچ میں رہی کہ مادھو کو سو روپے بھیجوں تو کیسے بھیجوں لیکن کوئی ترکیب سمجھ میں نہ آئی، رات کی نیند بھی اڑ گئی، صبح ہوتے آنکھ بھی لگتی تو خواب دیکھتی کہ زمین سے لے کر آسمان تک اونچی ایک سیڑھی لگی ہے اور اس کے نیچے مادھو کھڑا کہہ رہا ہے "ببلا یہ ترقی کا زینہ ہے پر سو روپے فیس دیئے بنا اس پر چڑھنے کی اجازت نہیں مل سکتی، کبھی دیکھتی سمندر میں طوفانی لہریں اٹھ رہی ہیں اور ان لہروں میں مادھو غوطے کھا رہا ہے۔ ببلا اسے دیکھ کر سمندر میں کود پڑتی ہے اور غوطے کھانے لگتی ہے، اس وقت مادھو چلا کر کہتا ہے "ببلا جلدی سے سو روپے کا نوٹ ساگر دیوتا کی بھینٹ کر نہیں تو ہم دونوں آج ڈوب جائیں گے"۔ اور کبھی سپنے میں اسے محسوس ہوتا کہ دو جلتے ہوئے ہونٹ اس کے ہونٹوں میں پیوست ہوئے جا رہے ہیں اور وہ اذیت بھری مسرت کے اندھیرے میں ڈوبتی جا رہی ہے کہ دفعتاً کوئی شیطانی ہاتھ مادھو کو اس کی آغوش سے گھسیٹ کر دور ایک چٹان پر پٹخ دیتا ہے۔ اور ایک ڈراونی آواز سپنے میں بھی اس کا دل دہلا دیتی ہے "پہلے سو روپے لاؤ سو روپے"۔

چیخ مار کر اس کی آنکھ کھلی تو دن چڑھ چکا تھا اور اس کی ماں کہہ رہی تھی "ببلا ری کیا ہوا؟ سپنے میں ڈر گئی تھی کیا؟"

اس دن ببلا نے ماں سے کہا "بابا کو بہت محنت کرنا پڑتی ہے ماں، پھر بھی ہمارا خرچہ پورا نہیں ہوتا، میں بھی کہیں نوکری کر لوں تو کیسا ہو؟" پہلے تو اس کی ماں کو یہ خیال ہی برا لگا "پاگل ہوئی ہے ری ایسے بدنظر شہر میں چھوکریوں کا کام پر جانا مجھے تو بالکل نہیں پسند، کرسچین چھوکریوں کی بات اور ہے"۔ مگر کچھ سوچ کر یہ بھی کہا "خیر تیرے بابا آئیں گے تو ان سے کہوں گی تو جانے اور وہ جانیں"۔ ببلا کا خیال تھا بابا کبھی اجازت نہیں دیں گے مگر بنسی لال نے بیوی کی بات سن کر کہا "ٹھیک تو کہتی ہے ببلا اس تنخواہ پر تو میں ان بچوں کو بمبئی میں نہیں پڑھا سکتا، ببلا کی چھوٹی موٹی نوکری لگ جائے تو بڑا سہارا ہو جائے"۔ اور پھر ببلا سے "بڑے وقت پر یاد آیا، اری تو نے ہندی کا بھوشن پاس کیا ہے نا؟ بس پھر کام بن جائے گا۔ اپنے پڑوسی ہیں نارتن لال جی، وہ کہہ رہے تھے کہ ان کی مل میں جو سوشل ورکر ہے وہ مزدوروں کے لیے ہندی کلاسیں کھولنا چاہتی ہیں انھیں ضرور ہندی ٹیچروں کی ضرورت ہوگی۔"

باہر بورڈ پر لکھا تھا "مس سیتا دیوی رام چند سوشل ورکر" مگر ببلا اندر جو پہنچی تو دیکھا سفید کرتا پاجامہ پہنے ایک دبلا سا گورا سا

لڑکا بیٹھا ہے۔

"جی شما کیجئے۔ میں سیتا دیوی جی سے ......" اور یہ کہتے ہوئے وہ اُلٹے پیروں لوٹنا چاہتی تھی کہ اس "لڑکے" نے اشارے سے اسے روکا اور مسکرا کر کہا۔

"میں ہی سیتا دیوی ہوں، کہو کیا کام ہے؟"

تب بملا نے دیکھا کہ "لڑکا" دراصل اس سے عمر میں کچھ بڑی لڑکی ہے۔ جس کے بال لڑکوں کی طرح چھوٹے چھوٹے کٹے ہوئے ہیں اور جو کھدر کا کرتا اور لڑکوں جیسا ڈھیلے پائنچوں کا کھدر کا پاجامہ پہنے ہوئے ہے اور نہ جانے کیوں بملا کو یوں محسوس ہوا جیسے اس سیتا دیوی کے لڑکوں جیسے بال اس سے کچھ کہہ رہے ہیں مگر وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ وہ اس وقت نہ سمجھ سکی۔

اس کے بھوشن کے سرٹیفکیٹ پڑھ کر ہی سیتا دیوی نے بملا کو ہندی ٹیچر کی نوکری دینا منظور کر لی، کام صرف چار گھنٹے روز اور تنخواہ صرف پچاس روپیہ ماہوار ہفتے میں ایک دن چھٹی سال میں ایک مہینے چھٹی۔" "اور پیشگی؟ کیا دو مہینے کی تنخواہ پیشگی مل سکے گی؟" سیتا دیوی نے جواب میں کہا "بملا تم بیٹھ جاؤ اور پھر بات کرو۔ تم بمبئی میں بالکل نئی اور سیدھی معلوم ہوتی ہو۔ جانتی ہو کتنی مشکل سے اور کتنے دباؤ ڈال کر میں نے مل مالکوں کو یہ ہندی کلاسیں چلانے پر راضی کیا ہے۔ اگر کہیں ان کو معلوم ہوا کہ ہندی ٹیچر دو مہینے کی تنخواہ اڈوانس مانگ رہی ہے تو سیٹھوں کو دل کا دورہ پڑ جائے گا۔" اور پھر کرسی آگے سرکا کر دھیمے لہجے میں جیسے ایک سہیلی دوسری سہیلی سے بات کرتی ہے۔ "مگر تمہیں یہ اڈوانس کیوں چاہئے، گھر میں کوئی بیمار ہے؟ تو میں علاج کا انتظام کر سکتی ہوں۔"

"نہیں نہیں بہن جی گھر میں کوئی بیمار نہیں ہے۔"

"تو تمہارا بیاہ ہے کیا؟ ایسی صورت میں تمہارے پتا کو اڈوانس دلوایا جا سکتا ہے، ٹرام کمپنی کے سوشل ورکر کے ذریعہ۔"

"نہیں نہیں بہن جی بابا کو تو اس بات کا پتہ بھی چل گیا تو برا ہو گا۔ اچھا اب میں جاتی ہوں۔ کل سے کام پر آجاؤں گی۔"

مل سے لوٹتے ہوئے وہ ٹرام میں اوپر جا کر بیٹھ گئی۔ حالانکہ اس کا گھر وہاں سے دور نہیں تھا، مگر اس وقت وہ کہیں الگ بیٹھ کر اس مسئلے پر سوچنا چاہتی تھی، کنڈکٹر نے پوچھا "کہاں کا ٹکٹ کاٹوں؟" اس نے کہہ دیا جہاں تک یہ ٹرام جائے گی۔" اور پھر اپنے خیالات میں کھو گئی۔ دفعتاً اسے ایسا محسوس ہوا کہ ٹرام خالی ہے اور نیچے کوئی ٹرام کی آہنی دیواروں کو دھڑ دھڑ پیٹ رہا ہے "اے دیوی جی میوزیم آگیا، اترنا ہے یا واپس جانا ہے؟"

وہ نیچے اتر آئی اور بے خیالی میں اپالو بندر کی طرف چلنے لگی، دو موٹروں کے نیچے آتے آتے بچی جلدی سے فٹ پاتھ پر ہو لی اس کے بعد اسے ہوش آیا تو وہ شیشے کی دیوار کے سامنے کھڑی اس میں سجے ہوئے میموں کے سروں کو دیکھ رہی تھی۔ کسی کے سر پر سنہری بال کسی کے سر پر کالے، کسی پر بھورے، کسی کے گھونگھریالے، کسی کے بالکل مردوں کی طرح کٹے ہوئے۔ اور یکایک اس کی سمجھ میں آگیا کہ سیتا دیوی کے لڑکوں جیسے بال اس سے کیا کہہ رہے تھے۔

....

ٹیکسی کرافورڈ مارکیٹ سے آگے نکل چکی تھی۔

بملا نے پوچھا۔ "تم نے امتحان پاس کر لیا اور ہمیں مٹھائی بھیجنا تو کیا خبر بھی نہ بھیجی، ماتا جی کو تو بہت چنتا تھی کہ نہ جانے مادھو کا کیا ہوا۔

ہمارا گھر جب سے چھوڑا ایک چٹھی بھی نہ بھیجی؟"

"بملا کیا بتاؤں بس کچھ ایسے ہی کاموں میں پھنسا ہوا تھا۔ چھ مہینے دہلی میں رہا، وہاں سے کانپور گیا، پھر کلکتے مگر اب میں بمبئی آگیا ہوں۔ ہمیشہ کے لیے۔"

"بی۔ اے ہو۔ نوکری تو اچھی ملی ہو گی؟"

"نوکری تو اچھی ہے۔ مگر میں نے بی۔ اے نہیں کیا، امتحان نہیں دے سکا۔"

"امتحان نہیں دیا! تو وہ فیس......"

"فیس کا بھی عجیب قصہ ہوا بملا! یاد ہے میں نے تمہاری ماتاجی کو اس بارے میں خط لکھا تھا؟ اسی طرح اور بھی دس بارہ رشتہ داروں اور دوستوں کو خط لکھے تھے۔ ان میں سے تین تو بمبئی ہی میں رہتے ہیں مگر کسی نے پھوٹی کوڑی تک نہیں بھیجی اور فیس بھرنے کی آخری تاریخ گزر گئی۔ اگلے دن میں تمہارا گھر چھوڑ کر واپس گاؤں جانے کی سوچ رہا تھا کہ ڈاکیے نے ایک تار کا منی آرڈر لا کر دیا، سو روپے کا مگر اس پر بھیجنے والے کا نہ نام تھا نہ پتہ اور آج تک یہ نہ معلوم ہو سکا کہ یہ مہربانی کس کی تھی، مگر ان سو روپوں سے میری قسمت بدل گئی۔"

"تو کیا کیا ان روپوں کا تم نے؟"

"میں نے امتحان کی فیس دے کر بی۔ اے کی ایک بیکار ڈگری لینے کے بجائے ساٹھ روپے کا ایک بڑھیا سوٹ سلوایا اور باقی روپے لے کر دہلی پہنچ گیا۔ وہاں ایک دوست نے اس کام میں لگوا دیا سو تم دیکھ سکتی ہو کہ میں کتنا کامیاب ہوں۔" اور یہ کہہ کر اس نے اپنی ریشمی ٹائی کی گرہ کو ٹھیک کیا۔

"کیا ہے تمہارا کام؟"

"میرا کام یہی ہے کہ......" مگر اتنے میں ٹیکسی ایک چھ منزلہ عمارت کے نیچے جا کر کھڑی ہو گئی سوم ناتھ نے کہا "یہ ابھی معلوم ہو جائے گا تمہیں۔"

بملا پہلی بار لفٹ میں چڑھ کر چوتھی منزل تک پہنچی، مادھو اسے لے کر بڑی بے تکلفی سے ایک دفتر میں داخل ہوا اور ٹائپسٹ لڑکیوں کے بیچ میں سے "ہیلو، ہیلو" کہتا ہوا ایک کمرے میں لے گیا، جو اتنا ٹھنڈا تھا کہ اندر گھستے ہی بملا کو چھینکیں آنے لگیں۔

"لگتا ہے ایئر کنڈیشننگ کی عادت نہیں ہے تمہیں؟ اچھا تم بیٹھو میں ابھی آتا ہوں، یہ کہہ کر وہ باہر گیا اور بملا نے سہمی ہوئی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا، زمین پر گہرا نیلا قالین اتنا نرم اور دبیز کہ پاؤں دھنسے جاتے تھے، ایک میز کاغذوں اور تصویروں سے لدی ہوئی، تصویریں سب خوبصورت عورتوں کی، ایک طرف تین ٹانگوں پر لدا ہوا بڑا سا سینما کا کیمرہ۔ دو تین اور کیمرے۔ تین بڑے بڑے بلبوں کے لیمپ جن کی روشنی چندھیانے والی تھی، اور ایک چھوٹی تپائی پر لال لال تیل کی بوتلیں جن کے لیبلوں پر کھلے بالوں والی ایک لڑکی کی تصویر تھی اور تیل کا نام لکھا تھا۔

"کالی گھٹا ہیر آئل"

سامنے ایک بلیک بورڈ اور اس پر ہندی حروف میں لکھا تھا: میرے بال اتنے لمبے صرف اس لیے ہیں کہ میں ہمیشہ کالی گھٹا ہیر آئل استعمال کرتی ہوں۔"

وہ ان سب ان مل اور بے جوڑ چیزوں کا آپس کا تعلق سمجھ نہیں پائی تھی کہ اتنے میں دروازہ کھلا اور ایک گنجا سا موٹا سا آدمی

موٹے موٹے شیشوں کی عینک پہنے داخل ہوا۔ اور انگریزی میں بولا۔

"اوہ ہیلو، سو یو آر کرنز گرل فرنڈ؟" (SO YOU ARE KIRAN'S GIRL FRIEND?)

"جی میں مادھو کے ساتھ آئی ہوں۔"

"مادھو؟ کون مادھو! اوہ تمہارا مطلب ہے اپنا کرن کمار، ویری اسمارٹ برائے۔"

اور اسی وقت مادھو داخل ہوا ہاتھ میں ایک کنگھا لیے ہوئے۔

"مادھو یہ کیا تم نے اپنا نام بدل لیا ہے کیا؟"

"ہاں لملا مادھو جیسے بھولے نام سے اس دنیا میں کوئی ترقی نہیں کر سکتا۔۔۔ ہاں تو دیکھو تم اپنے بالوں میں کنگھی کر رہی ہو۔ تمہارا منہ دوسری طرف ہے۔ کیمرہ صرف تمہارے بالوں پر ہے، دھیرے دھیرے کیمرہ پیچھے جاتا ہے، اب ہم تمہارے بالوں کی حیرت انگیز لمبائی دیکھتے ہیں، اب تم آہستہ آہستہ کیمرے کی طرف مڑتی ہو، مسکراتی ہو اور کہتی ہو۔

"میرے بال اتنے لمبے صرف اس لیے ہیں کہ میں ہمیشہ کالی گھٹا ہیئر آئل استعمال کرتی ہوں۔"

"مگر مادھو میرے بال تو۔۔۔۔۔۔۔"

"اس میں شرمانے کی کوئی بات نہیں یہ تو بزنس ہے، دھندا ہے، کام ہے، کیوں شرما جی ٹھیک کہتا ہوں؟ ہاں تو لملا چند منٹ پوز کرنے کے پورے سو روپے تمہیں ملیں گے۔ یہ فلم پروڈیوس کرنے کے ہزار روپے مجھے ملیں گے اور اس فلم کو بنانے کے ٹھیکے میں پانچ ہزار کا منافع ہوگا شرما جی کو —— ہاں تو شرما جی اب آپ ہندوستان کے ہی نہیں، ایشیا کے ہی نہیں، دنیا کے سب سے لمبے بال دیکھیں گے۔"

اور یہ کہہ کر اس نے ڈرامائی انداز میں لملا کے سر سے پلو کھینچ لیا اور لملا نے شرم کے مارے اپنا منہ چھپا لیا۔

مادھو چلایا۔ "لملا! تم نے یہ کیا کیا؟"

اور شرما نے کہا۔ "کرن۔ یہ سب کیا ہے۔ ہم سے مذاق کرتے ہو۔"

"ہندوستان کے ہی نہیں، ایشیا کے ہی نہیں، دنیا کے سب سے لمبے بال؟ ساڑھے پانچ انچ لمبے۔ اسی پروگرام کے تم ہزار روپے مانگ رہے تھے؟"

"مگر مسٹر شرما۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

"گیٹ آؤٹ اور اب مجھے اپنی صورت کبھی نہ دکھانا اور نہ کسی دوسری ایڈورٹائزنگ کمپنی میں گھسنے کی کوشش کرنا میں تمہاری اس حرکت کی رپورٹ اپنی ایسوسی ایشن کو بھیجنے والا ہوں۔"

ٹیکسی کے بجائے اب وہ ٹرام ہی میں لوٹ رہے تھے۔

لملا نے پوچھا۔ "اب میں تمہیں مادھو کہوں یا مسٹر کرن کمار؟"

"مسٹر کرن کمار مر گیا، مادھو ہی کہو۔"

"مجھے معاف کرنا مادھو، میں نے بال کٹوا کر تمہارا اتنا نقصان کروا دیا۔"

"وہ تو ہوا مگر ببلا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے ایسا کیا کیوں؟"

"کنگھی کرنے میں بہت وقت جاتا تھا، اب میں روز کام پر جاتی ہوں نا، مل میں مزدوروں کو ہندی پڑھانے، وہی ہندی جو تم نے مجھے پڑھائی تھی۔"

"تو کیا مجھے ایسا کام نہیں مل سکتا؟ چھوٹی سی نوکری بھی مل جائے تو میں تمہارے پتاجی سے بات کروں۔"

"کیوں نہیں، ہمارے یہاں ہی کام کر سکتے ہو اب وہ مل میں باقاعدہ اسکول بنانا چاہتے ہیں۔ تم تو پڑھا کر ہو ڈیڑھ سو روپے مل جائیں گے۔ سارے دن پڑھانے کے۔"

"اور تم؟"

"میں چار گھنٹے پڑھاؤں گی۔"

"اور باقی وقت؟"

"باقی وقت تمہارے گھر کی دیکھ بھال کروں گی۔"

"میرا گھر؟"

"نہیں میرا گھر۔"

اور ان دونوں نے چلتی ٹرام میں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا اور نہ جانے کتنی دیر دیکھتے ہی رہے، اور اس وقت ببلا کو معلوم ہوا کہ نگاہوں کا طویل بوسہ بھی ہونٹوں کے پیار سے کم تکلیف دہ اور کم لذت بخش نہیں ہوتا۔

"چلو چلو ٹرمنس آگیا ٹرام خالی کرو" کنڈکٹر کی آواز نے وہ طلسمی لمحہ ختم کر دیا، گھبرا کر دونوں اٹھے، جیسے چوڑ پکڑے گئے ہوں۔ کنڈکٹر کھڑا ان کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا — "بابا" ببلا چلائی۔ "یہ ہیں ......" مگر اب وہ مادھو کا نام نہ لے سکی۔

رات، چور اور چاند

(مسلسل)

بلونت سنگھ

جوالا سنگھ کو عمر بھر اس بُری طرح سے پسپا نہ ہونا پڑا تھا۔ راستے میں زیادہ گفتگو بھی نہ ہوئی البتہ جوالا سنگھ نے دو ایک مرتبہ کلال کو گالی دے کر کہا——

"حرام جادہ کہتا تھا ان کے پاس بندوک نہیں ہے اور پھر چلّانے لگا "چھوٹے باؤ مجھے مت مارو میں کلال ہوں"۔ بھلا کوئی پوچھے کہ تو ان کا سالا تو نہیں لگتا تھا جو وہ تجھے چھوڑ دیں اور اگر وہ نہ بھی مارتے تو کیا میں چھوڑ دیتا......" پھر اس نے پالی کی طرف مخاطب ہو کر کہا، "آج تک ہم اس طرح کبھی نہ بھاگے تھے۔ انتجام ٹھیک نہیں تھا۔ بھیدی اچھا ہونا چاہیے۔"

کاہن سنگھ بولا——

"پر چاچا یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ بندوک بن کر آ گئی ہو اور کلال کو اس بات کا پتہ نہ چلا ہو۔"

"کہاں ہو سکتا ہے۔" دو تین آوازیں آئیں۔

پالی کہنے لگا——

"اس چھوٹے باؤ کی گردن تو میں نے مروڑ ڈالی ہوتی، بچ گیا۔ سالے نے ایسی تڑا تڑ گولی چلائی کہ بس...... مجھے بھی مار ڈالا ہوتا، وہ تو بھلا ہو چھنتو کا اس نے کچھ ایسا ہاتھ مارا کہ اس کا نشانہ چوک گیا......"

چھنتو نے اُڑتے ہوئے بالوں کو کانوں کے پیچھے دباتے ہوئے کہا——

"ہے! نہ معلوم کہاں سے لایا تھا بندوک جیل سنگھ۔ بندوک ٹھیک ہوتی تو میں وہاں ایک ایک آدمی کو بھون ڈالتی......"

جوالا سنگھ نے سر ہلا کر کہا——

"بچارے جیل سنگھ کی موت کا بہت اپھسوس ہے، پر ہم بدلا لیے بنا نہیں رہیں گے۔ اب کے اور بھی پکا انتجام کر کے جائیں گے۔"

کاہن سنگھ بولا——

"بندوبست تو آج بھی بہت اچھا تھا، پر ایک تو ان کے پاس بندوک نکل آئی جس کا ہمیں پتہ ہی نہیں تھا۔ دوسرے ہماری بندوک کھراب ہو گئی، نہیں تو ہم انھیں مجا چکھا دیتے۔"

چنتو نے سانڈنی اور بھی تیزی سے اُڑائی اور کاہن سنگھ کے قریب پہنچ کر بولی ——

"برکھوردار پھکر نہ کرو۔ بکرے کی ماں کب تک کھیر منائے گی۔ حرام جادہ چھوٹا بابو تو کتے کی موت مارا جائے گا۔"

کاہن سنگھ کے گاؤں کے قریب پہنچ کر جوالا سنگھ نے پالی کو مشورہ دیا کہ اگر وہ سیدھا اپنے گاؤں کو چلا جائے تو بہتر ہو کیونکہ اس طرح کسی کو کوئی شک نہ گزرے گا۔ دو چار روز بعد وہ بھی وہاں پہنچ جائیں گے۔

پالی نے تجویز منظور کر لی ——

چنانچہ اس کے ساتھ ایک سانڈنی سوار بھیج دیا گیا تاکہ اسے گاؤں تک چھوڑ کر اور اس کی سانڈنی لے کر واپس چلا آئے۔

ان سے رخصت ہو کر جب پالی اپنے گاؤں کی طرف چلا تو رفتہ رفتہ اسے اپنی ناکامی کا احساس ہونے لگا۔ اس وقت تک گرما گرمی میں دیگر امور زیرِ بحث رہے لیکن درحقیقت اس کی سب امیدیں خاک میں مل گئی تھیں۔ جو جو ہوائی قلعے اس نے اپنے ذہن میں تعمیر کیے تھے آنِ واحد میں خاک میں مل گئے۔

پالی کا دل بوجھل ہو رہا تھا۔ اب غیر واضح مستقبل اس کے سامنے تھا۔ اس کا ذہن کچھ کام نہیں کرتا تھا۔ سرِ دست اور کسی ذریعے روپیہ حاصل ہونے کی امید نہیں تھی اور روپے کے بغیر اس کی دال ہی نہیں گل سکتی تھی۔ ایک نہایت حسین اور جمیل حریف سے مقابلہ تھا جو دنیاوی جاہ و جلال میں بھی اس سے کئی گنا بڑھا چڑھا تھا۔ شاید جلد ہی ڈاکے کا کوئی نیا پروگرام بن جائے لیکن اس بات کی امید نہیں تھی جب تک کہ پہلا قضیہ بالکل ختم نہ ہو جائے اس وقت تک جوالا سنگھ جیسے دور اندیش شخص سے یہ امید رکھنا کہ وہ کوئی نیا بکھیڑا شروع کر دے گا محض حماقت تھی۔

اسی ادھیڑ بن میں وہ اپنے گاؤں کی جانب بڑھتا گیا۔ اس نے اپنے ساتھی سے بھی کوئی بات چیت نہ کی۔ بے توجہی کے سبب ان کی رفتار بھی کم رہی چنانچہ نصف راستہ طے کرنے پائے تھے کہ سورج نکل آیا۔ پالی نے گاؤں سے ایک کوس اِدھر سانڈنی روک لی اور اپنے ساتھی سے کہا "میں اسی جگہ اُتر جاتا ہوں۔ یہاں سے پیدل گاؤں پہنچ جاؤں گا۔ دن چڑھ آیا ہے کسی نے ہم دونوں کو ساتھ ساتھ دیکھ لیا تو مفت میں شک ہو گا اسے۔"

اس نے ڈانگ سے لگی ہوئی چھوی بھی اتار کر اسے دے دی اور خود محض لٹھ اٹھائے گھر کو چل دیا۔

گھر والے یہی سمجھے بیٹھے تھے کہ وہ امرت سر اشنان کرنے کے لیے گیا ہوا ہے۔ اس نے وہاں پہنچتے ہی کہا ——

"رات سونے کا موقع نہیں ملا۔ لاؤ کچھ کھانے کو دو تاکہ میں جلدی سے سو جاؤں اور پھر جب تک میں خود نہ جاگوں مجھے کوئی نہ جگائے ——"

باسی روٹی اور مکھن کھا کر اوپر دو تین چھنّے (بڑے کٹورے) لسّی کے پی کر اس نے ایسی لمبی تانی کہ شام تک کروٹ نہ لی۔

سورج ڈوبنے کو ہوا تو سنداں نے اسے جگانا چاہا لیکن تاباں نے منع کر دیا۔

"سونے دے بے بے جب اس نے کہہ رکھا ہے کہ اسے کوئی نہ جگائے تو پھر کیوں جگاتی ہو۔"

"ہاؤ ہائے" سنداں منہ پھیلا کر بولی "ہم تو بڑے بوڑھوں سے یہی سنتے آئے ہیں کہ شام کے سمے نہیں سونا چاہیے......"

"تو بے بے اٹھ کر جو گالی بکنے لگے گا تو کیا پھائدہ؟"

پالی کافی دیر سو چکا تھا۔ اس نے بھابی کی یہ ڈانٹ سن لی لیکن اس نے نہ تو آنکھیں کھولیں اور نہ کروٹ بدل کر ان کی طرف منہ ہی کیا۔ بے بے جھنجھلا کر بولی ——

"ہے تو نہ سہی۔ اچھی بات بھی کہو اور جلی کٹی بھی سنوان گی..... ہاں نہیں تو۔"

بھابی کی آواز آئی ——

"تم تو یونہی بگڑ جاتی ہو بے بے۔ جلی کٹی کیا سنائی یہی تو کہا نا کہ بچارا بھیڑ بھاڑ میں رات بھر سو نہیں سکا۔ اب سونے دو، جب چاہے جاگے، یہاں کون جہاز رکا ہے اس کے جاگے بگیر......."

"نہیں مُنو تیرا کوئی قصور نہیں، جمانہ ہی ایسا ہے۔ کل جگ ہے کل جگ۔ بڑوں اور چھوٹوں میں کوئی تمیز ہی نہیں رہی۔"

"تو تو سٹھیا گئی ہے۔ جب بیٹھے بٹھائے بکھیڑا کرنے کو جی چاہے تو یونہی بکنے لگتی ہے۔"

سنداں گرم ہو کر بولی ——

"اے منہ کو لگام دے ری چھوکری —— میں نے کتا تو نہیں کھایا کہ بکھیڑا کرنے لگوں۔ بڑی سگھڑ بن بیٹھتی ہے۔ بات کرنے کا ڈھنگ تو سیکھ لے۔"

"بات کرنے کا ڈھنگ تو تجھ سے سیکھے کوئی......"

اتنے میں لہنا سنگھ بھی آ پہنچا۔ پنجالی ایک کونے میں ٹکا کر بولا ——

"ارے بھائی یہ کیا چپڑ چپڑ لگا رکھی ہے۔ کبھی تو چپکی بیٹھ جایا کرو......"

سنداں بولی ——

"چپکا بیٹھنے بھی دے کوئی؟"

لہنا سنگھ نے سمجھ لیا کہ ساس بہو میں جھپٹ ہو رہی ہے۔ مسکرا کر کہنے لگا ——

"چپکے رہنے میں بھی کوئی جور لگانا پڑتا ہے۔ بیٹھی رہو تو کون منع کرتی ہے بہو رانی!"

لہنا تھکا ماندہ آیا تھا لیکن اس وقت بڑے خوشگوار موڈ میں تھا۔ اسے ساس بہو کی لڑائی سے کوفت محسوس ہونے کی بجائے لطف محسوس ہونے لگا۔ بیوی کی طرف مخاطب ہو کر بولا ——

"کہو ری بہو رانی! کیا بات ہے؟"

"بات کیا ہے بے بے کہتی تھی کہ پالی کو جگا دو، میں نے کہہ دیا کہ بچارا رات بھر مشا پھر کھانے میں پڑا ہوگا، نیند آئی ہے تو سونے دو۔ جاگ کر اسے کوئی کام تو کرنا ہے نہیں......"

"اے میں تو کہتی ہوں کہ سورج ڈوبے سونا نہیں چاہیے۔ بس اتنی سی بات منہ سے نکلنے کی دیر تھی کہ یہ جنگلی بلی کی طرح پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ گئی......."

"پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑنے کی کیا جرورت مجھے۔ میں نے بھی تو دھیرج سے بات کہی تھی، تو آپ گرم ہو گئی۔ گسہ تو رہتا ہے ناک پر......."

"لے سُن لے۔ کوئی ایک بات کہی ہے اس نے۔ ناں جی اس بچاری کا کیا کسور۔ یہاں تو سارا آوا ہی اُوت گیا ہے۔ کسے کہیے کسے نہ کہیے۔"

اب لہنا سنگھ صحن میں بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ چکا تھا۔ بچوں نے گود میں چڑھ کر اس کی لمبی داڑھی کے بال آپس میں بانٹ لیے تھے اس نے اپنے تھکے ہوئے پاؤں کو سہلاتے ہوئے کہا۔

"جرا اُٹھ جگّو کی ماں مجھے پانی تو پلا دے...... ہاں تو بے بے کیا کہہ رہی تھیں تم۔"

"میں تو بس ایک ہی بات کہتی ہوں کہ آج کل تو بس چُپ ہی بھلی...... اب اس سرنوں ہی کو دیکھو، ندیدی ہمارے ہاتھوں میں پلی، بڑی ہوئی، منہ تو دیکھو کیسی بھولی بھالی ہے جیسے منہ میں دانت ہی نہیں......"

لہنا سنگھ نے پانی کا چھنّا ہاتھ میں لے کر کہا۔

"ہاں بے بے نہ ملوم کیا بھید ہے کئی اُلٹی سیدھی باتیں سُننے میں آ رہی ہیں۔"

پاآلی کے کان کھڑے ہو گئے۔

سنداں بولی۔

"اے ہماری بلا سے...... اُلٹی سیدھی باتیں بھی یونہی نہیں اُڑا کرتیں۔ کیا مجال بھی ہے کسی کی کہ کسی بھلے گھر کی بہو بیٹی کے بارے میں ایک پھچ بھی کہہ سکے۔ جب دال میں کچھ کالا ہوتا ہے تبھی لوگ باگ باتیں اڑاتے ہیں...... پر جی باگورو سے ڈرنا چاہیے۔ ہے بہو بٹیا! پانی تو مجھے بھی پلا دے نہ جانے ایسی شردی میں پیاس کاہے کو لگتی ہے۔"

لہنا سنگھ نے دل ہی دل میں کہا۔ لیجئے بہو رانی پر مہربان بھی ہو گئیں۔

بہو رانی نے بھی فرماں برداری سے پانی کا چھنّا ساس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"بے بے کو یہ بھی جاد نہیں رہا کہ آج دوپہر بیسن کی روٹیاں کھائی تھیں اب پیاس نہ لگے گی تو اور کب لگے گی؟"

یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگی۔

لہنا سنگھ نے پھر بات چھیڑی۔

"تو بے بے! تجھے تو ملوم ہوگا۔ مرد تو جونہی الول جلول ہوتے ہیں اور تجھے تو سارے گاؤں بھر کی کھبر رہتی ہے۔"

اس بات پر سنداں خوش ہوئی۔

"ارے ہاں! مجھے کھبر تو رہتی ہی ہے اور پھر سرنوں کی کھبر نہ رہے گی تو کس کی رہے گی۔ پر بیٹا ہمیں کسی سے کہنے کی جرورت بھی کیا ہے؟"

"ہم کوئی گیر تو نہیں نا، گھر کی بات گھر ہی میں رہے گی۔"

"اے ہے تُو تو پیچھے ہی پڑ گیا ہے میرے۔"

نایاں بولی۔

"ہاں بے بے آج کل بڑی کھسر پھسر ہو رہی ہے سرنوں کی بابت۔ یوں تو سرنوں سے بڑی کھلی بات چیت ہے میری، لیکن

معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے بھی کچھ چھپانے لگی ہے۔"

"ہاں بے بے بتانا"

لہنا بچوں کی طرح اصرار کرنے لگا —

اس کی گود میں بیٹھے ہوئے بچے بھی باپ کی نقل اتارنے لگے۔

"ہاں بے بے ہاں!"

"چپ رہو بے......" باپ نے انھیں کھدیڑ کر باہر بھگا دیا۔

"جاؤ گلی میں کھیلو — ہاں بے بے!"

پالی بھی ہمہ تن گوش تھا۔

سنداں نے سر گھما کر اس پر دوپٹہ کھینچ لیا۔

"تم تو یونہی پیچھے پڑ گئے...... آخر کیا بتاؤں؟"

لہنے نے آگے کو منہ بڑھا کر پوچھا۔

"اچھا تو یہ بتاؤ کہ جو یہ خبر مشہور ہو رہی ہے کہ سرنوں کا اس لپھٹین سے میل جول ہے اور پرسوں شام کو ایک آدمی نے ان دونوں کو جوہڑ کے کنارے دیکھا بھی ہے، کیوں یہ بات سچ ہے کیا؟"

"ہاں سچ ہے!"

پالی کے کانوں میں جیسے کسی نے گرم گرم سیسہ انڈیل دیا ہو۔ وہ لیٹا نہ رہ سکا۔

وہ اٹھ کر بیٹھا تو لہنے نے پوچھا۔

"ست سری اکال۔ پالی! تمھارے جانے کے بعد تو یہاں بڑے بڑے کارنامے ہو گئے ہیں۔"

پالی نے ماتھے پر بل ڈال کر جواب دیا۔

"دو راتیں تو میں باہر رہا ہوں۔ مجھے دو برس تو نہیں ہو گئے۔"

"واہ وا تم بھی بھولے بادشاہ ہو۔ دو دن بہت ہوتے ہیں۔ یہاں پل بھر میں دنیا بدل جاتی ہے۔"

پالی نے ہاتھ سے جوڑا ٹٹولتے ہوئے پوچھا —

"آخر ہو کیا گیا ہے مجھے بھی تو بتاؤ!"

"ارے بھئی سرنوں ہے نا — وہ اس لپھٹین سے میل جول کیے ہوئے ہے۔"

"کب سے؟"

"نہ جانے کب سے، پرسوں ہی تو دیکھا ہے انھیں ایک آدمی نے۔"

تو پالی کا شبہ درست نکلا، لیکن ممکن ہے یہ بات غلط ہو، محض افواہ ہو، وہ دونوں یونہی کھڑے ہوں......"

"تو کیا وہ روج ملتے ہیں؟"

"ہاں بھائی روج ملتے ہیں۔" لہنے نے جواب دیا۔

سنداں نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔

"ارے واہی تباہی کیوں بکتا ہے؟"

"کیا جھوٹ کہتا ہوں بے بے؟"

"جھوٹ ہو نہ ہو پر تجھے کیا ملوم وہ روج ملتے ہیں یا کبھی کبھی ملتے ہیں۔"

"ہاں ٹھیک تو ہے، اصل بات تو بے بے کو ملوم ہوگی، ہم کیا جانیں بھلا۔" تاباں نے لقمہ دیا۔

سنداں نے محسوس کیا کہ وہ اس سے اصل حال جانے بغیر نہ رہیں گے۔

"اصل بات یہ ہے کہ چٹھی پکڑی گئی ہے ایک۔"

"کس کی چٹھی؟"

"ٹھیک ملوم نہیں —— پتہ نہیں یہ بھی پال کی ہے یا سرنوں کی۔ ماں کے ہاتھ چٹھی لگی، اس نے پڑھی تو ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اس نے اپنے گھر والے کو بتا دیا۔ نرنجن نے نونڈیا کو ایسا مارا ایسا مارا کہ سارے بل نکال دیے۔"

"ہائے کیا سرنوں کو مارا...... تبھی تو کہوں کل جو ان کے ہاں گئی تو سرنوں کچھ ڈھیلی سی پڑی تھی، پوچھا تو کہنے لگی جرا طبیت (طبیعت) کھراب ہے۔"

"موئی چڑیل —— طبیت کیا کھراب جس روج مار کھائی اسی روج شام کو یار سے ملنے کو چل دی۔"

"اچھا بے بے!" لہنے نے حیرت کا اظہار کیا۔ "بڑی بے شرم ہوگئی ہے۔"

"بے شرم تو ہے۔ ماں باپ کی ناک کاٹ کر رکھ دی ڈائن نے۔ میری لڑکی ہو تو اٹھا کر کنوئیں میں پھینک دوں۔"

تاباں نے دونوں ہاتھ گالوں پر رکھ کر کہا ——

"افوہ ہمارے تو کھواب میں بھی یہ بات نہیں۔ کیسی سیدھی کیسی بھولی...... ارے توبہ میری کام یہ کرتی ہے۔ بے بے مجھے تو اکین (یقین) نہیں آتا۔"

"اکین آئے نہ آئے مجھے اس کی کھاص سہیلی کی جبانی مالوم ہوئی ہیں سب باتیں۔ اری میرے سامنے تو اس کی ماں بھی مان گئی...... پر ہاتھ جوڑتے پر میں نے صپھا (صاف) کہہ دیا کہ بو جس کے جیسے کرم ہوں گے سو کھد ہی بھگتے گا ہم لگائی بجھائی کیوں کریں...... ہاں بیٹیا اور کیا۔"

پالی کا سر چکر کھا رہا تھا۔

لہنا سنگھ کو تھکاوٹ اور بھوک فراموش ہوگئی۔ چونچ آگے بڑھا کر بڑے اشتیاق سے پوچھا ——

"ہے بے بے مار کھا کر بھلا وہ اسے ملنے کے لیے کیوں گئی...... ہم نے سُنا ہے کہ اس نے اس سے کہا کہ مجھے یہاں سے بھگا کر لے چلو تو پٹھین نے کہا 'بے پھکر رہو، جو ہم دونوں کے راستے میں کھڑا ہوا اسے پستول سے مار ڈالوں گا۔'"

پالی کے سینہ میں آگ سی لگ گئی۔

"ارے نہیں۔" سنداں نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "اصل بات مجھ سے پوچھو۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ مار کھا کر جب شام کو پرتھی پال سے ملی تو اس سے کہا کہ مجھے اپنے ساتھ بھگا کر لے چلو لیکن وہ بھی ایک ہی حرام جادہ ہے۔ بدمعاش تو ہے نا......"

"ہاں بے بے! بدماش تو ہئی۔ اری پنچی میں سبھی تو کہتے ہیں کہ بڑا بدماش ہے۔ کئی عورتوں کو کھراب کر چکا ہے......" تاباں نے حامی بھری۔

"جب وہ بدماس ٹھہرا تو کل کی چھوکری کو بھلا وہ کیا سمجھتا ہوگا؟"

"بس تو اس نے ٹرخا دیا......"

تاباں کو سہرتیوں پر واقعی بڑا غصہ آ رہا تھا۔ وہ اسے بھولی بھالی اور بالکل معصوم لڑکی سمجھتی تھی لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ اس کے دیور کو چھوڑ کر پرتھی سے پریم کی پینگیں بڑھائے گی۔ جل کر بولی —

"اچھا ہی ہوا بڑی آئی تھی وہاں سے پریم لڑانے......"

پالی کے دل پر اس وقت جو گذر رہی تھی اس کا کسی اور کو بھلا علم ہی کیا۔

لہنا بولا —

"ہاں تو بے بے پھر؟"

"ہن کو مار کھانے کے بعد بھی جب لاڈو رانی یار کو ملنے کے لیے پہنچی جوہڑ کے کنارے تو وہاں گاؤں کے ماچھی نے دیکھ لیا اور اس نے دو اور آدمیوں کو بھی دکھا دیا۔ بات سارے گاؤں میں پھیل گئی......"

"ہاں بے بے مردوں میں تو یہ بات مشہور ہو گئی ہے۔ اری ایک دو نے تو بچارے ماچھی کو جوتے سے مارا کہ جھوٹ بولتا ہے۔ بھلا اسے جھوٹ بولنے کی کیا جرورت۔ نرنجن سنگھ کے رشتے دار اڑا رہے ہیں کہ ماچھی بھی جھوٹا اور دوسرے دو آدمی بھی جھوٹ بولتے ہیں۔ کسی کی بہو بیٹی کا مالہ ہو تو لوگ جیادہ بولتے نہیں، کسی کی اجت پر......"

سنداں نے جھک کر کہا —

"نرنجن سنگھ کے رشتہ دار جو جی چاہے کہتے پھریں لیکن اتی بات جرور ہے کہ ادھر گاؤں میں بات پھیلی اُدھر جنداں نے پتی دیو کو پرتھی پال کے باپ کے پاس بھیجا کہ جو بات ہونی تھی سو ہو چکی آؤ اب ان دونوں کا بیاہ کر دیں......"

"اچھا؟ یہ بے شرم کہیں کے۔ لڑکی کو جہر کیوں نہیں دے دیا۔ جب میں گھر میں تھی تو میرا باپ کہا کرتا تھا چڑیل! جو تو نے درواجے سے باہر جھانکا بھی تو آنکھیں نکال لوں گا۔" تاباں بولی۔

"کل جگ ہے کل جگ۔ یہ تو جنداں کی ترکیب ہوگی۔ نہیں بھلا نرنجن سنگھ تو ایسا آدمی ہے کہ اس لڑکی کا کھون پی جائے —"

لہنا بولا —

"تو یوں کہو اب دونوں پریمیوں کا بیاہ رچایا جائے گا۔"

"نہیں بیٹا — لڑکے نے دل لگی میں لڑکی کو پھسلا لیا — کہاں کا پریم کہاں کی سادی۔ اگر وہ بیاہ کرے گا بھی تو کسی

کرستان سے کرے گا۔"

"اچھا تو پرتھی پال کے باپ نے بیاہ نامنظور کر دیا؟"

"باپ کیا نامنظور کرتا لڑکے نے انکار کر دیا۔ بڑی منت سماجت کی، ناک رگڑی لیکن وہ نہ مانے۔"

تاباں کو سرتوں کے پاجی پن پر غصہ آ رہا تھا، بولی —

"میں تو کہتی ہوں اچھا ہی ہوا۔ چیونٹی کے مرنے کے دن آتے ہیں تو اس کے پر نکلنے لگتے ہیں۔"

لہنے نے ملامت کرتے ہوئے کہا —

"ہُوں ہمیں کُھتش ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ کوئی مرے کوئی جیئے ہماری بلا سے، کیوں بے بے؟"

"ہاں بچہ!"

"اب کیا کریں گے وہ لوگ؟" تاباں نے پوچھا

"اب تو سنتے ہیں نہر پار والے حوالدار سے بات چیت ہو رہی ہے۔"

"ارے وہ حوالدار؟ مگر بے بے اس کی عمر تیس برس سے کم تو کیا ہو گی۔"

"ہاں مجبوری جو ٹھہری ——— آج صبح جنداں نے آپ ہی یہ بات بتائی تھی میں نے بھی سنا کر کہہ دیا کہ بہن اب کسی پردیسی سے بیاہ ہو گا۔"

تاباں بولی —

"ٹھیک تو ہے ...... چلو جی چھٹی ہوئی ...... جب ہمیں کچھ لینا دینا ہی نہیں تو کیوں پھجول میں ان کی باتیں کریں ——— ؟"

"ہاں جی!" سنداں نے بزرگانہ لہجے میں کہا۔ "ہم سے تو نہ صلاح لی، نہ کچھ پوچھا ہماری طرف سے چاہے لڑکی کو کنوئیں میں دھکیل دیں۔"

تاباں نے کہا —

"اور بے بے! ایک دن جنداں بڑے ٹھٹے سے کہنے لگی، ہم تو اپنی لاڈو کی شادی ایسے آدمی سے کریں گے جو نکھٹو نہ ہو بلکہ کچھ کماتا بھی ہو۔ ہم نے اسے چاؤ چونچلوں سے پالا ہے تو شادی کرتے سمے آنکھوں پر پٹی تو نہیں باندھے رہیں گے۔"

"بہو بٹیا! بڑے بول کا سر نیچا ہوتا ہے۔"

"میں تو سوچتی رہی کہ شاید ہمارے پالی کی طرف اشارہ تھا اس کا۔"

سنداں دل میں تو سرتوں کو بہو بنانے کی خواہاں تھی لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ لوگ یہ رشتہ کرنے کے لیے تیار کیوں نہیں ہیں اور یہ بات اسے بہت بری طرح کھلتی تھی۔ بظاہر تاؤ کھا کر بولی —

"ہُوں ہمارا چاند سا لڑکا ہے، ہمیں لڑکیوں کا گھاٹا ہے کیا......"

"نا۔۔۔۔۔ نا۔۔۔۔۔ ہمیں گھاٹا کاہے کو ہونے لگا۔ میں تو یونہی کہہ رہی ہوں۔ پہلے بھی مجھ سے پوچھتی رہتی تھی کیوں تایاں! پالی کہتا تھا کہ جمین کھریدوں گا ـــــ تو پھر اس نے کھریدی نہیں کیا ـــــ؟ ہیں کتنی مرجی کا مالک ہے کیا جانیے جمین کھریدے گا یا کوئی کاروبار کرے گا۔"

سنداں ماتھے پر بل ڈال کر بولی ـــــ

"آکھر اسے کیا متبل ہماری جمین سے۔ وہ اگر پالی کے لیے میرے آگے ناک بھی رگڑے تو بھی میں نہ مانوں۔ بھلا ایسی بدماش لڑکی سے بیاہ کروں گی اپنے پالی کا؟ ہمارے لونڈے کو تو دنیا کی ہوا تک نہیں لگی اور وہ ٹھہری چنڈال ـــــ بھلا دونوں کا جوڑ ہی کہاں ہے؟"

اس دوران میں پالی دم بخود بیٹھا رہا ـــــ

ایک بار اور صرف آخری بار

مہندر ناتھ

مایا ان عورتوں میں سے تھی جو بڑھاپے کے قریب پہنچ کر بھی اپنی بچی ہوئی خوبصورتی کو سنبھال کر رکھتی ہیں۔ یہ رکھ رکھاؤ، یہ سج دھج، یہ بناؤ سنگھار اور یہ اٹھلا اٹھلا کر چلنا، کبھی ساڑھی کو سنبھال کر اور پلو کو سینے پر بکھیر کر یوں ہمکلام ہونا جیسے مایا سب سے کہہ رہی ہو کہ ابھی ہمارے وہی دم خم ہیں، جو پینتالیس برس پہلے تھے۔ یہ بن سنور کر بیٹھنے کا ڈھنگ کوئی مایا سے سیکھے۔ یہ تو اسے وراثت میں ملا تھا۔ مایا کی خواب گاہ سے اس کے کردار کا پتہ چلتا تھا۔ ابھی تک اس کی چار دیواری سے سینٹ کی خوشبو آتی تھی، رنگین ریشمی پردے، پلنگ پر بے داغ چادر، دیواروں پر ہلکا گلابی رنگ، کچھ نیم برہنہ تصویریں جن سے مایا کے ذوقِ جمال کا پتہ چلتا تھا۔ میز پر چند اجنبی چہرے جو نو وارد کی طرف گھور گھور کر دیکھتے۔ یہ چہرے جو اس کی زندگی میں داخل ہوئے اور ذہن میں [illegible] کر کے چلے گئے۔ مایا میں ایک خوبی نہ تھی، وہ خوبیوں کا ہار تھی۔ فنِ موسیقی کی وہ استاد تھی۔ اس کی آواز میں ایک عجیب قسم کی چاشنی اور مٹھاس تھی۔ بڑے بڑے نواب اور راجے اس کے گھر آکر ٹھہرتے اور اس کے فن سے محظوظ ہوتے، فنِ موسیقی کے علاوہ مایا کا اندازِ گفتگو بالکل نرالا تھا۔ ایک عجیب قسم کی بے حجابی اور بے باکی اس کے طرزِ تکلم میں تھی۔ جب وہ فقرے بازی پر اتر آتی تو اس فن کے بڑے بڑے شہسوار اس کے سامنے گڑگڑانے لگتے اور جب وہ کھلکھلا کر قہقہہ لگاتی تو قہقہہ سننے والے مرد کچھ جھینپ سے جاتے۔

ان دنوں روپے پیسے کی کمی نہ تھی، اپنے شباب میں مایا نے اپنے جسم کا بڑی فراخ دلی سے استعمال کیا تھا لیکن بڑا سوچ سمجھ کر، دیکھ بھال کر، ٹھوک بجا کر اس نے اپنے جسم کا نیلام کیا اور اس کے عوض اسے سب کچھ ملا۔ ایک شاندار کوٹھی، ایک کار، بنک بیلنس، نوکر چاکر، اور اب تو لوگ اسے عزت اور احترام سے بھی دیکھنے لگے تھے۔

اسے اگر کسی بات کی فکر تھی تو صرف لاج ونتی کی جو سولھویں سال میں قدم رکھ رہی تھی۔ نہ جانے اسے اپنی لڑکی سے اتنی محبت کیوں تھی۔ جہاں ساری عمر سودے بازی میں گزری ہو وہاں محبت کا کیا دخل ہو سکتا ہے۔ یہ کوئی مایا ہی سے پوچھے، ویسے لاج ونتی سے کس کو محبت نہ تھی۔ اتنی حسین و جمیل لڑکی شاید ہی کسی کے گھر پیدا ہوئی ہو۔ جسمانی خوبصورتی کے علاوہ وہ بے پناہ خوبیوں کی مالک تھی۔ نہایت ہی شرمیلی اور کم گو، نیلی نیلی آنکھیں، مردوں سے ذرا دور رہنے والی، اپنی ماں کی وفادار لڑکی، نوکروں کے ساتھ اخلاق سے پیش آنے والی، مہمانوں کی خاطر تواضع کرنے والی، لڑائی جھگڑوں سے کوسوں دور رہنے والی لڑکی، حیا اور شرم کا مجسمہ تھی۔ اس بے باک گھر میں رہتے ہوئے کسی مرد کو اتنی جرأت نہ ہو سکتی کہ لاج ونتی سے کوئی بیہودہ مذاق کر سکے۔

مایا تو دن رات اسی سوچ میں ڈوبی رہتی کہ جلد از جلد لاجونتی کے ہاتھ پیلے کر دیے جائیں تاکہ وہ ماں کے فرائض سے سبکدوش ہو سکے۔

گھر میں کسی بات کی کمی نہ تھی۔ جس راستے پر وہ برسوں سے گامزن تھی اس راستے پر وہ لڑکی کو چلانا نہ چاہتی تھی۔ بس اب اسے لاجونتی کے لیے ایک خوبصورت سا لڑکا تلاش کرنا چاہیے جو کسی اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہو اور اچھا خاصا کماتا ہو۔ اس سے لاجونتی کا بیاہ کر دے گی اور اپنی باقیماندہ زندگی آرام اور چین سے گزار دے گی۔

یوں تو لاجونتی کے لیے گھر میں سب کچھ تھا۔ مایا نے موسیقی اور ناچ کی ٹریننگ کے لیے ایک ڈانس ماسٹر اور ایک مشہور موسیقار رکھا ہوا تھا۔ دونوں لاجونتی کو ناچ اور موسیقی کی ٹریننگ دیتے۔ جوانی کے آتے آتے لاج ونتی نے گانا اور ناچنا بھی سیکھ لیا۔ گانا تو وراثت میں ملا تھا، ناچ کے لیے جسم، فضا اور طبیعت موزوں تھی۔ چند سالوں کی مشق کے بعد اس کے جسم نے ناچ کے تمام موڑ، اتار چڑھاؤ سیکھ لیے جو ایک نرتکی کو سیکھنے چاہئیں۔ ناچ نے اس کے جسم کو اور لوچ دار بنا دیا اور فنِ موسیقی نے اس کی آواز میں ایسی موسیقیت پیدا کر دی جو بلاشبہ قابلِ رشک تھی۔

سب سے ناقابلِ فراموش بات تو یہ تھی کہ لاجونتی بلا کی ذہین اور شریف تھی۔ ذہانت کی لوگ تعریف کرتے لیکن شرافت کا اس گھر میں کوئی کام نہ تھا۔ لاج کو بیہودہ ناچوں سے سخت نفرت تھی۔ جسم کی نمائش کرنا، ہر وقت کمر ہلانا، آنکھوں کو یونہی اوپر نیچے مٹکانا اور سینے کو بلاوجہ گنبد کی طرح ظاہر کرنا، ان تمام باتوں سے اسے چڑ تھی۔ بھڑکیلا لباس پہننا اسے گوارا نہ تھا۔ رنگوں کے انتخاب میں وہ بڑی احتیاط سے کام لیتی اور اس انتخاب میں اس کی جمالیاتی حس کو کافی دخل تھا۔

جس گھر میں وہ پلی تھی یا پل رہی تھی، جس ماحول میں لاجونتی نے اپنی عمر کے سولہ سال گزارے تھے اس ماحول میں اگر کوئی اور لڑکی ہوتی تو کب کی ماں کی طرح اسی راستے کو اختیار کر لیتی جس راستے پر چل کر اس کی ہوشیار اور بے باک ماں نے اچھی خاصی جائیداد بنا لی تھی لیکن نہ جانے لاجونتی نے اپنے احساسات اور جذبات پر کون سے ضبط کے بند لگا رکھے تھے کہ وہ ٹوٹنے میں نہ آتے۔

جب کبھی وہ سپید براق ساڑھی میں ملبوس ہو کر ماں کے سامنے آتی تو ماں بھی ایک لمحہ کے لیے ٹھٹک سی جاتی۔ ہائے کہیں کوئی دیوی تو آسمان سے نہیں اُتر آئی، کیا یہی میری بچی ہے، اتنی حسین، اتنی معصوم، اتنی حیادار، اتنی سگھڑ ——— تم نے تو ابھی تک کچھ نہیں دیکھا بیٹی! اری جب میں تمہاری عمر کی تھی تو میں نے کیا کچھ نہ دیکھ لیا تھا۔ مایا کی نگاہ لاجونتی کے چہرے پر آ کر رک جاتی۔ گوری گوری بے داغ جلد، دو نیلی نیلی خوبصورت آنکھیں رخساروں پر ہلکی سی سرخی، پتلے پتلے ہونٹ، لب رشک سے بھرا، ناک کے نتھنے حساس، ٹھوڑی روم کی شہزادیوں کی طرح پُر وقار، صندلی گردن اور نیچے سینہ ایلورا اور اجنتا کے مجسموں سے مستعار لیا ہوا، کسی یونانی حسینہ کی طرح صحت مند اور نشہ آور سرو قد، کمر میں بانکپن اور نیچے ٹانگیں سڈول اور گداز اور پاؤں پیارے پیارے چھوٹے چھوٹے صاف اور ستھرے، ایڑیاں گلاب کے پھولوں کی طرح سرخ۔

اس لڑکی کے لیے کوئی دیوتا چاہیے جو بالکل اتنا ہی خوبصورت اور حیادار ہو۔ آسمان کی طرح روشن اور شفاف، صبح کی مانند اُجلا اُجلا اور درخشاں۔ اب تو لاج ونتی کی شادی کرنا چاہیے، نہ جانے اس کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ یہ تو کچھ نہ کہے گی، مجھے ہی اس کے لیے کچھ سوچنا پڑے گا جلد ہی اس کے ہاتھ پیلے کرنے ہوں گے۔ یہ اپنے گھر چلی جائے تو میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو۔ یوں تو اس گھر میں مردوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ کچھ سال پہلے بڑے بڑے راجے اور نواب بھی آتے تھے، اب تو نوابوں کا زمانہ ختم ہو گیا لیکن اس شہر میں سیٹھوں کی کمی نہ تھی۔ لاج ونتی کسی کو پسند تو کرے۔ اس کی شرمیلی نگاہ سے کسی دن اس بات کا پتہ نہ چلا کہ وہ کسی مرد کو چاہتی ہے، ہاں بہت سے مردوں نے مایا کے سامنے اپنی بے چین روح اور جسم کے تقاضوں کی فریاد کی اور روپوں کا انبار لگانا چاہا لیکن مایا کے پاس ان مردوں کے لیے مغلظ گالیوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اگر کوئی بگڑا ہوا نواب پان کھا کر ہونٹوں اور مسوڑھوں کو لال کر کے منہ میں پیک رکھے ہوئے اپنی ہوس کو مایا کے سامنے بے نقاب کرتا تو مایا کہتی "صاحبزادے! پہلے پیک تھوکو ———

بھیر بات کرنا۔"

وہ بچارا ایک ٹک تکتا اور کھسیانا ہو کر مایا کی طرف دیکھتا۔

"ارے میاں! کچھ تو خیال کرو، باپ کے ٹکڑوں پر پل رہے ہو۔ جب سرکاری پنشن بند ہو جائے گی تو میری لڑکی کو کہاں سے کما کر دو گے، کچھ کما کر دکھاؤ اپنے ہاتھوں سے، اور پھر آپ کی شکل و صورت سے اتنی نحوست برستی ہے کہ میری لڑکی ایک دن بھی تیرے ساتھ نہ رہ پائے گی۔ پیک تھوک دو، پھر منہ بھر گیا ہے۔ شادی سے پہلے پان کھانے کی تمیز سیکھ لو۔"

ایسی عورت کے سامنے اپنے ناکام عشق کا اظہار کرنا بالکل بے سود تھا۔ ایک بار تو ایک سیٹھ صاحب لاجونتی پر بُری طرح فدا ہو گئے یوں تو ہر سیٹھ ہر لڑکی پر فدا ہونے کا حق رکھتا ہے، یہ حق انھیں پیدا ہوتے ہی مل جاتا ہے اسی لیے اکثر سرمایے کے پجاری اپنی اپنی تجوریاں کھولے ہوئے ادھر کا رُخ کرتے اور آخر میں جب دال نہ گلتی تو گالیاں کھاتے ہوئے واپس اپنی بدصورت بیویوں اور کند ذہن داشتاؤں کی گود میں اپنے گنجے سر رکھ کر لاجونتی کے لیے آنسو بہاتے۔

لیکن یہ نئے سیٹھ صاحب لاجونتی پر بُری طرح مر مٹے۔ انھیں لاجونتی پر فدا ہوتے ہوئے خود بھی لاج نہ آئی۔ یوں تو یورپ کی کئی بار سیر کر چکے تھے اور جب کبھی سلسلۂ کلام جاری کرتے تو اکثر بات یوں شروع کرتے "جب میں لندن میں تھا" لندن، پیرس اور وی آنا کا تو اس طرح ذکر کرتے جیسے یہ شہر چیچ پوکلی سے زیادہ دور نہ تھے۔ ان کے لب و لہجہ میں انگریزیت تھی، بات چیت میں ایک سلیقہ اور پیار کرنے کے ڈھنگ میں مشرقی اور مغربی رنگوں کا امتزاج تھا یعنی نسل دیکھ کر عشق فرماتے، روپیہ بے تحاشہ خرچ کرتے، صرف شکل و صورت سے مار کھاتے تھے۔ گو اتنے بدصورت نہ تھے اگر ان کے چہرے پر چیچک کے داغ نہ ہوتے (جن کو مٹانے کے لیے انھوں نے سوئٹزرلینڈ کے مشہور سرجن سے علاج کرایا تھا) تو وہ قبول صورت کہلا سکتے تھے۔ سب سے بڑی خوبی ان میں یہ تھی کہ ابھی تک انھوں نے شادی نہ کی تھی۔

وہ تقریباً ہر روز مایا سے ملنے آتے۔ ان کی متلاشی نگاہ لاجونتی پر ہوتی لیکن بات وہ مایا سے کرتے۔ وہ جانتے تھے سب سے پہلے شمع کس کے سامنے رکھنی چاہیے۔ خزانے کی کنجی تو مایا کے پاس تھی۔ اگر خزانچی کو خوش نہ کر سکے تو حُسن کا سرمایہ انھیں کیسے ملے گا۔ اگر مایا انھیں اپنا داماد قبول نہ کر سکی تو وہ لاجونتی سے بات کر کے کیا کریں گے۔ اسی لیے وہ لاجونتی سے کبھی کھل کر بات نہ کر سکے۔ نگاہوں پر ایک شرمیلا غلاف چڑھا کر، جس کے اندر ہوس اور عشق کی چنگاریاں پھنکارتی تھیں، اسے کبھی بے نقاب نہ ہونے دیا۔ ہر روز پھلوں کے ٹوکرے لاتے، کوئی تہوار آتا تو اس کی خوشی میں تحفے لاتے اور اپنی ہونے والی ساس کی ہر طرح خدمت کرتے۔

مایا تو ان ہتھکنڈوں سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ اس بے حیا سیٹھ کو جو اتنا باحیا بنتا تھا اور جسے اپنی دولت اور امارت پر اتنا گھمنڈ تھا اسے یہ بتانا چاہتی تھی کہ لاجونتی اس کے گلے کا ہار نہیں بن سکتی، وہ بُت پرست بھی تھی اور بُت شکن بھی ____ سیٹھ صاحب چھ ماہ تک برابر آتے رہے اور کسی نہ کسی بہانے مایا کو تحفوں سے سجاتے رہے ایک دن تنگ آ کر مایا نے پوچھ ہی لیا "آخر آپ کیا چاہتے ہیں؟"

سیٹھ صاحب کافی وقت ضائع کر چکے تھے۔ اب مزید باحیا بنتا انھیں خود ہی اچھا نہ لگا۔

"میں ____ میں ____ صرف لاجونتی کا ہاتھ چاہتا ہوں۔ بس اور کچھ نہیں" سیٹھ نے مشرقی تہذیب کے دائرے میں رہ کر یہ بات کہی۔

"آپ اس کا ہاتھ کیوں چاہتے ہیں؟"

"کیونکہ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

وہ جانتے تھے جو کچھ وہ کہہ رہے تھے بالکل جھوٹ تھا لیکن بات بنانے کے لیے انھوں نے یہ بات کہہ ہی دی۔

”لیکن وہ تو آپ کے بغیر زندہ رہ سکتی ہے سیٹھ صاحب! میں نے اپنی لڑکی سے پوچھ لیا ہے‘ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ سیٹھ صاحب کو اتنا باحیا بننے کی ضرورت نہیں اور حیا تو عورتوں کا زیور ہے اور آپ نے چار داشتائیں مختلف صوبوں میں رکھی ہوئی ہیں کیا وہ آپ کی بیویاں ہیں یا مائیں ———؟“

”آپ کیا فرما رہی ہیں؟“

”جی میں فرما نہیں رہی ہوں، میں دراصل بک رہی ہوں کیونکہ اس آزاد ہندوستان میں بےحیائی اور بےباکی کا استعمال کبھی نہ کبھی کرنا چاہیے نہیں تو ہمارے ایسی عورتوں کا زندہ رہنا مشکل ہو جائے گا۔ عیاری صرف مردوں کو زیب نہیں دیتی، عورتیں بھی اس فن سے واقف ہو جائیں تو کیا برائی ہے آپ مہربانی کر کے میری کوٹھی سے اسی وقت باہر نکل جائیے اور دوبارہ اِدھر کبھی تشریف نہ لائیے۔“

جب لاجونتی نے یہ قصہ سنا تو اسے اپنی ماں سے اور محبت ہو گئی۔ وہ واقعی اس کے لیے ایک اچھا لڑکا تلاش کر رہی تھی یعنی اسے بیاہنا نہیں چاہتی۔ اس کی اپنی جستجو بے معنی ہے وہ اپنی ماں پر بھروسہ کر سکتی ہے۔ انھی دنوں بابا کے کچھ رشتہ دار آئے۔ ان سب نے سیر و تفریح کے لیے پونا جانے کی صلاح بنائی۔ ذرا آب و ہوا بدل جائے گی۔ یہ برسات کا موسم اور خاص کر بمبئی سے پونا تک سفر قیامت خیز ہوتا ہے ان دنوں۔ چاروں طرف پہاڑ اور پھر ہلکی ہلکی سی پھوار اور یہ پھیلی ہوئی دھند، کہ قریب کی چیز بھی دکھائی نہ دے اور جب گاڑی کسی سرنگ میں داخل ہوتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ اندھیرے کی بستی سے اجالے کا راکٹ گذر رہا تھا اور سرنگ ختم ہونے کے بعد پھر وہی دھند، بارش کبھی تیز کبھی کم، جب کبھی دھند وادیوں سے اٹھ کر چوٹیوں کی طرف جاتی تو ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آتا۔ ہرے درخت، ہری بھری جھاڑیاں، سبز سبز پتّیوں پر بارش کے قطرے جیسے کسی دوشیزہ کے رخساروں پر اس کے قیمتی اور انمول آنسو، یہ نظارہ واقعی قابلِ دید ہوتا ہے۔

جب یہ چھوٹی سی ٹولی پونا پہنچی تو سب لوگ ایک ہوٹل میں ٹھہرے، یہیں پر بابا کی ملاقات لیفٹیننٹ کھنہ سے ہوئی، دیکھتے ہی بابا کی باچھیں کھل اٹھیں، شمالی ہندوستان کی ہواؤں میں پلا ہوا نوجوان، فراخ ماتھا، فراخ سینہ، جسم گٹھا ہوا، ایک تنومند درخت کی طرح لحیم شحیم۔ نگاہوں میں بے پناہ کشش، آواز میں کھرج، رنگ گندمی۔ کھنہ اسے پسند آیا، یہی اس کا داماد ہو سکتا ہے، میری لاجونتی کا خاوند، ایک اچھے خاصے عہدے پر فائز تھا، ہوشیار اور چالاک بھی ہے جلدی ترقی کر جائے گا۔

ایک دن بابا نے لیفٹیننٹ کھنہ کو گھر پر دعوت دی اور اپنی بیٹی سے تعارف کرایا۔ دونوں نے نیم باز نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور شاید نگاہوں ہی نگاہوں میں ایک دوسرے کو پسند کر لیا۔

لاج یہ جانتی تھی کہ یہ لڑکا ماں کو پسند تھا۔ بےحد خوبصورت تھا۔ سرسوں کے ساگ اور مسلسل گندم کے استعمال سے اس کے چہرے پر ایک عجیب سی چکناہٹ سی آ گئی تھی۔ بولتا ہی نہیں بس دیکھتا ہی جا رہا ہے۔ آنکھوں میں غنودگی سی تھی، کھنہ کے ہونٹ کتنے سرخ تھے کیا لپ سٹک لگاتا ہے۔ لاج نے دل ہی دل میں سوچا۔ لیفٹیننٹ کھنہ نے لاجونتی کی طرف دیکھا، یہ باریک نفیس ابرو جیسے کسی خوش مذاق مصور کی قلم طرازی ہو، نیلی نیلی خوبصورت آنکھیں، لمبی لمبی محبوب پلکیں اور ہائے یہ آنکھوں کی نیلگوں گہرائیاں، بس اور کیا چاہیے۔ پونا کی خوشگوار فضا نے سونے پر سہاگے کا کام کیا، ایک دعوت کے بعد دوسری دعوت اور پھر تیسری۔ پہلے نگاہیں ملیں مشرقی انداز میں، پھر ہاتھ ملنے لگے، وہی گرمی، حرارت، جوش، تپش، ایک نرم اور ریشمی ہاتھ، دوسرا سخت کھردرا بےرحم ہاتھ۔ جب نگاہیں اور ہاتھ مل کر تھک گئے تو دل کی دھڑکنیں تیز تر ہوتی گئیں، حتیٰ کہ دو ہونٹ ملنے کے لیے

سب بے قرار ہو گئے۔

مایا سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ جو وہ چاہ رہی تھی وہی کچھ ہو رہا تھا۔ اس سے آگے اگر کچھ ہو گیا تو بات حد سے آگے بڑھ جائے گی۔ اگر لاجونتی اس کے ہاتھ سے نکل گئی —— کیا مطلب —— نہ جانے یہ فقرہ اس کے ذہن میں کیسے سرک آیا، راتوں کی تنہائی میں، دن کی روشنی میں یہ فقرہ اسے ڈسنے لگا۔

آج دونوں اکٹھے سینما گئے تھے۔ گو مایا نے اپنے ماموں زاد بھائی کو ان کے ساتھ بھیج دیا تھا۔ آج دونوں ندی کے کنارے کافی دیر تک بیٹھے رہے لیکن ایک آیا بھی ان کے ساتھ تھی۔ آج دونوں پہاڑ کی چوٹی پر پیدل گئے تھے لیکن نوکر بھی ان کے ساتھ تھا۔ آج دونوں —— نہ جانے اس کے دل میں کیا سمائی کہ اس کے ذہن نے ایک عجیب زقند لگائی۔ لاجونتی تو تمہارے بڑھاپے کا سہارا ہے۔ سارے گھر کی رونق تو اسی کی وجہ سے ہے، یہ چلی گئی تو سارا گھر بے رونق ہو جائے گا، تمھیں کوئی نہ پوچھے گا۔ روپیہ تو ہے لیکن کب تک رہے گا۔ جب یہ روپیہ ختم ہو جائے گا تو تُو کیا کرے گی۔ اب تم سے کیا کام ہو گا۔ کنپٹیوں کے گرد بال سفید ہو رہے تھے۔ بالوں کو ابھی سے لوہا لگا رہی تھی۔ دن بدن موٹی اور بدصورت ہو رہی تھی۔ اب تو لاجونتی تمہاری جگہ لے سکتی ہے۔ جتنے لوگ یہاں آتے تھے ان سب کی نگاہیں لاجونتی پر تھیں۔ وہ ترسی ہوئی نگاہوں کی پیاس کو جانتی تھی۔ لیکن وہ کیا سوچ رہی تھی اور کیوں۔ اری تو ماں ہے اور وہ تیری بیٹی ہے —— تیری زندگی کے باقی دن —— مایا کی ممتا تو ابھری لیکن برسوں کی عیاشی اور فراغت نے ذہن پر جو اثرات چھوڑے تھے، ان کے نقوش بہت گہرے تھے۔ انھوں نے ماں کی ممتا، خلوص اور پیار کو وقتی طور پر دولت کے انبار تلے روند دیا۔

بس پھر کیا تھا! اگلے دن ہی پونا چھوڑ کر بمبئی کا رخ کیا۔ لاجونتی کو بہت ہی برا لگا کیونکہ بمبئی کی طرف رخ کرنے سے پہلے وہ لفٹیننٹ کھنہ سے مل نہ سکی تھی۔ اسے کھنہ سے محبت تو نہ ہوئی تھی لیکن کھنہ اسے اچھا لگا۔ اس کی باتوں میں رس تھا۔ نگاہوں میں پیار تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے یوں مل رہے تھے جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ وہ قریب آ رہے تھے۔ اور بھی قریب آ جاتے اگر یہ لوگ بمبئی کی طرف رخ نہ کرتے۔ ماں نے یہ کیا کر دیا۔ اگر میری شادی کھنہ سے ہو جاتی تو زندگی بڑی اچھی طرح سے گزرے۔ خیر میں ماں سے بات کروں گی۔ ان کی کیا رائے ہے؟

اس سے پہلے کہ وہ ماں سے کچھ کہتی مایا نے لاجونتی سے بات کر لی۔ "لڑکا تو اچھا ہے لیکن سات سو روپے کماتا ہے۔ لاج! اتنی تھوڑی تنخواہ ہے کہ گھر کا گزارہ چلانا مشکل ہو گا۔ میری بچی! تُو دو دو سو روپوں کی ساڑھی پہنتی ہے، ہفتے بھر میں تین چار سو روپے ریس میں ہار جاتی ہے۔ شادی کے بعد تین چار سو روپے کا فلیٹ بھی چاہیے۔ باقی کیا بچا؟ گھر کا خرچ کیسے چلے گا؟ تمہارے لیے کوئی اچھا سا لڑکا تلاش کروں گی جو خاصے روپے کماتا ہو۔"

ماں نے جو کچھ کہا تھا وہ تو ٹھیک تھا۔ کافی دنوں تک لفٹیننٹ کھنہ کی تصویر اس کے ذہن میں گھومتی رہی اور وہ کمرے کو بند کر کے کئی بار روئی لیکن دل میں جو گہرا زخم ہو گیا تھا اسے آنسوؤں کی جھڑی بھی مندمل نہ کر سکی۔

جوں جوں دن گزرنے لگے مایا نے لاجونتی کے بیاہ کا چرچا زوروں سے شروع کر دیا۔ عشاق کی ایک بھیڑ لگ گئی۔ اس چکر میں

ایک چھوٹی سی ریاست کے راجہ پھنس گئے۔ لاج ونتی کو دیکھا تو اپنی سُدھ بُدھ کھو بیٹھے۔ لڑکیاں تو اس سے پہلے بھی دیکھی تھیں، راجہ صاحب کا اور دھندا ہی کیا تھا، خوبصورت لڑکیاں دیکھنا اور دامِ فریب میں پھنسانا اور پھر سربازار چھوڑ دینا لیکن لاجونتی تو سورج مکھی تھی، ایک ایسا ہیرا تھی جو شہنشاہوں کے تاج میں لگایا جاتا ہے۔ شہنشاہوں کا زمانہ تو ختم ہو چکا، انھوں نے سوچا لگے ہاتھ ہم اپنی قسمت آزما لیں۔ خدا دوبارہ راجہ بنائے یا نہ بنائے اتنی دولت پھر کیوں دے گا۔ ریاست تو ان کی چھن چکی تھی لیکن کچھ جواری ابھی تک انھیں راجہ صاحب پکارتے تھے۔ عادتیں وہی پرانی تھیں، حسن سے لگاؤ، کام نہ کرنے کا جذبہ، رات کو کسی طوائف کے کوٹھے پر جانا اور گانا سننا، رات کو جاگنا اور دن بھر سونا اور دوسری رات پھر ٹھمری کا پروگرام ——— بنک بیلنس تھا اس لیے چکر چل رہا تھا اور اسی چکر میں لاجونتی کی صورت کیا نظر آئی کہ ساری ٹھمریاں بھول گئے۔ سوچنے لگے یہ چاند کا ٹکڑا زمین پر کیسے آ گیا۔ وہ کونسا سپوتنک ہے جس کے سہارے اس چاند تک پہنچ سکتا ہوں۔ مایا سے ملے، اس نے خوب آؤ بھگت کی۔ زمانہ شناس عورت تھی، مایا نے چند دنوں کے اندر اندر پتہ لگا لیا کہ راجہ صاحب تیس چالیس لاکھ کی اسامی ہیں۔ بس پھر کیا تھا خاطر تواضع اور ہونے لگی۔ خوش قسمتی سے راجہ صاحب زرا وجیہہ جوان تھے۔ جوانی کا ڈھنگ سے استعمال کیا ہوتا تو زیادہ دن ان کی جوانی چلتی لیکن خدا غارت کرے ان جواریوں کو جنھیں خود بھی اپنے حلوے مانڈے کی فکر تھی، اگر وہ راجہ صاحب کو صرف ایک لڑکی کے حوالے کر دیتے تو ان کی بیکار راتیں کیسے کٹتیں۔ لیکن راجہ صاحب اس بار ایسے ریشہ خطمی ہوئے کہ کچھ عرصے کے لیے وہ اپنے جواریوں کو بھول گئے ——— مایا نے سوچا اگر لاجونتی کی شادی ان سے ہو جائے تو لاج کی زندگی آرام اور چین سے گزر جائے گی۔ روپے کی کمی نہیں، راجہ صاحب لاکھوں کے مالک ہیں ——— اور لاجونتی کو بھی یہ راجہ اچھا لگا۔ راجہ صاحب جن کا نام رام کمار تھا دیکھنے میں بھولے بھالے، خوبصورت، خوش گفتار، جمالیاتی حس کے مالک، سینٹ اور نکٹائی کے شیدائی، عشق اور حسن کے افسانے سنانے والے تھے ——— رام کمار کی صحت بھی بُری نہ تھی۔ زندگی اچھی کٹ سکتی تھی۔ اگر موقع ملتا ——— مایا اپنی بیٹی کے خیالات کو بھانپ گئی اس لیے اس بار مایا نے لاج کو اس کے ہونے والے خاوند کے قریب نہ آنے دیا بلکہ دونوں کو ایک دوسرے سے بہت دور رکھا لیکن اس بار ماں کی مامتا ایسی اُبھری کہ مایا نے دونوں کی سگائی کر دی۔ راجہ صاحب نے ایک کار بطور تحفہ لاجونتی کو پیش کی۔ راجہ صاحب کار دے کر گھر کی طرف روانہ ہوئے کیونکہ مایا نے وعدہ کر لیا تھا کہ تین ماہ کے بعد شادی کر دی جائے گی۔

تین ماہ کا عرصہ سوچنے سمجھنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اس بار تو مایا کی مامتا ایسی اُبھری کہ اس نے تہیہ کر لیا کہ لاج ونتی کے ہاتھ پیلے کر دیے جائیں گے، یہ روز روز کا انتظار اچھا نہیں ہوتا۔ بھلا لاج ونتی بھی کیا سوچتی ہوگی کہ اس کی ماں ہر بار شادی کا ڈھونگ رچاتی ہے اور عین موقع پر کنی کترا جاتی ہے ——— لاج کو یہ راجہ صاحب خاص پسند نہ تھے لیکن اس نے سوچا، زندگی شرافت سے کٹ جائے گی، کسی بات کی کمی نہیں، صرف زندگی سنوارنے کی کوشش کرنا ہو گی اس لیے اس نے اپنی ناؤ کو بہتے دریا کے حوالے کر دیا اور مخالف ہواؤں سے مقابلہ کرنے کی کوشش نہ کی۔

شامتِ اعمال سے انھی دنوں مایا کی چھوٹی بہن آ گئی جو اکیلی نہ آئی بلکہ پورا خاندان سمیٹ کر لائی۔ دو جوان آوارہ لڑکے، جو اپنی ماں کی کمائی پر زندہ تھے۔ چھوٹی اور بڑی بہن میں صرف عمر کا فرق تھا، کردار اور گفتار میں دونوں بہنیں ایک ہی قسم کی تھیں۔ بڑی بہن کما کر گھر بنا چکی تھی، چھوٹی بہن چار پانچ عشق کر کے گھر لٹا چکی تھی لیکن ابھی تک عشق کرنے کی ہوس باقی تھی ——— اس کی لڑکیاں جوان

ہو رہی تھیں اور اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ ان کی بڑھتی ہوئی جوانی کو کیسے روکے، دبلے لڑکیاں، بڑی ہو کر کوئی نہ کوئی دھندا کریں گی لیکن بے چارے لڑکے جنھوں نے راج اور دلیپ کی طرح پیشانی پر بال بکھرا کر چلنا تو سیکھ لیا تھا مگر کم بخت ان کی طرح ایکٹنگ نہ کر پاتے، ان کا کیا ہوگا؟ اپنی ماں کو انھوں نے وہ دکان سمجھ رکھا تھا جہاں گاہک آتے رہیں گے اور انھیں عیاشی کا سامان ملتا رہے گا۔

جب چھوٹی بہن نے یہ سُنا کہ لاجونتی کی شادی ہو رہی ہے اور وہ بھی ایک مالدار راجہ سے تو خرگوش کی طرح اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال لپکا اور وہ دوڑتی ہوئی اپنی بڑی بہن کے پاس پہنچی اور کہنے لگی ——

"دیدی! سُنا ہے کہ وہ راجہ صاحب بہت امیر ہیں۔"

"ہاں اندرا! یہ بات تو میں نے تمھیں بتائی تھی۔" بڑی بہن نے منہ میں پان رکھتے ہوئے کہا۔

"لاج کی شادی کر رہی ہو نا؟"

"ہاں —— ہاں —— کر رہی ہوں —— اس میں کیا شک ہے —— میرا کیا ہے، چند سالوں کی مہمان ہوں مرنے سے پہلے لاج کے ہاتھ تو پیلے کر دوں۔"

"دیدی! یہ مرنے کی بات کیوں سوچ رہی ہو؟ یہ ٹھیک ہے کہ اس کے پاس روپیہ ہے لیکن روپیہ دیکھا کس نے ہے؟"

"شادی سے پہلے وہ کار دے گیا اور سُنا ہے کہ بنک میں چالیس لاکھ روپے جمع ہیں۔"

"سُنا ہے یا دیکھا ہے؟"

"تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟"

"میں یہ کہہ رہی ہوں دیدی کہ تم اتنی ہوشیار اور چالاک ہو کر بھی اپنی لڑکی کی شادی یوں کر رہی ہو جیسے سہاگنیں اپنی لڑکیوں کی شادیاں کرتی ہیں۔ اگر لاج ہاتھ سے نکل گئی تو ——؟"

"نکل گئی —— کیا مطلب ——؟ لڑکی کی شادی کرنی ہے۔"

"لیکن —— کیوں —— بہرحال اگر شادی کرنی ہے تو سوچ سمجھ کر کرو۔ ان راجے مہاراجوں کا کیا بھروسہ —— شراب اور ریس میں لاکھوں روپے ہار دیتے ہیں اور ان کے یار دوست ہی آدھا مال مفت میں ہضم کر جاتے ہیں۔"

"آخر تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"دیکھو دیدی! تیری لڑکی میری لڑکی ہے اور میری لڑکی تیری لڑکی ہے۔ میں لاج کا بُرا تو نہیں چاہتی —— ہم دونوں نے اپنی زندگیاں جس طرح گزاری ہیں وہ تو دنیا کو معلوم ہے لیکن شادی کرنے سے پہلے لڑکے کو ٹھوک بجا کر دیکھ لو۔ کہیں ایک کار کے عوض لڑکی کو نہ لے بھاگے اور تمھارے پاس جو اثاثہ ہے وہ جہیز میں ہڑپ کر لے اور آخر میں تم صرف رام دُھن گاتی رہو۔"

"اری تو صاف بات کیوں نہیں کرتی۔ یہاں کون سے تمھارے عاشق بیٹھے ہیں۔"

"میں کہتی ہوں دیدی! اگر راجہ صاحب واقعی دولت مند ہیں اور ہماری لاجونتی انھیں اتنی پسند ہے تو شادی سے پہلے دو لاکھ روپے تیری لڑکی کے نام کر دیں تو میں جانوں کہ وہ راجہ ہیں اور ہماری لڑکی کو رانی بنانا چاہتے ہیں۔"

"یہ سودا ہو گیا۔"

"خیر پھر سوچنا کیا ہے تو آج کیوں نہیں کرتی۔ آخری بار۔ اس کے بعد تو لڑکی تیرے پاس نہیں آئے گی۔ روپیہ ملے گا تو کچھ پیسے ان نامراد لڑکوں کو دے کر اپنا پیچھا چھڑاؤں گی اور باقی روپے تمہاری لڑکی کے پاس رہیں گے۔ تیرا دل چاہے تو اپنے پاس رکھنا نہیں تو لاج کو دے دینا —— بس ایک بار اور صرف آخری بار آزما کے دیکھ۔"

مایا کو اس ساری گفتگو میں صرف یہی فقرہ اچھا لگا "ایک بار اور صرف آخری بار" اور یہ فقرہ اس کے ذہن پر کابوس کی طرح چھا گیا۔ مایا سوچنے لگی اندر ٹھیک کہتی ہے۔ کوئی اور ماں ہوتی تو لڑکی کو اسی راستے پر چلاتی جس راستے پر وہ خود چل رہی تھی۔ اس نے کیا سکھ دیکھا تھا اور جب سکھ پانے کے دن آئے تھے تو وہ لاجونتی کو ایک راجے کے حوالے کر رہی تھی۔ شادی میں جہیز دینا ہوگا اور جہیز بھی بڑھ چڑھ کر دینا چاہیے۔ اگر جہیز نہیں دیا تو شادی کرنے سے کیا فائدہ اور اگر سب کچھ دے دیا تو اپنے پاس کیا رہے گا؟ رنڈی کی لڑکی رنڈی ہی کہلائے گی اور پھر بڑھاپے کے دن —— جوانی تو روپوں کے بغیر کٹ سکتی ہے لیکن بڑھاپے کا کاٹنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

مایا نے راز دے کر راجہ صاحب کو بلوایا اور یہ حقیری تجویز ان کے سامنے رکھ دی۔ دو لاکھ روپے شادی سے پہلے بنک میں لاجونتی کے نام جمع کر دیے جائیں پھر شادی ہوگی۔ راجہ صاحب یہ سن کر بہت جھنجھلائے۔ عیاش تو تھے لیکن ایسی عیاشی کس کام کی کہ گھر لٹ جائے اور مال بھی ہاتھ میں نہ آئے۔ جی میں آیا کہ کار واپس مانگ لی جائے لیکن اتنا عرصہ جو کوٹھی کے گرد طواف کیا تھا اس کا معاوضہ بھی ادا کرنا تھا۔ گالیاں دینے کو جی چاہا لیکن مایا کے سامنے کس کی مجال تھی کہ منہ پھاڑ کر کچھ کہہ سکے۔ آخر میں مایا نے اپنے مخصوص انداز میں کہا "ابے بہت سے راجے دیکھے ہیں۔ ارے تو دو لاکھ روپے میری لڑکی کے نام نہیں کر سکتا تو راجہ کس بات کا کہلاتا ہے مفت کا۔ دے کر میری لڑکی سے بیاہ کرنا چاہتا ہے اور رنڈی کی کمائی جہیز میں لینا چاہتا ہے۔ میری لڑکی اتنی سستی نہیں جتنی تو سمجھتا ہے۔"

بیچارا راجہ اپنا سا منہ لے کر چلا گیا۔ مسلسل دو دن لاج اپنے کمرے میں بند رہی۔ پلنگ پر اوندھی لیٹ کر روتی رہی۔ اسے اپنے آپ سے کچھ نفرت سی ہو گئی۔ ہر شخص نے اسے گڑیا کا تماشا سمجھ رکھا ہے جیسے اس کی اپنی کوئی ہستی نہ تھی۔ ماں کا آخری وار بھی برداشت کر گئی۔ اس بار تو اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ اپنی قسمت خود بنائے گی۔ جو لڑکا اسے پسند آئے گا اسے ماں کی مرضی کے بغیر پسند کرے گی۔ اس کے بعد جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

انہی دنوں ایک فلم پروڈیوسر مایا کے گھر تشریف لائے۔ تین چار سال ہوئے ایک بار ادھر آئے تھے۔ ان دنوں لاج چھوٹی سی تھی اس بار لاجونتی کو کیا دیکھا کہ دیکھتے ہی رہ گئے "ارے واہ! تم کہاں تھی بے بی؟ ارے اتنی جلدی اتنی بڑی ہو گئی؟" پہلے پروڈیوسر نے لڑکی کو کن انکھیوں سے دیکھا، پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا "بے بی! ذرا گھوم جاؤ" اور لاج اس طرح گھومی کہ ایک لمحہ کے لیے پروڈیوسر کے جسم میں ایک جھنجھناہٹ سی پیدا ہو گئی "ذرا رک جاؤ" اور لاج چلتے چلتے رک گئی —— جیسے آبشار اپنی جگہ پر منجمد ہو گیا۔ "ذرا چلو!" "وہ پھر چلی ——" "تم واقعی طوفان ہے" وہ فلمی زبان میں بولا۔ پھر سنجیدگی سے وہ لاج کے جسم کے ہر موڑ کو کیمرہ اینگل سے دیکھنے لگا۔ چہرے کو دیکھا، چہرے کی رنگت کو دیکھا، بالوں کو دیکھا، پلکوں کی لچک کو دیکھا، ناک کو دیکھا، ناک کے حساس نتھنوں کو دیکھا، کانپتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھا، صندلی گردن کو دیکھا، نیم گلابی بلاؤز کو دیکھا، بلاؤز میں ابھری ہوئی گولائیوں کو دیکھا، کمر کو دیکھا اور کمر کے لوچ کو دیکھا، کولھوں کو دیکھا، کولھوں کی محراب کو دیکھا اور پھر سر سے لے کر پاؤں تک اس سرو قد کو دیکھا اور پھر ایسی نگاہ سے دیکھا کہ لاجونتی مسکرا اٹھی۔

"ماں!" پروڈیوسر چیخ اٹھا۔

ماں نیچے اتری تھی، پروڈیوسر نے بابا کے پاؤں چھو لیے "ماں تم گریٹ ہو۔ تمھاری بچی گریٹ ہے۔ میری فلم بن جائے گی تمھاری بیٹی کو ہیروئن بنا دوں گا۔ بیٹی تمھاری رہے گی، ہیروئن میری ہوگی ——— بیس ہزار پہلی فلم میں کام کرنے کا معاوضہ ملے گا۔ بولو، منظور ہے ——— کنٹریکٹ ابھی کرتا ہوں، اسی وقت۔"

"بچی سے پوچھ لو۔ میں تو نہیں چاہتی کہ وہ فلم میں کام کرے۔"

پروڈیوسر نے بچی کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا ——— اور حیرت زدہ ہو گیا کیونکہ بچی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ لمبے قد کا خوبرو بدن، گوری گوری رنگت پر چھدرے سے بھورے بال، کالی سیاہ آنکھیں، جسم بھرا ہوا، اس کے جسم کا ہر موڑ چلا اٹھا۔ "ہاں! میں کام کروں گی۔"

"گریٹ ——— تم بھی گریٹ ہو، تیری ممی بھی گریٹ ہے۔ آج ہی کیمرہ ٹسٹ ہو جائے۔ نیچے میری کار کھڑی ہے ——— للی! آج تم نے میری لاج رکھ لی۔"

بابا نے اپنی آنکھوں سے دونوں کو جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ کچھ نہ بولی۔ دونوں کار میں بیٹھے۔ پروڈیوسر کا ہاتھ لاجونتی کی کمر کے گرد تھا۔ لاجونتی نے اس وقت اسے محسوس نہیں کیا کیونکہ وہ کئی سالوں سے اس بات کا انتظار کر رہی تھی کہ کوئی مرد اس کی کمر کے گرد ہاتھ رکھے۔ یہ نوجوان اسے پسند تھا اور آج جس پیشے کو اس نے اختیار کیا تھا اس میں عشق، آرٹ اور روپیہ کا ایک عجیب سنگم تھا۔ ہوا اس کے بالوں سے کھیل رہی تھی اور اس کی کمر اور خمدار ہو گئی تھی۔

اوپر بالکونی میں بابا نے دونوں کو کار میں اوجھل ہوتے ہوئے دیکھا اور وہ زیرِ لب بڑبڑائی "ہاں! ایک بار اور صرف آخری بار۔"

اور پھر بالکونی کی چق گرا دی۔

گلاب کے پھول

کشمیری لال ذاکر

رات کو اپنی کھلی چھت پر چارپائی پر لیٹے ہوئے وہ سوچا کرتا یہ مدھو آخر آ کیوں نہیں جاتی اب؟ سوچ کیا رہی ہے؟ ٹریننگ میں تو اس کا نام چن لیا گیا ہے اور اس کی اطلاع بھی اسے مل چکی ہے۔ جوں جوں مدھو کے آنے میں دیر ہو رہی تھی، جتیندر کے اشتیاق کی آنچ تیز ہوتی جاتی تھی۔ یہ اشتیاق کی آنچ بھی ایک مصیبت ہے۔ ایک دم تیز ہو جائے تو کم بخت بھٹی بن جاتی ہے اور پگھلا دیتی ہے۔ انسان کے دل و دماغ کو اور جب دل و دماغ پگھلنے لگیں تو جانتے ہو کیا ہوتا ہے۔ انسان بہت حساس ہو جاتا ہے۔ اسے ہوا کے ہر جھونکے پر گمان ہوتا ہے کہ وہ اس کے محبوب کے شبستاں سے ہو کر آیا ہے۔ کلی کھلتی ہے تو اسے لگتا ہے کہ کسی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی ہے۔ پھوار پڑے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ کوئی غمگین آنکھ اداس ہے۔ آکاش میں گھٹا چھا جائے تو اسے یاد آنے لگتا ہے کسی دوشیزہ کے شانوں پہ بکھرے ہوئے لمبے لمبے بال ہیں۔ جن میں سے نازک رنگوں سے نکلتی ہوئی ہلکی ہلکی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ جوانی کی یہ مدھر باس کتنی نشیلی ہوا کرتی ہے۔ اس کا خیال آتے ہی جتیندر کے ذہن پر ایک سرور کی سی کیفیت چھا جاتی۔ آنکھیں بند کر لیتا۔

اور پھر اچانک اسے ایسے محسوس ہونے لگتا کہ کسی کا ریشمی گلابی پلو اس کی پلکوں سے چھو رہا ہے اور ایک بڑی پرسکون اور دلنواز نرماہٹ اس کے پپوٹوں کو تھپتھپا رہی ہے۔ جیسے اپنی ڈیوڑھی کی دہلیز میں کھڑی کوئی خوبصورت لڑکی اسے بڑے پیار کے انداز سے اشارے کر رہی ہے اور وہ جھجک رہا ہے۔ دہلیز کے اندر قدم رکھتے ہوئے اور ٹکر ٹکر دیکھے جا رہا ہے۔ گورے نازک چہرے کی طرف اور پھر ایک سنگیت سا گونجتا ہے۔ اس کے کانوں کے آس پاس کوئی کہہ رہا ہے۔

”جھجکو مت اندر آ جاؤ۔ میں تو ایک مدت سے آنکھوں کے دیئے جلا کر تمہارا انتظار کر رہی ہوں کہ کب تم ادھر سے گزرو اور کب میں تمہیں بلا سکوں۔“

وہ ایک بار بھرپور نظروں سے لڑکی کی طرف دیکھتا ہے۔ یہ پھر کہیں اسے لوٹنے کی سازش تو نہیں ہو رہی۔ زندگی میں کب تک لٹتا رہے گا وہ آخر۔ اب رکھا ہی کیا ہے اس کے پاس لٹانے کو۔

”خدا کے لیے ایسی نظروں سے مت دیکھو مجھے۔ میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ آ جاؤ اندر۔ باہر بہت تیز لو ہے۔ اندر میں نے اپنے بالوں کے سائے بکھیر دئیے ہیں۔ تم آؤ تو سہی۔“

وہ یہ سن کر سوچتا ہے۔ ایسی آنکھوں والی لڑکی دھوکا نہیں دے سکتی۔ وہ مسکرانے لگتا ہے۔

”آ بھی جاؤ، کیوں بے رحم بن رہے ہو؟“

اور اُسے لگتا ہے جیسے ایک چھناکے کی سی آواز اُبھری ہے۔ شاید لڑکی کی کلائی میں پڑی کانچ کی چوڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرا گئی ہیں اور پھر ایک نازک ہاتھ بڑھ کر اُس کا ہاتھ تھام لیتا ہے اور اُس کی اُنگلیاں جیسے برف سے تراشی ہوئی شمعوں پر جم گئی ہوں۔ کتنی ٹھنڈی تھیں۔ اس کی گوری انگلیاں جیسے جاڑوں کی ایک چاندنی رات منجمد ہو کر جون کی جلتی ہوئی دوپہر سے گلے مل رہی ہو۔

اور ایک شام مدھو آخر آ ہی گئی۔ مُراری خود اُسے ساتھ لے کر آیا تھا۔ جتیندر حیران تھا کہ مراری فضول ہی کیوں ہر مہینے مکان کا آدھا کرایہ ادا کرتا تھا حالانکہ اُسے صرف ایک چارپائی بچھانے کی جگہ چاہیے تھی۔ جتیندر جب اُس کے سامنے مکان بدل لینے کی تجویز رکھتا تو مُراری کہتا کہ وہ مدھو کو نرسنگ کی ٹریننگ دلوانا چاہتا تھا۔ وہ آ گئی اور اس کے ساتھ اس کے دونوں چھوٹے بھائی آ گئے تو پھر بڑے مکان کی ضرورت ہو گی اور اب اگر یہ مکان چھوڑ دیا تو پھر ایسا مکان نہیں ملے گا۔ بات درست تھی۔ اسی لیے جتیندر اور مُراری ہر مہینے اپنی تنخواہ میں سے پچیس پچیس روپے نکال کر مالک مکان کی ہتھیلی پر رکھ آتے تھے۔ اس مالک مکان جیسا حریص آدمی اُس نے آج تک نہ دیکھا تھا۔ پیسہ دیکھ کر تو جیسے اس کی رال ٹپکنے لگتی تھی۔ لیکن انھیں مکان چاہیے تھا، بڑا سا مکان۔ مدھو کے لیے جو کوئی کام دھندہ کر کے گھر کی ذمہ داریوں میں مراری کا ہاتھ بٹانا چاہتی تھی۔ مالک مکان کے منہ سے رال ٹپکتی ہے تو ٹپکا کرے۔ انھیں اس سے کیا؟

مراری نے جس سمے دروازہ کھٹکھٹایا جتیندر سو رہا تھا۔ آج فیکٹری میں بیچارے کو بہت کام کرنا پڑا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر اس کی آنکھ کھلی۔ اس نے فوراً اٹھ کر دروازہ کھولا۔ اس کی آنکھوں میں ابھی نیند کا بوجھل خمار بھرا پڑا تھا۔

”لے آیا ہوں مدھو کو۔“

مراری کی یہ بات سُن کر جتیندر کی آنکھوں کا خمار ایکدم ٹوٹ گیا۔

اس نے دیکھا دروازے کے باہر ایک گوری سی، نازک سی، بالکل گڑیا جیسی لڑکی کھڑی تھی اور اس کے ساتھ اُس کے دونوں بھائی تھے۔ ایک کی عمر کوئی آٹھ برس کی ہو گی۔ اور دوسرے کی دس گیارہ برس کی، جیسے وہ دونوں اس گڑیا سے کھیلتے ہوں۔

مراری سوٹ کیس لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ دونوں لڑکے تھوڑا تھوڑا سامان اٹھا کر اندر لانے لگے۔ جتیندر ابھی تک دروازے ہی میں کھڑا تھا۔ اچانک اُسے احساس ہوا کہ اُسے بھی سامان اٹھا کر اندر رکھنا چاہیے۔ چنانچہ وہ بھی ایک ٹرنک اٹھانے کو جُھکا۔

”یہ بھاری ہے، آپ سے نہیں اُٹھے گا“

یہ آواز کہاں سے آئی تھی؟ مدھو تو اُسی طرح گڑیا کی مانند بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ آواز آئی ضرور تھی کہیں سے۔ شاید خاموشی نے ہی بات کی ہو۔ کبھی کبھی سکوت بھی تو بولتا ہے۔

وہ ٹرنک واقعی بھاری تھا۔ جتیندر سے اکیلے نہیں اٹھا۔ مُراری اور اس نے مل کر اُسے اٹھایا اور اندر لے گئے۔

مدھو جب کمرے کے اندر داخل ہونے کو اس کے قریب سے گزری تو جتیندر نے دیکھا وہ کتنی چھوٹی تھی۔ وہ تو سفیدے کے درخت کی طرح قد نکالے جا رہا تھا۔ اُس کے مقابلے میں تو مدھو بادام کا ایک چھوٹا سا پیڑ لگ رہی تھی۔ لیکن صرف قد سے کیا ہوتا ہے۔ سفیدے کا درخت چاہے کتنا بھی اونچا ہوتا ہو جائے نکلے گی تو اس سے بدبودار روئی ہی جو کسی کام نہیں آتی۔ تکیے میں بھرو تو دنوں میں کیڑے رینگنے لگیں اور بادام تو دو سال میں پھول دینے لگے گا۔ ہلکے گلابی اور سفید رنگ کے اُجلے اُجلے پھول۔

اور جب مدھو کسی بات پر مسکرائی تو جتیندر کو محسوس ہوا جیسے اس کے چھوٹے چھوٹے ہموار دانت نہیں بادام کے پھول چمک رہے تھے جیسے اس ویران گھر میں بہار آ گئی ہو۔

دوسری صبح جتیندر کا اوف تھا۔ مراری صبح سویرے اپنے کام پر چلا گیا اور جاتے ہوئے یہ ہدایت کر گیا کہ سب مل کر گھر کو صاف کریں، فرشوں کو دھوئیں اور سامان کو ٹھیک ڈھنگ سے لگائیں۔

راجو اور بلی پانی بھر کر لا رہے تھے اور مدھو فرش صاف کر رہی تھی۔ راجو اور بلی تھک جاتے تو پھر جتیندر بالٹیاں بھر کر لاتا۔ تھوڑی ہی دیر میں سارا گھر دُھل گیا جیسے کسی کھنڈر پر ٹوٹ کے مینہ برسا ہو اور جب دھوپ کمروں میں پھیلی تو گیلے کمرے واقعی ایسے لگ رہے تھے جیسے کسی عمارت کے کھنڈر چاندنی میں چمک رہے ہوں۔ مدھو خالی خالی کمروں میں اِدھر اُدھر گھومتی ہوئی اُس شہزادی کی طرح لگ رہی تھی جسے ایک پرانے اور غیر آباد محل میں قید کر دیا گیا تھا اور جو جھروکے میں بیٹھی راہگیروں کو اداس نگاہوں سے دیکھتی رہتی تھی اور جس کی طرف کبھی کسی نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تک نہ تھا کیونکہ کسی کو بھی یہ خیال نہ آ سکتا تھا کہ اُس ٹوٹے پھوٹے محل میں کوئی شہزادی بھی رہ سکتی ہے۔

کمرے صاف کر چکنے کے بعد سب نے مل کر سامان لگایا۔ ٹرنکوں کے اوپر دُھلے ہوئے مستطیل کپڑے بچھائے۔ دو بڑے بڑے ٹرنکوں کو دیوار کے ساتھ جوڑ کر ان پر گدے کو دوہرا کر کے بچھایا اور اس پر کاسنی رنگ کی ایک پھولدار چادر ڈال دی۔ اس سے صوفے کا کام چلے گا۔ ننگی اور ویران دیواروں پر گھٹیا قسم کے ٹنگے ہوئے کیلنڈر جتیندر نے ایکدم اکھاڑ پھینکے جن پر انگڑائیاں لیتی ہوئی نیم برہنہ عورتوں کی تصویریں چھپی تھیں۔ مدھو کیا سوچتی ہو گی۔ کیسا آدمی ہے جتیندر جسے اس قسم کی بیہودہ تصویریں پسند ہیں۔

"یہ کیلنڈر کیوں اتار دیئے آپ نے؟"

"ویسے ہی"

"تاریخیں دیکھنے میں آسانی رہتی۔"

"تم اپنا سال آج سے شروع کرنا، تاریخ یاد رکھنے میں دقت نہ ہو گی"

مدھو جتیندر کی بات سُن کر مسکرا دی۔

پھر اس نے اپنے ٹرنک میں سے کچھ فوٹو نکالے۔ کچھ اس کے سکول کے فوٹو تھے، جن میں وہ اپنی کلاس کی لڑکیوں کے ساتھ ڈراموں میں حصہ لے رہی تھی، فینسی ڈریس میں کھڑی تھی، انعام لے رہی تھی۔ راجو بازار سے میخیں لے آیا تھا۔ جتیندر نے وہ سب فوٹو دیواروں پر ٹانگ دیئے تھے۔

ایک تصویر ایک اداس اور گمبھیر عورت کی تھی جس کے چہرے پر غم کے نشان تھے اور جس کے بالوں میں غربت کی دھول تھی اور جس کے ماتھے پر ذمہ داریوں کے ہاتھ کی لگی ہوئی مہر تھی۔ سہاگ کی بندی تو بہت عرصہ ہوا مٹ گئی تھی۔ اس روز جب مراری کے پتا ایک رات کام سے واپس آتے ہوئے ایک ٹرک کے نیچے کچلے گئے تھے۔ ان کے جسم سے بہا ہوا خون آج بھی اس عظیم عورت کی آنکھوں میں شعلہ بن کر سلگ رہا تھا۔ اسی آگ میں وہ زندگی بھر جلتی رہی اور جب مری تو اس کی چتا جلانے کے لیے صرف گیلی لکڑیاں ملی تھیں۔ جنھوں نے اس کی ہڈیوں کو دھک دھک کر پگھلایا تھا۔ ایکدم جلا کر راکھ نہیں کیا تھا۔

اس رات ٹوٹ کر مینہ برسا تھا اور شمشان میں گیدڑ چیختے رہے تھے اور مراری، مدھو، راجو اور بلی کو ساتھ لیے دیر تک ویران سڑکوں پر گھومتا رہا تھا۔

اور جب مدھو نے یہ تصویر ٹرنک سے نکال کر اپنے دوپٹے کے پلو سے پونچھی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

یہ اس کی ماں کی تصویر تھی۔

جتیندر کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ اسے اپنی ماں کی یاد آئی جو اسے بچپن میں ہی اکیلا چھوڑ کر مر گئی تھی اور اس کے پاس اس کی کوئی تصویر بھی نہ تھی۔ کاش! اس کے پاس اپنی ماں کی کوئی تصویر ہوتی جسے دیکھ کر کبھی کبھی اسے آسودگی کا احساس ہوتا اور جب اس نے مدھو کے ہاتھ سے اس کی ماں کی تصویر لی تو اسے لگا جیسے اس کی اپنی ماں بھی ایسی ہی تھی۔ اسی طرح اداس، گمبھیر اور چٹان کی طرح سخت اور اس کا سر آپ سے آپ اس تصویر پر جھک گیا۔

"یہ سب کی ماں ہے۔ ہم جیسے سب لوگوں کی ماں جو دکھ درد سہتے ہیں اور ایک حسین مستقبل کے خواب دیکھتے ہیں۔ آؤ ہم سب اسے پرنام کریں۔"

مدھو، راجو اور بلی سب سر جھکائے کھڑے تھے اور رو رہے تھے۔

اس لمحہ مراری کام سے لوٹا۔

اندر قدم رکھتے ہی وہ ٹھٹک گیا۔ اسے لگا جیسے وہ کسی مندر میں اس سمے داخل ہوا تھا جب پوجا ہو رہی تھی۔ اور سب لوگ آنکھیں بند کیے بھگوان کی آرادھنا کر رہے تھے۔ کتنا مقدس لمحہ تھا، کتنی پوتر اور عظیم گھڑی تھی۔ وہ وہیں رک گیا۔

اور جب جھکے ہوئے سر اوپر اٹھے تو مراری نے آگے بڑھ کر مدھو، راجو اور بلی کو اپنے ساتھ چمٹا لیا۔

جتیندر ماں کی تصویر کو سامنے والی دیوار پر ٹانگ رہا تھا۔ بے دھیانی میں ہتھوڑا اس کی انگلی پر پڑا۔ وہ چیخا نہیں۔ چیختا وہ کبھی نہیں تھا۔ وہ اس روز بھی نہ چیخا تھا جب اس کی ایک انگلی مشین میں آ کر کٹ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اس روز بھی تھے۔ وہی آنسو بہت دنوں کے بعد آج پھر اس کی پلکوں پر قطرہ قطرہ اٹھے تھے۔ اس نے جھٹ سے قمیص کی آستین سے آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ اور گھوم کر مراری کی طرف دیکھا۔ کسی کی نظر اس کے آنسوؤں پر نہ پڑی تھی۔ سب اپنے ہی میں مگن تھے۔

مدھو کے روکنے کے باوجود شام کا کھانا انھوں نے ہوٹل میں کھایا۔ جتیندر نے کہا، آتے ہی چولہا کیوں جھونکنے لگے بیچاری مدھو۔ یہ تو روز کا بکھیڑا ہے۔ ایک دن ناغہ ہو گیا تو کونسی آفت ٹوٹے گی۔

جتیندر نے صرف کافی کی پیالی لی۔ مراری نے ملک شیک پیا۔ مدھو اور راجو اور بلی نے کھانا کھایا۔ مدھو بیچاری کا تو فقط نام ہی تھا۔ کھایا سب کچھ راجو اور بلی نے ہی تھا۔ وہ تو ایک لقمہ توڑ کر لمحوں انتظار کرتی رہتی۔ منہ میں ڈالنے کا اور منہ میں ڈال لیتی تو دوسرا نوالہ لینے تک گھڑیاں بیت جاتیں۔

ٹھنڈے ملک شیک کا گھونٹ بھرتے ہوئے مراری نے کہا۔

”جتیندر کام تو کرتا ہے کپڑے کی مل میں لیکن لکھتا کم بخت کہانیاں ہے۔“

”سچ بھائی صاحب؟“ مدھو نے چونک کر کہا۔ اور بڑی حیرت سے جتیندر کی طرف دیکھا جیسے سوچ رہی ہو کہ یہ بدھو کہانیاں بھی لکھ سکتا ہے؟ کہانیاں لکھنے والے تو اور ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ یہ بیچارہ کیا لکھے گا کہانیاں؟

”ہاں ہاں، بہت اچھی کہانیاں لکھتا ہے۔“

”کیا واقعی آپ کہانیاں لکھتے ہیں؟“ مدھو بھول گئی کہ ہاتھ میں پکڑا ہوا روٹی کا ٹکڑا اُسے منہ میں بھی ڈالنا ہے۔

”درجنوں لکھ رکھی ہیں ظالم نے۔ اس کی کہانیوں کے تو چرچے ہوتے ہیں ہر جگہ۔“ جتیندر کی جگہ جواب مراری نے دیا تھا۔

”جب کوئی اچھا پرنٹ مل سے نکلتا ہے تو میں سمجھتا ہوں میری کہانی مکمل ہو گئی ہے۔“ جتیندر نے بڑے سکون سے کہا۔

”اور جب یہ کپڑا کسی جسم پر سجتا ہے تو مجھے لگتا ہے میری کہانی کو لباس مل گیا ہے۔“ مدھو کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا ویسے ہی پکڑا تھا۔

”اور جب یہ کسی دُلہن کے بدن پر نکھر کر دوسروں کی آنکھوں میں بستا ہے تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری کہانی کا بیاہ ہو رہا ہے۔“

مدھو کی آنکھیں چمک رہی تھیں جتیندر کی بات سُن کر۔ یہ ضرور لکھتا ہو گا کہانیاں، بھائی صاحب غلط نہیں کہتے وہ سوچنے لگی۔

”اور جب آنگن میں کھیلتا ہوا کوئی بچہ اسے مٹی سے لت پت کر دیتا ہے تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ اب میری کہانی جوان ہو رہی ہے۔“

راجو اور بلی مزے سے آئس کریم کھا رہے تھے۔ مراری ملک شیک کے ہلکے ہلکے گھونٹ لیتے ہوئے مسکرائے جا رہا تھا۔ ایک مدھو تھی جو گم صُم سی بیٹھی تھی۔

”اور جب یہ کسی مردے کے جسم پر کفن بن کر پھیلتا ہے تو مجھے لگتا ہے میری کہانی مر گئی ہے اور جب چتا سے شعلے نکلتے ہیں تو میری کہانی جل کر راکھ ہو جاتی ہے اور پھر یہ راکھ اڑ کر بادام کے پیڑوں پہ جم جاتی ہے۔ اور بادام کے پھول ——“

جتیندر اچانک رُک گیا۔

مدھو کے ہاتھ میں پکڑا ہوا روٹی کا ٹکڑا پلیٹ میں گر گیا —— اُس نے رومال سے ہاتھ پونچھا۔ اس کی نظریں جتیندر

کے پریشان چہرے پر جمی تھیں۔

"اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟ رک کیوں گئے آپ؟" مدھو رونکھی سی آواز میں بولی۔

اس کے سفید سفید ہموار دانت ادھ کھلے ہونٹوں میں سے جھانکتے ہوئے بادام کی کلیوں کی طرح لگ رہے تھے۔

"اس کے بعد جو کچھ ہوتا ہے وہ اچھا نہیں ہوتا۔" جتیندر نے تیکھے سے انداز میں کہا۔ اور کرسی سے اٹھ کر کاؤنٹر پر چلا گیا اور بل کے پیسے ادا کرنے لگا۔

"کیا ہو گیا بھائی صاحب اِن کو؟" جتیندر کے یوں اٹھ جانے پر مدھو نے مراری سے پوچھا۔

"ایسے دورے انہیں اکثر پڑتے ہیں، لیکن اس کا دل آئینہ ہے۔ اس میں تم اپنے من کے بھاؤ پورے نکھار سے دیکھ سکتی ہو۔" مراری نے جواب دیا۔

جتیندر بل ادا کر چکنے کے بعد ہوٹل کے دروازے کی طرف بڑھ گیا، ان کی طرف واپس نہیں آیا۔ جتنی دیر تک وہ اٹھ کر باہر نکلے جتیندر کسی طرف نکل گیا تھا۔ وہ اُسے نہ پا سکے۔ اُسے آج تک پا ہی کون سکا تھا۔ جب کسی کو یہ احساس ہونے لگتا کہ اُس نے جتیندر کو پا لیا ہے۔ وہ ایکدم ایک سکے کی طرح ہاتھ سے پھسل کر پانی میں گر جاتا اور پانے والا خالی ہاتھ لیے گھر لوٹ جاتا۔ جیسے آج مدھو اور مراری اور راجو اور بلی خالی ہاتھ گھر لوٹ رہے تھے۔

کئی لوگ جو جتیندر کو اپنانے آئے تھے۔ اسی طرح خالی ذہن لے کر واپس گئے تھے۔

چھت کے دو حصے تھے۔ جب تک مدھو نہیں آئی تھی۔ جتیندر اور مراری چھت کے ایک ہی حصے پہ سوتے تھے۔ چھت کا دوسرا حصہ استعمال میں نہ آتا تھا۔ مدھو کے آنے پر جب مراری اپنی چارپائی جتیندر کے ساتھ بچھانے لگا تو اُس نے ٹوک دیا۔

"تم اپنی چارپائی اُدھر بچھایا کرو، انہیں تمہاری ضرورت ہے۔"

"رات کو سونا ہی تو ہے، ادھر سو لیا یا اُدھر، کیا فرق پڑتا ہے۔"

"پڑتا ہے فرق۔" جتیندر نے غصے سے جواب دیا۔

اور مراری بیچارہ اپنی چارپائی اٹھا کر چھت کے دوسرے حصے پر لے گیا۔

"کیوں! وہیں نکالا مل گیا بھائی صاحب؟" مدھو طعنہ کس رہی تھی۔

"ہاں اس کی سلطنت میں کسی کے لیے گنجائش نہیں۔" مراری نے کہا۔

"ٹھاٹھ سے اکیلے سونا چاہتے ہیں نا کھلی چھت پہ۔" راجو بولا۔

"نہیں یہ بات نہیں راجو۔ وہ رات دیر سے سوتا ہے، ذرا سی چھیڑ ہو تو اس کی نیند ٹوٹ جاتی ہے، میں ادھر سویا کروں گا تمہارے پاس۔"

"اپنی نیند کا بڑا خیال ہے انہیں۔" مدھو بولی۔

"اُسے تمہاری نیند کا بھی خیال ہے، جبھی تو اُس نے مجھے یہاں بھیج دیا ہے۔"

مدھو خاموش رہی۔ بولی نہیں۔

تھوڑی دیر بعد سب سو گئے۔ لیکن مدھو کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس نے چارپائی ذرا ایک طرف کھینچ لی جہاں سے چپن کا دریچہ صاف نظر آنے لگا جہاں جتیندر سویا تھا۔ لیکن وہ سویا کہاں تھا، جاگ رہا تھا اور تاروں پر نظریں گاڑے جانے کیا سوچ رہا تھا۔ مدھو دیر تک جاگنے کی کوشش کرتی رہی۔ لیکن تھی وہ نیند کی رسیا، اور اس کی آنکھ لگ گئی۔ جب تک جاگتی رہی اسے احساس ہوتا رہا کہ جتیندر سویا نہیں تھا۔

دوسری صبح مدھو کو اسپتال جانا تھا۔ آج اس کی ٹریننگ کا پہلا دن تھا۔ ایک تو وہ اٹھی دیر سے تھی۔ اور اب تیار ہونے میں فضول دیر کر رہی تھی۔

مراری نہا دھو کر تیار ہو گیا تھا۔ جتیندر چارپائی پر پڑا سگریٹ پی رہا تھا اور ساتھ کے کمرے میں ڈریسنگ ٹیبل کے قریب کھڑی مدھو اپنے بال ٹھیک کر رہی تھی۔ مدھو کے بال اتنے لمبے تھے کہ اگر وہ انہیں کھلا چھوڑ دے تو ایڑیوں تک پہنچ سکتے۔ اس کا قد چھوٹا تھا۔ اس لیے بال اور بھی لمبے دکھائی دیتے تھے۔ جتیندر نے کبھی مدھو سے کہا تو نہیں لیکن کئی بار اس نے سوچا ضرور کہ اگر مدھو کے کھلے ہوئے بال کبھی اس کے پاؤں میں الجھ گئے تو وہ چلتے چلتے گر پڑے گی۔ کئی بار وہ سوچتا کہ مدھو جو کچھ کھاتی پیتی تھی اس کا اثر اس کے جسم پر تو کچھ نہ پڑتا تھا البتہ بالوں پر ضرور پڑتا تھا۔ بالوں کو سنبھالنے، سنوارنے اور انھیں دھونے میں چار چار گھنٹے لگا دیتی۔ وہ بڑی احتیاط اور محبت سے کام لیتی تھی، جس طرح ایک ماں اپنے بچے کو نہلا دھلا کر تیار کرنے میں پوری لگن کا اظہار کرتی ہے۔ کھلی کھڑکی سے ہوا آنے کے کارن کنگھی سے الجھتے ہوئے مدھو کے بال اڑ اڑ کر دوسرے کمرے میں چارپائی پر لیٹے سگریٹ پھونکتے ہوئے جتیندر کو بھی نظر آ رہے تھے اور وہ سوچ رہا تھا کہ کوئی اور وقت ملا تو وہ پارک میں تنہائی میں بیٹھ کر مدھو کے بالوں پر ضرور ایک کہانی لکھے گا اور اس کے ہونٹوں سے نکلے ہوئے دھوئیں کے مرغولے اڑ کر فضا میں بکھر رہے تھے، جیسے آکاش میں گھٹائیں جھوم رہی ہیں۔ جیسے کسی کے شانوں پہ بکھرے بال لہراتے ہیں، جیسے کسی بڑے سے درخت کے ساتھ لپٹی ہوئی بیلیں رقص کرتی ہیں۔

مراری اندر داخل ہوا۔ اسے جلدی تیار نہ ہو سکنے والوں سے چڑ تھی۔ اسی بات پہ کئی بار اس کا جتیندر سے بھی جھگڑا ہوا تھا۔ مدھو بڑے انہماک سے کنگھی کر رہی تھی۔ آج اسپتال میں اس کا پہلا دن تھا اور اسے احساس ہی نہ تھا اس بات کا۔ کتنی مشکل سے اس نے اس کی ایپلیکیشن کروائی تھی۔

”آخر یہ سانپ کیوں پال رکھے ہیں تم نے؟“ مراری غصہ سے بولا۔ مدھو چونک اٹھی۔ اس کے ہاتھ سے کنگھی چھوٹ کر نیچے گر گئی۔

یہ کیا کہہ ڈالا تھا اس کے بھائی نے؟ یہ کیا سوجھی تھی اسے؟ اس نے ایک بار گھوم کر مراری کی طرف دیکھا لیکن بولی نہیں۔ اس کے بعد بولا مراری بھی نہیں۔ کمرے سے باہر نکل گیا اور راجا دربلی پر برسنے لگا۔

جتیندر مراری کے ان الفاظوں کو سن کر کہیں اور پہنچ گیا تھا۔ صندل کے گھنے جنگل میں، خوبصورت پیڑوں سے دھیمی دھیمی خوشبو سے مست ہو کر بھورے رنگ کے لمبے لمبے پتلے سانپ ایک دوسرے میں گتھے ہوئے تنوں سے لپٹ کر سو رہے تھے۔ ان سانپوں کے کاٹنے سے کسی کو زہر نہیں چڑھتا تھا بلکہ شہد کی مٹھاس خون میں گھلتی ہے۔ ان کے ڈنک سے انسان مرتا نہیں بلکہ امر ہوتا ہے۔ ان کو پیار سے پکڑ کر گردن کے گرد لپیٹ کر چلا جائے۔ انھیں جان سے مار دینے

کو نہیں۔

جانے کتنی ہی دیر جتیندر صندل کے گھنے جنگلوں میں سورج کی دھوپ سے چھپ کر اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا اور جنگلی پھولوں کی خوشبو اُس کے دماغ میں رچتی رہی۔ کتنی ہی دیر اُس کے کانوں میں جھرنوں کے ملہار گونجتے رہے اور وہ ایک کھوئے ہوئے، بھٹکے ہوئے شکاری کی طرح اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر راستے کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا۔ کوئی بھی تو نہیں تھا اُسے راستہ سُجھانے والا۔ تو کیا وہ اپنے ساتھیوں سے کبھی نہ مل سکے گا؟ کیا صندل کی خوشبو اور گھنے درختوں کی چھاؤں اُسے اپنے آپ میں جذب کر لینا چاہتی تھی؟ کیا اُسے جذب ہو جانا چاہیئے؟ کیا اُسے اپنی ہستی کھو دینی چاہیئے؟ یوں ہی سوچتے سوچتے وہ کہیں دور نکل گیا۔ اُسے اُس وقت ہوش آیا جب وہ بھورے بھورے سانپ ایک دوسرے میں گُتھے ہوئے صندل کی شاخوں سے گر کر اچانک اُس کے قدموں میں آ پڑے۔

”مجھے اسپتال تک چھوڑنے نہیں چلیئے گا آپ؟“ مدھو اس کے سامنے کھڑی تھی اور اُسے کچھ بھی نظر نہ آ رہا تھا۔ صندل کی چھاؤں نے جیسے اُسے واقعی جذب کر ڈالا تھا۔ اُس نے آنکھیں جھپکتے ہوئے سامنے دیکھا۔ ہلکی سی دھند چھا رہی تھی اس کے سامنے۔

”سپنا دیکھ رہے ہیں کیا؟“ مدھو مسکرائی۔ بادام کے پھول کھل اُٹھے۔

”ہاں اس صبح کو دیکھ رہا ہوں جب تم نرسنگ کی ٹریننگ ختم کر چکنے کے بعد آؤ گی اور تمہارا روپ بدل چکا ہوگا تمہاری دنیا بدل چکی ہوگی مراری کی ذمہ واریاں بٹ چکی ہوں گی اور پھر کھنڈروں میں دھیرے سے بہار آ جائے گی اور بادام کے پھول۔۔۔۔“

ٹھیک اُسی لمحہ مراری راجو اور بلی کو ڈانٹ پلا کر کمرے میں داخل ہوا۔ مدھو نے سوچا۔ کاش وہ ایک لمحہ اور نہ آتا اور جتیندر اپنا فقرہ مکمل کر سکتا۔ کاش وہ کبھی اپنی بات پورے انداز سے کہے۔ کاش وہ یوں ٹوٹی ہوئی، ادھوری اور نامکمل باتیں نہ کرے۔ کاش وہ انسانوں کی طرح سوچ سکے، کاش!!

”تیار ہو گئیں تم؟“

”ہاں۔“ مدھو نے سر ہلایا۔

اور پھر مراری اور جتیندر اُسے اسپتال تک چھوڑنے گئے۔ وہ دونوں بہن بھائی نہا دھو کر، سج سجا کر، تیار ہو کر جا رہے تھے اور ان کے ساتھ چلتا ہوا جتیندر، قمیص کے کھلے بٹن، بکھرے ہوئے بال، بڑھی ہوئی شیو، عجیب تضاد کی سی کیفیت پیش کر رہا تھا۔ مراری کو کوفت ہو رہی تھی لیکن مدھو خوش تھی۔ دراصل یہی جتیندر کا اصلی روپ تھا۔ اسی سے اُسے پیار تھا۔ اسپتال کے گیٹ کے اندر داخل ہوتے ہوئے مدھو نے ایک بار جی بھر کر جتیندر کو دیکھا جیسے کہہ رہی ہو، میرے ٹریننگ لے کر اس گیٹ سے باہر واپس آنے تک اپنا اصلی روپ کھو مت دینا۔ اسے قائم رکھنا۔ اسی میں تمہاری جیت ہے۔

اور پھر وہ چلی گئی اور جتیندر اور مراری واپس آ گئے۔ مراری کام پر چلا گیا اور جتیندر ہوٹل میں جا کر کافی پیتا رہا۔

یوں تو نرسوں کے لیے ہاسٹل میں رہنا ضروری تھا لیکن جن کے گھر تھے انھیں باہر رہنے کی اجازت تھی۔ مدھو ٹریننگ کے اوقات کے بعد شام کو گھر آ جاتی تھی۔ سب مل کر چائے پیتے تھے۔ کھانا بھی گھر ہی پر بنتا تھا۔ جتیندر کھانا ہوٹل ہی میں کھاتا تھا البتہ شام کو جب گھر پہ ہوتا چائے اُن کے ساتھ پیتا تھا۔

جتیندر آج بہت دیر سے گھر لوٹا۔ سب انتظار کرتے کرتے سو گئے تھے۔ سونے سے پہلے مدھو نے چھوٹے چھوٹے کنکر اٹھا کر جتیندر کے بستر پر چادر کے نیچے بڑے اہتمام سے بچھائے۔ احتجاج کی یہی راہ اسے سوجھ پائی تھی۔ جتیندر سے صرف یہ پوچھنا کہ وہ دیر سے کیوں آیا تھا کارگر ثابت نہ ہوگا۔ کہانی کاروں کو سیدھی سادھی باتیں بھلا پسند ہی کہاں آتی ہیں۔ سیدھے سادے لوگ ان کی کہانیوں کے کردار بھی تو نہیں بن سکتے۔ انھیں تو ساکن فضا سے لگاؤ ہی نہیں ہوتا۔ کہیں کوئی بجلی چمکے، تارہ ٹوٹے، طوفان جاگے، تو کہیں جا کر انھیں احساس ہوتا ہے زندگی کا۔ ورنہ تو وہ کچھ سمجھتے ہی نہیں۔

جتیندر نے دروازہ کھٹکھٹایا تو کوئی نہ بولا۔ سب سو رہے تھے۔ مدھو بھی سو گئی تھی۔ نیند کی تو وہ شروع ہی سے رسیا تھی نا۔

جب اس نے دوبارہ دروازہ کھٹکھٹایا تو مراری کی نیند ٹوٹی۔ اس نے نیند کے خمار ہی میں دروازہ کھولا اور دوبارہ چارپائی پر گر گیا۔ اسے یاد ہی نہ رہا کہ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا بھی تھا۔ جتیندر نے اندر سے دروازہ بند کیا اور پھر صراحی سے پانی کا گلاس انڈیل کر پیا۔ صراحی کی تنگ سی گردن میں سے پانی نکلتے ہوئے بڑی پیاری سی آواز نکلی جیسے صراحی قہقہے لگا رہی ہو کہ اس نے کسی کی پیاس بجھائی تھی اور وہ کسی حاجت مند کے کام آئی تھی۔ پھر جتیندر نے کپڑے بدلے اور اوپر چھت پر سونے چلا گیا۔ ہوا کی ہلکی ہلکی رمق اس کے تھکے ہوئے جسم کو بڑی بھلی لگی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ فوراً بستر پر گر جائے۔ مدھو، راجو اور بلی کے اصرار سے اتنا ضرور ہو گیا تھا کہ اس کا بستر بچھا دیا جاتا تھا۔ ورنہ پہلے تو نیچے سے بستر اٹھا کر چھت پر اسے خود ہی لے جانا پڑتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ اتنا تھکا ہوا ہوتا تھا کہ بستر اٹھانے کی ہمت ہی نہ ہوتی تھی اور وہ کھلی چھت پر کھڑی چارپائی کی بٹی ہوئی موٹی موٹی رسیوں سے جسم کو رگڑتے ہوئے رات کے کسی پہر میں سو جاتا تھا اور جب جاگتا تھا تو اس کے جسم کے ننگے حصوں پر موٹی موٹی رسیوں کے نشان گڑے ہوتے تھے جیسے مختصر نیند اس کی آنکھوں کی راہوں سے گزرتے ہوئے اپنے نشان چھوڑ گئی ہو۔

وہ ایکدم بستر پر گرا اور پھر فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ بھی گیا۔ چادر کے نیچے رکھے کنکر اس کی پیٹھ میں چبھ گئے تھے۔ اس نے چادر کو الٹ کر دیکھا کنکر اس انداز اور ترتیب سے رکھے تھے جیسے ان کو جوڑ کر کوئی نام بنتا ہو۔ اس نے سوچا یہ راجو اور بلی کی شرارت ہوگی۔ کم بختوں نے ناحق نیند خراب کی تھی۔ وہ کنکر اٹھا کر پھینکنے لگا تو جانے اسے کیا خیال آیا کہ اس نے ماچس جلائی اور کنکروں کی ترتیب دیکھنے لگا۔ لمحہ بھر کے بعد اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”اچھا تو یہ بات ہے!“ اس نے اپنے آپ سے کہا اور چھت کے دوسرے سرے پر نگاہ ڈالی جہاں سب گہری نیند سو رہے تھے۔

پھر اس نے سارے کنکر احتیاط سے اکٹھے کئے اور انھیں تکیے کے کونے کے نیچے رکھ دیا۔ چارپائی پر لیٹے لیٹے اس کی نگاہیں آسمان میں چمکتے ہوئے چاند کی طرف اٹھیں۔ اماوس سے کچھ دن پہلے کا چاند بڑی اداسی سے تاروں کی مدھم ہوتی ہوئی قندیلوں کو دیکھ رہا تھا جیسے انھیں جلتے رہنے کی تلقین کر رہا ہو۔ کچھ دیر کے بعد اس نے کروٹ لی۔ اس کا دایاں گال نرم تکیے پر ٹک گیا۔ اسے ایک ہلکی سی جانی پہچانی خوشبو آنے لگی جو اسے صندل کے درختوں میں گھومتے ہوئے آئی تھی۔ یہ صندل کی شاخیں اس کے تکیے پر کہاں سے آ گری تھیں؟

صندل کی شاخیں واقعی گری تھیں اس کے تکیے پر آج۔ مراری کے آنے تک مدھو کھلی چھت پر اکیلی بیٹھی رہی اور پھر جانے کیوں کچھ دیر کے لیے ابھی ابھی بچھائے ہوئے جتیندر کے بستر پر لیٹ گئی جیسے دیکھنا چاہتی ہو کہ یہ کہانیاں لکھنے والے کیسے بستر و

سوتے ہیں۔

بستر خوب نرم تھا۔

"جبھی تو انھیں اپنی نیند کا اتنا خیال رہتا ہے۔" وہ دھیرے سے بڑبڑائی اور بستر سے اٹھ کر چند لمحے کچھ سوچتی رہی اور چھت کے دوسرے حصے کی طرف جانے سے پہلے کنکروں کو جوڑ کر اپنا نام بنا گئی جتیندر کے بستر پہ۔ اور اسے چادر سے ڈھانپ دیا۔

"انھیں تو نیند آتی ہے، دوسروں کو تو جیسے ضرورت ہی نہیں سونے کی؛ جاگتے ہیں آدھی رات تک دروازہ کھولنے کو۔ بڑے خراب ہیں۔"

اس نے تکیے کو ڈھنگ سے رکھا تھا اور پھر سونے چلی گئی تھی۔

صندل کے جنگلوں میں بھٹکتا ہوا اس کا ذہن جانے کب تھک کر آخر سو گیا۔ جانے کیسے ایک بار اس کی آنکھ کھلی تو اُسے لگا کہ بھورے بھورے سانپ اس کے بستر کے قریب ہی لہرا کر پل بھر ہی کہیں غائب ہو گئے تھے۔ مدھو رات کے پچھلے پہر جاگی تھی اور دیکھنے آئی تھی کہ جتیندر ابھی تک سویا تھا یا نہیں۔ اس کی کھلی ہوئی لمبی چوٹیاں لہرا گئی تھیں۔ کھلی چھت پر بہتی ہوئی ہوا کی ہلکی ہلکی لہروں میں۔

جتیندر صبح دیر تک سویا رہا۔ مراری کب کا تیار ہو کر کام پر بھی جا چکا تھا۔ مدھو منہ ہاتھ دھو کر اور چائے کا پانی انگیٹھی پر رکھ کر راجو اور بلی کو جگانے چھت پر آئی تو جتیندر اب بھی سو رہا تھا۔ وہ جتیندر کی چارپائی کے قریب آ گئی۔

"اُٹھیے، رات تو کب کی بیت چکی۔"

جتیندر نے آنکھیں کھولیں۔ سورج نکل آیا تھا اور دھوپ چھت پہ آنے لگی تھی۔

"رات کس وقت آئے تھے آپ؟"

"بارہ بجے۔"

"بارہ بجے تک میں اپنے نوٹس لکھتی رہی تھی۔"

"تو پھر ایک بجا ہو گا۔"

"ایک بجے تک تو میں جاگ رہی تھی۔"

"تو پھر دو بجے ہوں گے۔" جتیندر نے کھینچ کر کہا۔

"کس نے کھولا تھا آپ کو دروازہ؟"

"مراری نے۔"

"میں نے تو انھیں دروازہ کھولنے سے منع کر دیا تھا۔"

"نیند میں کھول دیا ہو گا اُس نے۔" جتیندر نے جواب دیا۔

"رات نیند تو اچھی آئی تھی آپ کو؟"

مدھو کی بات سن کر جتیندر کو چادر کے نیچے بکھرے کنکروں کی بات یاد آ گئی۔

"ہاں تم نے بادام کے پھول جو بکھیر رکھے تھے میرے بستر پہ۔"

"بادام کے پھول!" مدھو نے حیرت سے مسکراتے ہوئے کہا اور اس کے دانتوں کی دھلی ہوئی کلیاں چمکنے لگیں۔

"بڑی مٹھاس تھی ان پھولوں میں۔"

"اچھا!"

جتیندر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"جب تم ٹریننگ ختم کر کے واپس آؤ گی تو تمہارا روپ بدل چکا ہوگا نا؟"

"کیوں؟"

"یہ نہیں جانتا، لیکن بادام کے پھول اسی طرح سنبھال کر رکھنا، شاید کسی کے کام آئیں۔"
جتیندر نے مسکراتی ہوئی مدھو کے خوبصورت دانتوں کو غور سے دیکھا اور تکیے کے نیچے رکھے کنکروں میں سے کچھ کنکر نکال کر اچھالنے لگا۔

"کسی کے لیے تو گلاب کے پھول بھی ہوں گے۔" مدھو نے یہ بات کہی تو اس کے گورے گالوں پر سرخی کے ڈورے دوڑ گئے، جیسے گلاب کے پھول مہک اٹھے ہوں۔

"گلاب کے پھول اور صندل کے جنگل اور لہراتے ہوئے سانپ ـــــ" جتیندر بہکا بہکا سا کچھ کہتا رہا۔ جب اس نے سر اٹھایا تو مدھو جا چکی تھی۔ وہ کیوں چلی گئی تھی، وہ سوچنے لگا۔

چھت پر دھوپ پھیل رہی تھی۔

راجو آیا تھا چھت پر۔

"زیدی نے تکیے کے نیچے رکھے پھول منگوائے ہیں۔"

"کیوں، وہ میں نے ایک دن گلدان میں سجانے کے لیے حفاظت سے رکھ لیے ہیں۔"

جتیندر چارپائی سے اٹھا۔ اس نے ایک بھرپور انگڑائی لی اور راجو کا ہاتھ تھامے چھت سے نیچے اتر گیا۔

زہے روانیٔ عمرے کہ در سفر گذرد

ڈاکٹر مختار الدین احمد، ایم۔ اے، ڈی فل (آکسن)

بغداد

۱۱ر اکتوبر سنہ ۵۳ء

صبح ۵ بجے بیدار ہوا۔ جنوبی افریقہ کے ایک صاحب جن سے KLM کے ہوائی جہاز پر ملاقات ہوئی تھی اور اب یہیں ہوٹل میں میرے ساتھ ٹھہرے ہوئے ہیں جاگ گئے تھے اور پلنگ پر بیٹھے ہوئے جمائیاں لے رہے تھے اور کہتے جاتے تھے: "بھائی صاحب! اب آپ کیوں نہیں اٹھ بیٹھتا! میں کوفی (کافی) منگاتا ہوں"۔ آخر انہوں نے ملازم کو بلوا کر 'کوفی' منگوا ہی لی۔ اور مجھے ناچار بستر چھوڑنا ہی پڑا۔ ٹھیک ½۶ بجے صبح کو "عراقی ایرویز" کی کار ہوٹل پہنچ گئی۔ پونے سات بجے صبح "مطار" (ہوائی اڈہ) پر پہنچ گیا۔ کسٹم کی چیکنگ کے لئے ابھی سامان رکھے ہی گئے تھے کہ اس اطلاع پر کہ آکسفورڈ تعلیم کے لئے جا رہا ہوں آفیسر نے حمال کو اشارہ کیا اور سامان لمحوں میں ٹھیلے پر جا کر ہوائی جہاز پر پہنچ گیا۔

ہوائی اڈے پر ہر جگہ انگریزی اور عربی کی تختیاں نظر آئیں۔ میں ان تختیوں کو غور سے پڑھتا رہا۔ کوئی شخص اگر ان ملکوں میں آجائے تو کچھ ہی دنوں میں عربی سمجھنے اور بولنے لگ جائے۔ پاسپورٹ انسپکٹر کے کمرے پر "مفوض جوازات السفر" ہال کمرے کے دروازے پر "لا یجوز دخول غیر المسافرین الی قاعة التفتیش" (صرف مسافروں کے لئے ہال میں داخلہ کی اجازت ہے) ٹیلیفون کی کھڑکی پر "یمکنک التکلم بالتلیفون من ھنا" (یہاں آپ ٹیلیفون کر سکتے ہیں) کی تختیاں لگی ہوئی ہیں۔ ہوائی جہاز کا بھی یہی حال ہے۔ نشست کے بائیں ہاتھ کے دستے پر ایک بٹن اس پر "الضیاء" (روشنی) لکھا ہوا ہے۔ بٹن دبایئے روشنی ہو جائے گی۔ دوسرے بٹن کے پاس "المضیفة" (HOSTESS) اور کھڑکی کے اوپر "مخرج اضافی" (EMERGENCY EXIT) لکھا ہوا ہے۔

میرے قریب ایک امریکی نوجوان بیٹھا ہے میرے ساتھ بیروت جا رہا ہے کہتا ہے یہاں عربی سیکھنے کے ارادے سے آیا ہوں۔ ویسے دلوں کا حال خدا کو معلوم۔ یہ ضرور ہے کہ اس نے اپنی نوٹ بک میں عربی کے بہت سے جملے لکھ رکھے ہیں اور انہیں کی مدد سے اپنا کام چلاتا ہے بعض عربی جملوں کو پڑھ نہیں سکتا تو وہاں پر انگلی رکھ کر دکھاتا ہے کہ لوگ اس کا مقصد سمجھ جائیں۔

جہاز روانہ ہوا تو دریچے کے قریب بیٹھ گیا۔ جہاز ابھی زیادہ بلند نہیں ہوا ہے۔ باہر کا منظر دیکھنے کے قابل ہے کھجور کے درختوں کی قطار اور مٹی کے مکانات کا دور تک سلسلہ پھیلا ہوا ہے مکانات بہت چھوٹے ہیں لیکن ان میں ترتیب و تنظیم کی وجہ سے ایک خاص حسن معلوم ہوتا ہے درمیان میں کسی شہر کی خوب صورت عمارتیں ملیں اور کچھ دیر کے بعد پھر کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اب جہاز بہت اونچا ہو چکا ہے حد نظر تک ریگستان ہی ریگستان ہے، کوئی دس منٹ ہو گئے اور اب تک یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ اب جہاز دس ہزار فٹ سے زیادہ بلند ہو چکا ہے ہوسٹس اعلان کرتی ہے کہ اب ہم لوگ سگریٹ

پی سکتے ہیں۔

ایک اور آفیسر کچھ فارم تقسیم کر رہا ہے ہمیں ان کی خانہ پُری کرنی ہے۔ وہی مشہور سوالات "رقم جواز السفر و نوعہٗ (پاسپورٹ کا نمبر اور قسم) مصدر الجواز (پاسپورٹ کہاں اشیو ہوا) اسباب السفر (سفر کا مقصد کیا ہے؟) قادم من ..... ذاہب الی ....." (کہاں سے آرہے ہیں اور کہاں جانے کا ارادہ ہے؟) الجنسیۃ (آپ کی قومیت کیا ہے؟)

پورے جہاز میں صرف آٹھ مسافر ہیں۔ KLM کے جس جہاز میں کراچی سے بغداد آیا تھا اس میں نشست کی پشت میں لکڑی کی بہت سبک سی "ٹرے" چھپی رہتی تھی اور جو چائے یا کھانے کے وقت نکال لی جاتی تھی۔ عراقی ایرویز کے اس جہاز میں یہ دلچسپ بات دیکھنے میں آئی کہ نشست کی پشت میں ایک چھوٹا سا مستطیل تختہ لٹک رہا ہے جب چاہا اسے کھینچ لیا چھوٹی سی ٹیبل تیار ہو گئی۔ امریکی تو زندہ دل ہوتے ہی ہیں۔ میرا امریکی دوست آگے کھینچ کر اس پر کہنی ٹیک کر ایک کتاب پڑھ رہا ہے۔ میں سوچتا ہوں یہ بات تو ٹھیک ہے میں نے کھانے کی ٹیبل کو لکھنے کی میز میں تبدیل کر لیا ہے اور جہاز کی تقسیم کی ہوئی اسٹیشنری پر کچھ خطوط لکھے اور اب ڈائری کی یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔

روکیفیلر فاؤنڈیشن کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر مسٹر گل پیٹرک کو سفر پر روانگی کی اطلاع دے دی۔ اور لکھ دیا کہ دہلی سے لندن تک ہوائی جہاز کے فرسٹ کلاس کا OPEN TICKET اور سفر خرچ کے لئے پانچ سو ڈالر مل گئے ہیں۔ ٹکٹ پر فاؤنڈیشن کے ڈھائی ہزار سے زائد خرچ ہو گئے۔ OPEN TICKET. کی قیمت ہمیشہ زیادہ ہوتی ہے اس میں راستے کے سارے مقامات پر مسافر جب چاہے اتر جائے اور جب چاہے کسی جہاز میں سوار ہو کر سفر کرنا شروع کر دے اس طرح مجھے شرق اوسط کے مختلف ممالک بغداد، دمشق، بیروت اور قاہرہ میں کچھ دن ٹھہرنے اور وہاں کے علماء اور ادیبوں سے مستفید ہونے کے مواقع مل جائیں گے۔ ڈاکٹر واٹسن نے ٹکٹ بھی ٹورسٹ کلاس کے بجائے فرسٹ کلاس کا دلوایا ہے حالانکہ اس تکلف کی ضرورت نہیں۔ ٹورسٹ کلاس بھی اچھا خاصا آرام دہ ہے۔

اب ڈاکٹر عبدالعلیم اور پروفیسر گب کو بھی مختصر سے خطوط لکھ دیئے۔

یہ ریگستان تو بڑا وسیع ہے ایک گھنٹہ ہو گیا اور ریگستان ختم ہونے کو نہیں آیا۔ اس درمیان میں صبح کی چائے آئی اور ناشتہ تقسیم ہوتا رہا — خوب صورت ڈبوں میں انگور، کھجور، جام لگے ہوئے ٹوسٹ، پنیر، پرندوں کے گوشت کے سینڈوچیں، مکھن لگے بسکٹ، اور پتا نہیں کیا کیا۔ کاغذ کے پیالوں اور کاغذ کی نیپکن (دستر خوان) پر س خ ج ع کے خوب صورت مونوگرام بنے ہوئے ہیں۔ خ ج ع تو الخطوط الجویۃ العراقیہ یعنی IRAQI AIRWAYS ہوا لیکن پتا نہیں یہ "س"، کیا ہے؟

لندن

۱۹ر اکتوبر ۵۳ء

لندن میں دو دن کے قیام کے بعد آج اوکسفورڈ روانہ ہو رہا ہوں۔ دل تمناؤں اور خوشیوں سے معمور ہے۔

میں مشرق میں بھی "آدابِ سحر خیزی" سے واقف نہیں اور یہ تو مغرب ہی ہے لیکن پچھلے دو دنوں کے برخلاف آج بہت سویرے جاگ اٹھا دریچے کے پاس آکر پردہ کھینچا تو پورا لندن دھند کی سیاہ چادر میں لپٹا ہوا نظر آیا۔ ہر طرف کہر ہی کہر تھی۔ پتہ نہیں یہ دودھ والے اور اخبار کے ہاکر اس تاریکی میں کس طرح اپنا کام کر جاتے ہیں۔

رات پھر ٹھنڈک رہی۔ کمرا گرم کرنے کا کوئی معقول انتظام نہ تھا۔ حیرت ہے اس کمرے میں اور اس مختصر بستر پر کوئی کس طرح گذر کر سکتا ہے۔ مغنی صاحب جب اس مکان میں پہلے دن مجھے لائے اور مالکہ مکان نے جو ایک پولش خاتون ہیں بتایا کہ یہاں ایک کمرہ خالی ہے، جس میں عرصہ تک ایک مشہور افسانہ نگار رہ چکی ہیں۔ تو میں نے کمرہ دیکھنے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی اور رہنے کی حامی بھر لی۔ یہ کمرا مکان کی سب سے اوپر والی منزل میں تھا۔ میں نے سوچا کہ اچھا ہی ہوگا۔ اب دیکھنا کیا! سامان مغنی صاحب کے یہاں تھا۔ صرف آ کر رات کو سو جانا تھا۔ چنانچہ معاملہ کر کے ہم لوگ فوراً باہر چلے گئے۔ رات میں جو کچھ گذری اس کی داستان طویل ہے۔ مختصر یہ کہ اگر ڈاکٹر ملک اپنے کمبل اور الیکٹرک ہیٹر نہ رکھ جاتے تو دوسرے دن آکسفورڈ کے کسی کالج کے بجائے میں ووکنگ مسجد کے پرسکون احاطے میں کسی درخت کی چھاؤں میں ابدی نیند سوتا ہوتا۔

آج صبح کی چائے پر مشرف الحق صاحب سے جو ان پولش خاتون کے شوہر اور مشہور شاعر شان الحق حقی صاحب کے بھائی ہیں ملاقات رہی۔ حبیب الرحمٰن صاحب علی گڑھ میں ان کا ذکر کر چکے تھے کچھ بے پروا اور بوہیمین قسم کے آدمی محسوس ہوئے لیکن ہیں بڑے خوش گفتار اور خوش اخلاق، بے تکلف اور بڑے بے ساختہ انگریزی اچھی بولتے ہیں اور شعر بھی کہتے ہیں۔ ابھی تک انہوں نے غالباً اپنی شہریت تبدیل نہیں کرائی ہے اور فی الحال پاکستانی ہی ہیں۔ اسی مناسبت سے انہوں نے پاکستان کا قومی ترانہ بھی لکھا تھا۔ ان کی شاعری کے متعلق اوروں کی رائے مجھے معلوم نہیں لیکن ان کی خود اپنی رائے خاصی اونچی ہے۔ پاکستان سے ناراض تھے بولے ان لوگوں نے میرے ترانے کے بجائے حفیظ جالندھری کے ترانے کو قومی ترانہ مان لیا ہے۔ میں ان کے خلاف ایک مضمون لکھوں گا اور ان کے ترانے پر تنقید بھی کروں گا۔ میں نے دیکھا بات طول پکڑ رہی ہے مجھے ابھی کئی کام کرنے ہیں اور پھر آکسفورڈ کی ٹرین پکڑنی ہے۔ میں نرمی سے بولا۔ آپ بھی اپنی طاقت کہاں خرچ کر رہے ہیں۔ حفیظ جالندھری پر مضمون لکھئے گا۔ اقبال زندہ ہوتے تو ایک بات بھی تھی...... آدمی بہت ذہین ہیں یا تو بات پا گئے یا پھر اس رشتے سے کہ میں ان کا ایک طرح مہمان تھا طرح دے گئے اور بات ختم ہو گئی۔ چائے کے ختم ہونے تک جو مزید وقت بچا وہ انہوں نے اپنی اس تحقیق کے نتائج بیان کرنے میں صرف کیا کہ لندن میں سب سے قدیم Pub (شراب خانہ) کون سا ہے اور انگلستان کے ادیبوں اور شاعروں اور دانش وروں کے پسندیدہ شراب خانے کون کون سے تھے اور خود موصوف نے کن کن مقامات مقدسہ کی زیارت کی ہے اور کن کن فن کاروں اور ادیبوں کے ساتھ۔ اس سلسلے میں ان کے معلومات بڑے بے پناہ تھے۔

چائے ختم کر کے اور مسز حق کی (جن کا پولش نام اس وقت مجھے یاد نہیں) مہربانی اور میزبانی کا شکریہ ادا کر کے میں دوسری منزل پر ساجد علیخان صاحب، راز مراد آبادی کے فلیٹ میں پہنچا۔ اطلاع ملتے ہی ڈرائنگ روم میں (جسے وہ بار بار دیوان خانہ کہتے تھے) آ گئے۔ انگلستان کا انہوں نے کوئی اثر نہیں لیا تھا۔ اسی طرح کرتے پاجامے میں بستر سے نکل کر آ گئے۔ بہت دن کے بعد ملاقات ہوئی تھی باتیں شروع ہو گئیں۔ علی گڑھ، ڈاکٹر ذاکر حسین، اردو ادب، قرۃ العین حیدر، پاکستان، BBC، خواجہ فیروز حسین، ناظم الدین، سبھوں کا ذکر آیا۔ عندلیب شادانی سے خفا نظر آئے اور جگر مراد آبادی کے بڑے مداح۔ جگر پر ایک کتاب لکھنی چاہتے تھے پرانے علیگڑین ہیں۔ ایک خاص قسم کی لیکن بے ضرر سی گالی ہر وقت بلا ارادہ استعمال کرتے رہتے ہیں واللہ معاف کرے۔ ان کا سخن تکیہ ہے۔ علی گڑھ سے بہت مختلف نظر آئے۔ کہتے ہیں اب میں نے اپنے کو بہت ٹھیک کر لیا ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے یہ کیا اپنے کو ٹھیک کرتے ان کی بیگم انہیں راہ راست پر لے آئی ہیں۔ کھانے پینے میں بھی بڑے مشرقی ہیں یہاں کی غذا بالکل پسند نہیں بی بی سی کے انگریز دوستوں سے کہتے ہیں تمہاری غذا بھی کوئی غذا ہے یہ تو نوٹ لاموٹ ہے گھر پر چپاتی اور قورمہ پکواتے ہیں۔ ذبیحہ کا بڑا خیال ہے انہیں۔ یہودیوں کی دکان سے بلکہ زیادہ تر ایک حبشی مسلمان رمضان کے یہاں سے گوشت منگواتے ہیں۔ اللہ کی شان! اسی مکان میں ایک طرف مشرف جیسا رند لاابالی اور دوسری طرف راز صاحب جیسا حامل لوائے شریعت ایک چھت کے نیچے پوری دو دنیائیں آباد ہیں۔

ابھی سوتے سے جاگے تھے۔ اس لیے شعر سنانے کے موڈ میں نہ تھے۔ ادبی تحریکوں کا ذکر ہوا تو موڈ بن گیا کچھ تازہ شعر سنائے پھر بیگم کو بلایا اور ملاقات کرائی۔ بڑے مضبوط ارادے کی خاتون نظر آئیں۔ ان کے بچے طارق کو دیکھا چائے پی، پان بھی کھایا۔ لندن میں اور پان اللہ کی شان۔ رازق العباد بھی اپنے نیک بندوں کو کہاں کہاں سے رزق بہم پہنچاتا ہے۔

دیر ہو چکی تھی۔ ٹیکسی لی اور سیدھا انڈیا ہاؤس پہنچا۔ وہاں تعلیمات کے مشیر KNASTER سے ملا۔ بہت اخلاق سے ملے اور بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اوکسفورڈ کے بعض پروفیسروں کے نام ذاتی خطوط دیئے پھر انہوں نے مسٹر ناگ سے ملایا ان کے پاس میرے سلسلے کی پوری فائل موجود تھی ۹ پمبروک اسٹریٹ میں MRS. PENNY نام کی کوئی خاتون ہیں ان کے مکان میں میرے قیام کا انتظام انہوں نے کیا ہے۔ نیسٹر صاحب نے ازراہ کرم ایک کاغذ پر لینڈ لیڈی اور مکان کا نمبر، لندن سے آکسفورڈ کی ٹرینوں کے اوقات اور شرح کرایہ بھی لکھ دیا مکان کا کرایہ ہفتہ وار ۳ گنی ہے اور لندن سے اوکسفورڈ کا کرایہ ۹ شلنگ ہم پنس۔

وکٹوریہ اسٹیشن پر میں نے اور مغنی صاحب نے لنچ لیا۔ ۹½ شلنگ خرچ ہوئے۔ طشتری میں ۶ پنی واپس آئی وہ ویٹرس کے حوالے کی ابھی قیمتوں کا مجھے اندازہ نہیں اس لئے زیادہ خرچ ہو رہا ہے۔ ٹرین آئی تو فرسٹ کلاس بہت سے نظر آئے، تھرڈ کلاس کسی ڈبے پر لکھا ہوا نہیں ملا۔ خیر ایک ڈبے میں آ گئے معلوم تھا کہ تھرڈ کلاس ہی ہے، عافیت و آرام کے لحاظ سے ہمارے فرسٹ کلاس سے بہتر۔

میرا ہم سفر ایک کم سن انگریز لڑکا ہے۔ بالکل خموش۔ ایک آدھ بات کبھی اس سے کی لیکن بات کچھ آگے نہیں چلی۔ وہ بھی بے چارہ اپنی عادت سے مجبور ہے کیا کرے! انگریز بہت خاموش قوم ہے۔ اس کی رگوں کا لہو ٹھنڈا ہی رہتا ہے نہ گرم ہوتا ہے نہ بے کار جوش مارتا ہے لندن کے بڑے سے بڑے بازار سے گذرا، عظیم الشان اسٹور دیکھے، سینما کے پاس سے گذرا، اسکولوں اور کالجوں کو دیکھا۔ کہیں غل غپاڑا ہوتا نہیں دیکھا۔ ان کی بھیڑ میں بھی ایک تنظیم ہے۔ ہر شخص اپنی جگہ اطمینان سے کام میں مصروف ہے۔ مشغول، خموش اور مطمئن۔ انہیں کتنی ہی بڑی سے بڑی اور کیسی ہی بری سے بری خبر سنا دیجئے کیا مجال جو ذرا بھی ان میں انتشار آپ دیکھیں، ویسے ہی ساکت و صامت اور مطمئن بیٹھے رہیں گے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

ایک صاحب ابھی ٹکٹ دیکھ گئے۔ خواہ مخواہ زحمت فرمائی۔ پوری ٹرین میں ایک شخص بھی بغیر ٹکٹ کے نہ ہوگا۔ ہندوستان کے T. C یہاں آ جائیں تو بڑی مایوسی ہو سارے ذرائع آمدنی یک لخت بند۔ دوسرے صاحب ابھی چائے کو پوچھ گئے تھے منٹوں میں لے آئے۔ میں نے چائے پیالے میں انڈیلی اور ایک سگریٹ سلگا لی۔ ریسٹران اسسٹنٹ جب بل لے کے آیا تو اس نے مجھے دیکھا۔ پیسے لیے اور شکریہ ادا کر کے چلا گیا۔ بولا کچھ نہیں۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کہیں کوئی بات ایسی ہوئی ہے جو ہونی نہیں چاہئے تھی۔ اتفاق سے دریچے پر نگاہ پڑی تو معلوم ہوا یہ ڈبہ NON-SMOKERS کا تھا۔ سگریٹ پینے والوں کے لئے علیحدہ کمپارٹمنٹ ہوتے ہیں۔ میں یہاں بیٹھا تھا تو مجھے یہاں سگریٹ نہ پینی چاہئے تھی۔ بیرا تو کیا کہتا لیکن میرے نوجوان رفیق سفر نے بھی میری آزادی میں مخل ہونا پسند نہ کیا اور خاموش رہے۔ یہاں فرد اور اس کی خواہشوں کا احترام کرنا سکھایا جاتا ہے۔

علاقہ خوبصورت معلوم ہوتا ہے لیکن ابر و باراں نے حلیہ ہی بدل ڈالا ہے دونوں طرف سر سبز کھیت ہیں۔ کبھی کبھی کچھ مکانات بھی آ جاتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے لیکن صاف ستھرے، یہ اندر سے بڑے آرام دہ ہوں گے۔

گاڑی کی رفتار سست پڑ گئی۔ آکسفورڈ کا اسٹیشن اب کوئی دو منٹ میں آ جائے گا۔ شوق کی پہلی منزل ختم ہوئی۔ دوسری سامنے ہے۔

اکسفورڈ

۱۲؍مئی ؁۵۴ء

یہاں کے میدان کس قدر شاداب، سبزہ کیسا خوب صورت اور پھول کتنے حسین ہیں۔ درختوں میں پھول ہی پھول ہیں۔ ہر طرح کے پھول، سفید پھول، سرخ پھول، گلابی پھول، زرد پھول، کیاریوں میں جو بیل بوٹے ہیں ان کا حسن اور بھی جاذبِ نظر ہے۔

میرے کالج سے سو قدم کے فاصلے پر کرائسٹ چرچ کا عظیم الشان کالج ہے اور وہاں کے پھول اس موسم میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ میں یہاں سے بیٹھا ہوا دیکھ رہا ہوں اور محظوظ ہو رہا ہوں۔ یہ پھول کیسے چمک رہے ہیں کس طرح دمک رہے ہیں کس قدر لطافت اور حسن رکھتے ہیں اور کیسا سرور اور تازگی بخش رہے ہیں۔

لوگ زندگی سے تھک کر، حالات سے عاجز آکر، ناکامیوں سے مایوس ہو کر خودکشی کیوں کر لیتے ہیں۔ اس موسم میں فطرت کا حسن کیوں نہیں دیکھتے سورج کی چمک، رات کے سکون، دن کے اجالے اور شب ماہتاب سے لطف اندوز کیوں نہیں ہوتے؟ آکسفورڈ آکر 'ISIS' اور 'CHERWELL' میں کشتی رانی کے مناظر سے محظوظ کیوں نہیں ہوتے! ان سبزوں کے دونوں طرف بیٹھنے والوں اور زندگی سے لطف اندوز ہونے والوں کو ایک نظر کیوں نہیں دیکھتے اور خودکشی سے پہلے کرائسٹ چرچ کے سبزہ زار اور ان گنت رنگوں کے حسین زرین لہلہاتے پھولوں کی سیر کیوں نہیں کر لیتے۔ آئسس خوب صورت جھیل میں حسین سفید بطخوں کے پروں، ماڈلین کے ڈیر پارک میں ہرنیوں کے قافلوں، ٹرنٹی کے شاداب میدانوں اور کرائسٹ چرچ کے سبزہ زار اور دلکش پھولوں کو دیکھ کر دل میں زندہ رہنے کی خواہش، کام کرنے کا شوق اور مناظرِ فطرت سے شاد کام ہونے کی امنگ اور حوصلہ کس درجہ بڑھ جاتا ہے۔

اکسفورڈ

۱۵؍جون ؁۵۴ء

سمرسٹ مام کی مشہور تصنیف MOON AND SIXPENSE کا DE - LUXE ایڈیشن جو بڑے اہتمام سے شائع ہونے والا تھا اس ہفتہ بازار میں آگیا۔ کتاب کیا ہے "مرقعِ چغتائی" ہے۔ یہ ایڈیشن بڑے اہتمام سے نکلا ہے اور کچھ نسخوں پر مصنف کے دستخط بھی ہیں۔ آج بلیک ول میں خاصی بھیڑ تھی اور اس ایڈیشن کی بڑی مانگ تھی۔

یہ سمرسٹ مام وہی ہیں جن کی پہلی تصنیف LIZA OF LAMBETH شائع کرتے وقت ناشرین FISHER UNWIN بڑے متردد تھے کہ کتاب چھاپ تو دیں لیکن کوئی اسے خریدے گا بھی؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا چھاپنا خسارے کا باعث ہو، بہرحال انہوں نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے ازراہِ احتیاط اس کتاب کے تھوڑے سے نسخے چھاپے تاکہ نقصان بھی ہو تو زیادہ نہ ہو۔ یہ ۱۸۹۷ء کی بات تھی۔ اب اسی کتاب کا یہی ایڈیشن بلیک ول کے شوکیس میں بڑے اہتمام سے رکھا ہوا ہے اور اس کی قیمت دس گنی ہے اور اسی مصنف کی دوسری کتاب کا DE. LUXE ایڈیشن چھپا ہے جس کے خریدنے کے لئے یہاں ایک بھیڑ لگی ہوئی ہے۔

کیمبرج

۲؍اگست ؁۵۴ء

اوکسفورڈ مجلس اور برٹش کونسل کے زیرِ اہتمام کئی بار طلبا کیمبرج گئے لیکن کسی نہ کسی وجہ سے میں شریک نہ ہو سکا، آج تنہا کیمبرج جا رہا ہوں۔

اسٹیشن پہنچا تو ٹرین کے چھوٹنے کا وقت ہو چکا تھا۔ گیارہ شلنگ چھ پنس کو کیمبرج کا ٹکٹ خریدا اور سامنے کے ایک ڈبہ میں سوار ہو گیا۔

میں نے ٹکٹ تھرڈ کلاس کا لیا ہے (یہاں دو ہی درجے ہیں فرسٹ اور تھرڈ) لیکن ڈبے ایسے آرام دہ اور پرتکلف کہ پتا نہیں چلتا کون تھرڈ ہے کون فرسٹ۔ یہاں ڈبے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔ انگریز زندگی کی ساری عادات و خصائل میں ڈھکا چھپا رہتا ہے۔ اس کی ہر چیز ڈھکی چھپی ہونی چاہئے۔ لمبے ڈبوں میں پرائیویسی نہیں ہوتی اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم بازار میں بیٹھے ہیں۔ ہندوستان کے تھرڈ کلاس کے ڈبے یاد کیجئے۔ لوگوں کا ایک ہجوم ہے۔ بھانت بھانت کے لوگ جمع ہیں۔ کوئی اونگھ رہا ہے، کوئی سو رہا ہے۔ ایک صاحب کھانا تناول فرما رہے ہیں۔ دوسری طرف پان لگ رہے ہیں۔ ایک کونے میں تاش کھیلا جا رہا ہے تو دوسری طرف سیاسیات پر زور و شور سے گفتگو ہو رہی ہے۔ کوئی ہانپ رہا ہے کوئی جماہیاں لے رہا ہے۔ آپ کسی لڑکی کو دیکھ رہے ہیں۔ لڑکی والا آپ کا سوٹ کیس تاک رہا ہے۔ اب بتائیے پرائیویسی کہاں رہی۔ عشق کرنے اور شعر سوچنے کا بھی موقع نہیں ملتا۔

میں جب یہاں آیا تو صرف ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ کچھ دیر کے بعد ایک صاحب آئے۔ اب ایک صاحب اور آ گئے ہیں۔ دونوں دو مختلف کناروں پر بیٹھے ہیں۔ اور اپنے اپنے اخبار پڑھ رہے ہیں۔ لڑکی ہاتھ کے سفید دستانے بن رہی ہے۔ اب اس نے مکمل کر لیا اور ہاتھ میں پہن کر اس نے داد طلب نظروں سے دیکھا۔ میں کچھ اس طرح مسکرایا جیسے کہہ رہا ہوں خوب ہے۔

لڑکی ایک گاؤں میں اتر گئی۔ گاؤں کے چھوٹے چھوٹے اسٹیشن بھی کس قدر خوب صورت ہوتے ہیں اور ان کے گاؤں کتنے پرکیف ہیں۔

ابھی کوریڈور سے گزر کے پلیٹ فارم پر اترا تو دیکھا اکثر ڈبے خالی ہیں اور بعض میں ایک دو مسافر ہیں۔ درجہ اوّل عام طور پر خالی ہے۔ یہاں کوئی صاحب درجۂ اوّل میں سفر کرتے ہیں خصوصاً یونیورسٹی کے طلباء تو لوگ بڑے شبہے کی نظر سے انہیں دیکھتے ہیں کہ خیریت تو ہے۔ ان کی طبیعت زیادہ ناساز تو نہیں۔ جیسے درجہ اوّل صرف بنکرز، ڈائریکٹرز، وزراء اور مریضوں کے لئے مخصوص ہے۔

قلم کی سیاہی ختم ہو چلی تھی میں گھبرا رہا تھا کہ یہ ڈائری نامکمل رہ جائے گی اس لئے کہ ممکن ہے کیمبرج پہنچ کر موقع نہ ملے۔ اور ٹرین میں تو ظاہر ہے کہ کوئی کام نہیں۔ ابھی سوٹ کیس میں تلاش کیا، تو سیاہی کی بوتل مل گئی۔ ٹرین اب تک یہاں کھڑی ہے۔ دو ایکسپریس ٹرینیں گزر چکی ہیں ممکن ہے کسی تیسری کا انتظار ہو۔ سامنے نہایت خوب صورت کوچ کھڑی ہے۔ غالباً کسی قصبہ کو جاتی ہے۔ لاؤڈ اسپیکر اب بھی اعلانات نشر کر رہا ہے میرے دونوں ہم سفر یہاں اتر گئے ہیں۔ اب ڈبے میں میں تنہا ہوں اور تین کبل کے تختے ——— ان چار تصویریں بھی ہیں۔ سب ٹرینوں اور اسٹیشنوں کی۔ ماضی اور تاریخ سے اس قوم کی محبت دیکھئے۔ چاروں تصویریں قدیم ہیں ایک کا عنوان ہے "سفر ۱۸۴۴ء میں"۔ ڈربی کا قدیم اسٹیشن، نورتھ مڈلینڈ ریلوے۔ کچھ مسافر کھڑے ہیں سب پرانے لباس میں ہیں۔ دوسری تصویر ایک ٹرین کی ہے، مختصر سا انجن ہے۔ ڈرائیور صاحب کھڑے ہیں انجن پر کوئی چھت بھی نہیں پتا نہیں بارش میں کیا کرتے ہوں گے۔ یہ لوگ اور کہاں سر چھپاتے ہوں گے۔ ان کے پیچھے ایک ڈبے میں کوئلے کا ذخیرہ ہے اور اس سے پیچھے ٹرین کے ڈبے جن میں مسافر بیٹھے ہیں۔ اس کا عنوان ہے "سفر ۱۸۵۵ء میں" تیسری تصویر ۱۸۸۰ء کی ہے۔ اب ٹرین کی شکل و صورت بہت حد تک بدل گئی ہے۔ چوتھی تصویر ۱۹۱۵ء کی ہے۔ ایک قصبہ کے پلیٹ فارم پر گاڑی کھڑی ہے، دو مسافر کھڑے ہوئے ہیں۔ دودھ کے دو بڑے پیپے بھی پلیٹ فارم کی دوسری جانب رکھے ہوئے ہیں۔

ہاں میں یہ لکھنا بھول گیا کہ تھرڈ کے ان ڈبوں میں HEAT REGULATORS بھی نشست کے پاس لگے ہیں کہ جس قدر اور جس طرح چاہیئے کمرہ گرم کر لیجئے۔ آج تو خیر موسم معتدل ہے دھوپ نہیں لیکن دن گرم ہے۔ ٹھہرئیے اخبار دیکھ کر درجۂ حرارت بتاتا ہوں۔ لیجئے صاحب! اس اخبار میں تو کہیں درجۂ حرارت کا ذکر ہی نہیں۔ تمام عورتوں کی تصویریں چھاپ رکھی ہیں اور تصویریں بھی کیسی!

ٹرین ابھی چلنے نہ پائی تھی کہ ایک شخص پکار گیا کہ یہ ٹرین کیمبرج جا رہی ہے۔ مبادا کوئی غلطی سے بیٹھ گیا ہو۔ ٹرین چلی تو دوسرا شخص ہر ڈبے میں آکر پوچھ گیا کہ کچھ کھانے پینے کو تو نہیں چاہیئے۔ عام طور پر لوگ لیمونیڈ وغیرہ پیتے ہیں۔ تعجب نہیں سگرٹیں بھی ٹرین پر مل جاتی ہوں کوریڈر کی وجہ سے یہ بڑی آسانی ہے۔ کہ آپ بیسوں ڈبے سے گذر جاسکتے ہیں اندر ہی اندر، پلیٹ فارم پر اترنے کی ضرورت نہیں اور نہ ٹرین کا قیام شرط ہے ٹرین چل رہی ہے آپ بھی چل رہے ہیں۔

انگریز اخبار پڑھنے کا بڑا پابند ہے۔ ٹرین میں تو اخبار، خیر سے ہمارے ہاں بھی لوگ پڑھ لیتے ہیں یہ دوسری بات ہے کہ خریدتا ایک ہے پڑھتے سارے مسافر ہیں۔ یہاں یہ بات سخت معیوب ہے کوئی شخص کبھی اخبار یا رسالہ مانگ کر نہیں پڑھتا، خود خریدتا ہے اور پڑھتا ہے نہیں خریدتا ہے تو کھڑکی سے خوب صورت مناظر دیکھتا ہے یا عشق کرتا ہے یہ بھی نہیں تو اونگھتا ہے یا جھک مارتا ہے لیکن اخبار کبھی نہیں پڑھتا۔

تو جناب ٹرین جب بلیشلی اسٹیشن پر پہونچی تو سارے اچھے اخبار بک چکے تھے اور میری قسمت میں REVEILLE رہ گیا تھا۔ یہ ہفتہ میں دو بار شائع ہوتا ہے اور ڈھائی پنس اس کی قیمت ہے۔ ہمارے یہاں کے 'لطفِ شباب' اور 'بیسویں صدی' کے ہم پلہ ہے فرق یہ ہے وہ رسالے ہیں اور یہ اخبار۔ خوب خوب تصویریں چھپتی ہیں، خوب خوب لطیفے شائع ہوتے ہیں۔ اور طرح طرح کی چٹ پٹی چیزیں اس میں نکلتی رہتی ہیں۔ اور یہ یہاں کا بڑا پاپولر اخبار ہے۔

صاحب! یہ ٹرین تو بلیشلی سے نکلنے کا نام نہیں لیتی۔ تین ٹرینیں گذر چکی ہیں اور پتا نہیں کہاں سے کہاں پہنچ گئیں لیکن یہ جوں توں اپنی جگہ پر موجود ہے یہ ٹرین کیا ہے ہمارے دوست کا تحقیقی مقالہ ہے جو خلیل الرحمٰن اعظمی کے قول کے مطابق مرہٹوں کی تاریخ میں اب تک الجھا ہوا ہے ـــــ لیکن صاحب مرہٹوں کے نام میں بڑا جادو ہے۔ ابھی بہ مشکل یہ لفظ لکھ پایا تھا کہ ٹرین چل کھڑی ہوئی اب اس میں تین نوجوان آگئے ہیں۔ تینوں کیمبرج جا رہے ہیں لیکن یہ لوگ طالب علم سے زیادہ سیاح معلوم ہوتے ہیں۔ ایک چپ چاپ ہے، غیر متحرک، ساکت اور حیران۔ دوسرا ایک جاسوسی ناول 'ٹرین میں قتل' (حسنِ انتخاب کی داد دیجئے) پڑھ رہا ہے۔ تیسرا لگاتار سیٹی بجا رہا ہے اور گراموفون ریکارڈ پرکھ رہا ہے۔

اب ٹرین وسیع اور سرسبز و شاداب میدانوں سے گذر رہی ہے۔ دونوں طرف سبزہ ہی سبزہ ہے اسٹیشنوں کے قریب کچھ آبادی نظر آجاتی ہے یہ چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں اور بہت خوب صورت۔ یہاں بھی انہیں ساری دلچسپیاں اور آسانیاں کم و بیش شہر کی سی حاصل ہیں۔ گیس کا چولھا، ریڈیو، ٹیلی وژن، اب اور کیا چاہیئے۔

کیمبرج کا اسٹیشن بہت چھوٹا سا ہے۔ ہمارے علی گڑھ کا اسٹیشن تو اس کے مقابلے میں بہت شاندار ہے۔ باہر نکلا تو معلوم ہوا کہ یونیورسٹی جانے کے لئے مجھے اسٹیشن ہی پر بس نمبر ۱۰۱ مل جائے گی آگے چل کر بس نمبر ۱۰۲ بدل لینی ہے میں پوچھنے کو تھا کہ '۱۰۱' اور '۱۰۲ کیوں'، اور '۲ کیوں نہیں آخر یہ سو نمبر تک کی بسیں کہاں ہیں'۔ لیکن انگریز اکثر خاموش رہتا ہے اور آپ سے بھی خاموش رہنے کی توقع کرتا ہے اس لئے میں نے خموشی ہی میں نجات سمجھی۔ میں بس نمبر ۱۰۱ میں آکر اوپر کی منزل پر بیٹھ گیا ہوں تاکہ شہر اچھی طرح دیکھ سکوں میں یہاں تنہا ہوں نہ کوئی مسافر ہے نہ مسافر نواز، ڈرائیور سامنے کی دکان میں چائے پی رہا ہے اور بھی لوگ۔ اسی قماش کے وہاں موجود ہیں۔ بالکل ہندوستان کے کسی قصبہ کی بس کا لطف ہے شاد عارفی کی نظم کے بعض بند یاد آ رہے ہیں دھوپ خوب پھیلی ہوئی ہے شہر چھوٹا ہے لیکن اچھا خاصا معلوم ہوتا ہے بھیڑ زیادہ نہیں اور ہو بھی تو آپ کو تکلیف نہ ہوگی ہر شخص اپنی جگہ پر بیٹھے گا جگہ نہیں تو کھڑا رہیگا آپ پر بیٹھنے کی ہرگز کوشش نہیں کرے گا۔

لیجئے صاحب JESUS GREEN تو آ گئی۔ یہ جیزس کالج کے پاس کا علاقہ ہے سامنے میدان ہے اور سرسبز و شاداب اسی لیے یہ نام پڑ گیا ہے۔ مجھے ' MAIDS CAUSWAY ' جانا ہے جہاں ۶۶ نمبر کے مکان میں میرے ایک پاکستانی دوست ٹھہرے ہوئے ہیں۔ گھنٹی بجائی تو مکان کے نیچے سے ایک عورت نکل کر آئی۔ ہمارے ہاں لوگ اوپر کی منزل سے جھانکتے ہیں اور وہیں سے باتیں کرتے ہیں۔ اور رومیو جیولٹ کا منظر پیش ہو جاتا ہے یہاں مالکہ مکان زمین دوز کمرے سے نکلتی ہے اور دروازہ کھول کر وہیں سے بات کرتی ہے بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ اس قوم کی ایک تہائی آبادی زمین دوز حصوں میں رہتی ہے۔

کیمبرج
۳؍ اگست ۵۴ء

میں نے ایک ہفتہ کے لئے ۱۲ نمبر کے مکان میں ایک کمرہ لے لیا ہے یہ زیادہ وسیع نہیں لیکن بہت پر تکلف ہے اور قدیم فرنیچر سے آراستہ مکان کی کئی منزلیں ہیں اور مختلف اصحاب اس میں رہتے ہیں۔ طالب علم، فن کار، سیاست دان، سیاح سبھی موجود ہیں۔ لینڈ لیڈی کوئی چالیس سال کی ہوگی۔ لیکن سعدی کی طرح مزاج میں طفلی اور شوخی اب بھی باقی ہے خوب باتیں کرتی ہے شوخ رنگ کے کپڑے پہنتی ہے گہری لپ اسٹک لگاتی ہے اور امریکی سگریٹیں پیتی ہے بہت مہذب ہے اور بہت فہمیدہ۔

صبح ناشتے کے کمرے میں اور اصحاب سے بھی ملاقات ہوئی۔ ایک جرمن پروفیسر سے ملا، پندرہ سال ہوئے جرمن چھوڑ کر یہیں بس گئے ہیں یونیورسٹی میں استاد ہیں اور بائیوکیمسٹری میں ریسرچ کرتے ہیں، بڑے ہنس مکھ اور بے حد دلچسپ، ناشتہ بے پناہ طور پر کرتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں انگریز صبح کی چائے بہت بھرپور پیتے ہیں۔ اور ناشتہ بہت زوردار کرتے ہیں لیکن یہ خدا کا بندہ اس پر بھی بس نہیں کرتا۔ ان کے لئے کچھ اور بھی چیزیں میز پر موجود تھیں پہلے تو ہم لوگوں نے دودھ اور کورن فلیک کھایا، اس کے بعد دو انڈے نیم بریاں، پھر تین ٹوسٹ ٹماٹر کی قاشوں کے ساتھ، پھر ایک دو ٹوسٹ مکھن جام لگا کر کھائے، کافی پی، یہاں تک تو میں بمشکل موصوف کا ساتھ دے سکا۔ اب انہوں نے بیکن تناول فرمایا چٹنی کے ساتھ، پھر ٹھنڈے گوشت کے قتلے بسکٹ کے ساتھ اس کے بعد ایک قدح پھلوں کا رس پی گئے اور اس درمیان میں دو تین پیالیاں کافی کی۔

میں نے سمجھا مصروف آدمی ہیں ممکن ہے لنچ کے لئے وقت نہ ملتا ہو اور اس طرح ناشتہ اور لنچ ساتھ ہی کھا لیتے ہوں۔ میں نے پوچھا۔ آپ کو لنچ کا وقت تو مشکل ہی سے ملتا ہوگا؟ اس لہجے میں انہوں نے جواب دیا جیسے وہ کہہ رہے ہیں: بھئی قوم کے لئے کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا ہے' بولے نہیں صاحب! وقت تو نکالنا ہی پڑتا ہے۔ میں نے کہا کہیں کالج کے پاس ہی سینڈوچیں مل جاتی ہوں گی۔ بولے، جی نہیں! جی نہیں!! ان میں کچھ حرارے مکمل طور پر نہیں ملتے، اور سینڈوچ کھا کر میں کام کرنے کا قائل نہیں۔ اس لئے میں یہیں آ کر لنچ لیتا ہوں۔ لینڈ لیڈی میری مرغوب غذا جانتی ہے۔ ڈنر کے ذکر میں انہوں نے بڑے اعتماد اور رازدارانہ لب و لہجہ میں کہا۔ رات کو جب تک اچھی طرح نہ کھاؤں گہری نیند نہیں آتی۔ اور سچی بات یہ ہے کہ میں رات کو کچھ نہ کھانا صحت کے لئے سخت مضر سمجھتا ہوں۔

لیکن آدمی بڑا فاضل ہے اور صحیح معنوں میں پروفیسر۔ ایک دن شام کے وقت میں ان کے کمرے کے سامنے سے گذرا۔ شام ہو چلی تھی اور تاریکی اچھی خاصی چھا رہی تھی مجھے دیکھتے ہی انہوں نے اندر بلا لیا۔ دیکھا کہ میز پر جھکے ہیں، کاغذات پھیلے ہوئے ہیں۔ کچھ فوٹوگراف سامنے رکھے ہوئے ہیں۔ اور کام کر رہے ہیں۔ کام کے انہماک میں انہیں یہ بھی احساس نہیں کہ شام ہو گئی ہے اور کمرے میں روشنی اچھی طرح نہیں آ رہی ہے۔

موٹے بہت ہو گئے ہیں۔ چند قدم چلنا دشوار ہے ٹرنیٹی کالج کچھ دور نہیں لیکن وہاں پہنچنے کے لیے 'بس کے انتظار میں 'قطار' میں کھڑے رہتے ہیں۔ صبح کو ان کی پیالی میں کافی انڈیلتا ہوں تو جرمن زبان میں DANKE SCHON کہہ کر شکریہ ادا کرتے ہیں پھر ہنستے ہیں اور پھر انگریزی میں اس کا ترجمہ کرتے ہیں۔

کیمبرج

۵؍ اگست

کیمبرج کا شہر چھوٹا ہے لیکن بہت خوب صورت، شہر کی ساری اہمیت کالجوں کی وجہ سے ہے چھوٹے بڑے بیسیوں کالج ہیں۔ اور ہر ایک اپنے رنگ میں ممتاز لیکن مجھے کنگس کالج اور ٹرنیٹی کالج بہت پسند آئے۔ ٹرنیٹی تو ہمارے اوکسفورڈ کے کرائسٹ چرچ کی ہمسری کا دعوے دار ہے۔ ان کالجوں کی پشت پر دریائے کیم رواں ہے اور اچھے موسم میں ان کا حسن دیکھنے کے قابل ہوتا ہے مجموعی طور پر مجھے کیمبرج پسند آیا۔ اور آکسفرڈ میں اگر پروفیسر گب، باڈلین لائبریری اور کرائسٹ چرچ کے سبزہ زار نہ ہوتے تو شاید میں کیمبرج چلا جاتا۔

قیام کیمبرج کی پہلی ہی شام، پروفیسر حمید احمد خاں کی قیام گاہ کی تلاش میں صرف کی۔ ۱۵۳ چسٹرسن روڈ پہنچا تو ان کی لینڈ لیڈی نے بتایا کہ وہ یورپ کی سیاحت کو گئے ہوئے ہیں۔ اور آج کل روم میں ہیں۔ پتا نہیں اس سڑک کا نام چسٹرٹن کے نام پر کیوں رکھا گیا ہے ممکن ہے کسی زمانے میں اس کا یہاں قیام رہا ہو۔

اقبال کے قیام کیمبرج کے متعلق کچھ معلومات میں نے حاصل کرنی چاہیں لیکن وقت کی کمی کے باعث میں زیادہ توجہ نہ کر سکا۔ ڈاکٹر تاثیر مرحوم پیمبرک کالج میں تھے یہیں عربی کے پروفیسر آربری ہیں۔ بعض باتیں معلوم ہوئیں ان کی بعض تحریریں اور بعض رجسٹروں پر ان کے اندراج بھی دیکھے ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو سے دل چسپی رکھنے والے جو طلبا، کیمبرج میں مقیم ہیں وہ اس طرف توجہ کریں۔

پروفیسر حمید احمد خاں کی عدم ملاقات سے جو طبیعت میں افسردگی تھی اسے آج شیخ محمد اکرام صاحب کی غیر متوقع ملاقات نے دور کر دیا۔ میں انہیں امریکہ میں، اور وہ مجھے ہندوستان میں سمجھ رہے تھے اچانک ایک مانوس آواز سنائی دی اور ایک متعارف چہرہ سامنے آیا۔ دوسرے لمحہ ہم لوگ معانقہ میں مصروف اور ایک دوسرے کی خیر و عافیت پوچھ رہے تھے طے یہ ہوا کہ اس وقت میں ان کی قیام گاہ پر چلوں اور دوسرے دن کھانا ان کے ساتھ کھاؤں۔ ان کے یہاں پہنچا تو ان کا کمرہ کتابوں اور کاغذات سے بھرا پایا۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ کتابیں کہاں رکھی جائیں اور بیٹھا کس جگہ جائے انہوں نے اس سفر کی حالت میں اور یورپ کے مختصر سے قیام میں اس قدر کتابیں جمع کر لی ہیں کہ مجھے ان پر رشک آنے لگا۔ باتیں شروع ہوئیں تو اندازہ ہوا کہ انہوں نے علمی کاموں کے بڑے بڑے مفید منصوبے تیار کیے ہیں۔ متحدہ ہندوستان کی تہذیب و تمدن کی تاریخ پر بڑی گہری نظر ہے ان کی، اور انہوں نے ان موضوعات پر بہت اچھا مواد جمع کر رکھا ہے خدا کرے انہیں اطمینان سے کام کرنے کا موقع مل جائے۔

بارہ بجے شب تک مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ دوسرے دن کنگس کالج میں گئے اور دیر تک فارسی اور اردو کی قلمی کتابیں دیکھتے رہے دن کا کھانا ہم لوگوں نے 'کوہ نور' میں کھایا اور خالص ایشیائی کھانا، اور کیمبرج میں بیٹھ کر دلی اور کراچی کا لطف لیتے رہے۔

کیمبرج یونیورسٹی لائبریری میں اپنے موضوع کے سلسلے میں مواد مل رہا ہے لیکن زیادہ نہیں۔ جن موضوعات پر آج کل کام کر رہا ہوں۔ اس سلسلے کے معلومات استانبول اور قاہرہ میں ملیں گے یا جرمنی اور ہالینڈ میں۔ پروفیسر آربری نے کنگس کالج کا کتب خانہ دیکھنے کا مشورہ دیا تھا وہ بھی دیکھ لیا

عربی کے سلسلے کی یہاں زیادہ کتابیں نہیں۔ ہاں اردو مخطوطات میں دو نادر چیزیں ملیں۔ دیوان آبرو اور دیوان نعیم دہلوی۔ آبرو کے دیوان کی اطلاع تو قاضی عبدالودود صاحب سے عرصہ ہوا مل چکی تھی لیکن دیوان نعیم کے وجود کی اطلاع آج ہی ہوئی۔ دیوان آبرو کا فوٹوگراف منگوا رہا ہوں اور دیوان نعیم کی نقل خود ہی کر رہا ہوں۔ کل کورپس کرسٹی کالج جانا ہے وہاں تذکرہ صدر الدین آزردہ اور کلیات شاد دیکھنا ہے۔ تذکرہ آزردہ پہلے بھی کمیاب تھا اور اب بھی کمیاب ہے۔ شیفتہ کے علاوہ کوئی اور اسے دیکھنے کا مدعی نہیں۔ اس کا ایک ناقص نسخہ یہاں موجود ہے اور کسی دوسرے نسخہ کے وجود کا اب تک علم نہیں ہوا ہے۔ موقع ہوا، تو علی گڑھ پہنچ کر اسے انجمن اردو کی طرف سے شائع کراؤں گا۔

کیمبرج

۱۸ اگست

کورپس کرسٹی کالج کے لائبریرین بہت دل چسپ اور خوش اخلاق نکلے۔ کالج پہنچا تو ایک معمر سے آدمی پر نظر پڑی جو ہاتھ اور چھڑی دونوں پشت پر رکھے ہوئے کالج کے سبزہ کے گرد گھوم رہے تھے۔ میں نے ان سے لائبریری کی راہ اور لائبریرین سے ملاقات کی شکل پوچھی۔ کہنے لگے تم بالکل صحیح جگہ پر اور صحیح آدمی سے بات کر رہے ہو (لائبریری دس قدم کے فاصلے پر تھی اور لائبریرین یہی حضرت تھے) پانچ منٹ کے بعد جب لائبریری کھلی تو مجھے لے کر اندر داخل ہوئے بڑے اخلاق سے پیش آئے۔ مخطوطات کی الماریوں کے پاس ایک میز کے گرد بٹھا کر چلے گئے اور کہہ گئے کہ ان الماریوں میں کتابیں ہیں اور یہ رجسٹر ہے جس کتاب کی ضرورت ہو بلا تکلف نکالو اور پڑھو۔

یہ تجربہ بڑا دل چسپ تھا میرے لیے، شام تک بیٹھا کتابیں پڑھتا اور کتابوں سے گرد جھاڑتا اور اپنے کپڑے گرد آلود کرتا رہا۔ اور لائبریرین صاحب سیاحوں اور زائروں کو قدیم کتابیں اور نوادر دکھاتے رہے۔ یہ شخص قدیم مطبوعات یورپ پر بڑی گہری نظر رکھتا ہے اور اس لائبریری میں قدیم مطبوعات کا بہت اچھا ذخیرہ موجود ہے۔ ایک ٹورسٹ کو وہ بتا رہا تھا کہ شیکسپیئر نے جو فلاں ڈراما لکھا ہے اس وقت اس کے پیش نظر یہ کتاب ضرور تھی۔ یہ کتاب طب کی تھی اور تشریح الاعضاء سے تعلق رکھتی تھی اور تمام انسانی ڈھانچوں کی تصویریں اس کتاب میں بنی ہوئی تھیں۔ لائبریرین صاحب بتا رہے تھے کہ اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے جو یورپ میں چھپی ہے اور شیکسپیئر کے زیر بحث ڈراما لکھنے سے پہلے شائع ہو چکی تھی۔

آپ جانتے ہیں کہ جو اپنے فن کے ماہر ہوتے ہیں وہ کسی نہ کسی حد تک کھوئے رہتے ہیں اور بشاش سے معلوم ہوتے ہیں۔ یہی حال ان حضرت کا تھا وہ زمان و مکان سے بے نیاز ہو کر لوگوں کو کتابیں دکھا رہے تھے۔ ایک خاندان کہیں باہر سے کیمبرج آیا ہوا تھا وہ کسی طرح ان کی زد میں آگیا۔ یہ خاندان بوڑھے تھکے ہارے افراد پر مشتمل تھا، ایک بڈھا مرد، تین بوڑھی عورتیں۔ ان حضرت نے معلومات کا دریا بہانا شروع کر دیا۔ وہ حوالہ پر حوالہ دیے جا رہے تھے اور کتابوں پر کتابیں سامنے رکھے جا رہے تھے۔ یہی نہیں انھوں نے ان لوگوں سے پڑھوانا شروع کیا۔ اس لئے کہ بدقسمتی سے ان کی نظر کمزور تھی اور عینک (ان کے بقول) ان کی بیوی کے پاس رہ گئی تھی۔ آدھ صفحہ ایک صفحہ تک تو خیر مضائقہ نہ تھا لیکن اس سے زیادہ کے لیے وہ تیار نہ تھے۔ بوڑھی عورتیں دیر تک ان سے کھڑا رہنا مشکل تھا۔ عینک لگا کر لاطینی عبارتیں پڑھنا تو بڑا مشکل کام تھا۔ ایک نے بدقسمتی سے کسی مصنف کا نام لیا کہ میں جانتی ہوں، اس نے بھی یہ لکھا ہے۔ ارے صاحب! یہ تو ان کی طبع کے لئے ایک تازیانہ ہوا وہ فوراً اس کتاب کو بھی اٹھا لائے اور اس کی عبارتیں پڑھوانی شروع کیں اسی اثنا میں ایک فرانسیسی ترجمے کا ذکر آیا، وہ بڑھے ایک الماری کی طرف، خواتین نے بہت کہا کہ رہنے دیجیے لیکن وہ بھلا کہاں ماننے والے تھے، منٹوں میں اس کو لے کر پھر ان پر مسلط.... اب وہ ہیں کہ بار بار کہہ رہی ہیں کہ مجھے اب چائے پر جانا ہے، ہاں پروفیسر! یہ کتاب واقعی بہت دلچسپ ہے

میں پھر کبھی آؤں گی اور واقعی بڑا افسوس ہے کہ وقت بہت کم رہ گیا ہے لیکن وہ کسی طرح راضی نہ ہوتے تھے اور اس بات پر مصر تھے کہ زیر بحث مصنف کے خیالات جن جن اطالوی اور فرانسیسی مصنفین نے لئے ہیں وہ ساری کتابیں ان خواتین کو دیکھ کر جانا چاہئے۔

خواتین کی عجیب حالت تھی انہیں نوادر دیکھنے کا شوق ضرور تھا۔ لیکن کچھ اس قسم کا جس طرح آزادی کے بعد لٹن لائبریری علی گڑھ میں کسی گاؤں کے کچھ مکھیا اور مہنت قسم کے لوگ لائبریری دیکھنے آئے۔ وسط ہال میں کھڑے ہو کر انہوں نے ادھر ادھر دیکھا اور بولے "یہاں تو بڑی پستکیں جمع ہیں!" اور پھر وہ واپس ہو گئے۔

تو حضرت ان کا بھی معاملہ کچھ اسی قسم کا ہونے والا تھا لیکن یہ ہمارے پروفیسر کے چکر میں آ گئیں۔ ایک ان میں سے زیادہ سوجھ بوجھ کی تھیں انہیں اب یاد آیا کہ ان کی ٹرین چھوٹنے میں اب صرف آدھ گھنٹہ رہ گیا ہے اس لئے 'کم از کم پروفیسر انہیں تو اجازت ہی دیں۔

ایک کم سن سی امریکی لڑکی ان سبھوں سے زیادہ ثابت قدم اور علم کی شوقین نکلی وہ بھی کسی طرح ہال میں ان لوگوں کے ساتھ ہو گئی تھی' اور یہاں پروفیسر کا مفت لیکچر دیکھ کر اس قافلے میں شریک ہو گئی تھی ان لوگوں کے جانے کے بعد بھی وہ بدستور ان کی کتابوں میں دلچسپی لیتی رہی۔

اب شام ہو چلی تھی۔ اور لائبریری بند ہونے کا وقت ہو گیا تھا وہ میرے پاس آئے اور بولے مجھے افسوس ہے کہ آپ سے بالکل باتیں نہ کر سکا میں نے کہا یہ میری کم نصیبی ہے لیکن یقین فرمائیے میں آپ کے ارشادات سے برابر مستفید ہوتا رہا ہوں (وہ میری میز کے دوسرے کنارے ہی پر کھڑے ہو کر سارے کرتب دکھا رہے تھے گویا میرے سر پر ہی کھڑے ہو کر تقریر فرما رہے تھے۔) بولے۔ یہ کچھ نہیں۔ آپ چائے اس وقت ہمارے ساتھ پی رہے ہیں میں کچھ کہنے والا ہی تھا کہ بولے۔ میں نے بیوی کو فون کر دیا ہے اور وہ ہم لوگوں کی اب منتظر ہوں گی اور دیکھئے (اس امریکی لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) میں نے انہیں بھی مدعو کر لیا ہے یہ بھی ہمارے ساتھ چل رہی ہیں۔

یہ شخص بڑا تجربہ کار معلوم ہوتا تھا اور اپنے شکار پر سارے اسلحہ آزما لینے کا قائل تھا۔

چند منٹ میں ہم لوگ ان کے فلیٹ میں تھے ان کی بیوی بڑی مذہبی اور خدا ترس تھیں یہ بھی کچھ کم خدا ترس نہ تھے فرق یہ تھا کہ یہ خدا کے ساتھ ساتھ اپنی بیوی سے بھی بے حد ڈرتے تھے۔

لندن

۱۵؍ اگست ۱۹۵۸ء

بلجیم اور ہالینڈ کے لئے آج ڈھائی بجے کی ٹرین سے روانہ ہو رہا ہوں۔ مسٹر گل میرک نے روکیفیلر فاؤنڈیشن کے لندن آفس کے ذریعے ویزا، سفر کے اخراجات اور دوسرے امور کے سارے انتظامات مکمل کر دئے ہیں۔

آدھ گھنٹہ پہلے وکٹوریہ اسٹیشن پہنچ گیا۔ حفیظ زیدی اور مغنی صاحب رخصت کرنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ ٹرین میں جگہ ریزرو کرا لی ہے۔ میرا نمبر ۸ ۲ ہے ۵۰ پونڈ کے سفری چیک اپنے بنک سے لے لئے ہیں انگلستان کے قانون کے مطابق اس سے زیادہ کی رقم کے سفری چیک بن بھی نہیں سکتے۔ ۴۴ پونڈ کے امریکن ایکسپریس کے سفری چیک میرے پاس پہلے سے موجود ہیں لائڈن میں روکیفیلر والے ڈچ کرنسی میں مزید رقم ماہوار بھیجتے رہیں گے۔

ابھی ٹرین میں چائے آ گئی۔ ہاٹ ٹی تھی۔ اور خوب تھی۔ سامنے کی سیٹ پر ایک جرمن عورت بیٹھی ہوئی ہے لندن سے اشٹوٹ گارٹ

جارہی ہے۔ معاذ اللہ کیا بلانوش عورت ہے۔ بچوں کو بسکٹ اور کیک کے ٹکڑے دے کر اس نے بہلا دیا اور خود بڑی پھرتی سے چائے کا پورا قدح صاف کر گئی ——

ڈوور پر پاسپورٹ دیکھا گیا۔ کسٹم والوں نے کچھ نہ پوچھا۔ ٹرین چھوڑ کر اب جہاز پر آگیا ہوں۔ یہاں کم سن سی جرمن لڑکیوں سے ملاقات ہوئی۔ ایک جس کا نام لینو ہے بمشکل ۱۲ سال کی ہوگی۔ موٹے جھبرے سفری لباس میں ملبوس ہے اس کے سفری تھیلے پر یورپ کے کئی ملکوں کے نشانات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کئی ممالک دیکھ آئی ہے۔ کہتی ہے ۱۵ دن اوکسفورڈ بھی رہ آئی ہوں میں نے امتحاناً پوچھا تو اوکسفورڈ کے چپے چپے سے واقف نکلی اس کی چھوٹی سی نوٹ بک میں کام کے سارے اندراج موجود ہیں۔ کون سا کالج کب بنا، کون سا چرچ کس نے بنوایا اور اس کی بلندی کیا ہے۔ ہندوستان کے متعلق بھی کچھ معلومات رکھتی ہے وجے لکشمی پنڈت کو جانتی ہے شاید لندن میں اس نے انہیں دیکھا بھی ہے۔

اب جہاز سے بلجیم کا ساحل نظر آرہا ہے۔ عمارتیں دور سے بہت خوب صورت نظر آرہی ہیں۔ انگلش چینل نسبتاً خاموش ہے متلاطم نہیں۔ اب جہاز ساحل پر لگ گیا۔ سخت بھیڑ ہے۔ پہلے پاسپورٹ آفس ملا۔ ٹرین کچھ فاصلے پر کھڑی ہے زندگی میں پہلی بار ایک ایسے ملک میں داخل ہو رہا ہوں جس کی زبان سے میں بالکل واقف نہیں۔ انگریزی، ایسا معلوم ہوتا ہے لوگ شاذونادر ہی جانتے ہیں۔ کم از کم ایسا نمونہ اب تک تو دیکھنے میں نہیں آیا۔

ایک شخص اشاروں کنایوں میں بتا گیا ہے کہ ۵ نمبر کی پلیٹ فارم سے ٹرین برسلز جائے گی۔ اب یہاں پہنچ کر ہر ایک سے پوچھتا ہوں کہ میری سیٹ رزرو ہے اور اس کا نمبر ۵۹ ہے بتاؤ یہ کہاں ہے؟ کوئی انگریزی نہیں سمجھتا۔ ایک ریلوے افسر سے پوچھا اس نے بتایا ٹرین کے اس کنارے پر ڈبہ ہے۔ لیجیے اس کنارے آگیا اس نمبر کی سیٹ موجود نہیں۔ دوسرے افسر سے رجوع کیا وہ بتا نہیں کیا سمجھا وہ بالکل مخالف سمت کا کنارا بتاتا ہے۔ ان دونوں کناروں میں یا تو گاڑی چھوٹ جائے گی یا میں ——!

آخر ریزرو سیٹ سے باز آیا۔ اور ایک کمپارٹمنٹ میں چلا آیا ہوں۔

لیڈن / ہولینڈ

۲ر دسمبر ۶۵ء

ڈاکٹر خلیل یحییٰ نامی جامعہ قاہرہ کا خط آیا ہے۔ یمن کے جن مخطوطات کے مائکروفلم انہوں نے یمن سے حاصل کئے ہیں وہ دار الکتب کی ملکیت ہیں۔ اور اس سلسلے میں مجھے دکتور محمد حسین وکیل دار الکتب اور فواد سید سے مراجعت کرنے کو کہتے ہیں۔

کتب خانے میں ایک اسرائیلی فاضل سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے HEBREW UNIVERSITY کے دو اساتذہ کے نام بتائے، جو عربی و اسلامیات میں ممتاز ہیں۔ پروفیسر گوئیٹن جو آج کل یمن کے یہودیوں پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں دوسرے صاحب پروفیسر مائر ہیں۔ یہ اسلامی فنون پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ آج کل اسلامی آرٹ اور آرٹسٹ کی ڈکشنری مرتب کر رہے ہیں، انہوں نے کیمبرج کے جلسہ مستشرقین میں اسلامی فنِ تعمیر —— بعض حقائق اور مسائل پر ایک مقالہ بھی پڑھا تھا۔

آج میں نے ڈاکٹر فورہوے کو جو کتب خانے کے شعبہ مشرقیات کے ناظم ہیں ابن الفارس کی مجمل اللغۃ نسخہ ۰۹۳۲ کے سرورق پر ایک دستخط کی طرف متوجہ کیا اور بتایا کہ یہ تحریر الملک المظفر شمس الدین یوسف بن عمر بن علی بن رسول سلطان یمن کے بیٹے الملک المؤید داؤد بن یوسف بن عمر بن علی بن رسول کی ہے جو یمن کا بادشاہ ہوا ہے ڈچ مستشرقین ہوتسما اور دی خویہ وغیرہ کی نگاہ اس پر نہ گئی یا ان سے یہ نام پڑھا نہ گیا۔

بون/ جرمنی

۴؍ جنوری ۵۵ء

آج صبح جونہی دیوار کے کلنڈر پر نظر پڑی تو بے اختیار مولانا محمد علی کی یاد آئی آج سے تقریباً پچیس سال پہلے آج ہی کی تاریخ کو ان کا لندن میں انتقال ہوا تھا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد سے مجھے یاد نہیں آتا کہ جنوری کی ۴ تاریخ آئی ہو اور مجھے سوگوار نہ کر گئی ہو۔ ان کی زندگی جس طرح گذری اور انہیں موت جس طرح آئی اس کے کچھ واقعات تیزی سے تصور کی آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ یہ شعر

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور !
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

ایک زمانہ تک میں محمد علی مرحوم کا سمجھتا رہا تھا اور بعد کو غالب کے دیوان میں دیکھنے کے بعد بھی یقین نہیں آتا تھا کہ یہ شعر غالب کا ہے یہ شعر تو جوہر ہی کا ہونا چاہئے اس کا وہی رنگ ہے اور وہی انداز اور کس قدر مطابق حال۔

* * *

اوکسفورڈ

۵؍ مارچ ۵۵ء

HILARY TERM وسط مارچ میں ختم ہو رہا ہے اب چھ ہفتوں کے لئے اوکسفورڈ میں پھر تعطیل ہے۔ میں اس فرصت میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ یونیورسٹی بند ہے لیکن باڈلین لائبریری اور اشمولین میوزیم میں "ذخیرہ مارگولیتھ" تو بہرحال کھلا رہے گا۔

انڈر گریجوئیٹس پریلیم کی وجہ سے بہت مصروف ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ تعطیلات میں سیر و سیاحت اور کالج میں سالانہ رقص کے جشن کی خوشی میں سرمست ہیں، مختلف کالجوں سے دعوت نامے آنے شروع ہو گئے ہیں۔ بعضوں کی چھپائی اور گیٹ اپ دیکھنے کے لائق ہے۔ لیبرل کلب والوں کا دعوت نامہ منظوم آیا ہے اور دلچسپ

"WHETHER YOU ARE FROM JESUS'. ST. HILDA'S OR 'JOHNS,'
ENGULFED BY LECTURES OR ESSAYS FOR DONS[2];
WHETHER YOU READ GREATS[3], MATHEMATICS OR LAW,
ON March the Eleventh THERE ARE PLEASURES IN STORE,
FOR, ON THAT NIGHT. FROM NINE UNTIL THREE,
WE ANNOUNCE, AT THE Randolph Hotel[4] THERE WILL BE

---

1. JESUS COLLEGE اور ST. JOHN'S COLLEGE یہاں کے مشہور کالج ہیں۔ پروفیسر گب ST. JOHN'S کے فیلو ہیں۔ ST. HILDA لڑکیوں کا مشہور کالج

2. DONS آکسفرڈ کے اساتذہ

3. بی اے (آنرز) کا کلاسیکس کا نصاب

4. آکسفورڈ کا مشہور ترین اور گراں ہوٹل، بیلیل کالج اور اشمولین میوزیم کے پاس واقع ہے۔

THE Liberal Club Ball. DON'T PLEAD MODS' OR PRELIMS[2]
YOU'LL RESPOND FAR BETTER TO EXAMINERS' WHIMS,
FOR AN EVENING'S BREAK AND FOR Thirty-five 'Bob'[3]
A DOUBLE TICKET WOULD SURELY BE 'JUST THE JOB.'
ECONOMISTS WILL TELL YOU IT'S LITTLE TO PAY,
WITH Refreshments ALL IN, AND FIRST CLASS Cabaret
AND YOU WOULD ENJOY YOURSELF FULLY — NOT HALF
WHEN YOU DANCED TO THE music of Mike Scarfe[4].
SO WE SHALL BE HAPPY TO WELCOME YOU ALL
TO AN EVENING'S PLEASURE AT THE LIBERAL CLUB BALL."

TICKETS FROM DAVID PENWARDEN (KEBEL)

ایڈنبرا یونیورسٹی

۱۷؍اپریل ۶۵ء

اس عمارت کو دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ جسے یہاں کے لوگوں نے رومنوں کی تقلید میں بنانے کی کوشش کی تھی لیکن اس پر زیادہ صرف ہونے لگا تو عمارت نامکمل رہ گئی اب تک اسی حالت میں ہے صرف بارہ پایے بن سکے تھے۔ حق یہ ہے کہ خوب ہیں انہیں دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ہم روم یا یونان کی کوئی عمارت دیکھ رہے ہیں اسکاٹ لینڈ کے لوگ اسے مکمل نہ کر سکے اس لئے اس عمارت کا نام DISGRACE OF SCOTLAND پڑ گیا ہے۔

سہ پہر کو ڈاکٹر شمعون ٹونکنڈوالا ملنے آئے اور اپنے ساتھ ڈاکٹر منٹگمری واٹ کے یہاں لے گئے۔ یہ وہی ہیں جنہوں نے "محمد ایٹ مکہ" لکھی ہے۔ اور آج کل حضور کی مدنی زندگی پر ایک کتاب لکھنے میں مصروف ہیں، جامعہ ایڈنبرا کے شعبہ عربی و اسلامیات کے صدر ہیں، شہر سے کوئی ۱۵ میل دور ایک گاؤں میں رہتے ہیں۔ ہم لوگ بس سے کوئی آدھ گھنٹہ میں پہنچ گئے۔ مکان پرانی وضع کا ہے لیکن باغ وسیع اور خوب صورت ہے وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ باغ میں تھے اور باغبان کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ایک آرٹسٹ خاتون مس وائلٹ ڈی کیمپ کو بھی انہوں نے لوگوں سے ملانے کے لئے مدعو کر رکھا تھا یہ لکھنؤ، دہلی، بمبئی وغیرہ ہو آئی ہیں۔ مسز واٹ بھی بہت خلیق اور پڑھی لکھی خاتون ہیں اور بہت شگفتہ مزاج۔ تصویریں بھی بناتی ہیں اور شاعری

۱، 2 ۔ بی اے سال اول کا سالانہ امتحان اگر کسی کے پاس ریاضی ہے تو اس کا نام MOD ہے اور اگر دوسرے مضامین کا طالب علم ہے۔ پھر اس امتحان کا نام PRELIM ہے۔

3. BOB انگلستان کے عوام شلنگ کو کہتے ہیں۔

4. MIKE SCARFE کا آرکسٹرا آکسفورڈ میں مشہور ہے۔

بھی کرتی ہیں۔ چلتے وقت ذاکر صاحب اپنی بعض تصانیف اور ان کی بی بی نے اپنے شعروں کا ایک چھوٹا خوب سا مجموعہ اپنے قلم سے دستخط کر کے دیا۔

گلاسکو

۱۲ر اپریل ۵۵ء

گلاسکو یونیورسٹی کے کتب خانے میں بہت سا وقت صرف ہوا۔ قلمی کتابیں ہیں لیکن ہمارے نقطہ نظر سے بہت اہم نہیں۔ شعبہ اسلامیات بھی کئی بار ہو آیا ہوں۔ صدر شعبہ مسٹر بشوپ ہیں۔ یہ کوئی ۶۵ سال کے ہوں گے۔ بڑے لائق اور خلیق۔ ہم طالب علموں سے اس طرح ملے اور ایسی عزت و تکریم کی جیسے وہ اپنے کسی ہم عصر سے مل رہے ہوں۔ آج کل تفسیر زمخشری کے بعض اجزا کا انگریزی میں ترجمہ کر رہے ہیں۔ مجھ سے ملانے کے لئے مسٹر اسپنسر ٹرمنگھم کو بھی بلوا لیا تھا۔ افریقہ میں اسلام ان کا خاص موضوع ہے۔ یہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ THE CONDITION OF ISLAM IN WEST AFRICA ان کی مشہور کتاب ہے۔ بشوپ صاحب کبر سنی اور مصروفیات کے باوجود یونیورسٹی کی سیر کراتے رہے اور لوگوں سے ملاتے رہے۔ میں نے نوٹ بک پر دستخط کی فرمائش کی تو انگریزی کے بجائے عربی میں لکھا۔ العبد الفقیر الی رحمۃ اللہ ارک بشوب۔ گلاسکو۔

ڈرہم

۲۵ر اپریل ۵۵ء

یونیورسٹی کے مشرقی شعبے میں فضلا کا اجتماع ہے۔ چار پر سارے احباب سے ملاقات رہی۔ ہر شخص کسی نہ کسی کام میں لگا ہوا ہے۔ پروفیسر ٹھیکر سامی زبانوں سے دل چسپی رکھتے ہیں، اور یہاں اورنٹیل سیکشن کے ڈائریکٹر ہیں۔ مسٹر گل پیٹرک نے انہیں میری آمد کی پہلے سے اطلاع دے دی تھی۔ جدید عربی ادب کی کتابیں خریدنے کے لیے ڈرکینیلر نے حال ہی میں ہزاروں پونڈ یہاں دئے ہیں۔ فوسٹر صاحب لائبریرین ہیں۔ عربی کتابیں اس کثرت سے آگئی ہیں کہ لائبریری ایک دوسری عمارت میں منتقل کی جا رہی ہے۔ یہ خاموش سے آدمی ہیں لیکن جب بولتے ہیں تو آنکھیں بند کر کے۔ ایک بیرن باڈم ہیں وہ ترکی کی تاریخ کے استاد ہیں۔ فارسی سے بھی واقف ہیں۔ جیمز کریگ جو عربی میں اپنا نام جیمز کریغ لکھتے ہیں نوجوان اور ذہین آدمی ہیں آج کل ہسٹری آف دی عربز ان ماڈرن ٹائمز پر کام کر رہے ہیں یہاں عربی کے لکچرر ہیں اور موڈرن عربک لٹریچر ان کا خاص موضوع ہے۔ احمد امین کی سوانح حیات حیاتی کا ترجمہ کر رہے ہیں اور تہذیب الاخلاق لابن مسکویہ کو انگریزی میں منتقل کر رہے ہیں جب میں نے انہیں بتایا کہ ان کے ایک ہم نام امریکہ میں حیاتی کا ترجمہ کر رہے ہیں اور مڈل ایسٹ جرنل (واشنگٹن) میں اس پر ایک مضمون بھی شائع کر چکے ہیں تو ان کا اضطراب دیکھنے کے قابل تھا، بار بار ہاتھ ملتے تھے اور کہتے تھے افسوس وہ مجھ سے آگے بڑھ گئے اور میں دوسرے کاموں میں پھنسا رہا۔

رچرڈ ہل سے بھی ملاقات رہی۔ یہ سوڈان اور نیر عرب ویسٹ پر کام کر رہے ہیں۔ ان کی کتاب تاریخ سوڈان پریس میں ہے۔ اپنے فضل الرحمن صاحب بھی تھے جنہوں نے آکسفورڈ سے ابن سینا میں ڈاکٹریٹ لی ہے پروفیسر گب کے شاگرد رہے ہیں بڑی محبت سے پیش آئے۔ گھر پر مجھے اور عابد خاں صاحب کو کھانے پر بلایا، اور اپنے متعدد مضامین کے آف پرنٹ انہوں نے عنایت فرمائے۔

اوکسفورڈ

۳۰ر اپریل ۱۹۵۵ء

کل پروفیسر [illegible] کی بیٹی پال ارک کالی کا اکتیس سال کی عمر میں آکسفورڈ میں انتقال ہو گیا۔ پروفیسر کالی کو میں نے اس قدر مضمحل اور

افسردہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ویسے ہی بوڑھے ہیں لیکن مجھے آج ایسا معلوم ہوا جیسے اس حادثہ نے ان کی عمر میں دس سال کا اضافہ کر دیا ہو۔ پھر بھی وہ روزانہ کی طرح حسبِ معمول باڈلین آئے۔ خاموشی سے اپنے کاغذات پر جھکے رہے اور عربی اور عبرانی کے مخطوطات دیکھتے رہے۔ نوٹس بناتے رہے۔ اور آئین اسٹائین کی طرح کاغذ کے پُرزوں پر لکھتے رہے۔ ان میں ترمیم و اصلاح کرتے رہے اور پھر انہیں چاک کرتے رہے اور ردی کی ٹوکری میں پھینکتے رہے۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ طبیعت پر زور دے کر کام کر رہے ہیں دل و دماغ کہیں اور ہے لیکن وہ مطالعہ کی عادت سے مجبور ہیں کئی بار اٹھے کبھی کارڈس کی کیبنیٹ کے پاس گئے اور کبھی معجم البلدان اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی جلدیں الٹ پلٹ کرتے رہے۔ اچانک ان کی نگاہ مجھ پر پڑی مسکراتے ہوئے میرے پاس آئے اور کھڑے ہو گئے۔ کچھ اوڈگراف میرے سامنے رکھے ہوئے تھے دیکھتے رہے اور کام کی بابت پوچھتے رہے میں ان کے پاس تعزیت کے لئے نہ جا سکا تھا کہ کیا کہوں گا اور کس طرح کہوں گا ان کی تیس سالہ کمائی منوں مٹی کے نیچے دفن ہو گئی تھی ان کی تسکین کے لئے الفاظ کہاں سے لاؤں گا لیکن ان کا صبر و ضبط دیکھئے کہ انہوں نے علمی معمولات میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ حسبِ معمول کتب خانے میں موجود ہیں وہی انسائیکلوپیڈیا کی جلدیں سامنے ہیں۔ وہی لسان اور تاج العروس کی مجلدات ان کے پہلو میں ہیں۔

پروفیسر کالے اور ان کے خاندان کی پوری زندگی عجیب مصائب کا شکار رہی ہے وہ جامعہ بون میں سامی زبانوں کے پروفیسر تھے۔ ۱۹۳۸ء میں نازیوں کی یہود دشمنی شباب پر تھی اور ان کے مظالم سے تنگ آکر جرمن یہودی علماء اور سائنس دان ترکِ وطن کر رہے تھے۔ پروفیسر کالے کی باری اس وقت آئی جب ایک دن ایک یہودی کی دکان، پولیس کے سامنے بلکہ اس کی رضامندی سے عوام کے فسادات اور جرمنوں کی یہود دشمنی میں تباہ و برباد ہو گئی ہنگامی جب روانہ ہو گئے تو پروفیسر کی بیوی اور ان کے بچے اس خاندان کے پاس تسلی کے لئے گئے اور جو کچھ وہ ان کے لئے کر سکتے تھے اس کی کوشش کی۔ ان ہمدردی کرنے والوں کے نام فوراً نوٹ کر لئے گئے اور اسی کے بعد سے یہ خاندان نازیوں کے عتاب کا نشانہ بن گیا۔ یہ خاندان بوڑھوں اور بچوں پر مشتمل تھا بچوں میں سب سے بڑا بیٹا پال تھا جس کی عمر اس وقت پندرہ سال تھی۔ ان لوگوں کی توہین و تذلیل، ہنگامہ و فسادات کی داستان، بچوں کی ماں نے بڑے دردناک انداز میں تحریر کئے ہیں، جنہوں نے اس ظلم و ستم کی قید سے نکل آنے کا پروگرام بنایا اور اس میں کامیابی حاصل کی۔ یہ مختصر سی دلچسپ کتاب نازی جرمن کے مظالم کی بڑی موثر داستانوں میں شمار کی جاتی ہے۔

پال میرے کالج St. Catherine's ہی کے طالب علم تھے وہ یہاں ۱۹۴۱ء میں داخل ہوئے جہاں انہوں نے کلاسیکس دینیات اور السنۂ سامی کی تحصیل کی پھر ان کی توجہ زیادہ تر مصریات کی طرف ہو گئی۔ ۱۹۴۸ء میں انہیں ووسٹر کالج میں اسٹوڈنٹ شپ مل گئی جہاں وہ چھ سال رہے اس عرصے میں وہ مصر کی ایک قدیم عیسائی خانقاہ میں ادبی اور تاریخی معلومات پر مشتمل قبطی، یونانی اور ادبی مواد کی چھان بین کرتے رہے اور پھر ایک مقالہ لکھ کر اس پر انہوں نے یہیں سے ڈاکٹریٹ لی۔ بعد کے سال انہوں نے اسی مقالے کو کتاب کی شکل دینے اور مزید کانٹ چھانٹ پر صرف کیا۔ یہ کتاب ۱۹۵۴ء میں اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کی اشاعت کے فوراً بعد یونیورسٹی کالج میں مصریات پر کام کرنے کے لئے انہیں ایک فیلو شپ مل گئی۔ اور اپنے مستقبل کے کام کے لئے ایک لائحہ عمل مرتب کر رہے تھے کہ اس سال کے ابتدا میں ان کے دوستوں کو ان کی غیر معمولی علالت کی اطلاع ملی۔

میں ان سے ملنے ریڈکلیف گیا تو انہوں نے حسبِ معمول مسکراتے ہوئے استقبال کیا اور بڑی حد تک معذرت خواہانہ انداز میں بتایا کہ وہ سرطان کے مریض ہیں۔ اور مرض اس قدر آگے بڑھ چکا ہے کہ اب کوئی دوا، کوئی آپریشن کارگر نہیں ہو سکتا۔ یہ کہہ کر انہوں نے عجیب نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ میں ان نگاہوں کی تاب نہ لا سکا۔ اور میں ہسپتال کے دریچے سے باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ وہاں نامور ڈاکٹروں کی کاریں کھڑی تھیں، نرسیں اور ڈیوٹی

پر کے ڈاکٹر یہاں وہاں بھاگ دوڑ رہے تھے کچھ بین الاقوامی ماہرین مہلک امراض کے استعمال کے لئے ریسرچ میں مصروف تھے یہ انگلستان کا مشہور ترین ہسپتال تھا اور یہاں کے لوگ اپنے اپنے فن کے ماہرین میں شمار کئے جاتے ہیں۔ لیکن پال کے مرض کے سامنے سب عاجز ہیں اور بے بس۔

ہمت اور جواں مردی کے ساتھ تو بہت مرتے ہیں لیکن جس ہمت، بردباری اور استقلال کے آثار ان کے چہرے پر نظر آئے کم دیکھنے میں آتے ہیں۔

پال کی ابھی عمر ہی کیا تھی۔ اس کم عمری میں جب کسی کو یقین ہو جائے کہ موت کا چنگل روز بروز اور لمحہ بہ لمحہ اس کے قریب ہوتا جا رہا ہے اور یہ کہ اب اسے کوئی طاقت اس سے چھڑا نہیں سکتی تو اس کی ذہنی پریشانی اور مایوسی کا کیا حال ہوتا ہوگا اور اس وقت پتہ نہیں اسے کیسے کیسے ناکردہ گناہوں کی حسرت یاد آتی ہوگی اور کیسی کیسی رنگین تمنائیں اس کے دل میں انگڑائیاں لیتی ہوں گی۔ کبھی اس کے تصور کی دنیا میں ایک خوب صورت چھوٹا سا گھر ابھرتا ہوگا اس کی محبت کرنے والی بی بی اور پیارے پیارے بچے سامنے آتے ہوں گے اور کبھی مناظر فطرت مکمل تازگی اور بھرپور حسن کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہوں گے۔ لیکن پال موت کے وقت ان سب باتوں سے بے نیاز تھے — انھیں صرف اپنے بوڑھے (پروفیسر کالے) کی ضعیفی اور تنہائی کا خیال تھا جن کے یہ بڑے فرماں بردار اور چہیتے بیٹے تھے اور پھر ان کے غیر مکمل مضامین اور تصانیف تھیں جن کی تکمیل کی حسرت وہ اپنے سینے میں دفن لیے جا رہے تھے

زندگی کے بقیہ چند ہفتے انہوں نے اسی حال میں بڑی خاموشی اور توجہ سے اپنے غیر مکمل مضامین کو مرتب کرنے اور دوسری تحریرات کو درست کرنے میں صرف کیے اس کے چند ہی دنوں بعد وہ بڑی خاموشی، بڑے صبر و سکون اور بڑی مسرت میں جس میں کسی قسم کی بے یقینی یا تلخی کا شائبہ تک نہ تھا۔ انہوں نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

اوکسفورڈ

۳۰؍ مئی ۱۹۵۵ء

سنیچر کی شام کو ڈاکٹر یقین نے چائے پر مدعو کیا تھا۔ میں اس دن ایکزیٹر لائبریری میں کام کر رہا تھا۔ کچھ ایسا مصروف ہوا کہ بالکل بھول گیا اور ان کے یہاں نہ جا سکا آج میں نے ان سے مل کر معذرت کی لیکن مجھے اندازہ ہوا کہ انہیں تکلیف پہنچی ہے۔ مجھے سخت ندامت ہے مجھے ایک ایسی ڈائری رکھنی چاہیے جس میں اس قسم کے اندراجات کر لیا کروں آئندہ خیال رکھوں گا اور انہیں بھی مطمئن کرنے کی کوشش کروں گا۔

آج WHITE - DAY تھا اور بڑی چہل پہل تھی دو بجے دن کو بشپ، کلاجی اور منسٹروں کا بڑا شاندار جلوس سینٹ جانس کالج سے نکل کر MARTYR'S MEMORIAL کے پاس پہنچا جہاں پر آج سے چار سو سال پہلے ۱۵۵۵ء میں BISHOP LATIMAR اور بشپ نکولس وغیرہ کو چرچ آف روم کے خلاف اعلانِ حق کرنے کے جرم میں جلا کر راکھ کر دیا گیا تھا۔ ہزاروں آدمی لندن اور دوسرے مقامات سے آئے ہوئے تھے۔ موسم بھی بہت خوب صورت تھا۔ مضافات کے لوگوں نے یک کرشمہ دو کار کیا۔ اوکسفورڈ کے کالجوں، پرانی عمارتوں اور دوسرے قابلِ دید مقامات کی سیر کی۔ کرائسٹ چرچ کالج کے خوب صورت لان پر خوش گپیاں کیں اور فطرت کے مناظر سے لطف اندوز ہوئے اور نہر ISIS کے کنارے لیٹ کر دھوپ کا غسل لیا، اور کچھ تصویریں بھی کھینچ لیں۔ بعض سوجھ بوجھ والی خواتین نے "اول ورتھ" اور "مارک اینڈ اسپنسر" جا کر ضروری خرید و فروخت بھی کر لی اور کچھ کپڑوں کے نئے ڈیزائن بھی دیکھ آئیں۔ لڑکیوں نے باتوں ہی باتوں میں کچھ نئے دوست بنا لئے اور پرانے دوستوں سے "تجدید محبت" بھی کر لی۔

اوکسفورڈ

۲ جون ۵۵ء

اسلامک یونین کے زیر اہتمام آج شام کے ۵ بجے 'اسلامی فقہ کے بعض نئے مسائل' پر پروفیسر شاخت کی تقریر تھی تقریر بہت پُر از معلومات تھی۔ مختلف اسلامی ممالک میں جو جدید مسائل کا سامنا ہوا ہے اس سلسلے میں ہندوستان کے متعلق بہت اچھے معلومات تھے اور اینگلو اسلامک لار کے متعلق دلچسپ اشارے۔ سوالات کے جوابات اچھے دئے لیکن اندازہ ہوا جیسے وہ نروس ہو رہے ہوں یا ہر شخص کے متعلق سمجھ رہے ہیں کہ مجھ پر اعتراض کرنے کی نیت سے سوال کر رہا ہے۔ سوال کرنے والوں میں پروفیسر بیسٹن اور میرے فلسطینی دوست وہاب الخالدی پیش پیش تھے۔ پروفیسر گب کے امریکہ چلے جانے کی وجہ سے جو اوکسفورڈ میں لاوڈین پروفیسر آف عربک کی جگہ خالی ہوئی تھی اس کے لیے شاخت اور بیسٹن دونوں امیدوار تھے انتخاب بیسٹن کا ہوا۔ شاخت کو بعض ناکامیوں اور کچھ دوسرے حالات نے ذرا چڑچڑا اور وہمی سا بنا دیا ہے وہ اب پروفیسر کریمر کی جگہ پر لیڈن یونیورسٹی میں عربی و اسلامیات کے پروفیسر ہیں لیکن اپنے علمی کارناموں اور آکسفورڈ میں ایک عرصہ تک استاد ہونے کی وجہ سے انہیں یقین تھا کہ انتخاب انہیں کا ہوگا۔ فیصلہ ان کی توقع کے خلاف ہوا اور انہیں بڑا صدمہ ہوا۔ میں نے ایک بار یہاں کے ایک فاضل ڈون سے اس فیصلہ کا سبب پوچھا کہ شاخت اسلامی فقہ کی دنیا میں مسلم الثبوت ماہروں میں سمجھے جاتے ہیں۔ اور بہ حیثیت اسکالر کے ان کا درجہ بہت اونچا ہے۔ پھر بھی پروفیسر گب کی جگہ پر ان کا انتخاب کیوں نہ ہوا؟ وہ بولے پروفیسر کے انتخاب میں متعدد امور پیش نظر رکھے جاتے ہیں اس میں علم و فضل کے ساتھ سلامت روی کی بہت ضرورت ہوتی ہے اور یہ بھی ملحوظ رہتا ہے کہ وہ کس قدر لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور کتنے لوگ اس کے ساتھ یا اس کے تحت خوش اسلوبی اور خوش دلی سے کام کرنے پر آمادہ ہیں۔

پروفیسر شاخت اور ان کی بیوی کوئی ایک ہفتہ سے یہاں مقیم ہیں کل میں نے ان سے ملاقات کے لیے جائے قیام پر وقت لیا تھا۔ بہت اچھی طرح ملے اور کام کی رفتار کے متعلق پوچھتے رہے میں نے بعض مسائل ان سے حل کئے۔ ابن کبیر کے رسالہ فضائل من اسمہ احمد و محمد کے متعلق کہنے لگے آپ اسے ایڈٹ کیجئے اور اس فکر میں نہ پڑیے کہ احادیث موضوع ہیں یا کیا؟ اس قسم کے اکثر فضائل والی احادیث کا درجہ عام طور پر مستند نہیں ہوا کرتا۔

اثنائے گفتگو میں ان کی بی بی کافی بنا کر لے آئیں۔ پروفیسر شاخت جرمن یہودی ہیں (یہودی کبھی پہلے رہے ہوں گے اب کیا ہوں گے۔) اور ان کی بی بی انگریز۔ ان کا دل غالباً ہولینڈ میں ابھی اچھی طرح نہیں لگا اسی لیے کچھ مہینوں کے وقفوں کے بعد چند دنوں کیلئے انگلستان چلی آتی ہیں میں نے پوچھا لیڈن میں آپ نے مکان کا انتخاب کر لیا۔ بولیں۔ اب تک طے نہیں ہو سکا ہے۔ ہم لوگ عارضی طور پر ایک مکان میں منتقل ہو گئے ہیں لیکن مستقل قیام کے نئے مکان کی نوعیت میں میرا اور جوزف (پروفیسر شاخت) کا اختلاف ہے۔ میں چھوٹا مکان چاہتی ہوں جس کو میں سنبھال سکوں اور جس کی صفائی وغیرہ میں کر لیا کروں۔ یہ اتنا بڑا مکان چاہتے ہیں جس میں ان کا پورا کتب خانہ منتقل ہو جائے۔

---

۹ جون ۵۵ء

PLAY HOUSE میں ہملٹ دیکھا۔ مجھے تھیٹر کے کھیل پسند نہیں آتے لیکن یہ ضروری ہے کہ ہملٹ کا کردار جس نے ادا کیا ہے وہ خوب تھا۔ فلم، ریڈیو اور ٹیلی وژن نے تھیٹر کے فن کو بڑا نقصان پہنچایا ہے اور پورے ملک میں یہ روز بروز انحطاط پذیر ہے۔ ہاں شیکسپیر کی جائے پیدائش اسٹراٹ

فورڈ کا تھیٹر اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے جہاں عوام کے ساتھ ساتھ حکومت برطانیہ پورے طور پر دلچسپی لیتی ہے۔ امریکی عطیے اس پر مستزاد اور یہاں بڑا اہتمام ہوتا ہے اور ملک بھر کے اعلیٰ اداکار اس میں حصہ لیتے ہیں، ہجوم اس قدر ہوتا ہے کہ بعض مرتبہ چھ چھ ماہ پہلے سے سارے ٹکٹ فروخت ہو جاتے ہیں۔ برٹش کونسل کی توجہ سے ایک بار کچھ ٹکٹ فراہم ہوئے اور ہم لوگ TWELVTH NIGHT دیکھنے گئے۔ انگلستان کے دو مشہور اداکار سر اولیور لارنس اور ویون لی کام کر رہے تھے۔

۱۰ر جون ۵۵ء

۸ بجے شام کو اوریل کالج پہنچا جہاں ہم نے اسلامک یونین اور عرب سوسائٹی کی طرف سے پروفیسر گب کو رخصتانہ کی دعوت دی، اور پروفیسر بیٹن کو خوش آمدید کہا۔ مشرق کے بہت سے طالب علم جتنے پروفیسر گب کے سارے شاگرد جمع تھے اور مشرق اوسط کے بہت سے وہ طلبا بھی جو یہاں کسی اور فیکلٹی میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ مہدی سوڈانی کے خاندان کے ایک رکن صادق المہدی نے مختصر سی تقریر کی۔

گب صاحب نے دھیمی آواز میں تقریر شروع کی اور جب وہ اوکسفورڈ کی جدائی کا ذکر کر رہے تھے تو دل گرفتہ نظر آئے اور آبدیدہ ہو گئے۔ بولے میں نے یہ فیصلہ تو کر لیا کہ امریکہ جاؤں گا لیکن جب اس کا وقت آیا اور اوکسفورڈ چھوٹ رہا ہے تو میں اور میری بیوی دونوں ملول ہیں۔ اوکسفورڈ سے ایک زمانہ کے تعلقات ہیں وہ اب ٹوٹتے نظر آتے ہیں۔

۱۲ر جون ۵۵ء

شام کے ۷ بجے اوکسفورڈ مجلس کے زیر اہتمام کرشنا راؤ جو ہندوستان سے امریکہ اپنے رقص کے مظاہرے کے لئے گئی ہوئی تھیں اور اب کئی ہفتے سے انگلستان میں مقیم ہیں، ناچیں۔

رقص بہت کامیاب رہا اور انہوں نے یہاں کے مقامی آرٹ کے ماہرین سے خراج تحسین وصول کیا انگریز لڑکیوں اور لڑکوں کی بہت اچھی تعداد جمع تھی PLAY HOUSE میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ عورت دل والی ہے ٹکٹ کی فروخت سے جس قدر رقم جمع ہوئی ساری کی ساری رقم ہندوستان کے قحط زدہ علاقے کو بھیجنے کے لئے دے دی اور ایک پینی بھی اس نے لینے سے انکار کر دیا۔

اوکسفورڈ

۱۱ر اگست ۵۵ء

ڈاکٹر السٹرن سے ملنے گیا۔ مسز والزر بھی موجود تھیں خود والزر صاحب لیکچر دینے یورپ گئے ہوئے ہیں یہ لوگ ان سے اسی ہفتہ یونان میں ملیں گے کچھ دن وہیں قیام کریں گے پھر السٹرن، انسائیکلوپیڈیا کے ایک جلسہ میں شریک ہونے کے لئے ڈنمارک چلے جائیں گے۔

میں یہ سطریں بستر میں گھس کر لکھ رہا ہوں ریڈیو سے برٹنڈ رسل کی تقریر THEN AND NOW سن رہا ہوں۔ آواز سے عمر کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن لب و لہجہ اب بھی صاف ہے، ٹھہر ٹھہر کر بولتے ہیں اور ایک ایک لفظ صاف طور پر تلفظ کرتے ہیں اس تقریر میں اپنی جوانی کی زندگی کیمبرج کے زمانہ قیام کے قصے اور احباب اور بعض مشاہیر سے ملاقات کا حال بیان کر رہے ہیں۔ اب رات کے ساڑھے آٹھ بجے ہیں اور BBC سے ۲۰ سوالات، نشر ہو رہے ہیں ـــ GILBERT HARDING حسب معمول پہیلیاں بجھا رہا ہے یہ میرا بہت پسندیدہ پروگرام ہے۔

۱۵ر اگست ۵۵ء

مغربی شعر و موسیقی کے ایک پرائیویٹ جلسے میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ اسے جلسہ نہیں کہنا چاہئے یہ چند مخصوص اصحاب کی ایک نشست تھی یہ دراصل ایک کلب ہے لیکن اس کی ممبر شپ بہت محدود ہے۔ ان ممبروں کو یہ اجازت ہے کہ ایک مہمان اپنے ساتھ لا سکتے ہیں۔ لیکن ان کے کھانے اور شراب کی (اگر وہ پیتا ہو) قیمت اس ممبر کو ادا کرنی ہو گی۔

پہلے کھانا ہوا۔ بجلی کی ساری روشنیاں بجھا دی گئیں اور موم کی شمعیں روشن ہو گئیں۔ مدہم سروں میں مغربی موسیقی ہوتی رہی پھر شعر و نغمہ کی باری آئی۔ VOCAL MUSIC میں بلیلی کالج کے ایک امریکن نیگرو طالب علم نے حصّہ لیا۔ انہوں نے پال رابسن کے ایک آتشیں نغمے کی نقل کی تھی اور لوگوں کا بیان ہے کہ بہت کامیاب تھی۔ بقیہ طالب علم کوئی نہ کوئی ساز بجاتے رہے درمیانی وقفوں میں بعض لڑکوں نے اپنی یا اپنی پسندیدہ نظمیں سنائیں یہ محفل ہمارے مشاعروں کی فضا سے قطعاً مختلف تھی جس طرح یہ شعر سنانے والے ہمارے شعرائے کرام سے مختلف تھے۔ MAUREEN LYNCH نے ایک ہسپانوی نظم سنائی اور پھر اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا نظم کچھ اس طرح شروع ہوتی ہے۔

THERE IS NO REASON WHY
YOU SHOULD PASS
WITHOUT SAYING
"GOOD-EVENING"
YOU'VE EVEN STOPPED
GREETING US.
SPEAK TO US
AND DON'T LOVE US.

سینٹ آئیوز، کورنوال

۱۲ر ستمبر ۵۵ء

سہ پہر سے شام تک کا وقت گھومنے پھرنے اور زیادہ تر کمرے کی تلاش میں صرف ہوا کمرے اگر آرام دہ ہیں تو سمندر کے رُخ پر نہیں واقع ہیں۔ سمندر کے رُخ پر ہیں تو وہاں ٹورسٹ پہلے سے متمکن ہیں۔

آج کے لئے تو ایک ہوٹل میں بہت اچھا وسیع کمرہ مل گیا ہے یہی نہیں کہ سمندر کے رُخ پر ہے بلکہ عین سمندر پر واقع ہے چھوٹی چھوٹی کشتیاں ادھر ادھر دوڑ رہی ہیں۔ سامنے "منارہ نور" ہے اور ساحل پر بے شمار مخلوق رواں دواں۔

۲ر ستمبر ۵۵ء

ایڈیتھ ناٹ اینگل جن کا قلمی نام گلیزا (GALEIZA) ہے ان کی تصویروں کی نمائش یہاں ہو رہی ہے۔ موضوع زیادہ تر پھول

ہیں۔ ان کی تصویروں میں MADEIRE BASKET رنگوں کے تناسب کے لحاظ سے بہت خوب ہے دوسری قابلِ ذکر تصویر وہ ہے جس میں انہوں نے فن لینڈ کے مشہور موسیقار سبیلیس SIBELIUS کے ایک نغمہ کی تصویر کشی کی کوشش کی ہے سبیلیس کا خط مصورہ نے مجھے دکھایا ہے جو شکریہ میں اس نے لکھا ہے اس کا دستخط بہت دل چسپ ہے اور اس سے اس کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے ST. IVES HARBOUR کی تصویر بھی بہت اچھی اس نے بنائی ہے پوری بندرگاہ کہرے سے ڈھکی ہوئی ہے۔ لطف یہ ہے کہ ان کی انگلیاں بالکل ٹیڑھی ٹیڑھی ہیں بچپن میں اپنی سوتیلی ماں کے ظلم و ستم کا شکار رہی ہیں کوئی دس سال سے مصوری کا پیشہ انہوں نے اختیار کیا ہے یہ نمائش ان کے اپنے فلیٹ میں ہو رہی ہے داخلہ ذریعہ ٹکٹ ہے

---

۵ ستمبر ۵۵ء

ابھی ST. EARTH میں ماتو نے چائے پی اور میں نے کاغذی گلاس میں اورنج اسکواش۔ ST. IVES جانے والی ٹرین میں جگہ دیکھ رہا تھا کہ دو کم سن انگریز بچوں نے آواز دی۔ 'PLENTY OF ROOM HERE' یہ بہت غیر انگریزی طریقہ تھا اور مجھے بہت پسند آیا۔ ہم لوگ اس ڈبے میں سوار ہو گئے یہاں صرف یہی دو بچے تھے ایک کوئی بارہ سال کا ہوگا دوسرا چودہ سال کا۔۔۔ چھوٹا بہت تیز ہے یہ دونوں بہت غریب طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ کپڑے بہت معمولی ہیں اور صاف بھی نہیں۔ بڑا لڑکا اسکول میں پڑھتا ہے اور جمعہ، سنیچر، اتوار کو ایک قصاب کی دکان پر کام کرتا ہے۔ دس شلنگ روزانہ ملتے ہیں۔ چھوٹا بھی باضابطہ اسکول میں پڑھتا ہے اور ایک گوالے کے یہاں ۱۵ شلنگ پر کام کرتا ہے ابھی دونوں سمندر سے تیر کر آ رہے ہیں۔ چھوٹا کہہ رہا ہے میں ۵۰ گز تک تیر سکتا ہوں۔ ہندوستان کا پایہ تخت وارسا کو سمجھتا ہے بڑے نے گاندھی جی کا اور چھوٹے نے پاکستان کا نام سنا ہے کمپارٹمنٹ میں پڑے ہوئے اخبارات سے یہ لوگ ہوائی جہاز بنا رہے ہیں اور کھڑکی سے باہر فضا میں اڑا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا تمہیں ST. IVES پسند ہے؟ چھوٹا بولا، مجھے صرف دنیا میں ایک چیز پسند ہے اور وہ روپیہ ہے۔ میں نے پوچھا، روپیہ کیا کرو گے؟ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر بولا: کھانے کے لئے۔ اس سے ہوا کا رخ معلوم ہو سکتا ہے۔

ان بچوں نے ربڑ کے جوتے، گھٹیا سوتی کپڑے کی پتلون پہن رکھی ہے۔ قمیص بھی بہت میلی ہے کریس اور استری کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا بال کب سے نہیں بنے ہیں۔

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ دونوں کے پاس ٹکٹ ہیں۔ ابھی برمنگھم کے ایک صاحب یہاں سوار ہوئے اچھے خاصے شستہ آدمی ہیں ان سے میں نے اس کا ذکر کیا تو بولے۔ ان پر انگلستان کے سارے بچوں کا قیاس مت کرنا۔ یہ صحیح تعلیم و تربیت سے محروم رہے ہیں۔

لندن

۷ اپریل ۵۶ء

DOEVE کی ایک آئل پینٹنگ نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس کا عنوان ہے۔ IF WINTER COMES, CAN SPRING BE FAR BEHIND?

آکسفورڈ/ ۸ دسمبر ۵۵ء

آج فن لینڈ کے مشہور موسیقار SIBELIUS کی عمر ۹۰ سال کی ہو گئی۔ بی بی سی اس ہفتے اس کے کئی شہ پارے نشر کر چکا ہے اس وقت

شب کے آٹھ بجے ہیں۔ رائل فیسٹول ہال لندن سے سبیلو کے اعزاز میں سر ٹامس بیچم کی سرکردگی میں اس کے کئی نغمے نشر ہو رہے ہیں۔ یہ نغمے صرف انگلستان میں نہیں، فن لینڈ، یورپ بلکہ دنیا کے سارے اہم ملکوں میں سُنے جا رہے ہوں گے خود سبیلیاس ایک پُرسکون گاؤں میں بیٹھا ہوا اپنے یہ نغمے سن رہا ہو گا۔ سبیلو کی صحت ۹۰ سال ہونے کے باوجود بہت اچھی ہے۔ فن لینڈ کے پایۂ تخت سے کوئی ۲۵ میل کے فاصلے پر اس نے اپنا مکان بنوایا ہے جس کا نام اس نے AINOLA رکھا ہے اس وقت ان کی اولاد اور اس کے بچوں کی تعداد ۱۴ ہے۔ اس کی بیوی کہا کرتی ہے کہ مجھے کوئی ۵۰ آدمیوں کی دیکھ بھال کی فکر روزانہ دامن گیر رہتی ہے۔

وہ آکسفورڈ بھی آ چکا ہے اور اس کی یاد وہ اب تک فراموش نہیں کر سکا ہے چاندنی راتوں میں ٹیمس (جس کا نام آکسفورڈ میں ISIS ہے) کی سیر، کالجوں کے بلند مینارے، نیو کالج میں Dr. HARRIS کا سنایا ہوا باخ کا نغمہ اسے سب یاد ہے۔ چند ماہ پہلے St. EVES (کارنوال) میں جب میں ایک جگہ تصویروں کی نمائش دیکھ رہا تھا تو مصورہ میرے پاس آئی اور میری دل چسپی دیکھ کر اپنی تصویریں خود دکھانے لگی اور ان کی وضاحت کرنے لگی۔ اس نے ایک تصویر دکھائی جو بالکل سمجھ میں نہیں آئی۔ کچھ لکیریں اور کچھ نقوش۔ اس نے بتایا کہ اس تصویر میں سبیلو کے ایک نغمے کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس نے سبیلو کا خط بھی دکھایا جو اس نے مصورہ کو شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا تھا۔ اس کا دستخط بہت دل چسپ تھا۔ بہت لمبا اور بہت واضح۔ کاغذ پر الفاظ بہت گہرے منقوش تھے اور دستخط مجموعی طور پر بہت پُراثر۔ مجھے اپنی کم مائیگی پر افسوس ہوا کہ اس مغنی کا اس وقت تک میں نے نام بھی نہیں سنا تھا۔ غنیمت ہے کہ رنگا داس باسو اس سے قدرے واقف تھے اس لئے مصورہ کو پتہ نہ چل سکا کہ ہم لوگ اس معاملے میں بالکل کورے ہیں۔

لندن

۷ر اپریل ۵۶ء

آج انگلستان چھوڑ رہا ہوں اور ہوائی جہاز سے جرمنی اور سوئزرلینڈ ہوتا ہوا استنبول پہنچ رہا ہوں فرینک فورٹ میں پروفیسر ریٹر اور ٹیوبنگن میں پروفیسر لِتمان کو خطوط لکھ دیئے ہیں اور ملاقات کا وقت مقرر کر لیا ہے لندن میں یہ دو تین دن بڑی مصروفیت کے گذرے برٹش میوزیم اور انڈیا آفس میں مختلف قسم کی چیزیں دیکھنا ہو۔ اور نوٹس بتاتا ہے دارا شکوہ کا البم خوب چیز ہے —— لندن میں پونے تین سال قیام کے بعد بھی لندن کا البرٹ میوزیم اور دوسرے عجائب خانے نہ دیکھ سکا دو دن میں کیا دیکھتا۔ کچھ دوستوں اور کچھ معلوماتی کتابچوں کی مدد سے بس یہاں وہاں کچھ دیکھ لیا۔ ٹیٹ گیلری، لاہور کے پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کے ساتھ دو سال پہلے دیکھ چکا تھا لیکن وقت نکال کر وہاں پھر گیا۔ اب کے ٹرنر کی تصویروں کو غور سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اور کچھ نہ ہو تو لینڈ اسکیپ پر جو قدرت حاصل ہے اس کا مقابلہ انگلستان کا کوئی مصور مشکل ہی سے کر سکے گا۔ اس کے بعض شاہ کاروں کے عکس بھی خریدے اور چلتے چلاتے روداں کے حسین ترین شاہ کار "بوسے" کو ایک نظر دیکھ لیا۔ وہ تندرست جسموں کا کس قدر حسین اور پُرکیف پیچ و خم ہے جو مرمریں پتھروں سے کھود کر نکالا گیا ہے۔

زیورخ / سوئزرلینڈ

۸ر اپریل ۵۶ء

اب جہاز، بادلوں سے کہیں اوپر کوئی بیس ہزار فٹ کی بلندی پر اڑ رہا ہے انسان نے بھی کتنی ترقی کی ہے۔ عرش ملسیانی کی نظم "عظمت آدم" یاد آ رہی ہے کس قدر خوب صورت شعر ہیں۔

ابنِ آدم کو تو دیکھو کہ کہاں آ پہنچا
.... کودگاں آ پہنچا

اندھیری گلیاں

ابوسعید قریشی

اشوک کا کتبہ، موسیٰ کا مصلےٰ، سیف الملوک کی جھیل...... لفافے پر جانے پہچانے خط کو دیکھ کر اس کے دل میں کتنے ہی دیے جل اٹھے ہر قدم پر ایک نیا منظر تھا ـــ بنفشی پہاڑ، چاندی سی چوٹیاں، پسے ہوئے موتیوں جیسی چھلنی جھیلیں...... خط کے نکتے سے پھلجھڑیوں کا ایک پیڑ روشن ہو گیا ـــ برف پوش پہاڑوں کی ماہتابی تنائیں، ننگی چٹانوں کا قرب بے پایاں جھیلوں کا جلوہ! ٹُوٹُو کر تریں تو اس کو یوں محسوس ہوا تھا جیسے کہکشاں آ گئی ہے۔ اور پھر اس کہکشاں میں ایک چاند چمکا ایک سورج ابھرا ـــ کاغذ کے اس ایک پرزے سے کتنے ہی داغ سلگ اٹھے۔ اس کی آنکھوں کے آگے دھواں چھا گیا اور وہ نڈھال ہو کر صوفوں کی تہوں میں دھنس گیا۔

چاٹگام کی چٹانوں، بنگال کے پرآب راستہ بدلتے ہوئے دریاؤں کے اور سندربن کے سبز اندھیروں میں سر دے دے تھک کر وہ کراچی پہنچا تھا۔ لیکن وہاں اس کا کوئی ٹھور ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس نے سامان کلوک روم میں رکھا تھا۔ اور شام کی گاڑی سے پنڈی چل دیا تھا۔ جب سے اس نے بائیں خواجہ کی چوکھٹ چھوڑی تھی اسے کوئی آستاں نہیں ملا تھا۔ اس نے خود کو ہمیشہ پناہ گزین تصور کیا تھا۔ جو جان کے خوف سے بھاگ نکلا ہو۔ بزدل! اس کے دوست وحید نے ہمیشہ اس منطق کا مذاق اڑایا تھا ـــ پٹھان منہ میں نسوار رکھتے ہیں، ہندوستانی پان کی جگالی کرتا ہے، امریکی چیونگ گم کو تمدن کی علامت سمجھتا ہے۔ اور تم قنوطیت کا انگوٹھا چوستے ہو۔ مجھ کو دیکھو "جذباتیت" کو پاس نہیں پھٹکنے دیتا۔ اور خوش ہوں۔ ارے بابا کبھی حقیقت پسندی سے بھی کام لو ـــ اور اپنے ایک خط میں اس نے لکھا تھا کہ اگر تمہاری یہی حالت رہی۔ تو سندربن کا کوئی اژدہا یا برہم پتر کی کوئی مچھلی تمہیں نگل جائے گی اور اخبار میں ایک چھوٹی سی سرخی چھپ جائے گی کہ پاکستان کا ایک نوجوان سر دئیا اژدہے کے پیٹ میں! بہت ہوا تو نوجوان کے ساتھ "ہونہار" بھی لکھ دیں۔ یا پھر تمہاری ڈگریوں کا ذکر آ جائے گا ـــ اپنی کینچلی اتار دو چھٹی لو اور چلے آؤ۔ ہزارہ بڑا پر فریب علاقہ ہے۔ وہ کشمیر والی بات تو نہیں۔ اب کشمیر کے نام پر جذباتی نہ ہو جانا۔ تمہیں وہ دن یاد آ گئے ہوں گے۔ جب ہم ہر سال وہاں جایا کرتے تھے اور تم نے نیا نیا اقبال کا قصیدہ یاد کیا تھا ؎ دخترکے برہمنے . . . لیکن تم وہاں بھی ماتھا نہ ٹیک سکے۔ اماں ہٹاؤ! اچھا یہ بتاؤ کہ تم کب آ رہے ہو۔ اور ہاں تمہیں یہ سن کر خوشی ہوگی کہ اب میں شادی شدہ ہوں۔ تمہیں اس تقریب کی اطلاع یوں نہ دی کہ اتنی سی بات کے لئے کہاں زحمت دوں۔ دیگ پکانے کے لئے یہیں کسی ہوٹل میں انتظام کروں گا۔ خیر ہٹاؤ اس قصے کو تو چھٹی لے کے آ جانا یار۔ تم سے ملنے کو میرا دل بہت زور کر رہا ہے...... یہاں بھی کئی ایک اچھے خاصے پرفضا مقام ہیں۔ پھر اگلے وقتوں کی طرح سیر کو چلیں گے۔ مگر تم آؤ تو سہی۔ بیوی نے اپنے تمہارے سبھی راز شاہدہ سے کہہ ڈالے ہیں۔ اسے تم سے ملنے کا بہت اشتیاق ہے آتی دفعہ شیر کی کھال یا ہاتھی کے دانت، نہیں تم نے خود شکار کیا ہو ضرور لیتے آنا (چاہے بازار سے کیوں نہ لاؤ میں یقین کروں گا) شاہدہ یعنی بیگم وحید کی طرف ـــ کیا سمجھے! جونوں اور پرس

کی خاطر اژدہے کی کھال کی بھی فرمائش ہے۔ اور ہاں ایک تھان انگوٹھی سے گذرنے والی ململ کا۔ اور " پڑیا ایک نیلی روشنائی کی "

لیکن چار ماہ کی چھٹی پر جب وہ کراچی سے پنڈی پہنچا اور گاڑی بدلنے کے لئے اسٹیشن پر اترا۔ تو اس کے کان میں بابو جی قلی! کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی کسی نے اس کا سوٹ کیس چھین لیا۔ اس نے مڑکے دیکھا تو قلی کے بجائے وحید تھا۔

ارے تو تو سچ مچ بارہ سنگھا دکھائی دے رہا! اور وحید نے ایک ایسا قہقہہ لگایا کہ پلیٹ فارم گونج اٹھا۔

مگر تم نے تو حویلیاں پہنچنے کو لکھا تھا۔ شاہد نے کہا

میں نے سوچا وہاں جو انتظار کروں گا یہیں کیوں نہ چلا آؤں۔ دوسرا شو بھی ہو جائے گا۔ اور یہاں ارادہ کرتے دیر لگتی ہے۔ نہ اس پر عمل کرتے جو فیصلہ کرو غلطی کرو، درست یا غلط۔ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ۔ چلو اب۔

وحید کے خط سے یہ ساری یادیں متحرک فلموں کی طرح زندہ ہو گئیں۔ اور پھر جیسے چلتے چلتے فلم ٹوٹ جائے اس نے خود کو ایک اندھیرے میں محسوس کیا

کاغان کی سیر کے بعد جب وہ ایبٹ آباد پہنچے تھے تو رات سوتے میں وہ یکایک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا جیسے وہ وحید کے بنگلے کے برآمدے میں نہیں تھا بلکہ رسالو کے غار میں قید تھا۔ جس کی اندھیری گلیوں میں ہر جانب ایک عورت کے خدوخال جھلملا رہے تھے۔ اور وہ سوچنے لگا تھا جانے یہ کون ہے یہ کون ہے۔ میں نے اسے کہاں دیکھا ہے۔ وہاں ——

لفافے پر وحید کے جانے پہچانے خط سے یہ یادیں اچانک بیدار ہو گئی تھیں۔ اک ایک ——

راولپنڈی کے سٹیشن کے باہر جب وحید نے اپنی کار کا دروازہ کھولا تو اندر یکایک روشنی ہو گئی اور ایک عورت کے خدوخال نظر آئے —— ہاں جی تم لوگ ایک دوسرے سے متعارف ہو گے نہیں ہو تو ہو جاؤ گے —— وحید نے شاہد کا سامان سنبھالتے ہوئے کہا —— یہی وہ بھگوڑا ہے شاہدہ! پناہ گزین تخلص کرتا ہے جس کو سر پھوڑنے کے لئے اب تک کوئی آستاں نہیں ملا۔ اور ہاں بھئی یہ تمہارے ناموں کا بندوبست کرنا پڑے گا کچھ —— شاہد اور شاہدہ۔ اگر تم دونوں میرے دوست نہ ہوتے تو میں قانونی چارہ جوئی کرتا۔ بطور حفظ ماتقدم۔ تمہارا تو حق شفع ہوتا ہے ایک دوسرے پر —— شاہدہ جھینپ گئی اور اس کی آنکھیں جو نیند سے بوجھل ہوئی جا رہی تھیں، کھل گئیں، جیسے سو گئی ہے، ان کی پتلیاں اتنی سیاہ تھیں جیسے بنگالہ کے جنگل —— اچھا بھئی اب چلیں! وحید نے کہا —— آپ عقبی نشست میں تشریف رکھنے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں پناہ گیر صاحب۔ آگے آئیے! تم ادھر سرک آؤ شاہدہ۔ اور حضرت آپ بے تکلف ہو کر بیٹھئے۔ اگر آپ کا بازو ان محترمہ کے بازو سے چھو جائے گا تو آپ کو چھالا نہیں پڑ جائے گا —— موٹر کا دروازہ بند ہو گیا اور چھت کا بلب بجھ گیا —— مری کے راستے چلیں گے شاہدہ ہے تو خطرناک لیکن تھرل اسی میں ہے! —— ڈش بورڈ کی روشنی میں شاہدہ کا چہرہ خواب کی سی شکل اختیار کر گیا۔ چند خطوط، کچھ سائے، آبی رنگوں کا خاکہ! کار جب پہاڑ کے موڑوں پر گھومتی تو وہ شاہد کی طرف جھک جاتی جیسے گری جا رہی ہے۔ اس کی ساڑھی کا پلو پھڑپھڑا کر بار بار شاہد کے چہرے کو چھو رہا تھا اور وہ اس کی گرم، مدہوش کن، غیر مانوس خوشبو! شاہد کی کنپٹیاں دھڑکنے لگیں اور جسم پھنکنے لگا۔ اس کے جی میں آئی کہ کود جائے۔ کھڑکی سے باہر منہ نکال کر اس نے ایک لمبا سانس لیا —— کیوں کیا ہوا؟ وحید کی آواز آئی۔ ہاں تو چکر آ رہے ہیں شاہد میاں! تم کیسے سرد ہو یار۔ یا شاید تمہاری ہڈیوں میں بنگالہ کی نمی بیٹھ گئی ہے۔ ٹھہرو کوئی مناسب مقام دیکھ کر ابھی رکتے ہیں۔ یہ لو! شاہدہ کے شکن آلود لباس کو دیکھ کر شاہد پریشان ہو گیا اور اپنی بوکھلاہٹ دور کرنے کے لئے ڈکی کی طرف بڑھا۔ جہاں سے وحید ناشتہ دان نکال رہا تھا۔

سخت غیر مہذب واقع ہوئے ہو واللہ۔ ایک خاتون کو اکیلی چھوڑ کر چلے آئے، بھئی تمہاری میزبان ہیں وہ۔

کیا یہ شروع ہی سے ایسے ہی باتونی واقع ہوئے ہیں شاہد صاحب؟ شاہدہ نے پوچھا

شاہد چونک پڑا۔ اس کی آواز میں کسی بھولی بسری دھن کی کیفیت تھی۔ کسی راگ کا بھولا ہوا ٹکڑا ہو جیسے

جی ہاں! یہ بچپن ہی سے کچھ ایسا ہی واقع ہوا ہے۔ شاہد نے جواب دیا۔

کچھ ایسا! — یعنی مبہم بات — وحید نے کہا — آپ اپنا مطلب واضح الفاظ میں بیان کیجئے۔ ہماری سب مصیبتیں اسی ابہام کے باعث ہیں۔ الفاظ کا غلط استعمال — حقیقت کو حقیقت نہ سمجھنا — اس نظریہ حیات کو کبوتر کا فلسفۂ زندگی کہا جاتا ہے۔ آپ کا مطلب اگر یہ ہے کہ میں بھی واقع ہوا ہوں تو میں اس کو داد تصور کرتا ہوں۔ اور شکریہ بجا لاتا ہوں۔ تم گویا بھول گئے کہ میں علی گڑھ کے تقار خانے سے ڈی بیٹ کی ٹرافی لا چکا ہوں — فصاحت و بلاغت مجھے ورثے میں ملی ہے۔ قریش سے نسبت، عربی روایات —

عرب کے گھوڑوں اور اونٹوں کی تعریف تو تم نے بھی سنی ہوگی — شاہدہ بولی — یا پھر بدوؤں کی زبان درازی کا شہرہ ہے، خود پسندی اور تکبر کے بارے سے وا سب نجی ہیں۔

آج تو واقعی تم اس دعوے کو غلط ثابت کر رہی ہو — شاہد — شاید تمہاری موجودگی سے انہیں کچھ سہارا مل گیا ہے آج۔ ورنہ یہاں تو ایک سے دوسرا جملہ نہیں سنا ان معصوم کانوں نے — یک حرفی سے سہ حرفی ہوگئی۔ زندہ باد!

جی! یوں کیوں نہیں کہتے — شاہدہ بولی کہ مجھے اپنی آواز سے عشق ہے۔ کسی دوسرے کو بولنے کا موقع بھی دیا ہے تم نے!

خوب خوب! کہے جاؤ خدا کی قسم۔ تمہیں اپنی نسوانیت کا واسطہ ہے، رکیو مت۔

مگر شاہدہ رک گئی۔ اور ایک ساعت کے لئے مکمل سکوت طاری ہو گیا۔ قطعاً کوئی آواز نہیں تھی۔ شاہدہ کے چہرے پر یکایک جیسے دھند کا نقاب چھا گیا اور اس کے خدوخال پھر ویسے ہی نظر آئے جیسے کار کی چھت کا لیمپ یکایک چمک کر بجھ گیا تھا۔ اور اس چہرے کا تصور ہی باقی رہ گیا تھا۔ جو لیمپ کی روشنی میں چمکا تھا۔ اور وہ نیند بھری ستاروں جیسی آنکھیں پراسرار اندھیروں سے جھانکتی رہ گئیں۔

مناظرہ باز ملا! شاہد نے اس پراسرار خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ بحث ہار رہی ہو تو آواز دکس دو....

شاہدہ کی آنکھیں احسان مندی کے احساس سے چمک اٹھیں۔

وحید کے خیال سے اک ایک واقعہ پھر زندہ ہو گیا۔ اک ایک منظر۔ اک ایک آواز، سُر اور سُرتیاں

پیچ کا پر خطر راستہ، کنہار کے کف آلود کنارے، ندی نالوں کا شور، گہرے کھڈوں پر پل سراٹاتے تختے، اندھے موڑ جن کے اس طرف جانے کھڈ کہ چٹان اور سہمے ہوئے سانس! وحید اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا اور پچھلی سیٹ پر شاہد اور شاہدہ تھے۔ سانس روکے ہوئے کہ اس موڑ کے اس طرف جانے کیا ہو گا، زندگی یا موت! ہر قدم پر یہی احساس ہوتا تھا۔ کہ راستہ ختم ہو گیا۔ کبھی سہارا لینے کے لئے اور کبھی محض خوف سے شاہدہ کا ہاتھ کئی بار اس کے ہاتھ سے چھو اٹھا۔ اور ہر بار ایک اجنبی عورت کے لمس سے شاہد کے بدن میں سنسنی دوڑ گئی تھی۔ مگر وحید حسب معمول قہقہے لگاتا، سگریٹ اڑاتا، فقرے کستا رہا — اگر موت کو ایک حقیقت تصور کر لیا جائے — اس نے کہا تھا — تو موت بے معنی ہو جاتی ہے۔ عین موت کی ساعت اس زندگی کے مقابلے میں آنکھ کا پلکارا بھی نہیں جو آدمی کو آدمی کے ساتھ کاٹنے کی اذیت اور سمجھنے کی کوشش میں گذارتی ہے اور جب وہ کسی حد تک اس گورکھ دھندے کو سمجھنے کے قابل ہوتا ہے تو بلاوا آجاتا ہے کہ فلاں ابن فلاں حاضر ہے! — خیر ہٹاؤ! تھرمس لاؤ اور کافی کی بات کرو۔ کافی کے نام پر مجھے زین العابدین کی منقال عورتیں یاد آجاتی ہیں — اے سبحان اللہ کیا فلیور ہے — ارے تم دونوں تو سولی پر ٹنگے نظر آرہے ہو — یہ کاغان ہے پیارے — بدیع الجمال کا دھمال، موسیقی جانتے، نہیں۔ خیر مشرقی پاکستان کی سناؤ۔ سنا ہے وہاں دھان کے کھیتوں میں زمین چلتی ہے اور آدمی کھڑا رہتا ہے....

شاہد کو اپنے سفر کی ایک ایک منزل یاد آگئی ——— ناران ——— شوگران، اور سیف الملوک کی جھیل ——— گائیڈ نے کہا تھا کہ چاندنی رات کو یہاں اب بھی پریوں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے، وہ چٹان، جس کی اوٹ میں سیف الملوک نے بارہ برس اپنے خوابوں کی محبوبہ کا انتظار کیا تھا۔

بارہ برس کہا تم نے؟ وحید نے پوچھا

جی ہاں! گائیڈ نے جواب دیا

تو وہ بھاڑ جھونکنے والی مثل آج سمجھ میں آئی۔ سخت جاہل تھا جو ایک خیالی مخلوق کی خاطر بارہ برس عمر عزیز کے غارت کر دیے۔ یہ ہمارے دوست بھی کچھ ویسے ہی گھامڑ واقع ہوئے ہیں جس طرح بعضے آدمی خالص گھی کی تلاش کرتے ہیں اسی طرح یہ حضرت بھی، کسی منزل، کسی آستاں، عشقِ حقیقی اور بے لوث محبت جیسے کسی مقصدِ عظیم کی خاطر سندر بن دھندلکوں میں گم ہیں ——— اور یہ ہماری محترمہ ——— ابھی ہماری اس عمر میں بھی ہزار داستان کے افسانوں کا اعتبار کرتی ہیں۔

بوکھلائے ہوئے گائیڈ نے باری باری تینوں سیاحوں کی طرف دیکھا اور گلا صاف کر کے پھر اپنا رٹا ہوا سبق دہرانے لگا ——— اور بارہ برس کے انتظار کے بعد ایک روز پریوں کی پھڑپھڑاہٹ اور گھنگھروؤں کی چھن چھنا چھن سنائی دی۔ اور ایک تخت اترا۔ عاشق نامراد کی مراد بر آئی۔ اور بیگم صاحب یہیں، اسی پتھر پر جس پر آپ کھڑی ہیں، اسی مقام پر بدیع الجمال نے اپنے کپڑے اتار دیے۔

شاہد کی نگاہیں شاہدہ کی طرف اٹھیں اور اسے محسوس ہوا جیسے پریوں کی شہزادی سچ مچ اپنے پیدائشی حسن میں اس کے سامنے بے حجاب کھڑی ہے ان کی نگاہیں ٹکرائیں اور جھک گئیں۔ شاہدہ نے اپنی شال اپنے گرد زور سے لپیٹ لی۔ شاہد اپنے تصور سے گھبرا گیا۔ لگراتے وحید کا قہقہہ سنائی دیا۔

قربان جائیے اس نازک خیالی کے، ایسی عینی شہادت کو تو مرتا بھی مان لینے کو جی چاہتا ہے۔ نشان تمغہ دے دیا ——— اور اسے پھر قہقہوں کا دورہ پڑا۔

مگر تم نے یہ نہیں سوچا کہ اگر آدمی ہر چیز کو روایتی پیمانوں سے ناپنے بیٹھ گیا تو دنیا کا سارا ادب، ساری شاعری، سارا آرٹ ختم ہو جائے گا ——— شاہدہ نے کہا ——— اور تائید کے لیے شاہد کی طرف دیکھا۔

بھابی ٹھیک کہہ رہی ہیں مسٹر میٹر آف فیکٹ۔

لچر شعر، پوچ کہانیاں، گھٹیا تصویریں اور بھونڈے مجسمے ختم ہی ہو جائیں تو اچھا ہے ——— دماغی الجھنوں، ذہنی بیماریوں اور جنسی جرائم کے اعداد و شمار پر اس کا خوشگوار اثر پڑے گا۔ میں نے اس مضمون کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور کم از کم اس پر ایک جواب مضمون ضرور تحریر کر سکتا ہوں ——— کیا سمجھے! مگر اب آگے بڑھیئے سیف الملوک صاحب ہمیں واپس بھی جانا ہے.....

اور یہ ٹوٹو سر ہے جناب، موتیوں کا تالاب! گائیڈ نے کہا۔ اس کے پانی میں جادو کی تاثیر ہے۔ کہتے ہیں ملکہ نورجہاں کی آنکھیں دکھتی تھیں ——— ٹوٹو سر کے چند چھینٹوں سے روگ جاتا رہا اور ملکہ نے اسے نین سکھ کا نام دیا۔

شاہد اور شاہدہ کی نگاہیں ٹکرائیں۔ کہیں بادلوں کے دامن سے روشنی کی ایک کانپتی ہوئی کرن جھیل کی سطح پر پھسلتی ہوئی نکل گئی۔ شاہد کو اپنے سامنے ہر طرف موتیوں کا زیور دکھائی دیا ——— نورجہاں۔ نین سکھ!! ایک چاند نکلا، ایک سورج ابھرا۔ اور کائنات اس کا طواف کرنے لگی فضاؤں میں آفاقی نغمے گھل گئے۔

اور اگر میں تمہارا نام نورجہاں رکھ دوں! وحید کی کھنکتی ہوئی آواز پھر سنائی دی۔ لیکن جہانگیر کا تشخص متنازعہ فیہ ہے۔ اور اس نے معنی خیز نظروں سے شاہد کی طرف دیکھا۔

کیا بکواس ہے! شاہد اور شاہدہ نے ایک ساتھ کہا۔

تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے شاید۔

شاید۔ یعنی آپ کو اپنی قوتِ فیصلہ کا اعتبار نہیں۔

تمہاری بذلہ سنجی ابتذال آمیز ہوتی جارہی ہے۔ شاہد کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔

آپ ٹھیک کہتے ہیں شاہد بھائی۔ بعض اوقات تو ان کی حقیقت پسندی تکلیف دہ حد تک پہونچ جاتی ہے۔

ارے! PANZERS MOVEMENT۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ... کہ... خیر ہٹاؤ۔ اب ایک سنیپ ہوجائے تم لوگوں کا۔ تھینک یو! سبحان اللہ کیا کیمرہ ہے ایسا لینز ہے کہ منہ بولی باتوں کی تصویر کھینچتا ہے۔ شاہدہ ایک تصویر تم اتاروگی اب۔ میری اور شاہد کی۔ اور وہ شاہد کے بازو میں کھڑا ہوگیا۔ خدا قسم اگلے زمانے یاد آگئے۔ بُرا تو نہیں مان گئے میری باتوں کا۔ شاہدہ کو چھیڑنے میں مجھے مزا آتا ہے دراصل۔ وہ کیا کہا تھا چچا غالب نے؟ ارے تم ابھی فوکس بھی نہیں کرچکیں۔ پیرلیکس ریموو کرنے کے لئے انگشت و نگاہ کی انتہائی کوآرڈی نیشن درکار ہوتی ہے جناب۔ ساز ملانے اور فوکس کرنے میں اناڑی عمریں غارت کردیتے ہیں۔ صحیح فوکس حقیقت شناس آنکھ ہی کرسکتی ہے....

اور ان بادلوں کے پیچھے نانگا پربت ہے — گائیڈ کی آواز آئی — جس کا بھید کوئی نہیں جان سکا — مگر وحید کی نگاہیں شاہدہ پر گڑی ہوئی تھیں۔ اور اس کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ ابھی ابھی قہقہے لگا رہا تھا۔ مگر گائیڈ کہہ رہا تھا — نانگا پربت، جس کا برفانی حسن کتنے ہی جواں سال کوہ پیماؤں کے گرم لہو کو سرد کرچکا ہے جس کی تسخیر ابھی باقی ہے۔

اگر ایورسٹ سر ہوسکتی ہے تو یہ بھی نہیں بچے گی — وحید کی کھنکھتی ہوئی آواز پھر سنائی دی — یہ دوشیزہ بھی سہاگن ہوجائے گی....

وحید کے خطاب سے یہ ساری باتیں یوں زندہ ہوگئیں جیسے شاہد ٹیلی ویژن سیٹ کے سامنے بیٹھا تھا۔ اور ادھر اس کی سیاحت پر رواں تبصرہ ہو رہا تھا۔ سکرین کی روشنی یکایک بجھ گئی۔ اور پھر وہ اس رات کے اندھیرے میں کھوگیا جب وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔

اس رات سوتے میں اس کو یکایک سخت قسم کی گھٹن کا احساس ہوا۔ جیسے اس کی تمام تشنۂ تکمیل آرزوؤں نے اسے اپنی باہنوں میں جکڑ لیا۔ اسے اپنے قریب ہی، چاروں طرف اس چہرے کے خدوخال نظر آئے۔ جسے اس نے کہیں دیکھا تھا۔ اس نے خود کو وہ دیو تصور کیا جو رسالو کی رانی کے پہلو سے اٹھ کر ندی، نالوں اور پہاڑوں کو پھلانگتا ہوا اس غار میں آچھپا تھا اور جو اس عورت کی مدد کے لئے پل بھر کو نہیں رکا تھا۔ جس کو اس نے اپنے جادو سے رام کرلیا تھا مگر وہ غار پراسرار اندھیروں میں ہر جگہ موجود تھی اس کے نقش یوں جھلملا رہے تھے جیسے کار کی چھت کا بلب بجھ جانے کے بعد کوئی تصور باقی رہ گیا تھا۔ کالی کجراری نیند بھری آنکھیں اور گالوں پہ لہراتی ہوئی بالوں کی لٹیں — کوہسار کی ہوا شاہدہ کے چہرے سے اڑتے ہوئے آنچل سے ٹکرائی۔ اور کوئی مدہوش کن گرم اور مانوس خوشبو اس کے ذہن میں بیدار ہوئی اس سے چند ہی گز کے فاصلے پر وحید کے پلنگ کے برابر شاہدہ کا بستر تھا۔ وہ ہلکے فاختئی رنگ کی شال اوڑھے سو رہی تھی تنفس سے اس کے شال میں مدوجزر کی سی کیفیت تھی۔ یا جیسے کنارے سے بندھی ہوئی ناؤ ڈول رہی ہو۔ پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہہ جانا چاہتی ہو۔ شاہد کے سینے میں طوفان سا اٹھا۔ اور اس کے جی میں آئی کہ شاہدہ کے ادھ کھلے ہونٹوں کو جو شاید کچھ کہتے کہتے رک گئے یا کہنے کو کھلے تھے۔ ان سوئی ہوئی آنکھوں۔ ماتھے پر لہراتی ہوئی زلفوں اور اس کے سارے سراپا کو چوم لے اور چومتا چلا جائے۔ وہ خواہشات جو شاہد کے دل میں کئی دن سے پرورش پا رہی تھیں

اور جنہیں اس نے ڈانٹ ڈانٹ کر بار بار سلایا تھا۔ یہ ایک بالغ اور آزاد ہو گئی تھیں۔ اس نے نیند میں ان کو کسی ماں پہ آمادہ دیکھا تھا اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا یہ کیسے ممکن ہے! وہ سوچنے لگا۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے! بچپن کا دوست، بھائیوں سے عزیز۔ اور اس کی —— ! ممکن —— ایسا نہیں ہو سکتا —— اس قدر کمینہ کون ہو سکتا ہے! —— وہ اٹھ کر صحن میں ٹہلنے لگا —— دسویں کا چاند دیوار کی شاخوں سے جھانک رہا تھا —— نازِ حسن محبوب گیسوؤں کے سایے۔ اس نے سگریٹ سلگایا۔ کہیں دور چنگ کی آواز سنائی دی اور سیف الملوک کی اداس دھن بھری سے دیکھ کے حسن جہاں پری دادا ریغ پیا گل لالے —— شاہد کے خیالات پھر اپنے محور پر مرکوز ہو گئے۔ اور اس کے سراپا کی ایک ایک تفصیل، تفصیل جس کو اس نے اپنے آپ سے بھی چھپے چوری جانے کب جمع کیا تھا اس کی نگاہوں میں ابھرنے لگی۔ لباس کی نمائش، رنگوں کا امتزاج۔ اس عمر میں اتنے شوخ رنگوں کا شوق کم دیکھنے میں آتا ہے۔ آبی رنگوں، بوئے گل ہولئے بہار کی طرح لطیف، شفاف اور پریوں کی جمیل اور بدیع الجمال کے جلوے کی طرح لافانی۔ لولوبرا اور نور جہاں کے حسن جہاں تاب کی مانند، اور وہ خم، وہ قوسیں، نشیب و فراز —— دفعتاً درختوں کے سایوں میں کوئی سویا ہوا جھینگر جاگ اٹھا۔ جھینگر کی صدا شاہد کو کسی آگ بجھانے والے انجن کے سائرن کی طرح سنائی دی۔ اس کا اپنا جسم جلتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے گریبان کے بٹن کھول دیے۔ پہاڑ کی اوٹ سے جہاں رسالو کا غار تھا۔ دھند کے مرغولے اٹھ رہے تھے چاند چھپ گیا اور سارے میں جیسے دھنکی ہوئی روئی اڑنے لگی۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔

صبح جب وہ ناشتے کی میز پر بیٹھا تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اور نگاہیں کہیں دور خلاؤں میں دیکھ رہی تھیں۔

آپ کی طبیعت تو اچھی ہے شاہد بھائی؟

ہوں؟ وہ چونک پڑا۔ جی ہاں، شکریہ۔ ویسے ذرا تھکان ہو گئی —— اور ہاں وحید میں واپس جا رہا ہوں بھائی۔

بہتر! وحید نے نہایت اطمینان سے چائے کی چسکی لگاتے ہوئے کہا۔

ایک ضروری کام یاد آ گیا

ہاں ہاں تم جانا چاہتے ہو تو اس کی ضرور کوئی معقول وجہ ہو گی۔ وحید نے، روزمرہ کے لہجے میں کہا۔

اور شاہد کو اپنی دوستی کا اصول یاد آ گیا۔ کہ انفرادیت کی پرورش اور احترام! کوئی کسی کے کام میں دخل نہیں دے گا۔ صرف ضمیر کی پابندی ہمارا آئین ہو گی۔ انسانیت کے ارتقا کی آخری منزل جس میں استبداد کا نام نہیں ہو گا...... اپنے حلف وفاداری کی سبھی شقیں اس کو ایک ایک کر کے یاد آ گئیں مگر وحید کہہ رہا تھا۔

اچھا بھئی! اب کے ہم آئیں گے تمہارے پاس۔ سنا ہے سلہٹ بڑا خوب صورت علاقہ ہے —— چار شاہدہ! ارے تم کیسی میزبان ہو، مہمان ٹھٹھر رہا ہے بے چارہ۔

شاہدہ چونک پڑی۔ اس کا چہرہ دھند میں چھپے ہوئے سورج کی طرح زرد تھا۔ پیالی بڑھاتے وقت اس کی انگلیاں شاہد کے ہاتھ سے چھو گئیں اور پیالی ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ وحید نے قہقہہ لگایا۔

تم بھی اس سیٹ کو سنبھال سنبھال کے رکھتی تھیں کہ جہیز کا ہے —— لو اب —— بڑی خوشی ہو رہی ہے مجھے۔

قصور میرا ہے وحید!

میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا؟ نہیں، سوال یہ نہیں کہ قصور کس کا ہے —— قصور کسی کا بھی نہیں —— چینی کے برتن کو ٹوٹنا ہی چاہیے —— ٹوٹنا اس کا مقدر ہے ورنہ وہ چینی نہیں سفال ہے، سنگ ہے! ٹوٹنا چینی کی خوبی ہے، بلکہ ٹوٹنا ہی چینی کی خوبی ہے۔ اس کی

قدر و منزلت ابھی سے ہے کہ نازک ہو، آبگینوں کی طرح، دل کی مانند، نگاہ سے فیصلہ ہو جائے، گھنٹی سی بجے، جل ترنگ سی گونجے، نغمۂ خوابیدہ کی بازگشت کی بازگشت، ـــــ مگر شکست کی آواز! افسوس غالب اس راز کو نہ سمجھ سکا۔ یہی شکست تو گل نغمہ و پردہ ساز ہے۔ کن! تخلیق کی ہر صدا درد و کرب کے پردوں سے ابھرتی ہے ـــــ مگر میں کیا بک رہا ہوں ـــــ تمہیں جانا ہے . . . . . .

وحید کے خط کو دیکھ کر یہ ساری باتیں اس کے ذہن میں بیدار ہو گئیں۔

پیارے شاہد ـــــ وحید نے لکھا تھا ـــــ تمہیں معلوم ہے کہ میں بلا ضرورت کبھی خط نہیں لکھتا۔ شاعر نہیں کہ دوست کو غزل سنانا اور اس سے داد لینا منظور ہو۔ موجد نہیں کہ اپنی کسی ایجاد کا ذکر کروں۔ فلسفی نہیں کہ زندگی سے پہلے کیا تھا اور موت کے بعد کیا ہوگا کے چکر میں سر کھپاؤں۔ سیدھا سادا پریکٹیکل قسم کا آدمی ہوں۔ تمہاری خیریت ہمیشہ نیک مطلوب رہی ہے اور اب پہلے سے بھی زیادہ نیک مطلوب ہے۔ اور ہمیشہ رہے گی۔ (خود ہٹا کٹا ہوں اس لئے تصور نہیں کر سکتا کہ تم بیمار بھی ہو سکتے ہو۔ صحت ماشاء اللہ تمہاری بھی اچھی ہی رہی ہے۔ کونین تو سنا ہے ادھر صبوحی کی طرح استعمال ہوتی ہے اس لئے ملیریا کا بھی ڈر نہیں۔) تو؟ تو اس خط کا مطلب۔ بے تاب نہ ہو۔ صبر کرو کیونکہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے! ـــــ ہاں تو یہ خط بھی کسی ضرورت سے لکھ رہا ہوں۔ یعنی کہ بہرحال لکھ رہا ہوں۔ لفاظی معاف۔ اور یہ میری زندگی کی سب سے اہم تحریر ہے۔ ذرا سنبھال کے رکھنا کیونکہ ممکن ہے کسی دن عجائب خانے والے مانگ بیٹھیں کیونکہ ہمارے ہاں جو چیزیں کسی کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ انہیں عجائب خانوں کی نذر کر دیا جاتا ہے ـــــ مگر بات رہی جا رہی ہے۔ جواز اس خط کا! تو سنو ـــــ جب سے تم گئے ہو ہزارے پر خزاں چھا گئی ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں جذباتی نہیں ہوں۔ لیکن جو چند دن تم یہاں گزار گئے ہو ان سے مجھے اپنے چاروں طرف نئی زندگی نئی خوشیوں کا احساس ہوا تھا۔ جیسے سرما کی برف پگھلنے کے بعد سبزہ پھوٹتا ہے . . . . اور کائنات سوتے سے جاگ پڑتی ہے۔ ساون کی جھڑی کے بعد کوئی پراسرار نقاب اپنا نقاب الٹ دیتی ہے اور سورج کی سنہری دھوپ میں کندن کی طرح جگمگا اٹھتی ہے۔ میرے چاروں طرف خوشیوں کی فضا تھی۔ شاہدہ خوش تھی اور میں خوش تھا۔ سیف الملوک کا بے ہودہ قصہ مجھے بے حد دل چسپ معلوم ہوا۔ اور اشوک کا کتبہ (بڑا سیدھا آدمی تھا بے چارہ، اپنے ہم جنسوں کو نہ سمجھ سکا۔ اور انسانیت کی آس لگائے جگہ جگہ مکتی شانتی اور نجات کے کتبے گاڑتا پھرا) مگر بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ یہ زبان شاعر سہ تری جوانی تک۔ ہاں تو شاہدہ خوش تھی اور میں خوش تھا۔ تمہیں یاد ہوگا کہ باری مرحوم مجھے کہا کرتے تھے کہ تجھے عشق نہیں ہو سکتا۔ اور تم جانتے ہو کہ میں نے کبھی کسی کی خاطر اختر شماری نہیں کی۔ زندگی کو روگ لگانے کا فائدہ۔ زندگی آدمی کو صرف ایک بار عطا ہوتی ہے۔ اس کو ملال کرنا کفرانِ نعمت ہے۔ دیوانگی ہے۔ اور روگ بھی عشق سا۔ ایک سودائی لیلے لیلے پکارتے ببول کا کانٹا ہو گیا۔ دوسرا دیوانہ تیشہ سے سر پھوڑ مرا وغیرہ وغیرہ۔ تو میں نے کہا کہ عشق کے روگ سے مجھے خدا نے محفوظ رکھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود جب میں نے پہلی بار شاہدہ کو دیکھا تو مجھے پنجابی کا وہ بیت یاد آ گیا ـــ

منڈا موہ لیا تو تیاں والا . . . .

اور معاً مجھے خیال آیا کہ اسے میری بیوی ہونا چاہئے۔ ایک تندرست، تعلیم یافتہ، خوبرو لڑکی کے سوا مجھے اور کیا چاہئے تھا۔ یہ ساری خوبیاں ذرا مشکل ہی سے اکٹھی ہوتی ہیں۔ قبول صورت لڑکیوں کو تو یار لوگ تعلیم بھی مکمل نہیں کرنے دیتے! اور پھر یہ حاسد مرد حفظ ماتقدم کے طور پر سیدھی سادی بھولی بھالی لڑکیوں کو جن کے ابھی کھیل کود کے دن ہوتے ہیں۔ ماؤں کی ذمہ داریاں سپرد کر دیتے ہیں۔ لیکن میں شاہدہ کی بات کر رہا تھا۔ اس پر بھی چاروں طرف سے یلغار ہوئی۔ لیکن ماں باپ کی روشن ضمیری اور اس کی اپنی بالغ نظری آڑے آئی۔ اور جب مجھے خیال آیا کہ اسے میری بیوی ہونا چاہئے۔ تو وہ فارغ التحصیل ہو چکی تھی اور تم جانتے ہو کہ شکل و صورت کچھ اپنی بھی بری نہیں۔ خیر سے نوکر بھی ٹھہرا۔ چنانچہ شادی ہو گئی۔ اور بظاہر بڑی کامیاب۔ اس کا حسن، اس کی سلیقہ شعاری اور شائستگی تم خود دیکھ چکے ہو۔ اچھی تربیت، اچھی تعلیم، اور اچھا خون (میں اب تک اس کا قائل ہوں) بڑی نیک، بڑی شریف، وفا شعار، خدمت گذار

فرض شناس، خوش مزاج! لیکن اس کے باوجود مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اس کو بیدار نہیں کر سکا۔ حسن خوابیدہ ہو جیسے۔ بلّور کا خوبصورت جھاڑ، جس کی روشنیاں ان جلی پڑی ہوں۔ میں نے سوچا شاید اجنبیت ہے دور ہو جائے گی۔ لیکن شاید مجھ میں وہ شعلہ نہیں جو اس شمع کو روشن کر سکتا۔ ہوا جب اس کے بلور کی صراحیوں سے گذرتی تھی تو آواز تو ضرور آتی تھی لیکن نغمہ بیدار نہیں ہوتا تھا۔ جیسے وادی سرِ غاب ہو، ساز کی طربیں نہ ملی ہوں۔ مگر پھر ایک رات میرے گھر کی چھت سے آویزاں بلور کی صراحیاں پازیب کی طرح بج اٹھیں اور مجھے "انار کلی" میں جشن کی رات اور نبستی کی وہ غزل یاد آ گئی۔ جو مصنف نے نادرہ سے گوائی ہے ۔۔

اے ترک غمزہ زن کہ مقابل نشستہ

شیش محل کے کونوں سے ایک ایک شعاع لاکھ لاکھ بار چمکی اور چکا چوند کر گئی ـــــ مگر یہاں سے یہ قصہ انار کلی کے افسانے سے الگ ہو جاتا ہے ـــ ان نگاہوں میں مدہوشی نہیں تھی، بیداری تھی، ادب تھا، احترام تھا، وارفتگی میں احتیاط شامل تھی۔ سرشاری تھی مگر ہوش کے ساتھ۔ جب یہ نگاہیں آپس میں ٹکراتیں تو چاروں طرف زندگی کی رو بہ نکلتی۔ جیسے کڑاکے کی سردی میں آتش دان روشن ہو جائے۔ ہزارے کی وادیوں اور کاغان کی جھیلوں نے ایسی جگمگاہٹیں نہ دیکھی ہوں گی۔ محبت کی اس فضا نے جو میرے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی مجھے بھی سرشار کر دیا ـــــ تم حیران ہو گے کہ یہ شاعر دشمن شخص شاعری کر رہا ہے۔ ہاں! میں نے کہا تھا نا کہ یہ خط میری زندگی کی سب سے اہم تحریر ہے اور پھر میں شاعروں کا دشمن تو ہوں لیکن اچھے شعر سے مجھے ہمیشہ شغف رہا ہے (ورنہ میں تم ایسے مصرعۂ بے طرح کی داد کیسے دیتا) لیکن بات رہی جاتی ہے ـــــ اور پھر فانوس یکا یک بجھ گیا۔ بلور کی صراحیاں برف کی ڈلیاں بن گئیں۔ نغمہ خاموش ہو گیا۔ ساز اداس! تمہارے جانے کے بعد شاہدہ بجھ گئی۔ جیسے فلم دیکھتے وقت لاؤڈ سپیکر فیل ہو جائے اور صرف ہونٹ ہلتے نظر آئیں۔ تمہیں دیکھ کر وہ جاگ اٹھی تھی۔ مگر اب ـــــ تم مداہنت کی سوچ رہے ہو گے کہ دوست پر تہمت لگا رہا ہے مجھے اس بارے میں صرف اتنا کہنا ہے کہ کاش مجھ پر بھی کسی نے محبت کی تہمت لگائی ہوتی! رہے تم، سو اس میں تمہارا یا شاہدہ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ دلوں کی باتیں کبھی کسی کی سمجھ میں نہیں آئیں۔ تمہاری نظریں جب بھی ملتیں تو میں نے پھولوں کی بارش ہوتی دیکھی ہے۔ وہ حسین تو تھی ہی تمہاری نگاہوں نے اسے دلبری سکھا دی۔ سیف الملوک اور لُولُو سر کے کنارے میں نے شاہدہ کو بدیع الجمال اور نور جہاں کے قالب میں دیکھا ہے مگر تمہارے جانے کے بعد سیف الملوک اور لُولُو سر ساکن پانی کے آسیب زدہ جوہڑ ہیں۔

مگر شاعری بہت ہو چکی یار۔ حد سے بڑھ گئی تو مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو جائے گی۔ بات مختصر کرتا ہوں۔ ایک بار شاہدہ کو بیدار دیکھنے کے بعد میں اسے خوابیدہ نہیں دیکھ سکتا۔ میں اسے پھر خوش و خرم دیکھنا چاہتا ہوں۔ سنگ مرمر کے مجسمے پر طلوع آفتاب کی سرخی، دھوپ کی زندگی بخشنے والی گرمی، جوان امنگوں کی حدت۔ اور پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم میرے لئے کیا کر سکتے ہو؟ ٹھہرو میں بتاتا ہوں۔

تم دونوں شریف زادے ہو۔ ایک بچپن کا جانی دوست، ایک جس نے مجھ کو اور جس کو میں نے تین مرتبہ قبول کیا، دونوں کا اپنا اپنا مقام ہے۔ تم نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی نہ کر سکتے ہو جو آئین دوستی اور وفاداری کے خلاف ہو ـــــ مگر تمہاری وضع احتیاط سے میرا دم گھٹنے لگا ہے۔ میں نے جب بھی شاہدہ کے سامنے تمہارا ذکر چھیڑا وہ اٹھ کر چلی گئی۔ چنانچہ میں نے ایک روز صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ تمہیں شاہد سے عشق ہے لیکن بوالہوسوں نے عشق کو ایسا بدنام کیا ہے (اور ان میں تمہارے شاعر بھی شامل ہیں) کہ شریف لوگ محفل میں عشق کا لفظ بھی استعمال نہیں کرتے۔ اگر کسی نے مرد اور عورت کی محبت سے ہٹ کر بھی بات کی تو عشق کو ایسا معما بنا دیا۔ اور خود اس میں الجھ کر رہ گیا۔ خیر ہٹاؤ۔ یہ بحث چل نکلی تو خواہ مخواہ کفر کا فتوے لگ جائے گا ـــــ تو میں نے شاہدہ سے کہہ دیا کہ تمہیں شاہد سے عشق ہے اس پر اس کا چہرہ پہلے زرد اور پھر سرخ ہو گیا اور اس روز مجھے معلوم ہوا کہ حسین عورت کا غصہ بھی کتنا حسین ہوتا ہے۔ وہ بھڑک اٹھی اور سسکیاں لیتے ہوئے میری گندہ ذہنی کو کوسنے لگی اور کہا کہ تم اس کے بھائی ہو ـــــ تم بھی شاید یہی کہو گے، بہن بھائی بہنا

کے اس رشتے کو ہم نے ہمیشہ مجبوری کا فلسفہ قرار دیا ہے۔ دو اجنبی روحوں کے درمیان دوستی ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ بھائی بہن نہیں ہو سکتے۔ مرد عورت جب ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ تو اس کی انتہا وہی ہوتی ہے جس کا فرائڈ کی نفسیات میں ذکر آتا ہے۔ ورنہ ذہنی بیماریاں پیدا ہوں گی۔ اس کا مہذب اخلاقی اور ترقی یافتہ علاج شادی ہے۔ لیکن یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ جہاں ایک مرد تو دوسری شادی سے بھی اس قسم کے فطری تقاضے کو پورا کر سکتا ہے، 'عورت کے لیے' شریف ماں باپ کی بیٹی اور شریف شوہر کی بیوی کے لیے اس میں صرف گھٹ گھٹ کے مرجانا ہی باقی رہ جاتا ہے اور ایک نہیں دو بلکہ پوری نسلیں بے جوڑ شرکت کی نذر ہو جاتی ہیں۔ حالانکہ آدمی اگر غلط اقدار، جھوٹی وضعداری اور جہالت سے کام نہ لے۔ تو خوشی کا ایک سیدھا، مستند، اخلاقی اور ترقی یافتہ راستہ بھی موجود ہے۔ جس کو مغرب نے تو اپنا لیا لیکن ہم بھول گئے۔ اور مذہب کی اجازت کے باوجود اسے مذموم قرار دیا —— طلاق! —— بڑا خوفناک لفظ ہے لیکن اس کا سیدھا سادا مطلب محض علیحدگی ہے اور اس معمولی سی حقیقت کو نہ سمجھنے سے قبول اور ایجاب کی آزادی حبس دوام کا حکم بن جاتی ہے اور وہ آغوش جس کی حسرت میں شاعری کی بانہیں سوکھ جاتی ہیں، حلقۂ زنجیر بن جاتی ہے۔ لاکھوں زندگیاں اس کے سرد لمس سے سن ہو چکی ہیں —— تو ان بانہوں کو کیوں نہ کسی زیادہ حقدار کی گردن کے لیے آزاد کر دیا جائے! —— بظاہر یہ بڑی چونکا دینے والی بات ہے۔ معاشرے کی لعن طعن وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ایسے معاشرے کی ایسی کی تیسی جو خوشی کے راستے میں کانٹے بچھا دے اور زندگی کو عذاب بنا کر خوش ہو —— میں اس معاشرے کے خلاف بغاوت کا اعلان کرتا ہوں اور تم کہ میرے بچپن کے دوست ہو اور مجھے سمجھتے ہو، اس میں میرا ساتھ دو گے۔ دو محبت کرنے والی روحوں کو ایک دوسرے سے منسلک کر کے صرف میرا روحانی درد و کرب ہی ختم نہیں ہوگا بلکہ خوشی ہو گی۔ ہم نے ہمیشہ ایک سے خیالات، ایک نصب العین سے محبت کی ہے۔ یہ ہم ایک ہی عورت سے محبت نہیں کر سکتے! تم شوہر کی حیثیت سے اور میں دوست کی حیثیت سے۔ میں BEST MAN کے فرائض سرانجام دینے کے لیے سلہٹ آ رہا ہوں۔ شاہدہ میرے ساتھ ہوگی۔

شاہد کے ہاتھ سے خط چھوٹ گیا۔ اور اس کے سامنے پھر وہی منظر ابھرے —— اشوک کا کتبہ، موہنے کا میلا، سیف الملوک کی جھیل اور موتیوں کا تالاب، اور اس کو محسوس ہوا جیسے کہکشاں قریب آ گئی ہے۔ اس کہکشاں پر ایک چاند ابھرا، ایک سورج طلوع ہوا اور وہ نڈھال ہو کر صوفے کی تہوں میں دھنس گیا۔'

ڈینگ ڈینگ اسمبلی

فکر تونسوی

پورے چار کروڑ باشندوں کی نمائندہ "ڈینگ ڈینگ اسمبلی" کا اجلاس شروع ہونے کی گھنٹی بجی تو ہر آنریبل ممبر نے فوراً اپنے ڈیسک پر رکھا ہوا لمبا عمودی کلاہ اٹھایا اور سر پر پہن لیا۔ رولز کے مطابق جو ممبر کلاہ پہن کر نہیں بیٹھتا تھا، عوام کا نمائندہ تسلیم نہیں کیا جاتا تھا ۔۔۔ ڈینگ ڈینگ اسمبلی کے قواعد سخت جمہوری تھے۔

اجلاس کا آغاز کرنے کے لیے مہا منتری آنریبل ٹاک ٹوں ٹوں اپنی نشست سے اٹھے اور بولے "صدر محترم اور آنریبل ٹھینگو! آج کے ایجنڈے کی سب سے پہلی مد ہے "قحط" اس لیے میں "قحط" پر بحث کا آغاز ......"

اچانک حزب مخالف کے رہنما آنریبل پھوں پھوں نے فوراً اپنی جیب سے ایک سیاہ رومال نکال کر فضا میں لہرایا جس کا مطلب یہ تھا کہ ملک پر کوئی پراسرار بلا نازل ہونے والی ہے اس لیے اس بلا پر بحث مقدم ہے ۔۔۔

سیاہ رومال کے احترام میں آنریبل مہا منتری فوراً اپنی نشست پر بیٹھ گئے اور صدر محترم نے آنریبل پھوں پھوں سے کہا "سیاہ رومال کی رو سے آپ کے بولنے کو فوقیت دی جاتی ہے۔"

آنریبل پھوں پھوں کا قد ناٹا تھا اس لیے وہ پنجوں کے بل کھڑے ہو کر ابھرے اور بولے ۔۔۔

"صدر محترم! مسئلہ اتنا سنگین اور دردناک ہے کہ میرے تمام آنسو میرے حلق میں اٹک گئے ہیں اس لیے مجھ سے بولا نہیں جاتا لیکن پھر بھی میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ نئی دلی سے ٹرنگ ڈونگ تک جو سڑک بنائی گئی ہے، اس کا نام "شوں شتراں کھابسی چوڑ روڈ" کیوں رکھا گیا ہے حالانکہ کھابسی چوڑ ایک معمولی آدمی تھا اور وہ "شوں شتراں" تو قطعی نہیں تھا ۔۔۔"

"لیکن یہ قحط سے زیادہ سنگین مسئلہ تو نہیں ہے۔" مہا منتری ٹاک ٹوں ٹوں نے فوراً موقع ملاحظہ کی اور جواباً سفید رومال ہلایا۔

"سنگین ترین ہے۔" آنریبل پھوں پھوں نے پھر سیاہ رومال ہلایا "کیونکہ سڑک کا یہ نام رکھنے پر پورے چار کروڑ عوام کے نازک تمدنی جذبات کو انتہائی صدمہ پہنچا ہے اور وہ گذشتہ دو راتوں سے نہیں سوئے جس سے ملک میں بغاوت پھوٹنے کا خطرہ ہے۔"

ایک آنریبل ممبر نے دوسرے آنریبل ممبر سے سرگوشی کی "چلو لابی ریسٹورنٹ میں چل کر بادام کا شربت پئیں" ۔۔۔ اور وہ بلیوں کی طرح بڑی احتیاط سے فرش پر اپنے پنجے رکھتے ہوئے باہر چلے گئے۔

باقی آنریبل ممبروں نے ان کی طرف حسد سے دیکھا۔

آنریبل پھیوں پھیوں نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا ——— "میرا، اوہ معاف کرنا، پونے چار کروڑ عوام کا خیال ہے کہ شمبو ٹراں ایک مقدس آسمانی خطاب ہے اور کھا ایسی جو اس کا اہل بالکل نہیں تھا کہ اسے آسمانی دیوتا بنا دیا جاتا، نہ صرف اسے یونا بنا دیا جاتا بلکہ سٹرک ایسی اہم تمدن آمیز چیز کا نام بھی اس کے نام پر رکھا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ عوام کے تمدنی جذبات سخت مجروح ......"

ایک لمبے قد اور پتلے جسم کے آنریبل ممبر جو اب تک اخبار پڑھنے میں مصروف تھے، بدستور اخبار ہاتھ میں لیے اٹھے اور بولے "کیا میں آنریبل مہامنتری سے پوچھ سکتا ہوں کہ آنریبل محرک کس سٹرک کی بات کر رہے ہیں؟ کیا ایسی کوئی سٹرک بنائی گئی ہے؟ اور اگر بنائی گئی ہے تو کہاں؟ اور اگر نہیں بنائی گئی تو کیوں ———؟"

آنریبل مہامنتری نے کہا۔ "سٹرک بننے کی رپورٹ اخباروں میں چھپ چکی ہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔" اس ممبر نے جیسے اطمینان کا سانس لے کر کہا اور پھر اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔

"کیا میں اپنی تقریر جاری رکھوں؟" آنریبل پھیوں پھیوں نے اٹھ کر پوچھا۔

"میرا خیال ہے، نہیں۔" آنریبل مہامنتری اسمبلی کے آئین کی کتاب ہاتھ میں لیے اٹھے اور بولے "ہمارے ڈینگ ڈینگ آئین کے صفحہ نمبر ایک سو اڑسٹھ، دفعہ نمبر پندرہ کے پیرا نمبر اٹھارہ کی رو سے چونکہ شمبو ٹراں کھا ایسی جو روڈ کا ابھی افتتاح ہی نہیں ہوا اس لیے یہ مسئلہ سیاہ رومال کی دفعہ کے تحت نہیں آسکتا۔"

اور مشرقی کونے کے آٹھ دس ممبر اونگھنے لگے اور ان کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے ایجنڈے کے کاغذ نشستوں سے نیچے جا گرے۔

ایک آنریبل لیڈی ممبر نے اپنے طلائی بلاؤز میں سے ایک چمکیلا پین (PEN) نکالا اور ایجنڈے کی کاپی پر اپنا نام لکھا، پھر لکھا، پھر لکھا اور پھر لکھتی رہیں۔

ایک سفید ریش، ضعیف ممبر جو شروع سے ہی اپنی گردن جھکائے اداس بیٹھا تھا خود بخود بڑبڑایا "ڈینگ ڈینگ قوم کا زوال نزدیک آپہنچا ہے ———"

آنریبل مہامنتری کے آئینی نکتہ اٹھانے پر صاحبِ صدر چونکے اور انھوں نے زور سے گھنٹی بجائی (جس سے ان کی ہتھیلی پر چوٹ آگئی) اور وہ بولے ———

"اس سوال پر ہاؤس کی کیا رائے ہے۔ کیا بحث سٹرک پر ہونی چاہیے یا قحط پر؟"

"سٹرک پر! سٹرک پر!!" پرمسرت آوازیں گونجیں۔

"——— ہاتھ کھڑے کیجیے، آوازیں نہیں، کیونکہ میں آوازیں نہیں گن سکتا۔" صدر نے اپنے حکم میں مزاح پیدا کرنے کی خاطر کہا۔

ہاتھ کھڑے ہوئے، گنے گئے، سٹرک کے حق میں ایک ہاتھ کم نکلا، دوبارہ گنے گئے، ایک ہاتھ زیادہ نکلا لہٰذا صاحبِ صدر نے کہا ———

"بحث سٹرک پر ہی ہوگی کیونکہ یہ مسئلہ ایک تمدنی قحط سے تعلق رکھتا ہے جو غذائی قحط سے زیادہ بھیانک ہے۔ آنریبل ممبران یاد رکھیں کہ تمدن اور غذا میں وہی فرق ہے جو دماغ اور معدہ میں ہے۔"

ہاؤس نے اس عالمانہ فقرہ پر پرجوش تالیاں بجائیں۔ خود صاحبِ صدر بھی اپنے اس فقرہ پر اتنے خوش ہوئے کہ وہ تالی کے بجائے اپنی گھنٹی بجانے لگے۔

اب آنریبل محرک جناب پھوں پھوں اپنی بغل میں ایک ضخیم گرنتھ دبائے ہوئے اٹھے اور بولے ——

"صدرِ محترم! سب سے پہلے میں لفظ "شوں شڑاں" کی تشریح کروں گا۔ شوں شڑاں وہ ہے جو انسان نہ ہو بلکہ شوں شڑاں ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ آسمانی چیز ہو مگر کھابسی جوج زمین پر رہتے تھے کبھی آسمان پر نہیں گئے۔ یہ دیکھیے ہمارے ملک کے اس مقدس گرنتھ میں صاف لکھا ہے کہ شوں شڑاں صرف وہی ہو سکتا ہے جس کے پنکھ ہوں مگر میں پوچھتا ہوں کیا کھابسی جوج کے پنکھ تھے؟"

مہامنتری ٹاناک ٹوں ٹوں نے دانت پیس کر ڈکارا "کیا آنریبل پھوں پھوں نے کھابسی جوج کو دیکھا تھا؟"

"نہیں، مگر میرے پاس ان کی تصویر موجود ہے جس میں ان کے پنکھ بالکل نہیں ہیں۔"

یہ کہہ کر انھوں نے جیب سے ایک چھوٹی سی تصویر نکالی۔ یہ ایک نحیف و نزار، سفید لمبی داڑھی والے کسی سادھو کی تصویر تھی۔ انھوں نے پورے ہاؤس کو یہ تصویر دکھائی جسے دیکھ کر ہاؤس کے آدھے ممبر بیک وقت چلا اٹھے ——

"یہ تصویر نقلی ہے، نقلی ہے۔"

"یہ تصویر اصلی ہے، اصلی ہے۔" باقی آدھے ممبر بھی چلائے۔

اسمبلی ہال میں ایک نشاط انگیز سی حرارت پیدا ہو گئی۔ "اصلی ہے، نقلی ہے" کے ٹکڑے نے جیسے ایک موسیقیت سی پیدا کر دی۔ میزوں پر تال دیے جانے لگے۔ چند ممبر آپس میں بحث کرنے لگے ——

"نقل اور اصل میں بڑا فرق ہوتا ہے۔"

"کیسے؟" دوسرے نے کہا۔

"مثلاً تمھارے دانت اصلی نہیں ہیں، نقلی ہیں۔"

"مگر میرے تو دانت ہی نہیں ہیں۔" اس نے اپنا پوپلا منہ واضح کرتے ہوئے کہا۔

ایک اور ممبر نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے ممبر سے کہا "تمھارے جبہ پر جو ہیرے جڑے ہیں وہ نقلی معلوم ہوتے ہیں۔"

دوسرے نے جواب دیا "مگر یہ تو میں نے آپ کی ہیروں کی دکان سے ہی خریدے ہیں۔"

"تو پھر میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔"

سفید ریش آنریبل ممبر گردن جھکائے بڑبڑایا "ڈینگ ڈینگ قوم کا زوال نزدیک آ پہنچا ہے۔"

صدرِ محترم جو اس شور و غل سے فائدہ اٹھا کر اپنے ایک دوست کو ضروری خط لکھنے میں مصروف ہو گئے تھے اچانک اپنی ذمہ داری کے احساس سے چونکے اور گھنٹی بجا کر بولے ——

"اسمبلی کے قاعدہ نمبر بی، سن نین سو چار کی رو سے میں مہامنتری کو مشورہ دوں گا کہ تصویر متنازعہ فیہ ماہرین کی ایک کمیٹی کے سپرد کر دی جائے جو چار دن تک رپورٹ پیش کرے کہ تصویر اصلی ہے یا نقلی —— اور بحث جاری رکھی جائے۔"

صاحبِ صدر کے اس حکم پر دونوں فریقین نے خوشی کی تالیاں پیٹیں جو ظاہر کرتی تھیں کہ دونوں کی فتح ہوتی ہے —— اور پھر مہامنتری نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے وزیرِ آمد و رفت آنریبل "جاتو جا جا" کے کان میں کہا کہ اب آپ اپنی جوابی تقریر شروع کریں۔ آنریبل سڑک منتری اپنے ہاتھ میں سڑک مذکورہ کا ایک نقشہ لے کر اٹھے اور بولے ——

”معزز ممبران! میں اپنے چند غیر متمدن دوستوں پر یہ انکشاف کرنا چاہتا ہوں کہ کھالسی جی نہ تصویر تھے نہ سڑک نہ پنکھا، وہ ان سب فانی چیزوں سے ارفع و اعلیٰ تھے۔ وہ تو اس کائنات کی روح تھے اور عوام ان کی یوں پرستش کرتے تھے جیسے ....“

”جیسے آپ اپنی گھوڑی کی کرتے ہیں۔“ ایک مخالف ممبر نے فوراً فقرہ مکمل کر ڈالا۔

ہاؤس ایک طویل قہقہہ میں بدل گیا۔ صدرِ محترم بھی ایجنڈے کی کاپی کی اوٹ میں مسکرا دیے۔ لابی میں بیٹھے ہوئے ممبران بھی اپنے اپنے شربتِ بادام کے گلاس ہاتھوں میں اٹھائے اندر آ گئے اور قہقہے میں شامل ہو گئے۔ ایک متانت زدہ پتھریلے چہرے والا ممبر اس سطحی مذاق پر بے حد غصہ میں آ گیا اور بطور احتجاج باہر چلا گیا اور وہاں سگریٹ پینے لگا۔ اس کے اس احتجاج کا کسی کو پتہ نہ چلا —— اس کے پیچھے ایک اور ممبر بھی کھسک گیا۔

آنریبل لیڈی ممبر نے اسے کھسکتے دیکھا تو وہ بھی اس کے پیچھے لپکی کیونکہ کھسکنے والا ممبر پامسٹری کا عالم تھا اور اس نے لیڈی ممبر کو بتا رکھا تھا کہ تمھیں جلد ہی کہیں سے دس لاکھ سکّے ملنے والے ہیں۔

آنریبل سفید ریش ممبر نے لیڈی ممبر کو چور نگاہوں سے جاتے دیکھا اور بڑبڑایا ——

”ڈینگ ڈینگ قوم کا زوال قریب آ پہنچا ہے۔“

قہقہے مدھم پڑے تو صدرِ محترم نے کہا ”آنریبل جاتو جا جا اپنی تقریر جاری رکھیں۔“

”میں اب نہیں بولوں گا۔“ آنریبل سڑک منتری ناراض سے ہو گئے۔

”ہاں، یہ نہیں بولیں گے۔“ آنریبل مہامنتری ٹامک ٹوئیں ٹوئیں گرج کر کہنے لگے ”جس ہاؤس میں پونے چار کروڑ عوام کے دلوں کے شہنشاہ، محترم شری شتراں کھالسی جو جیسی مقدس ہستی پر پھبتیاں کسی جائیں وہاں بولنا...... ؟ میں کہتا ہوں یہ ایک سازش ہے اور پونے چار کروڑ عوام اس سازش کا سر کچل کر رکھ دیں گے۔“

”عوام ہمارا سر نہیں کچلیں گے۔“ آنریبل پھوں پھاں نے چیلنج کیا۔

”کچل ڈالیں گے۔“ چیلنج منظور کر لیا گیا۔

”نہیں کچلیں گے۔“

”کچلیں گے۔“

”نہیں، کیونکہ عوام ہمارے ساتھ ہیں۔“

”نہیں، ہمارے ساتھ ہیں۔“

”ہمارے ساتھ ہیں۔“

”ہمارے ساتھ ہیں۔“

گیلری میں بیٹھے ہوئے ایک ڈرامہ نگار رپورٹر نے یہ بے ساختہ ڈائیلاگ فوراً اپنی کاپی میں نوٹ کر لیا۔

صدرِ محترم نے جو ایک بار پھر اپنے دوست کو خط لکھنے میں مصروف ہو گئے تھے، ایک بار پھر ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے گھنٹی بجائی۔ گھنٹی کی آواز سن کر اونگھتے ہوئے ممبروں نے قدرے آنکھیں کھولیں اور فوراً ہی بند کر کے پھر اونگھنے لگے۔ صدرِ محترم نے کہا ——

”عوام ہم سب کے ساتھ ہیں، بحث آگے بڑھائی جائے۔“

"عوام ہم سب کے ساتھ نہیں ہیں اس لیے ایک تحقیقاتی کمیشن بٹھایا جائے جو یہ رپورٹ کرے کہ عوام کس کے ساتھ ہیں۔" ایک ممبر نے جمہوری نکتہ اٹھا دیا۔

مہامنتری ٹاملک ٹوں ٹوں ایک لمبا سا کاغذ لے کر اٹھے اور بولے "کمیشن کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ آج صبح ہی مجھے عوام نے یہ دستاویز بھیجی ہے جس میں انھوں نے صریحاً تسلیم کیا ہے کہ وہ میرے ساتھ ہیں۔"

حزبِ مخالف کے رہنما آنریبل پھوں پھوں نے فوراً اٹھ کر ایک اور لمبا کاغذ ہوا میں لہرایا اور بولے "مجھے بھی عوام کی طرف سے یہ دستاویز موصول ہوئی ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ وہ میرے ساتھ ہیں۔"

صدرِ محترم نے مسکرا کر گھنٹی بجائی۔ "خاموش! خاموش! میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ عوام ہم سب کے ساتھ ہیں اس لیے میں مہامنتری سے کہوں گا کہ وہ سڑک پر اب سرکاری نقطۂ نگاہ پیش کریں۔"

اس بار مہامنتری کے لہجہ میں ایک مصنوعی انکسار اور مصالحت تھی۔ عوام کی دو الگ الگ دستاویزوں نے ان کی اخلاقی طاقت کو کمزور کر دیا تھا۔ وہ بڑی ملائمت سے بولے ——

"میں حزبِ مخالف کے دوستوں سے اپیل کروں گا کہ وہ بلند مزاج بنیں، میں بھی بنوں گا۔ سڑک کے نام میں تھوڑی سی ترمیم کر لیتے ہیں۔ اگر انھیں لفظ شوں پر اعتراض ہے تو اس کی بجائے "ڈوں" کر دیا جائے جس کا مطلب ہے خدا کا پرستار۔"

ایک ممبر نے اٹھ کر کہا۔ "بلند مزاجی کی خاطر یہ ترمیم ہمیں منظور ہے لیکن مہامنتری بھی بلند مزاجی کے نام پر ہماری ایک ترمیم منظور کریں کہ کھابسی جو میں سے جو کا لفظ نکال دیں۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ جو کا مطلب ہے نیک، مگر کھابسی قطعی نیک نہیں تھے اس لیے اس ہاؤس میں نیکی کی لاج رکھی جائے اور سڑک کا نام "ڈوں شڑوں کھابسی روڈ" رکھا جائے۔"

"شڑوں بھی کاٹ دیا جائے۔" ایک اور ممبر گرجا۔ "کیونکہ علمِ لسانیات کی رو سے ڈوں اور شڑوں اکٹھے نہیں آ سکتے۔ زبان کا یہ غلط استعمال ہمارے تمدنی ارتقا کو تباہ و برباد کر دے گا۔ یہ علمی دیوالیہ پن قوم کو ڈبو دے گا اس لیے سڑک کا نام ڈوں کھابسی جو روڈ رکھا جائے۔"

"—— پھر آپ نے جو جڑ دیا۔ یعنی ڈوں بھی اور جو بھی۔ آپ کیا دیکھ نہیں رہے کہ اس سے صوتی آہنگ کتنا بگڑ گیا ہے۔ نام وہ رکھا جائے جو غزل کا ایک مصرع معلوم ہو جیسے عرض کیا ہے۔ "یہ ہے ڈوں کھابسی کی روڈ۔""

ایک آنریبل ممبر نے لہرا کر مصرعہ دہرایا اور بولے "اوں ہوں، آہنگ تو بن گیا مگر "ڈوں" یہاں نہیں چلے گا۔ سڑک کے ساتھ کوئی مقدس نام نہیں چلے گا۔ عوام اعتراض کریں گے۔"

"تو اس کا متبادل لفظ بتائیے۔"

"ٹوں!"

"اس کا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ٹوں یعنی "بس یوں ہی ——""

"مجھے منظور ہے، اس سے وزن میں بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"مجھے بھی منظور ہے۔" مہامنتری نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ "کیا ہاؤس کو منظور ہے؟"

"قطعی نہیں، قطعی نہیں۔" آنریبل پھوں پھوں نے تڑپ کر کہا۔ "اصل قابلِ اعتراض لفظ تو کھالیسی ہے کیونکہ اس سے عوام کو چڑ ہے، کیا اس لفظ کے ہم معنی کوئی اور لفظ نہیں ہے؟"

"ہے —— مگر پہلے کھالیسی کے معنی بتایئے۔" شاعر نما ممبر نے کہا۔

"کھالیسی کا مطلب ہے" سایہ کرنے والا ——"

"یعنی جیسے پیڑ کا سایہ ہوتا ہے کیا؟"

"ہاں!"

"تو پھر رکھئے "یہ ہے دوں پیڑ کی روڈ۔""

"شرم شرم شرم!" مہامنتری مشتعل ہو گئے۔ "ایسی مقدس ہستی کو آپ ایک درخت بنا رہے ہیں۔ ایک عظیم روح کی یہ توہین؟ ہائے! اس عظیم روح کا ایک فقرہ۔ مجھے اس وقت فوراً یاد آ رہا ہے۔ کہ شیطان جب یہ کہے کہ وہ خدا سے نہیں ڈرتا تو اس کا مطلب ہے وہ ڈرتا ہے یہی وجہ ہے کہ آپ بھی ان کے نام کی برکت سے ڈر رہے ہیں اور خدا کو پیڑ بنا کر دراصل اپنا ڈر چھپا رہے ہیں۔"

یہ کہہ کر مہامنتری نے اپنے حمایتیوں کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں، یہی موقع ہے تالی بجاؤ، چنانچہ تالی بجائی گئی۔ ایک حمایتی نے تالی نہیں بجائی کیونکہ کل نئی کوٹھی بنانے کے اعزاز میں مہامنتری نے جو دعوت دی تھی اس میں اسے مدعو نہیں کیا تھا لہٰذا وہ غصہ میں اٹھ کر بولا ——

"—— صدرِ محترم! میں آپ کے نوٹس میں یہ بات لانا چاہتا ہوں کہ تالیاں بجا بجا کر ہاؤس کا وقت ضائع کیا جا رہا ہے۔"

"ہاں! ضائع کیا جا رہا ہے۔" ایک ساتھ کئی ممبروں کو یاد آ گیا۔

"علمِ ریاضی کی رو سے ......" اس آنریبل ممبر نے یکدم خشک لہجہ بناتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "ایک تالی بجنے پر ہاؤس کے پچیس سکّے خرچ ہو جاتے ہیں۔ پچاس تالیوں پر ساڑھے بارہ سو سکّے۔ آج پچیس بار تالیاں بجیں۔ اب آپ ضرب دیجئے، میں نے دے رکھی ہے اکتیس ہزار دو سو پچاس سکّے، اور اگر گذشتہ پچیس اجلاسوں کا شمار کیا جائے تو آٹھ لاکھ سکّے —— صدرِ محترم! آٹھ لاکھ سکّے —— قوم کے لہو سے نچوڑے ہوئے سکّے آٹھ لاکھ سکّے، تالیوں کی اس بنجر دھرتی میں بوئے جا چکے ہیں اور اس وقت —— معاف کیجئے، مجھے رونا آ رہا ہے۔"

یہ کہہ کر آنریبل ممبر رونے لگا۔

"ڈینگ ڈینگ قوم کا زوال قریب آ پہنچا ہے۔" سفید ریش ممبر بڑبڑایا۔

آنریبل مہامنتری گھبرا گئے اور آئین کی ضخیم جلد پر اپنا کانپتا ہوا ہاتھ رکھ کر سہارا لیا۔ آنریبل پھوں پھوں تیزی سے آنریبل 'رونے والے' کے پاس پہنچ گئے اور اپنے کالے رومال سے اس کے آنسو پونچھنے لگے۔ صدرِ محترم آنسوؤں کے وقفہ کو غنیمت جان کر دوبارہ خط لکھنے لگے۔ آنریبل لیڈی ممبر نے اپنے طلائی پین سے ایک کاغذ پر لکھا۔ "آٹھ لاکھ نہیں دس لاکھ سکّے ملنے والے ہیں۔" آنریبل پھوں پھوں نے آنسوؤں سے بھیگا ہوا رومال غصہ میں آ کر مہامنتری کی طرف پھینکا اور با آوازِ بلند کہا۔ "یہ دیکھئے آنسو، عوام کے آنسو، دس لاکھ آنسو جو آپ کی پالیسیوں پر بہے ہیں۔"

"یہ مگرمچھ کے آنسو ہیں۔" مہامنتری نے جواب دیا۔

"یہ بہتان ہے، یہ آنسوؤں پر بہتان ہے، عوام کے آنسوؤں پہ بہتان ہے۔" آوازیں آئیں۔

"واپس لو! واپس لو۔" آوازیں آگے بڑھیں۔

مہامنتری ٹاماک ٹوں نے جل کر کہا: "آپ لوگوں کے خلاف میرے پاس بھی کافی بہتان ہیں اور اگر آپ نے کھالسی مجھ کو آسمانی ہستی نہ مانا تو مجبوراً میں بھی یہ بہتان ہاؤس کے سامنے پیش کر دوں گا۔"

"اور اگر بہتان غلط نکلے ——— تو سزا؟" کسی نے اشتعال دلایا۔

"میں اپنی وزارت توڑ دوں گا۔" اشتعال کام آیا۔

"منظور ہے! منظور ہے!" خوشی سے چور چور آوازیں آئیں۔

آنریبل مہامنتری اب سنبھل گئے اور بولے: "مثلاً یہ آنریبل پھوں پھوں جنھیں سٹرک کے نام پر سخت اعتراض ہے انھوں نے ہی اس سٹرک کا ٹھیکہ حاصل کیا تھا اور تین لاکھ سکّے کمائے۔"

"شرم شرم شرم!" مہامنتری کے حامی بولے۔

آنریبل پھوں پھوں بجلی کی طرح تڑپ کر اٹھے: "مگر ان تین لاکھ میں سے ایک لاکھ سکّے میں نے مہامنتری کو واپس دے دیے۔"

"کیسے؟"

"ان کے جنم دن کے تحفہ کے بہانے۔"

"شرم شرم شرم!" آنریبل پھوں پھوں کے حامی گرجے

"ہاں ہاں، اور انھی ایک لاکھ سکّوں سے مہامنتری نے میری دکان پر سے نیا فرنیچر خریدا۔" ایک ممبر نے اطلاع دی۔

ہاؤس ایک بار پھر دلفریب گرمی سے معمور ہو گیا۔ کئی ہنسنے لگے، کئی رومال ہلانے لگے، کئی چیخنے لگے، کئی تھاپ دینے لگے، کئی گانے لگے صدرِ محترم نے خط کا آخری فقرہ مکمل کر لیا اور گھڑی کی طرف دیکھنے لگے کیونکہ انھیں گھوڑوں کی ریس پہ جانا تھا۔

آنریبل سٹرک منتری "جاتو جاجا" نے مہامنتری کے کان میں کہا: "کیا واقعی آپ نے ایک لاکھ سکّوں کا فرنیچر خریدا تھا؟"

"ہاں! اور بدمعاشی دیکھیے کہ فرنیچر کا نرخ بازار کے نرخ سے زیادہ لگایا گیا، مجھ سے دھوکا کیا گیا۔"

"آپ دھوکا دہی کا مقدمہ کر دیجئے۔"

"نہیں، میں اس دھوکا دہی کے خلاف استعفیٰ دے دوں گا۔"

"اگر استعفیٰ دینا ہے تو سٹرک کے سوال پہ دیجئے، فرنیچر کے سوال پر نہیں۔"

"نہیں، میں فرنیچر کے سوال پر دوں گا۔"

آنریبل لیڈی ممبر جو اب بے حد اکتا چکی تھی ایک جماہی لے کر آنریبل پامسٹ ممبر سے بولی: "میری بگھی کا ایک گھوڑا مر گیا ہے اس لیے مجھے یہ بتائیے کہ کیا وہ دس لاکھ سکّے مجھے جلدی نہیں مل سکتے، میرا مطلب ہے کل شام تک مل جائیں، ذرا ایک بار پھر ہاتھ دیکھ لیجئے۔"

آنریبل پامسٹ نے کہا: "ہاؤس کے حالات کے ستارے نئی چال چل رہے ہیں، شاید آج وزارت ٹوٹ جائے گی اور کل صبح جو نئی وزارت بنے گی، اس میں آپ کو وزیر ضرور بنایا جائے گا اور پھر دس لاکھ سکّے آپ کے قدموں میں پڑے ہوں گے۔ یاد رکھئے پامسٹری کوئی سطحی علم

نہیں ہے اس کی جڑیں ہمارے تمدن میں بڑی گہری جاچکی ہیں۔"

یہ سن کر آنریبل لیڈی ممبر درخت کے پتے کی طرح لہرانے لگی۔

اب ہاؤس کا شور و غل مدھم پڑ گیا تھا، حلق تھک چکے تھے۔ صدرِ محترم نے اس تھکاوٹ کو بھانپ کر کہا "ہاؤس پانچ منٹ تک مزید چالو رہے گا —— میں آنریبل ممبران کا ممنون ہوں کہ آج انھوں نے ملکی تمدن کے متعلق گہرے تعلقات کا ثبوت دیا۔ اگرچہ ہم بظاہر کسی فیصلہ پر نہیں پہنچے لیکن کبھی نہ کبھی ضرور پہنچیں گے۔ آخر میں میں مہامنتری سے کہنا چاہتا ہوں کہ کیا وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں! میں کہنا چاہتا ہوں کہ ......" سفید ریش آنریبل ممبر نے پہلی بار گردن اٹھائی اور بولا "... کہ ڈبنگ ڈبنگ قوم کا زوال قریب آپہنچا ہے۔"

تھکے ہوئے ممبران کھل کھلا کر ہنس پڑے، مہامنتری نہیں ہنسے بلکہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھے، ان کے چہرے پر شکست کی زردی کھنڈ چکی تھی۔ آنکھیں بے حس تھیں، انھوں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا ——

"صدرِ محترم! میں بھی یہی کہنا چاہتا ہوں کہ ڈبنگ ڈبنگ قوم کا زوال قریب آپہنچا ہے۔ جو قوم معمولی فرنیچر کی فروخت پر دھوکا دیتی ہے وہ قوم آج بھی ڈوبی اور کل بھی۔ ایسی قوم کا مہامنتری رہتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے اور میں اس غیر متمدن رویہ پر اپنی وزارت کا استعفیٰ پیش کرتا ہوں اور ...... اور ...... اور ......"

یہ کہتے کہتے ان کا گلا رندھ گیا اور وہ دم لینے کے لیے اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔

مہامنتری کے اس اعلان پر پرجوش تالیاں بجائی گئیں۔ دونوں فریقین کی طرف سے —— اور پھر سبھی ممبر اٹھ کر حزبِ مخالف کے رہنما آنریبل پھوں پھوں کے گرد مکھیوں کی طرح اکٹھے ہو گئے اور انھیں مبارک باد دینے لگے۔ سب سے پہلے آنریبل لیڈی ممبر نے مبارک دی اور اپنا نیا طلائی پین نکال کر بڑے پیار سے آنریبل پھوں پھوں کے چغے میں لگا دیا۔

دوسرے دن جب ڈبنگ ڈبنگ اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا تو مہامنتری آنریبل پھوں پھوں ایجنڈے کی کاپی ہاتھ میں پکڑے ہوئے کہہ رہے تھے ——

"آنریبل ممبران! ایجنڈے کی پہلی مد "قحط" ہے اور میں قحط پر بحث کا آغاز کروں گا۔"

اتنے میں حزبِ مخالف کے رہنما آنریبل ٹاک ٹوں ٹوں نے اٹھ کر فضا میں سیاہ رومال ہلایا اور بولے "صدرِ محترم! قحط سے زیادہ نازک مسئلہ یہ ہے کہ اسمبلی ہال سے نہر ڈگ مگ ڈولے تک جو سڑک بنائی گئی ہے اس کا نام ......"

(دہلی۔ ۱۰۔ ستمبر ۵۹ء)

لجیا

شکیلہ اختر

دیوالی کا حسن اپنے عروج پر تھا، مکانوں کی چھتوں، گھروں کے منڈیروں، کوٹھیوں کے احاطوں اور بالکنی کے کنگوروں پر چراغوں کی قطاریں جگمگا رہی تھیں اور آسمان کے ستارے جیسے زمین پر اتر آئے تھے۔ جگہ جگہ بجلی کے رنگ برنگے قمقمے لہک لہک کر اپنی بہاریں لٹا رہے تھے، در و دیوار سے خوشیاں پھوٹی پڑتی تھیں۔ برقی روشنیوں اور مرکری روڈوں سے لہکتی ہوئی سجاوٹ، لال کپڑوں سے لالوں لال بنی، آم کے پتوں اور کیلے کے تھموں سے ہریالی ہو ہو کر، سنور رہی سنورائی ہوئی گیٹیں لکشمی دیوی کی سواگت میں منتظر کھڑی تھیں۔ ہر طرف رنگ و نور کا سیلاب امنڈا ہوا تھا اور دنیا کا سارا حسن لکشمی دیوی کے چرنوں پر نثار ہو جانے کو مچل رہا تھا۔ پٹاخوں کی آواز کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھی۔ پھلجھڑیاں زمین کی گود میں ستارے نچھاور کر رہی تھیں اور جگہ جگہ جلتی ہوئی مہتابیاں جیسے سچ مچ مہتاب کی کرنیں چرا لائی تھیں۔ ریڈیو پر بہار کے نغمے گائے جا رہے تھے، قدم قدم پر اجیالا برس رہا تھا، دنیا خوش تھی، لوگ ہنس رہے تھے، قہقہے لگا رہے تھے۔ دولت کی دیوی آج ان کی چوکھٹ پر آنے والی تھی، کڑاہیاں چڑھی ہوئی تھیں اور قسم قسم کے پکوانوں کی خوشبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔

فضا میں رنگا رنگ کے پھول کھلانے والی چرخی تیزی سے چکر کاٹنے لگتی اور پیارے پیارے لٹکتے ہوئے پھول جیسے دیوی کے چرنوں میں نچھاور ہونے لگتے تھے۔ کون جانے کب دیوی کے پوتر چرنوں سے ان کے گھر منور ہو جائیں، انھیں تو اپنی آنکھیں بچھائے ہی رکھنی تھیں۔

اکیلی باہر کے برآمدے میں بیٹھی دور کا جلوہ دیکھتے دیکھتے جیسے ہی اس نے اپنے قریب آتے ہوئے چند قدموں کی آہٹ سن کر اپنی نگاہیں سیڑھیوں پر ڈالیں ایک لڑکی اس کی نظروں کی شہ پا کے اس کے آگے بڑھ کر بولی: "دیکھیے جی! یہ بچی شاید تماشا دیکھتے دیکھتے اپنے گھر والوں سے بچھڑ گئی ہے۔"

کئی لڑکیوں کے جھرمٹ میں ایک چھوٹی سی بچی میلی کچیلی فراک پہنے اپنی حیران نگاہوں سے دیدے پھاڑ پھاڑ کر سب کو دیکھتی جا رہی تھی۔ اس کے سر کے بال چیکٹ ہو کر جگہ جگہ سے جم گئے تھے اور انھی جمے ہوئے بالوں میں ایک پتلی سی چوٹی بھی گردن پر پڑی تھی۔ بچی خاموش تھی اور اپنی آنکھوں کو جلدی جلدی جھپکتی ہوئی وہ اپنی پتلی پتلی گہرے سانولے رنگ کی انگلیوں کو بار بار مسلتی جا رہی تھی۔ چہرہ اُترا اُترا سا تھا مگر ننھے سے نازک لبوں پر رہ رہ کر اداسی بھری مسکراہٹ بھی کوند آتی تھی جیسے عالم یاس میں وہ خود ہی اپنی بے بسی کا مذاق اڑا رہی ہو۔ اس کی پھٹی پھٹی شفاف آنکھوں میں حیرت کے ساتھ اپنی بے چارگی کا گہرا احساس چھپا ہوا تھا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنا تماشا بنا رہنا اس کو اچھا لگ رہا تھا۔ اس کی عمر چھ سال سے زیادہ نہ ہوگی مگر دیکھنے میں وہ پانچ سال سے بھی کم کی لگتی تھی۔ آس پاس کی بڑی چھوٹی لڑکیاں ایک گھیرا ڈالے کھڑی تھیں۔

"اے بچی! ارے بتا دے نا کہ تیرا گھر کہاں ہے؟" ایک لڑکی نے بے صبر ہو کر اس ننھی سی بچی کو ہلا کر پوچھا۔

سب کی نظریں بچی کے سیاہ مگر نازک سے لب پر جمی ہوئی تھیں اور وہ تھی کہ مزے مزے میں بڑی خاموشی کے ساتھ اپنی کومل سی انگلیوں کو مسلتی چلی جا رہی تھی۔

"ارے بھائی سُن!" دوسری لڑکی اس کے چھوٹے فراک کو پکڑ کر اس کو ڈولاتے ہوئے بول پڑی۔ "دیکھ، ادھر دیکھ، میں تجھے اتی سی مٹھائی دوں گی ـــ ہاں ـــ اتی سی۔" وہ اپنی دونوں باہوں کو دور تک پھیلا کر لالچ دلانے لگی "ہاں اب بتا تو دے کہ تیرا نام کیا ہے۔"

"ہاں ہاں! جیسے ابھی ابھی تو نے راستے میں بتایا تھا ـــ" تیسری لڑکی نے زور سے کہا۔

بچی نے اپنی داہنی انگلی سے اپنی بائیں انگلی کو پکڑ کر اپنا ہاتھ نیچے لٹکا دیا، ایک دفعہ مڑی اور پھر اس کی حیران نگاہیں باری باری گھوم کر سب کے چہرے پر پڑیں۔ اچانک اس کی آنکھوں میں بے چارگی کے باوجود ایک چمک پیدا ہوئی اور اس کے پتلے پتلے ترشے ہوئے سیاہ لبوں پر ایک بار پھر مسکراہٹ آئی اور وہ ذرا شرماتی ہوئی راگ کے ساتھ دھیرے سے بولی "لچی ...... یا ـــ!" اور پھر جلدی جلدی اپنی انگلیوں کو وہ دوسرے ہاتھ کی انگلی سے مسلنے لگی۔

بچی سب کے منہ کو تکتی ہوئی پھر خاموش ہو گئی تھی اور اس کے فراک سے بدبو اور بساند پھیل رہی تھی۔ ساری لڑکیاں اس خواہ مخواہ کی دردسری سے اب گھبرائی جا رہی تھیں اور ان کے دل پٹاخے کی آوازوں سے شاید مچلے جا رہے تھے۔ بار بار وہ کرسی پر بیٹھی ہوئی رقی کی طرف دیکھ دیکھ کر جیسے اپنے جانے کی اجازت چاہ رہی تھیں ـــ "دیکھئے نا زبیدی! اس کا نام آپ ہی لوگوں کی طرح ہے۔ بچی ہے نا بیچاری ـــ! اسی لیے رضیہ کو لچیا کہہ رہی ہے ـــ!"

"اور آنٹی! اسی لیے تو ہم لوگوں نے اس کو آپ کے پاس پہنچا دیا ہے، آپ ہی کچھ اتہ پتہ چلا کر اس کے گھر بھجوا دیں گی ـــ! یہ بیچاری ہمارے مکان کے پاس کھڑی رو رہی تھی، ہم سارے لوگ اس کے گھر کا پتہ پوچھتے پوچھتے تھک گئے مگر یہ کچھ بھی نہ بتا سکی۔"

اب تک لڑکیوں کے ساتھ رقی بھی اس بچی کا تماشا ہی دیکھتی رہی تھی۔ ایک لڑکی نے اس کو اچانک کندھے سے ہلا کر کہا ـــ "بہن جی! ادھر آس پاس تمام اس بچی کو اپنے نوکر کے ساتھ بھیج چکی ہوں مگر نہ یہ بچی کسی کو پہچانتی ہے اور نہ کوئی اس بچی کو پہچانتا ہے۔ میرے ملازم تھک کر واپس آ گئے اور اب ہم لوگ دو گھنٹے سے اس کو اس طرح سے لیے لیے پھر رہے ہیں۔"

"ہائے اللہ! دیوالی کے اس اُجیالے میں کس کا گھر اندھیالا ہوا ہوگا؟"

رقی بچی کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ بے اختیار اس کا جی چاہا کہ اس ٹکر ٹکر تکتی ہوئی بچی کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرے مگر اس کے ہاتھ آپ ہی آپ رک گئے۔ بچی بے حد میلی چکٹ تھی اور چھوئے بنا اس کے ہاتھوں میں چپچپاہٹ محسوس ہونے لگی تھی۔

گھر کے اندر سے اپنے اپنے کام دھام چھوڑ چھاڑ کر دائیاں اور نوکر سب بچی کے گرد آ کھڑے ہوئے تھے۔ گھر کے بچے بھی حیران ہو ہو کے بچی کو تک رہے تھے، ان کے ہاتھوں میں پھلجھڑیوں کے بھرے بھرے رنگین ڈبے اور مہتابی پٹاخوں کے بنڈل تھے جن کو رو دھو کر بڑے اور اماں سے ابھی ابھی انھوں نے بازار سے منگایا تھا مگر اتنی چھوٹی سی بچی کے تماشے کے آگے وہ اپنی دیوالی منانی بھول چکے تھے۔ گھر کی پرانی کھلائی بوا بچی کے پاس آئیں اور اس کی مسلتی ہوئی پتلی پتلی کومل سی انگلیوں کو اپنے کھردرے ہاتھ میں پکڑ کر بولیں "بول بٹیا! بول، تو رے بابا کا نام کا ہے؟" بچی کھلائی بوا کے ہاتھ پکڑتے ہی اس کے پاس آ کر اس سے سٹ گئی اور اپنی بڑی بڑی اداس آنکھوں سے

ایک ٹک لگائے اس کو دیکھتے دیکھتے پھر اسی طرح دھیرے سے مسکرائی ننھے ننھے بے حد سفید دانت ذرا سا چمکے اور وہ اپنی انگلی سے کھلائی بُوا کے پکّے بدرنگ ناخن کو کھرچتی ہوئی پھر اسی راگ سے بول پڑی: "لجی ——— یا ———!"

"ہاں ہاں تورا نام تو لجیا ہے بیٹی! او تورے بابا کا نام کا ہے؟ ——— بتا دے، جلدی سے بتا دے ——— دیکھ توری میّا رو رہی ہے ——— چل بیٹی چل ——— ہم تورے گھر پے پہنچا دیں۔"

کھلائی بوا اس کا ہاتھ پکڑے سیڑھیوں سے اُتر گئیں۔ لڑکیوں کی بھیڑ بچی کے ساتھ ہی برآمدے سے اُتر کر احاطے سے باہر چلی گئی۔ گھر کے بچوں نے افسوس کی نظر اتنی سی کھوئی ہوئی بچی پر ڈال کر دل سے دعا مانگی: "یا اللہ میاں! اس بچاری کا گھر مل جائے ———" اور پھر وہ اپنے تماشوں میں لگ گئے۔

رفی کا جی بڑا ہلکا ہلکا سا لگا ——— بڑا اچھا ہوا جو کھلائی بوا اس کو اپنے ساتھ لے کر اس کا گھر ڈھونڈنے چلی گئی تھیں، نہیں تو وہ کس مصیبت میں پھنستی ——— اتنی چھوٹی سی معصوم بچی کو اپنے گھر اور اپنے والدین سے بچھڑنے کا غم دیکھتے رہنا بھی بڑے دل گردے کا کام تھا۔

"ہائے بچاری! کیسے ٹکر ٹکر سب کا منہ تکتی جا رہی تھی ——— اور کم بخت ماں کیسی تھی ڈائن! جو اپنے سیر سپاٹے میں بیٹی تک کو کھو بیٹھی ——— یا اللہ ——— کھلائی بوا کو اس کا گھر مل جائے، اور ——— اور جو نہ ملا تو ———؟ تو پھر اس کی روح پر نہ جانے کب تک کچوکے لگتے رہیں گے۔ وہ کب تک ایک ایسی سہمی سہمی سسکتی روتی اتنی سی معصوم جان کو تڑپتا دیکھتی رہے گی اور اس کے اتنے چیکٹ سے کپڑے ہیں کوئی بھی تو اس کو اپنے ساتھ سلانے پر راضی نہ ہوتا۔" یکدم سے اس کی آنکھوں تلے کتے کا وہ ننھا سا پلّا گھوم گیا جو دسمبر کی رات میں سڑک کے کنارے والے نالے میں گر کر کُوں کُوں کرتا ہوا سب کی نیند خراب کر رہا تھا ——— آخر مشکلوں سے کیچڑ میں لتھڑا ننھا سا پلّا جب نکال کر گھر کے اندر لایا گیا تو کیچڑ اور بدبو سے سب کی ناک سڑ کر رہ گئی۔ جانے کس شیطان نے اپنی بلا اس کے سر ڈال دی تھی ——— پلّا سردی سے ٹھٹھرتا ہوا مستقل کُوں کُوں کرتا جا رہا تھا اور سارے گھر میں ڈھنڈیا پڑی تھی کہ اس پر کون سی چیز ڈھانکی جائے؟ جب کہیں جا کے کوئلہ لانے والا سڑا گلا بوریا ملا تب اس سے پلے کو ڈھانپ، اور ٹوکری کے نیچے چھپا کر سب کی جان میں جان آئی تھی اور اب؟ اب تو سڑے گلے بوریے والی بات نہ تھی۔ پلّے کی سردی سے کانپتی ہوئی کُوں کُوں کو سمجھنے والا کوئی نہ تھا مگر یہ تو مسکراتے ہوئے ننھے سے لبوں پر "لجیا" کی گاتی ہوئی آواز تو آپی آپ کلیجے کے پار ہوئی جاتی تھی۔ دیوالی کے چراغوں کی جوت اب کچھ مدھم پڑنے لگی تھی۔ روشنیوں کی قطاریں جگہ جگہ سے مٹتی جا رہی تھیں، پٹاخوں کی گونج میں بھی اب وہ پہلی سی بیقراری نہ رہی تھی۔ ہر طرف جیسے ایک ہلکا سا ٹھہراؤ آتا جا رہا تھا۔ فضا میں شورے اور جلی ہوئی گندھک کی بو بسی ہوئی تھی اور شہر کے اندر دیوالی کی لہکتی ہوئی روشنی کے سیلاب میں آتشبازی کے دھوئیں کا ایک کہرا چھا رہا تھا۔

باہر برآمدے سے اُٹھ کر وہ اندر چلی آئی۔ بچے رنگ برنگی سلائیاں سُلگا رہے تھے اور فرش پر رگڑ رگڑ کر ٹپ ٹپیا جلاتے جا رہے تھے۔ اتنی سی دیر میں وہ اپنے کھیلوں میں اتنے غرق ہو چکے تھے کہ ایک کھوئی ہوئی بچی اب ان کو یاد بھی نہ رہی تھی۔

قریب ہی کسی مکان میں بڑے زور سے پٹاخہ پھٹا اور کھلائی بوا بچی کا ہاتھ تھامے اندر گھسیٹتی چلی آئیں۔ رفی کا چہرہ فق ہو کر رہ گیا۔

"یا خدا! اب کیا ہوگا؟" بچی تھک کر نڈھال ہو رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں نیند کا نشہ بھرنے لگا تھا۔ کھلائی بوا دیوار سے لگ کر ہانپتی ہوئی بیٹھ گئیں اور بلا کہے سُنے بچی ان کے گھٹنے کی آڑ لے کر بیٹھ گئی تھی۔

"رفو بی ——— اب بتاؤ ——— کا کریں؟ کہوں پتہ نہ چلا۔ گلی گلی، دروازے دروازے لیے پھرے ——— مگر بابو ——— اپنی چھوکری کا

کوئی اَور چھور نہ ملا، ایکو ایک آدمی سے پوچھا مگر کوئی ہونکاری نہ بھرا۔ اب کا کروگی؟ بس اللہ کی دین جانو۔ پتہ نساں ملا تو ملا۔ نا تو پوسو پالو۔ اَور کا ہوگا ——— !"

کھلائی بُوا کے گھٹنے سے لگی بچی نے اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو جمائی لیتے ہوئے مشکل سے کھولا ——— "نانی! کھانا دے!"

"لے بابو ——— اپنی چھوکریاں تو بڑے سبھے ہیں رستو لگا بیٹھی۔" کھلائی بُوا کے پوپلے منہ سے بے اختیار ہنسی نکل گئی اور اس درمیان میں رفی کے دل و جگر پر کیا کیا بیتتی رہی، یہ وہی جانتی تھی ——— جانے آج کس پھیر میں وہ پڑ گئی تھی ——— !

بچی بڑا بڑا نوالہ لے کر کھانا نگلتی گئی اور جب بھری رکابی پانی کا گھٹ گھٹا کر پی چکی تو پھر سردی میں ٹھنڈے فرش پر پالتو کتے کی طرح کھلائی بُوا کے قدموں سے لگ کر بڑے آرام سے بے خبر سو گئی۔

گھر کے سارے لوگ اتنی چھوٹی سی پہیلی بوجھنے کو بےچین ہو رہے تھے۔ "ارے اپنی کوئی لاوارث بھکیرا وکیر کی بیٹی ہے۔ دیکھ کچھو ٹھنڈا اَونڈھا بوجھا رہا ہے۔"

"آؤ جرا دیکھو تو بھلا، اتنی سی چھوکری کیا جگرا۔ نا ہیّا نا بابا، نا رونا نا دھونا، مجھے ہیں کہے ہے نانی کھانا دے ——" کھلائی بُوا پھر ہنس پڑیں۔

"آخر کوئی تو گھر ہوگا، کوئی تو ٹھکانا ہوگا۔ کہتے، بلّی کی بھی اپنی ایک جگہ ہوتی ہے اور وہ بھی اپنی جگہ سے ہٹ کر مچھڑاتے ہیں۔ پھر یہ بچی کسی فقیر ہی کی سہی مگر اس کو کسی کی یاد تو آتی ہوگی، آخر کہیں تو اتنی سی زندگی بسیرا لیتی ہی آ رہی تھی، پھر اس کے آنسو کیوں سوکھ گئے ہیں؟ روئے دھوئے بغیر اتنے سکون سے یہ بچی کیسے سو گئی ہے؟" رفی کا دل کانپ اٹھا، شاید اس کے پاس آنے سے قبل ہی وہ اپنے سارے آنسو بہا کر ختم کر چکی ہو اور اب اس کا ننھا سا دل تھک کر نراس ہو چکا ہو۔

گھر بھر میں کھلائی بُوا بچی کے لیے کوئی پھٹا پرانا بچھونا ڈھونڈتی پھریں۔ سامنے مسہری پر کچھ فاضل کمبل اور چادریں پڑی تھیں، رفی کا جی چاہا کہ وہ ایک کمبل اس کو اوڑھانے کے لیے دے دے مگر کسی مشینی طاقت سے اس کے ہاتھ پھر رُک گئے۔ اس نے اپنے ضمیر کو تھپک کر سُلانے کے لیے دل ہی دل میں سوچا۔ "آج تو یہ بچی بڑی گندی ہو رہی ہے، کل وہ اسے ضرور نہلوا دے گی۔" اس کی مسہری پر اس کی سب سے چھوٹی بچی سو رہی تھی۔ اس کا گول گال چہرہ بجلی کی روشنی میں بڑا پیارا لگ رہا تھا اور گورے گورے گالوں پر جلد کے اندر سے سُرخی جھلک رہی تھی۔ رفی نے بے اختیار جھک کر بے بی کے چہرے کو چوم لیا۔ اگر کہیں اس کی یہ بچی کھو جاتی تو ——— اللہ! وہ کیسی دیوانی ہو جاتی؟ کھوئی ہوئی بچی بے بی کی عمر سے بس ایک ہی ڈیڑھ سال بڑی ہوگی ——— رفی نے سوچا کہ وہ خدا کو بھول گئی ہے۔ ایسا وقت کسی پر بھی آسکتا ہے۔ کون جانے اس بچی کی ماں کہاں کہاں بِلکتی ہوئی پھر رہی ہوگی؟ وہ اٹھ کر پاس کے دوسرے کمرے میں گئی۔ کھلائی بُوا سردی کے مارے اسی میں سویا کرتی تھیں، رفی کے جانے سے پہلے ہی انھوں نے اوپر تلے دو بوروں کو بچھا کر بچی کا بستر ٹھیک کر دیا تھا مگر اوڑھانے کے لیے سارے گھر میں ڈھونڈنے پر بھی کوئی فالتو بے کار چیز نہیں ملی تھی۔ دھوبی بھی سویرے ہی سارے میلے کپڑے لے گیا تھا نہیں تو میلے کپڑوں کی ڈھولی میں سے کوئی چادر ہی نکل آتی۔ کھلائی بُوا کی آنکھوں میں رحم بھری اُداسی چھا رہی تھی۔ "ہائے معصوم پھر سنہ ہے نگوڑی! کا تھا؟ ہمرے ساتھ سو رہتی مگر اوہی بلیّا اب اوساب سے جی ڈرت ہے نا۔" رفی نے محسوس کیا کہ کھلائی بُوا کے دل میں اس کے دل سے کہیں زیادہ وسعت ہے۔ وہ جلدی سے اس کمرے سے نکل آئی، اندر برآمدے کی چھوٹی چوکی پر دری اور چادر کا فرش بچھا تھا، اسی کو اس نے

اٹھا لیا، ننگی کھری چیز کی ہمیشہ سے اس کو بڑی بُری لگتی تھی، اس وقت بھی نگاہوں میں کھٹکی ——— مگر سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے ننھے ننھے ہاتھ پاؤں اس کی نگاہوں کے سامنے تھے اور وہ اپنے جسم میں خوشی کی ایک لہر محسوس کرتی ہوئی پھر اسی کمرے میں واپس آگئی، بچی نیچے بچھے ہوئے بوریے پر سکڑی ہوئی بے خبر سو رہی تھی، بچی کو دری اور چادر اوڑھا کر رفی کے دل کو قرار آگیا تھا۔ اب اس کو بھی چین کی نیند آسکے گی، اس کے بچے بڑے افسوس سے کھوئی ہوئی بچی کے گھر اور اس کے ماں باپ کی باتیں کرتے کرتے سو چکے تھے۔

"کہاں ہو بھئی ——؟" رفی نے چونک کر قریب آتے ہوئے اپنے شوہر کو دیکھا۔

"ارے ارے یہ کیا؟ پھر کوئی کتے کا پلا وِلا آگیا ہے کیا؟" رفی کا شوہر سوتی ہوئی بچی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا تھا۔

"نہیں بھئی کتے کا نہیں آدمی کا پلا کہیں سے آگیا ہے۔" رفی بڑے دُکھ کے ساتھ بولی اور وہاں کا لائٹ بجھا کر وہ انور کا ہاتھ پکڑے اپنے کمرے میں چلی آئی۔

دوسرے دن بہت سویرے ہی کھلائی بوا اس کمرے کو دھو رہی تھیں۔ بوریے کا بستر آنگن کے ایک کنارے دھرا تھا اور لجیا سردی سے سمٹی دیوار سے لگی بیٹھی حیران نگاہوں سے گھر کی صفائی کو دیکھ رہی تھی۔ رات کو پیشاب کر کر کے وہ اسی طرح سے بھیگے ہوئے بوریے پر پڑی سوتی رہی تھی اور پیشاب کے بہتے ہوئے دھارے میں کھلائی بوا پوری طرح سے نجس ہوگئی تھیں۔

گھر کی چھوکری بجھنیاں کا وجود اس گھر والوں پر ایک بار تھا، میلی کچیلی سی لڑکی جو پھسکڑا مار کر ہر جگہ بے تکلف بیٹھ جایا کرتی تھی گت سے کپڑے پہننے تک کا ڈھنگ جس کو اب تک نہ آیا، سر جھاڑ منہ پہاڑ اور لند پھند کپڑے لٹکائے کبھی کبھی گھر کے موٹے جھوٹے کام کر دیا کرتی تھی۔ رفی اسے اپنے گھر سے لائی تھی۔ دیہات کی آزاد آب و ہوا میں پلی ہوئی چھوکری شہر کی پابندیوں اور محدود دائرے میں بے بال و پر کی ہو کر بس پھڑپھڑا کے رہ جاتی تھی اور اپنے ماں باپ، گھر اور اپنی آزادانہ زندگی کی یاد میں اس کی کھوئی کھوئی ہر گھڑی سوچتی ہوئی رہتی تھی۔ رفی نے ایک گہری نظر اپنے گھر پر ڈالی۔ گھر کی اُلجھن سے کہیں زیادہ اس کے دل و دماغ میں ایک انتشار تھا۔ وہ بچوں کو اسکول بھیج کر ہلکی پیلی دھوپ میں بیٹھی سوئٹر بُننے لگی تھی کہ لجیا کا ہاتھ پکڑے بجھنیاں اس کے پاس آگئی۔ آج وہ دُھلی دُھلائی بڑی صاف ستھری نظر آ رہی تھی اور اس کے سُوجے ہوئے گالوں پر بھی زندگی کی ایک لہر دکھائی دیتی تھی۔ لجیا بھی نہا دھو کر ایک نئے روپ میں اس کے پاس کھڑی تھی۔ اس کے باریک مٹیالے بال ہوا میں اُڑ رہے تھے، اس کا گندا ہرا فراک دُھل کر نکھر آیا تھا اور اس کے جسم پر سے میل کچیل اور چیکٹ کی اتنی تہیں اُتر چکی تھیں کہ اب اس پر بڑی پاک صاف معصومیت چھا گئی تھی۔ وہ اپنی انگلیوں کو مسلتی ہوئی نگاہیں نیچی کیے اس کے قریب ہی کھڑی تھی، اس کی انگلیاں اتنی دیر تک پانی میں بھیگتی رہی تھیں کہ ابھی تک اس پر کے نازک چمڑے سکڑے ہوئے اور نمایاں طور پر لکیر دار نظر آ رہے تھے، دھوپ میں کھڑی ہونے کے بعد بھی اب تک وہ سردی سے ٹھٹھر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں، چہرہ اُداس اور نڈھال لگ رہا تھا مگر نازک سے پتلے اور سیاہ لبوں پر شرمیلی، افسردہ مسکراہٹ اب بھی کھیل رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ اپنے اُجلے دیدے اور سیاہ پتلیوں کو اوپر اٹھا کر رفی کو اجنبی نگاہوں سے دیکھ بھی لیتی تھی۔

بجھنیاں پہلی بار مسکرائی "بیگم صاب! کا بتاویں، اتّا اتّا میل نکلا ہے اس کے بدن سے۔ توبہ! توبہ! کیسا ماٹے باپ تھا، سر میں تو جٹا پھوٹ آیا تھا بیگم صاب۔ پورے ایک گھنٹہ تک نہلایا ہے اس کو ——— جانتے ہے؟ اکیلے میں اپنی چھوکریا کھوب رولے ہے۔ کہے ہے میّا مر گئی ہے، بابا گھر پے ہے، موسی بڑا مارے ہے، اب ہم ہنیں نانی پاس رہیں گے۔"

رفی نے مڑ کر لجیا کو دیکھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس کھینچ لیا۔

"بڑی اچھی ہے لجیا ــــ ہم اس کو فراک بنا دیں گے۔ بے بی کے ساتھ گڑیا کھیلے گی ــــ کھیلے گی نا لجیا؟" اور لجیا نے اقرار میں بہت آہستگی سے اپنا سر ہلا دیا۔ رفی نے بڑے دکھ بھرے پیار سے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی ــــ لجیا کے چہرے پر افسردہ خاموشی اور اس کی نگینی آنکھوں میں بیچارگی کو دیکھ کر وہ لرز اٹھی "بتا دے لجیا۔ تیرا گھر کہاں ہے؟" رفی کے لہجے میں سچ مچ التجا بھر آئی تھی ــــ!

"ہمرا گھر بے گڑ بیکلا ہے، آؤ گیہم، بونٹ، کھیساری۔" لجیا کے ہلتے ہوئے لب خاموش ہو گئے۔ اس نے اپنے خیال میں اپنا سارا پتہ نشان بتا دیا تھا۔

کھلائی بوا قریب سرکتی ہوئی آ کر بولیں "تب تو کوئی بنیا کی بیٹی بوجھا ہے۔" کھلائی بوا کو دیکھ کر لجیا ذرا سا ہنسی، جیسے رات بھر ایک ہی کمرے میں سو کر وہ ایک دوسرے سے بہت قریب آ گئی تھیں۔

"آؤ ہمرے دوکان میں کھیرا بھی بیکا ہے۔"

کھلائی بوا سر پکڑ کے بیٹھ گئیں "یا اللہ! کوئی اور جھرنا ملے ہے۔ ابھی بنیا کی دوکان بتاتے بتاتے، لو اب کمہار کا پتہ بتاوے چلی ہے ــــ ارے کھیرا سے تو چھپر چھایا جا ہے، بھلا گڑ کی دوکان پر کا ہے کو کھیرا بکے گا۔" کھلائی بوا نے بھرپور نظر سے لجیا کو دیکھا "ہائے نہا دھو کے نگوڑی کیسی ستھری نکل آئی ہے۔ پتھر پڑے ایسی ماٹے پر جو کھوج کھبر نا لے رہی ہے۔ صبح سے گلی گلی میں سب کے کان تلے ایسی کھبر پہنچا دیا ہے کہ ہمرے گھر ایک لٹھو بھولائی ہوئی چھوکری آ گئی ہے ــــ اب جس کی ہو آ کے لے لے۔"

مجھنیاں لجیا کی گردن دکھاتے ہوئے بولی "دیکھ بوا دیکھ۔ اب او ہی گردن کیسا جھلک رہا ہے، ارے نہنے نہنے میل تھا۔ اتنا میل ــــ" مجھنیاں اپنے ہاتھ پھیلا کر بولی مگر کھلائی بوا اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ نہ دیکھ سکیں۔ وہ بڑے غور سے لجیا کی گردن میں کالی ڈوری میں پڑا پیتل کا تعویذ دیکھ رہی تھیں۔

"ارے مجھنیاں! دیکھ تو جرا۔ ای کا پیچ ہے رے؟ کلمہ لکھا نا بوجھا ہے۔" کھلائی بوا اپنی دھنسی ہوئی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر لجیا کے گلے میں پڑے تعویذ کو غور سے دیکھتی ہوئی بولیں۔

روکھے بالوں سے بھرا ہوا مجھنیاں کا سر ننھی سی بچی کے سینے پر جھک پڑا "ارے ای تو سونڈھ ہے بوا۔ سونڈھ، چار ہاتھ ہے اور آگے یہ بڑا سا سونڈھ لٹک رہا ہے۔" مجھنیاں حیرت سے منہ پھاڑ کر بولی۔ رفی کرسی سے اٹھ کر ننگے پاؤں ان کے پاس آ گئی۔ اس نے تعویذ کو دیکھتے ہی پہچان لیا کہ لجیا کے گلے میں گنیش جی کی تصویر جھول رہی تھی۔ کھلائی بوا بات کی تہہ تک پہنچ گئی تھیں، ان کی خاموش نگاہیں بچی کی معصوم صورت کو ایسے تک رہی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں "اب کیا ہو گا؟" کھلائی بوا بڑی جہاندیدہ تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ صبح ہی صبح جب لجیا نے ان کو بتایا تھا کہ میا مر گئی ہے اور موسی اس کو مارتی رہتی ہے تو اسی وقت ان کا ماتھا ٹھنکا تھا اور ایسے آگ لگے، آفت مارے زمانہ میں کون گھڑی کیا ہو جاوے ہے؟ کون جانتا ہے؟

انور نے رات ہی رفی کو زمانے کی نزاکت سمجھاتے ہوئے اس بات کی تاکید کر دی تھی کہ سویرے ہی اس بچی کو پولیس اسٹیشن بھیج کر خبر کرا دو۔ اس طرح سے اپنی ذمہ داری بھی ختم ہو جائے گی اور خدا کرے اس غریب کا کوئی پتہ نشان بھی مل جائے۔" مگر لجیا کے نہانے دھونے اور باتوں کے چکر میں پولیس اسٹیشن کا خیال ہی نہ رہا تھا اور اب اس گھڑی جب کھلائی بوا زمانے کو گالیاں دے رہی تھیں اور لجیا کے گلے میں گنیش جی کی سونڈھ والی تصویر نظر آ رہی تھی تو اچانک اس کو انور کی تاکید یاد آ گئی۔

"بیچاری اتنی سی بچی —— کیسے اتنے بڑے دکھ کو سہہ رہی تھی۔ کیا پتہ پولیس والے بھی کوئی کھوج لگا سکیں گے یا نہیں۔"

تھانہ جانے سے پہلے کھلائی بوا نے لجیا کو بھر پیٹ کھانا کھلا دیا۔ رات ہی اس کو ایک الگ چٹ اُجڑی بے کار سی رکابی دے دی گئی تھی اور اتنی سی دیر میں وہ بچی اپنی رکابی رکھنے کی علیحدہ جگہ کو بھی پہچان چکی تھی۔ کھانے کا نام سنتے ہی اس کے چہرے پر بڑی پیاری رونق جھلک آتی اور وہ اپنے چھوٹے چھوٹے قدموں سے تیز چلتی ہوئی جھٹ سے اپنا برتن اٹھا کر لے آتی —— کھانا ملنے کی خوشی میں اس کی آنکھیں جگ مگ اٹھتی تھیں اور وہ بڑے بڑے نوالے لے لے کر جلدی جلدی کھانا نگلتی جاتی تھی۔ کھاتے وقت وہ بڑی حریص نظر آتی، مگر اس وقت بھی اس کی آنکھیں شرمیلی اور جھکی جھکی سی رہتیں اور لبوں پر وہی اُجڑی سی مسکراہٹ ہوتی، جب وہ پیٹ بھر کے کھانا کھا چکی اور رکابی دھو کے اسی میں پانی پی کر اپنے بھیگے ہوئے ہاتھ فراک کے گھیرے سے پونچھ چکی تو کھلائی بوا اس کی انگلی پکڑ کر چلنے لگیں۔

ٹھیک اسی وقت پاس کے دوسرے مکان سے ایک لڑکے نے آ کر یہ خبر سنائی کہ "ابھی صدر بازار میں لاؤڈ اسپیکر پر کسی پانچ چھ سال کے کھوئے ہوئے ایک بچے کے لیے اعلان ہو رہا تھا مگر وہ بچہ چونکہ کئی دنوں سے کھویا ہوا ہے اور اس کو خود جلدی بڑی تھی اس وجہ سے وہ تفصیل سے دریافت نہ کر سکا کہ وہ اعلان کسی لڑکی کے لیے تھا یا صرف لڑکے ہی کے لیے۔" رفی دل مسوس کر رہ گئی۔ شاید وہ اعلان لجیا ہی کے لیے ہو رہا ہو۔ لاؤڈ اسپیکر وہاں چلا رہا تھا اور لجیا کھلائی بوا کی انگلی پکڑے یہاں اس کا منہ تاک رہی تھی۔

جاتے جاتے رفی نے کھلائی بوا کو دم بھر کے لیے ٹھہرایا اور پرانے کپڑوں میں سے بلو رنگ کا ایک سویٹر لے آئی جو بدرنگ ہو کر بھی اچھا تھا اور جس پر سامنے سفید اون سے ایک موٹر بنی ہوئی تھی۔ رفی نے اپنے ہاتھوں سے لجیا کو سویٹر پہنا دیا۔ وہ اسی افسردگی کے ساتھ مسکرا پڑی۔ اپنے ہاتھوں سے سویٹر کو اپنے جسم پر سمیٹتی رہی اور پھر اس کی پتلی پتلی انگلیاں موٹر کے اوپر آہستہ آہستہ پھرنے لگیں۔ اس کی غمگین آنکھیں اوپر اُٹھیں اور وہ خوش ہوتی ہوئی دھیرے سے بولی —— "اپی موٹر گاڑی ہے۔" لجیا جب چلی گئی تب رفی نے اطمینان کا ایک سانس لیا۔ لجیا اور اس کے درمیان گنیش جی کی مورتی اب حائل ہو گئی تھی۔ اس نے پہلے سوچا تھا کہ پولیس میں خبر دے کر وہ بچی کو اپنے پاس ہی رکھ لے گی۔ اگر اس کے گھر والے آ گئے تو وہ چلی جائے گی اور نہیں تو پھر بے بی کے ساتھ کھیل کود کر وہ بھی پل ہی جائے گی مگر اب اس کے گلے میں پڑی ہوئی کالی ڈوری نے لجیا اور اس کے بیچ میں ایک سرحد کھینچ دی تھی —— سرحد کے ایک طرف رفی تھی اور دوسری طرف لجیا اور رفی اس سرحد کو توڑنے کی ہمت نہ کر سکتی تھی۔ ایک تو کلیجہ ایسے ہی نکلتا رہتا تھا —— پھر جان بوجھ کر شیر کے مان میں ہاتھ کون دے گا؟

بچے اسکول سے واپس آ کر لجیا کو ڈھونڈنے لگے اور بے بی تو آتے ہی میز پر اپنا بیگ پٹاک کر مچل پڑی۔ "تو میری چھوٹی سی دائی کہاں چلی گئی ——؟"

رفی ہنس پڑی سب بے بی نے بڑے مزے میں اپنے کام کی بات چپکے سے سوچ لی تھی۔ گھر کے اندر لجیا کا کوئی نشان نہ ملتا تھا۔ آنگن کے ایک کونے میں بس اس کی اوندھی پڑی ہوئی رکابی اور ایک کونے میں تہ کیے بورے کو دیکھ کر لجیا کے اس گھر میں آنے کا تھوڑا سا احساس ہو جاتا تھا۔

شام کے جھٹپٹے میں کھلائی بوا، لجیا کا ہاتھ پکڑے تھکی تھکی سی آ کر بیٹھ گئیں۔ "لے بابو —— تھانہ چوکی سب ہو آئے، کوئی پتہ نہ چلا، نام پتہ سب لکھا دیا ہے۔" لجیا اس گھر میں پھر سے لوٹ کر بڑی خوش نظر آ رہی تھی۔ اس نے مسکرا مسکرا کر سب کو دیکھا جیسے بتا رہی ہو کہ دیکھو ہم پھر واپس آ گئے نا؟"

کھلائی بوا نے بڑی تفصیل سے بتایا کہ داروغہ جی اور سارے پولیس والے بھی اس لڑکی سے کوئی خاص پتہ نہ چلا سکے۔ بچی گھر کا وہی پتہ بتاتی رہی تھی جو یہاں بتلایا تھا، اب تھانہ والوں نے وعدہ کیا ہے کہ کل لاؤڈ اسپیکر پر وہ اس کھوئی ہوئی لڑکی کا اعلان کریں گے۔ شاید کچھ پتہ چل جائے اور جب تک کوئی پتہ نہ چلے داروغہ جی نے اس بچی کو یہیں رکھنے کی گذارش کی تھی کیونکہ پولیس اسٹیشن میں اتنی سی بچی کے رکھنے اور دیکھ بھال کی کوئی صورت نہ تھی۔

لجیا گھر، آنگن اور سارے بچوں میں سمٹی سمٹی، دبی دبی سی جھجک جھجک کر کھیلتی نظر آتی۔ تجنیاں کے دل میں اللہ جانے کہاں سے ایسی مامتا پھوٹ آئی تھی جو اس کو ہر گھڑی نہلاتی دھلاتی اور سنوارتی رہتی تھی۔ گیرج کے پیچھے ڈبوں کے ڈھکنوں اور مٹی کے ٹھیکروں میں وہ بالو، پتھر اور بجریوں سے کھانے پکاتی رہتی، اسکول سے واپس آکر بے بی مزے مزے کا کھیل اس کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ وہ سچ مچ کی مالکن بنی اپنے چھوٹے چھوٹے حکم لجیا پر چلایا کرتی۔ لجیا کھیلتی، ہنستی، مسکراتی بھی تھی لیکن اس کی آنکھوں کی بیچارگی اور چہرے پر چھائی ہوئی افسردگی نہ گئی تھی ——— اس کی نگاہوں میں غم کی لہریں اپنی جگہ پر قائم تھیں۔ وہ اسی طرح سے کھوئی کھوئی سی حیران نظر آتی تھی۔ وہ کبھی نہ روتی تھی، کھل کر برستے ہوئے آسمان کی طرح اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ایک بوند بھی نظر نہ آتی تھی۔ جب وہ آئی تھی تو کئی دنوں تک کھلائی بوا کا آنچل پکڑے پکڑے پھرتی رہی تھی جیسے شاید اس آخری سہارے کے بھی کھو جانے سے وہ ڈر رہی ہو۔ تجنیاں اور کھلائی بوا سے بار بار وہ اپنی موسی کی شکایت کرتی رہتی تھی۔ کبھی کہتی ممیا گھر سے ہے، بابا مر گیا اور کبھی ماں کو مار کر باپ کو زندہ کر دیتی تھی مگر موسی جو اس کو مارتی رہتی تھی وہ جیتی جاگتی ہستی تھی۔

کھلائی بوا جہاں اپنا دامن بھر بھر کے ثواب کما رہی تھیں وہاں لجیا کو رات بھر میں کئی کئی بار پیشاب کراتے کراتے تھک جایا کرتی تھیں۔ تب بھی پیشاب کی دھار میں کھلائی بوا کے بستر کا کوئی نہ کوئی کونا نجس ہو ہی جاتا تھا اور صبح اٹھنے کے ساتھ کمرہ دھونے کی جو پریشانی ہوتی تھی وہ الگ تھی۔ رفی لجیا کو رستا بستا ہوا دیکھ کر مطمئن تھی مگر انور کو زمانے کا رنگ دیکھتے ہوئے پریشانی تھی۔ اب تو اس کی ذمہ داری اور بڑھ گئی تھی، کیونکہ پولیس والوں نے اپنی امانت اس کے گھر میں رکھی تھی اور لجیا کے ننھے ننھے پاؤں میں بھلا کس طرح سے بیڑی ڈالی جا سکتی تھی۔

ہفتہ بھی نہ لگا تھا کہ پولیس کا ایک جمعدار باہر برآمدے میں آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کو دیکھتے ہی تجنیاں اور کھلائی بوا کا چہرہ اُتر گیا۔ لجیا بلائی گئی۔ وہ اپنی انگلی مسلتی، آنکھیں جھکائے کسی مجرم کی طرح دیوار سے منہ کو چھپائے کھڑی رہی۔ جمعدار نے بتایا کہ اتنا اعلان کرانے پر بھی لجیا کے گھر والوں کا اب تک پتہ نہ چلا۔ پولیس والے اب اس بچی کو اناتھ آشرم میں بھیج دیں گے۔ اس کے گلے سے اگر گنیش جی کی تصویر نہ نکلتی تو درخواست دینے پر بچی کو اس گھر میں چھوڑا جا سکتا تھا مگر اب تو مشکل ہے۔ جمعدار نے بچی پانے کی رسید دے کر لجیا کا ہاتھ پکڑا اور سیڑھیوں پر سے اُتر گیا۔ رفی نے آخری نگاہیں بچی پر ڈالیں اور اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے پکار کر کہا، "دیکھئے یہ چھوٹی سی بچی ہے، ذرا اس کے ساتھ آہستہ آہستہ جائیے گا، نہیں تو یہ بچاری تھک جائے گی۔" رفی کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور اس کی نگاہیں لجیا کے دھیرے دھیرے اٹھتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدموں پر جمی ہوئی تھیں۔ بلو رنگ کا سوئٹر آج بھی اس کے جسم پر تھا جس کی موڑ اب میلی ہو چکی تھی۔ لجیا نے ایک دفعہ مڑ کر دیکھا اور اس کے ننھے ننھے پیر گیٹ سے باہر نکل گئے۔ کھلائی بوا نے آنچل سے اپنی آنکھیں پونچھ لیں۔ ضبط کرنے کی تمتماہٹ ابھی تک ان کے چہرے پر چھا رہی تھی۔

لجیا کے چلے جانے سے ایک اداسی چھا گئی تھی۔ کھلائی بوا کو رہ رہ کر افسوس ہوتا تھا کہ اگر ان کی نظر لجیا کے گلے کی تصویر پر جاتی تو وہ چپکے سے اس کو اُتار کر کہیں چھپا دیتیں۔ "ہائے ایسی معصوم پھرستہ سی بچی ہاتھ سے یوں بے ہاتھ تو نہ ہو جاتی۔" تجنیاں بھی

افسردہ تھی۔ لجیا کے آجانے سے اچانک اس کے اندر ایک زندگی آگئی تھی۔

شام کو اسکول سے واپس آکر بے بی نے جب یہ سُنا کہ اس کی ننھی سی ملازمہ اب ہمیشہ کے لیے چلی گئی ہے تو اس کا منہ بہت دیر تک سُوجا رہا۔ ”تو پھر اب میرے ساتھ کون کھیلے گا؟“

رفی نے بڑے لاڈ اور پیار سے اپنی بچی کو منایا ——— ”لجیا اپنے ماں باپ کے پاس گئی ہے بٹیا جیسے تم اپنی ممی کے پاس ہو۔“ اور رفی یہ کہتے کہتے بے تابانہ بے بی کو لپٹا کر پیار کرنے لگی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔

رات ہوتے ہی ہلکے اندھیرے میں بھاری جوتوں کی آہٹ باہر سنائی دی۔ جمعدار لجیا کو لیے واپس آگیا تھا۔ کھلائی بُوا اور نجنیاں دوڑ کر باہر گئیں۔ لجیا دیوار سے لگی کھڑی مسکرا رہی تھی اور اس کے فراک کی گود میں بہت سی چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ وہ بڑے پیار سے کھلائی بُوا کی ساری سے لپٹ گئی اور اپنی بھری ہوئی گودی ان کے آگے پھیلا کر ہنس پڑی۔ مرہی، بتاشے اور گڑ کے لڈو سے اس کے چھوٹے سے فراک کا دامن بھرا ہوا تھا۔ جمعدار نے کھلائی بُوا سے کہا کہ ”بس آج کی رات تم اس بچی کو رکھ لو، آج لکھا پڑھی میں بہت دیر ہوگئی ہے۔ کل اس بچی کو اناتھ آشرم میں بھیج دیا جائے گا ———“ کھلائی بُوا نے ایک ہی رات بڑی غنیمت سمجھی نہ جانے کیوں اب ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ لجیا اب ان سے کبھی بھی جُدا نہ ہوگی اور اسی طرح ہیرا پھیری کر کے وہ پھر ہمیشہ کے لیے انھی کے پاس آجائے گی۔

رفی کا چہرہ بھی دمک اٹھا تھا۔ اس نے لجیا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑے پیار سے کہا ”آگئی لجیا؟“ اور لجیا نے بڑے خلوص سے اپنی بھری ہوئی گودی رفی کے آگے پھیلا دی جیسے یہی چیزیں لانے کو تو وہ ان سے دن بھر کے لیے جُدا ہوئی تھی۔ بے بی کا چہرہ خوشی سے کھِل گیا۔ اس نے بڑے تحکم سے کہا ”دیکھ لجیا! اب کہیں مت جانا۔“

اتنے ارمانوں سے آئی ہوئی لجیا نے کمرے میں پھر پیشاب کی دھار بہادی تھی اور کھلائی بُوا اپنے ہاتھوں سے صفائی کر رہی تھیں مگر سب سے بڑی مصیبت تو یہ تھی کہ جہاں جہاں پیشاب کی دھاریاں بہی تھیں پختہ فرش پر سفید نشان پڑا رہ گیا تھا۔

نجنیاں نے سویرے ہی سویرے لجیا کو نہلا دھلا کر پاک صاف کر دیا تھا، اس کے بالوں کی ایک چوٹی بھی باندھ دی تھی اور آج پہلی بار اس نے لجیا کی آنکھوں میں کاجل بھی لگا دیا تھا۔ لجیا کسی دُلہن کی طرح شرمائی شرمائی اندر آئی۔ اس کو اپنا یہ سنگار بڑا اچھا لگ رہا تھا ——— بے بی نے اس کو دیکھتے ہی کہا۔ ”آج ہم تجھے دائی نہیں بنائیں گے، تو بی بی بنے گی اور ہم رانی بنیں گے، رانی۔“ اور بے بی لجیا کو یہ باتیں سمجھا کر اپنے اسکول چلی گئی۔

بھاری جوتوں کی آہٹ سنتے ہی کھلائی بُوا کے ساتھ نجنیاں اور رفی بھی افسردہ ہوگئیں۔ لجیا آج بھی روٹھے ہوئے انداز سے دیوار کی طرف منہ کیے کھڑی اپنے ناخن سے دیوار کے چُونے کو کھرچ رہی تھی۔ کھلائی بُوا کے چہرے پر آج ضبط کی تمتماہٹ نہیں تھی۔ ان کی اندر دھنسی ہوئی آنکھیں جیسے کہہ رہی تھیں کہ ”اس بچی کو لے کر تم پھر واپس آؤ گے۔ یہ ہم سے کبھی جُدا نہ ہوگی۔ آج دن بھر ہم اس کا انتظار کرتے رہیں گے۔“

نجنیاں رو پڑی، بہت دنوں کے بعد اس کو ایک کھلونا ملا تھا۔ باہر برآمدے سے رفی نے لجیا کو جاتے ہوئے دیکھا اس کے چھوٹے چھوٹے قدم آج بھی سپاہی کے لمبے لمبے ڈگوں کے ساتھ گھسٹتے ہوئے اُکھڑ رہے تھے۔ وہ ایک ٹک سے لجیا کو

جاتے ہوئے دیکھتی رہی مگر اس کی زبان سے کوئی لفظ نکل نہ سکا۔ لجیا احاطے سے گزر رہی تھی۔ اس کی کالی کالی پتلی سی ننگی پنڈلیاں حرکت کرتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ وہ چلی جا رہی تھی۔ آگے کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ اس وقت بھی وہ اپنی انگلیوں کو مسل رہی تھی۔ اس کا چہرہ اسی طرح اُداس تھا مگر کومل سے لبوں پر مسکراہٹ اب بھی باقی تھی۔ جاتے جاتے وہ مڑی، برآمدے کی طرف دم بھر کے لیے دیکھا اور خاموشی کے ساتھ احاطہ سے باہر نکل گئی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے اٹھتے ہوئے قدم اب سب کی آنکھوں سے اوجھل ہو چکے تھے

—— سارا دن گذر گیا، رات کے سناٹے چھاتے گئے، کھلاڑی بُڑا اور بچنیاں کئی دفعہ گیٹ تک جا جا کر دیکھ آئی تھیں۔ دونوں کے چہرے اُترے ہوئے تھے۔ رات چپکے سے گزر گئی، پھر دن بیتتے چلے گئے، لجیا واپس نہ آئی۔ آنگن کے کونے میں اس کی رکابی اوندھی پڑی رہ گئی تھی، تہ کیے ہوئے بورے ایک کنارے دھرے تھے اور چھوٹے کمرے کے پختہ فرش پر لجیا کے پیشاب سے رہی ہوئی اُجلی دھاریاں جگہ جگہ پر اب تک باقی رہ گئی تھیں۔

گھاؤ

واجدہ تبسم

حمید دودھ کی بالٹی اٹھائے اندر آیا تو سکینہ آلو اُبال رہی تھی —— حمید کو بالٹی زمین پر پٹختے دیکھ کر وہ ذرا صبر سے بولی —— "کتنا دودھ ہوا آج ——؟"

حمید نے لاپرواہی سے اس کی طرف دیکھا اور آواز نیچی کر کے بولا ——

"ایک پاؤ سے بھی کم ——"

ابھی سکینہ کوئی جواب دینے بھی نہ پائی تھی کہ اُدھر سے ماں چنگھاڑتی ہوئی آ موجود ہوئی ——

"ایک پاؤ —— آدھ پاؤ —— ڈیڑھ پاؤ —— دو پاؤ —— کبھی اس سے بڑھ کر دودھ دیا بھی ہے تیری گیا نے ——؟"

حمید نے لرز کر ماں کو دیکھا —— ساس کی تیز آواز سن کر سکینہ نے خود کو آلو کے چھلکے اتارنے میں مشغول کر لیا ——

"میں کہتی ہوں اس حرام زادی کو بیچ کیوں نہیں دیتا تو ——" ماں جھلا جھلا کر ہاتھ نچانے لگی ——

حمید ابھی کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ ماں پھر چیخ اٹھی —— "جانے منحوس ماری کون گھڑی سے خریدی گئی ہے کہ گھر واٹے میں اُلّو بول گیا —— کوئی دن تو سکھ کا نصیب نہ ہوا، اس پر بھی نئی نویلی دلہن کی طرح مرگھلی گائے کو کلیجے سے لگائے لگائے رہتا ہے ——"

حمید ذرا اکڑ کر بولا —— "ماں کیسی بات کرتی ہے تو —— دودھ تو بے چاری کا اب سوکھا ہے —— پہلے تو تین تین سیر دودھ اس نے ایک ایک دوہنے میں دیا ہے ——"

"ہاں ہاں جبھی تو تیرے ہاں مکھن کی دکان لگ گئی تھی نا —— ارے نابکار! تو نے تو عقل بیچ کھائی ہے —— بھلا کوئی مجھے بتائے تو اس گائے نے تجھے کیا سکھ دیا ہے ——؟"

پیچھے بیٹھی ہوئی سکینہ بولی —— "یہ تو نہ کہو ماں —— ہمارے تین تین بچے اسی لالی نے پالے ہیں —— ورنہ میں ایسی کون بڑی تندرست تھی کہ آج تین بچوں کے بعد بھی زندہ دکھائی دیتی ——"

"ہونہہ ——" بڑھیا زور سے چیخی —— "لالی —— لالی —— لالی —— لالی نہ کہو کالی کہو کالی —— سارے میں سیاہی پھیر دی کوکھ جلی نے —— اس پر بھی اتنا مان ہے شُسری کا —— میرا بس چلے تو آج طبیلے پر بیچ آؤں ——"

"تمہارے سینے میں تو دل نہیں ہے ماں، پتھر ہے پتھر ——" سکینہ بیزاری سے بولی —— "کوئی اب ایسے بھی سوچتا ہے بھلا —— ابھی

اسے لیے دن ہی کتنے ہوئے ہیں ایسے کہ قصائی کو دینے کے بارے میں سوچتی ہو!"

"جب اتنا ہی پیار پھٹا پڑ رہا ہے تو پھر پوچھتی کیوں نہیں اسے نانی کی طرح —— نانی اسے گائے میا کہتی ہے تو بھی کہنے لگ جا۔"

سکینہ ذرا مسکرا کر بولی ——

"اور جو کہنے بھی لگوں تو کیا بگڑ جائے گا ہمارا ——"

اس دیدہ دلیری پر بڑھیا تو حیران ہی رہ گئی —— دیدے پھاڑ کر بولی ——

"کیا بگڑے گا ——؟" پھر تیزی سے بولی —— "اس سے بھلا تو یہ ہے کہ تو بھی ہندو بن جا ——"

سکینہ ہانڈی میں ڈوئی چلاتی ہوئی بولی —— "ہاں! ہتھنی جیسا تو تیرا ڈیل ڈول ہے، اس میں دل بھی بڑا سارا ہوگا، پر اتنے بڑے دل سے ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں سوچنا تجھے اچھا لگتا ہے کچھ ——؟"

"اری کلموہی —— ہتھنی جیسا ڈیل تو کیا تیری لالی کے بھاگ میں —— اب بھی میں تجھے ہتھنی ہی نظر آتی ہوں ——؟"

ماں کو لالی سے ساری دشمنی بس یہی تھی کہ حمید کے باپ نے جب گائے خریدنے کی بات اٹھائی تو گھر میں سوائے تین بیسی کے ایک دھیلا بھی زیادہ نہ تھا —— اور یہ تین بیسی بھی ماں نے پائی پائی کر کے اس لیے جوڑے تھے کہ بہو کی پہلی زچگی پر اسے گھی اور میوہ کھلا سکے —— مگر حمید کا باپ تو جو سوچتا تھا، اسے پورا بھی کر دکھاتا تھا —— ماں کے کانوں میں تولے تولے بھر کی بھروان آنتیاں تھیں اور گلے میں موہن مالا —— سب کچھ ملا کر تین، ساڑھے تین تولے سے بھی اوپر جاتا تھا —— اشرف کی نظر بیوی کے گلے اور کانوں پر تھی۔ بیوی بھی یہ بات جانتی تھی مگر ہندوستان کی عورت تھی —— جو زیور کو اولاد ہی کا ایک روپ سمجھتی ہے —— اشرف نے جب دبی دبی زبان سے زیور کی بات سُنائی تو وہ بگڑ گئی ——

"ہے ہے کیسے مرد ہو تم —— کوئی یوں بیوی کے زیور پر نگاہ رکھتا ہے —— ایسا ہی گائے خریدنے کا ارمان ہے تو اپنا بل بوتا کیوں نہیں دکھاتے ——"

اشرف چاپلوسی سے ہنس کر بولا —— "اری بچیا کون ہے تیرا زیور —— میں تو گہن رکھنے کو بولتا ہوں۔ گائے کے دودھ کی آمدن پر تیرا ایک ایک ماشہ نہ چھڑوا لاؤں تو اپنے باپ کی نہیں سؤر کی اولاد کہہ دینا —— ہاں ——!"

اشرف ہنسی ہنسی میں اتنا دباؤ ڈال گیا کہ بڑھیا کو ناں کہتے نہ بنی اور گائے گھر میں آ گئی —— اونچی پوری لال رنگ کی گائے۔ مانو گائے نہ ہو اونچل جاتی کی بھینس ہو —— اِتنے اُتنے کو نہیں پورے تین سو کو ملی تھی —— اشرف کو تو یہ بھی خیال تھا کہ اس کی گھیلن سے نکلنے والے بچھڑے کیسے نامی بیل بنیں گے —— اِدھر دُودھ کی آسانی تو تھی ہی تھی ——!

لالی دُبتی گائے تھی، پہلے ہی دن حمید آستین چڑھا کر دودھ نکالنے بیٹھا تو تیز تیز جھر جھر کرتی دھاروں سے پیتل کی بالٹی آدھی بھر گئی —— ماپ لا کر دودھ کا اندازہ لگایا تو تین سیر سے بھی بڑھ کر تھا ——! اشرف نے بڑے فخر سے بیوی کی طرف دیکھا —— جیسے ——

"بول اب کیا بولتی ہے ——"

بیوی نے جھکولے سے منہ پھیر کر غصہ دکھایا —— جیسے ——

"مجھے کیا لینا دینا تمھاری گائے سے ——"

پہلے دن جو دودھ اُترا تو گھر کا گھر ہی میں رہ گیا —— دونوں جوان میاں بی بی اور دونوں بوڑھے میاں بی بی —— حمید تو ٹکٹکی لگا کر

کوئی سیر بھر دودھ ایسے ہی چڑھا گیا ——!

دو ایک دن دودھ کا یہی حال رہا کہ ادھر گائے کے تھنوں سے بالٹی میں اور پینے والوں کے منہ کو لگی —— مگر چوتھے پانچویں اشرف نے راتب لگا دینے کی بات سامنے رکھی ——

”گائے کا پیٹ اسی کے دودھ پر پلتا ہے اور پھر اس کی قیمت وصول کر کے تیری ماں کا زیور بھی چھڑانا ہے —“

حمید سر ہلا کر بولا —— ”بات تو ٹھیک ہے —— ! گائے کا دودھ اور ایسی نسلی گائے کا دودھ — کون نہ خریدنا چاہے گا —— تم کہو تو کل ہی سے سارا دودھ بکوا دوں ——“

ماں اُدھر سے بولی —— ”اور جو بہو پورے دنوں سے ہے، اس کا دھیان ہے کچھ —— ؟ تھوڑا گھر میں رہے تو اچھا ہے۔ اب گائے خریدی ہی ہے تو بہو دودھ کیوں نہ پیے —— ؟“

گائے ہرا چارہ کھاتی تھی اور بہتی دھاروں دودھ دیتی تھی —— حمید باپ بھی بن گیا اور ماں کا آدھا دھوا زیور بھی چھٹ کر آ گیا —— بچہ ہوتے ہی سکینہ کی صحت کی گرتی آ گئی —— بچہ بھی اوپر کے دودھ سے لگ گیا —— اور پھر یہ ہوا کہ گائے کا آدھا دودھ گھر ہی میں اٹھنے لگا —— سکینہ ادھر بچے پہ بچہ جنتی گئی اور سوکھتی گئی —— سکینہ کی بجائے لالی نے ماں بن کر بچوں کو پالا —— ماں کا جتنا زیور آ گیا بس آ گیا —— باقی کا سارا ساہوکار کے ہاں رہ گیا۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ حمید یا اشرف مہینے کے مہینے اس کا سود ضرور ادا کر آتے اور زیور ڈوبنے کی نوبت نہ آئی —— لیکن ایک لازمی بات جو ہونی ضرور تھی وہ ہو کر رہی کہ ماں لالی کی دشمن بن گئی۔ اسی کی وجہ سے اس کا زیور گہن میں پڑا تھا۔ اور اب دن گزرتے جا رہے تھے اور زیور واپس ملنے کی کوئی آس باقی نہ رہ گئی تھی —— کبھی کبھی بڑھیا بہت گرم ہونے لگتی تو اشرف اسے اطمینان دلاتا ——

”اپنا زیور ہی لے گی نا —— ؟ یا پھر لالی کی جان لے کر رہے گی —— ؟“

بڑھیا پھاڑ کھانے کو دوڑتی —— ”ہاں ہاں میں تو لالی کی جان ہی لوں گی —— بڑے زیور دینے والے آئے —— گلا، کان سارے بُچے ہو گئے —— اور پھر بھی طعنہ دیتے ہو کہ جان لے گی کیا —— ؟“

اشرف چھیڑنے کو بولتا ——

”اری بڑھاپے میں زیور پہن کر کیا کرے گی —— اب تو بہو کے دن ہیں —— تجھے اتنا شوق کیوں ہے زیور کا —— ؟“

بڑھیا تپتا شعلہ بن کر بولتی —— ”اپنے خصم کو دکھانا ہے نا، اس لیے شوق ہے ——“

اشرف زور زور سے ہنسنے لگتا —— !

اشرف نے زبان دے رکھی تھی کہ زیور نہ لوٹا دوں تو انسان کا نہیں سؤر کا جنا کہہ دینا —— اس کی نوبت ہی نہ آئی، موسمی بخار میں چار دن بھگت کر چٹ پٹ ہو گیا —— مرنے والے کو سؤر کی اولاد کہتی تو کیسے —— اور اگر کہہ بھی دیتی تو ملنا کیا تھا —— ؟ پھر مرنے والے کو برا بول بول کر گنہگار کیوں بنتی —— ؟“

اشرف تو مر گیا، حمید نے سوچا تھا کہ ماں کا زیور اس برس ضرور ہی لا دے گا —— اور یہ بات اس نے یوں بھی سوچی تھی کہ اب کے لالی گابھن تھی۔ چند روز بچھڑے کو دودھ پلا کر کہیں نہ کہیں بیچ دے گا —— کون نہ لے گا بھلا —— بس اک دم ماں کا زیور

لاکر اس کے قدموں میں ڈال دے گا ـــــ مگر قسمت اوندھی تھی، لالی کو سفید رنگ کا خوبصورت سا بچھڑا ہوا ضرور ـــــ پر جانے کیا ہوا، کسی نے کچھ جادو ٹونا کر دیا یا اس کی موت ہی آئی تھی کہ دوسرے ہی دن تھان پر مرا ہوا ملا ـــــ یہ صدمہ تو حمید کی جان کو ایسا لگا کہ تڑپ کر رو بھی نہ سکا ـــــ مگر ماں اب اچھی طرح جان گئی کہ میرا زیور تو اب عمر بھر ملنے سے رہا ـــــ لالی اس کی آنکھ کا کنکر بن کر ہر لمحہ کھٹکنے لگی ـــــ مر جائے تو جی کو سکون ملے ـــــ مگر لالی بھی لمبی عمر لے کر آئی تھی۔ مرتی تو کیا اس کا تو بال تک بیکا نہ ہوتا ـــــ

دھیلوں کے دن آئے تو لالی نے دودھ اک دم کم کر دیا۔ کہاں تو پیتل کی بالٹی چھلکی پڑتی تھی یا اب دھاریں بالٹی کے پیندے سے ٹکراتیں تو چھر چھر آوازیں بھی نہ نکلتیں۔ بس حمید دو چار ہاتھ چلاتا اور تھن خالی پڑ جاتے ـــــ چارہ اتنا ہی کھاتی ـــــ بھوسی کھلی میں بھی فرق نہ پڑا تھا مگر اک دم سے بند جیسا کر دیا ـــــ یہاں تو خود گھر والوں کے کھانے پینے پر آ کر بنی ہوئی تھی، لالی کی برابری کہاں سے ہوتی۔ مگر حمید تھا کہ اس کی سیوا کیے جاتا ـــــ کبھی کبھار سکینہ بھی الجھ کر بول جاتی ـــــ

"اس گائے نے تو ہماری گرہستی ہی چوپٹ کر دی ـــــ"

حمید اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر بولتا ـــــ "اری دیکھنا ہریالی لگتے ہی ایسا دودھ دے گی کہ ایک چھوڑ دو دو بیلی بالٹیاں بھریں گی ـــــ!"

یہ خیال تو حمید کو بھی ستاتا تھا کہ لالی فضول کا بوجھ بنی ہوئی ہے ـــــ جانور سے فائدہ کی بجائے الٹا نقصان ہو تو اس کا بیچ دینا ہی بھلا ـــــ مگر جب یہ خیال آتا کہ باپ نے کن ارمانوں اور چاؤ سے خریدی تھی تو طے کر لیتا کہ چاہے گھر کا برتن باسن تک بک جائے مگر کبھی گائے کو بیچنے کا سوچے گا بھی نہیں ـــــ

حمید اپنے بھائے تو گائے کی پوری دیکھ بھال کرتا رہتا تھا مگر جب گھر میں اپنے بچوں ہی کے کھانے کی برابری نہ ہوتی ہو تو گائے کا مان کون رکھے ـــــ؟ لالی گھوڑی کی طرح اچک اچک کر چلتی تھی، بھینس کی طرح دودھ دیتی تھی ـــــ ایک نظر کوئی دیکھ لے تو آنکھوں میں بھر کر رہ جاتی تھی، اب تو یوں کھڑکھڑی ہو گئی تھی کہ ساری ہڈیاں نمودار ہو گئی تھیں ـــــ

"جانے یہ ہڈیوں کا پنجر کیوں پال رکھا ہے ـــــ بیچ دے تو اچھا ہو جائے کہ میرا زیور چھوٹ جائے ـــــ"

حمید ماں کے سامنے کچھ نہ بولتا مگر جی ہی جی میں جل کر رہ جاتا ـــــ "کون سے کرموں کی دشمنی نبھا رہی ہے ماں ـــــ سمجھ نہیں پڑتا ـــــ زیور کی ایسی بھی کیا چنتا ـــــ؟"

لالی دن بدن سوکھتی جا رہی تھی۔ حمید نے اب لالی کو کھلی چھٹی دے رکھی تھی کہ جہاں چاہے جائے اور اپنا پیٹ بھر لے۔ لالی ڈنڈے بھی کھاتی اور چارا بھوسہ سبر کی ـــــ جو بھی مل جائے ـــــ مگر یہ سودا حمید کو مہنگا پڑا ـــــ پتہ نہیں کس نے ایک دن اپنے کتے کو لالی پر چھلا دیا ـــــ کتے نے مالک کی ایسی بات مانی کہ لالی کو دوسرے تیسرے دن ہی کھروں کے پاس کھرچ ہو گئی۔ پھیلتے پھیلتے وہ اوپر ہی اوپر بڑھنے لگی ـــــ اب حمید کا یہ کام تھا کہ لالی کی ڈور پکڑ کر روزانہ ڈھور ڈاکٹر کے پاس لے جاتا۔ اس کی دوا درمن کرتا اور اپنے طور پر جڑی بوٹیوں کو کوٹ چھان کر زخموں پر تھوپتا رہتا ـــــ

کہاں تو ماں اس کی موت کا ارمان لیے بیٹھی تھی یا اب حمید تھا کہ اس کو زندگی کی طرف گھسیٹ رہا تھا ـــــ ماں نے

تڑپ تڑپ کر بددعائیں تو بہت مانگیں مگر ایک بھی بددعا نہ لگی اور لالی بدنی کا بوجھ بنی پھر آنگن میں بندھی رہنے لگی ——— بیمار بچہ اچھا ہو جائے تو ماں کا اور بھی دلارا ہو جاتا ہے۔ لالی بیماری بھوگ کر اٹھی تو حمید کی آتی جاتی سانس بن گئی ——— ماں نے اپنے جسم کی ساری طاقت لگا کر چیخ چیخ کر گھر سر پر اٹھا لیا ——— روز ہی ماننا کلکل رہنے لگی ——— حمید تھک ہار کر کھیتوں پر سے آتا تو دیکھتا کہ سکینہ منہ تھتھائے ایک طرف پڑی ہے ——— بچے الگ منہ بسورے بیٹھے ہیں ——— ماں کونے سے لگی گائے کو گھورے جا رہی ہے ——— پوچھنے پر پتہ چلا کہ ماں نے آج لالی کی چھاج بھر کی کنڈی کر دی ——— کبھی بچوں کو کوٹ ڈالا تو کبھی بہو کو نوچ ڈالا ———

حمید سوچتا ماں کی بات بھی اپنی جگہ ٹھیک ہی ہے۔ اس کا زیور برسوں کا گیا اب آتا ہے نہ جب ——— ادھر گھر میں خرچ کی وہ تنگی ہے کہ صبح کھانا مل گیا تو دوپہر کی امید نہیں کہ کیا بنے گا؟ ایسے میں لالی دودھ بھی نہیں دیتی، الٹا اسی کا پوری کرو مگر جب لالی کے دکھ کا خیال آتا تو لرز کر رہ جاتا ——— وہ تو اب بیٹی جیسی ہو گئی تھی ——— کیا حمید سے یہ ممکن تھا کہ رابعہ کو کسی کے ہاتھوں بیچ دیتا ———؟ پھر یہ ماں کیسی بات سوچتی ہے ———؟

مگر ماں کے سوچنے کا انداز نہ بدلا پر نہ بدلا ——— وہی روز روز کی جھک جھک ——— وہی بک بک ——— حمید ہواس میں تھا مگر پھر بھی پاگل تھا ——— ماں نے گھر کا چین ہی جو لوٹ لیا تھا ———!

ایک دن حمید چارپائی پر بیٹھا رابعہ اور ستّو کو طوطے مینا کی کہانی سنا رہا تھا کہ اکدم سے دروازے کی کھڑ کھڑ ہوئی اور آگے آگے جمن خان اور پیچھے پیچھے نتھو برآمد ہوئے ——— ابھی حمید اس بے وقت کی آمد کے بارے میں کچھ سوچ بھی نہ پایا تھا کہ جمن خان نے بھد سے چارپائی پر گرتے ہوئے کہا ———

”تو پھر میں گائے کھول لے جاؤں ———؟“

حمید اچھلا ——— پھر سنبھلا ——— رک کر رسان سے بولا ———

”وہ کیوں جی ———؟“

اس پہ جمن خان نے نتھو کو ذرا حیرت سے دیکھا ———

”اوئے ——— تیری ماں آکے بول گئی ہے کہ گٹیا لے جاؤ اور میرا زیور دے دے ——— یہ سودا تو تیری ماں کا پٹایا ہوا ہے۔“

حمید چارپائی سے اترا اور نیچی نگہ غصہ بھری آواز میں بولا ———

”کہاں ہے ماں ———؟ اسے میرے سامنے تو بلاؤ ———“

نتھو ڈر کر پیچھے ہٹا ——— ”واہ بے دلیر ——— ماں کی ہتیا کرے گا کیا ——— انداج تو یہی کہتے ہیں تیرے ———“

جمن خان نے اسے سر سے پیر تک ذرا تضحیک بھری نگاہوں سے دیکھا اور طنز بھری ہنسی سے بولا ———

”ابے اتّی بانی تو پیسوں والوں کو بھلی دکھتی ہے ——— تو کیا کھا کے اکڑ دکھاتا ہے بے ———؟“

جمن خان چھ فٹ تھا، جسم کا ایسا بھاری مانو جنگل کا شیر ببر ——— لڑنے پر اتر آتا تو ابھی کے ابھی میں حمید کی بجائے حمید کا قیمہ آنگن میں بکھرا نظر آتا ——— حمید طرح دے کر بولا ”بانی کون دکھاتا ہے ساہو جی ——— تمھیں تو اپنی رقم ہی چاہیے نا ——— ماں دیوانی ہے

گاشے کی بات فضول بیچ میں لے آئی — میں تمہاری رقم دے دوں گا —"

جانے جمن خان کے دل میں کیا بیتی تھی؟ اپنی فٹ فٹ بھر کی جوتیاں کھدیڑتا ہوا یونہی چلا گیا — پیچھے سے نتھو مڑ کر بولا —

"بھادوں کے مہینے میں رقم مل جائے — ورنہ بھادوں ہی کی طرح رونا پڑے گا جی — ہاں —!"

بھادوں میں تو صرف دو مہینے رہ گئے تھے — حمید اس رقم کا کیا بندوبست کرے —؟ اسے کچھ نہ سوجھتا تھا — ماں سے جھگڑ پڑا — بیوی کو دھانس لیا — بچوں کو دھنادھن کوٹ کر رکھ دیا — مگر ان ساری باتوں سے رقم کا کیا بندوبست ہو سکتا تھا — صرف ماں کے بس میں تھا — وہ چاہتی تو آج یہ سودا پھیر سکتی تھی مگر وہ کہنے کیوں لگی تھی — سارا فساد تو اسی کا اٹھایا ہوا تھا

حمید کو خیال ہوتا شاید ماں خود ہی ایک دن دھیرے سے کہہ دے —

"ارے بیٹا مجھے زیور کی کیا پڑی ہے — پہننے دے، ڈوبا تو میری قسمت، ملا تو میری قسمت، میری زندگی تو گئی گزری ہوئی اپنے کارن تمھیں کیوں دکھ دوں —؟"

مگر ماں تو جیسے جیسے بھادوں قریب آ رہا تھا کھلتی جا رہی تھی — حمید ایک دن جیسے پھٹ پڑا —

"بڑھاپے میں کس کو سنگار دکھاؤ گی — ایسا شوقین تو کسی کو نہ دیکھا —"

بڑھیا نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا — "ہاں ہاں قبر میں ساتھ لے جاؤں گی — تیرا کیا بگڑتا ہے — حرام زادہ، سور کا جنا مجھے ٹوکتا ہے — ہاں ہاں سنگار کروں گی — کروں گی — کروں گی — ضرور کروں گی — تجھ سے تو لینے نہیں جاتی نا —؟"

حمید بگڑ کر بولا —

"اتنے دن لالی کا خون پیا — ذرا تو دیا کھاتی — تیرے کلیجے میں تو ڈائن بیٹھی ہے ڈائن —"

بڑھیا بچوں کی طرح منہ اچکا کر بولی — "ہوں ڈائن — پھر —؟ تیرا کیا بگاڑتی ہوں —؟"

یوں تو مصیبت کے دن کاٹے نہیں کٹتے مگر یہ سات ہفتے تو پر لگا کر اڑ گئے — بھادوں کو صرف ایک ہفتہ رہ گیا —

اس دن حمید صبح ہی صبح اٹھا — گاؤں میں اتنوں کے آگے ہاتھ پھیلایا، کہیں کچھ نہ ملا — آتے آتے جمن خاں کا گھر راستے میں پڑا — تھان پر کتنے جانور بندھے تھے —! حمید کا دل کٹنے لگا — اب لالی بھی یہاں بندھے گی —؟ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا — میں اس کمینے کے ہاں کبھی لالی کے پاؤں کی چھاپ بھی نہ پڑنے دوں گا — اس سے اچھا تو یہ ہے کہ قصائی کے ہاتھ لالی کو بیچ دوں اور رقم اس کے منہ پر دے ماروں! ہاں یہی ٹھیک ہے — بس اب یہی ہوگا — گھر میں سب سے یہی کہہ دوں گا

گھر میں داخل ہوا تو بچے پتھر سے پتھر ملا کر چکمہ بلا کھیل رہے تھے — لالی کھونٹے سے بندھی تھی — دکھ کے ساتھ حمید اس کے پاس جا کھڑا ہوا اور مری مری آواز سے بولا —

"سکو — میں لالی کو جمن کے تھان پر نہیں دیکھ سکتا۔ میں نے اسے قصائی کے ہاتھ بیچ ڈالا ہے —"

"ہائے اللہ —" سکو سینے پر ہاتھ مار کر بولی — "قصائی کو بیچ دے گئے؟ تم نے تو اسے رابعہ کی جگہ دی تھی۔ بھلا کوئی اپنی بیٹی قصائی کو بیچے گا —"

حمید یونہی سر جھکائے کھڑا رہ گیا ——— اس کے منہ سے آواز نکل ہی نہ سکی ۔ اکدم ایک پتھر جھکیر کھاتا ہوا آیا اور لالی کے پیر پر گر پڑا ——— لالی بچک گئی اور کھر پٹخنے لگی ——— حمید گلا پھاڑ کر چیخا ———

"حرام زادے ——— اگر لالی کے زخم لگ آیا تو قصائی کہاں خریدے گا اسے ———؟"

سکینہ کے کلیجے میں اب تک کھٹک ہو رہی تھی ——— پھر بولی ———

"کہاں تو تینوں کا کاجل بنائے رکھتے تھے، یا اب قصائی کے چھرے تلے دینے پر تلے ہیں ——— میں کہتی ہوں تمہارے دل ہے یا نہیں ———؟"

اکدم پھر سے ایک پتھر تیرتا ہوا آیا اور لالی کی دُم پر برس گیا۔ حمید نے کھا جانے والی نظروں سے بیٹے کو دیکھا مگر کچھ بولا نہیں۔ سکو دھیرے سے بولی ———

"ہائے میں تو دعا کر رہی ہوں کہ اس کے کوئی گھاؤ ہی لگ جائے تاکہ قصائی خریدے ہی نا ———"

"اگر گھائل گیا کو قصائی نہ خریدے گا تو میں آپ اسے مار دوں گا ——— میں نہیں برداشت کر سکوں گا کہ جو لالی اتنے دنوں سے میرے کھونٹے سے بندھی تھی، اب کسی اور کے تھان پر کھڑی نظر آئے ———" حمید تیزی سے بولا ——— اس کا منہ تمتما رہا تھا اور آنکھیں چمک رہی تھیں ———

"اور اگر ایسا ہی ہو گیا تو پھر ماں کے زیور کا کیا بنے گا ———؟" سکو نے کن انکھیوں سے ماں کی طرف دیکھ کر کہا ———

حمید گرجا ——— "تو تو نے جن کے ساتھ ایک رات سو جانا ———"

ہا ——— سکو کے منہ سے کچھ نہ نکلا ——— اس کی آنکھیں جیسے پھٹی ہی رہ گئیں ———

صبح قصائی آنے والا تھا ——— رات دھیرے دھیرے گزر رہی تھی ——— اس دن کے بعد سے حمید کچھ بولا ہی نہ تھا ——— اس چپکی نے اس کا من مار کے رکھ دیا تھا ——— وہ بے سُدھ پڑا تھا ——— کونے میں سکو اپنے بچوں کو لیے سو رہی تھی ۔ آنگن میں کھونٹے سے بندھی لالی بھی ٹانگوں میں گردن دبے خاموش تھی ——— بس ایک ماں تھی کہ جس کی آنکھ میں نیند نہ تھی ——— کوٹھڑی میں ایک تو یونہی حبس ہو رہا تھا، دوسرے نیند بھی لاپتہ تھی ۔ ماں نے دھیرے سے اندھیرے میں ادھر اُدھر ہاتھ مارے اور کونے میں سے کلہاڑی کھینچ لی ——— کلہاڑی اٹھا کر وہ بلی کے سے قدموں سے دھیرے دھیرے آنگن تک آئی ۔ لالی نے مانوس چاپ سُن کر گردن اونچی کی، اس کی گردن کے گھنگھرو بج اٹھے ——— ماں نے آرام سے اس کے گلے سے گھنگھرو کی پٹی اتار کر زمین پر رکھ دی اور اس کی رسّی کھول کر دھیرے دھیرے آنگن سے باہر لے چلی ———

باہر نکل کر بڑھیا نے اطمینان کی سانس لی اور پھر گائے کی رسّی کھینچ کر اسے بھگانا شروع کیا ——— گھر سے بہت دور پہنچ کر اس نے گائے کو روک لیا ——— جب یہ اطمینان ہو گیا کہ اب گھر کافی دور ہو چکا ہے اور گائے کی آواز گھر تک نہ پہنچ سکے گی تو اس نے چاند کے ننگے اُجالے میں کلہاڑی اٹھائی اور پیچھے سے گائے کی ٹانگ پر دے ماری ———

"با ——— با ———" گائے تکلیف سے چیخی ———

ماں کا دل ایک لمحے کو اپنی جگہ سے اڑا ــــــ دوسرے لمحے اس نے جھک کر دیکھا ــــــ لالی کی ٹانگ میں اتنا بڑا گھاؤ پڑ گیا تھا ــــــ!!

پھر اس نے دھیرے سے گائے کی رسّی تھامی اور واپس چلی ــــــ جوہڑ کے کنارے رک کر کلہاڑی دھوئی اور گائے کو کھینچتی گھر پہنچ گئی ــــــ

آنگن میں پہنچ کر اس نے گھنگھرو کی پٹی اٹھا کر پھر سے لالی کے گلے میں باندھ دی اور کلہاڑی کونے میں رکھ کر خود اپنے بستر میں اطمینان کے ساتھ جا سوئی ــــــ!

ڈیڈی اور قصہِ لیلےٰ مجنوں

دیوندر اسّر

"کان کھول کر سن لو، اگر پھر کبھی چھت پر گئے تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔"

"جی"

"نیچے کمرے میں بیٹھ کر پڑھا کرو، سمجھے"

"جی"

دوسرے دن میں نیچے کمرے میں بیٹھ کر پڑھنے لگا۔ کمرے میں سخت گرمی تھی۔ پسینے چھوٹ رہے تھے۔ مگر کتاب سامنے پڑی تھی۔ بچوں نے دھما چوکڑی مچا رکھی تھی۔ اور بستر پر ننھے بھیا نے الاپ شروع کر دیا تھا۔ ساتھ برآمدے میں ماں کھانا بنا رہی تھی۔ چولھا تھا کہ سلگتا جاتا تھا، جلتا نہیں۔ سارا دھواں کمرے میں بھر گیا تھا۔ ماں الگ چیخ رہی تھی۔

"کہاں مر گئے سب، بچہ رو رو کر جان دے رہا ہے" اور دھم سے ماں کمرے میں آ گئی۔

"لاٹ صاحب یہاں بیٹھے پڑھ رہے ہیں، یہ نہیں کہ ننھے کو اٹھا کر چپ کرائیں۔"

"پڑھوں یا بچوں کو گود میں اٹھائے اٹھائے چپ کراتا پھروں" میں پہلے ہی جلا بھنا بیٹھا تھا۔

"ہائے ہائے تم ہی تو دنیا میں ایک پڑھنے والے ہو۔ پڑھائی سے کیا کوئی گھر کا کام کاج چھوڑ دیتا ہے" ماں دوپٹے سے ہاتھ صاف کرتے بولی۔ اب میں کہاں لیے جاؤں۔ "مائی ڈیر ماما، اگر تم مجھے ڈیڈی سے چھت پر جانے کی اجازت لے دو تو میں ننھے کو گود میں اٹھائے لوریاں دیتا رہوں گا ــــ چندا ماما دور کے ــــ" لیکن میں خاموش رہا۔ ماں بڑبڑاتی شور مچاتی بچے کو باہر لے گئی۔

"پرماتما نے دو ہاتھ دیئے ہیں۔ کیا کیا کروں ان سے" ماں کافی دیر تک بولتی رہی۔

میں پھر کتاب لے کر بیٹھ گیا۔ منّی نے دوات کو ٹھوکر لگائی اور فرش پر تصویریں بنا دیں۔ تراخ میں نے چانٹا منّی کے منہ پر جمایا

"دیکھ کر نہیں چلتی۔"

"تم ہی نے تو دوات راستے میں رکھ دی ہے۔"

پیشتر اس کے کہ ماں منّی کے بال کھینچتی اور مجھے صلواتیں سناتیں میں کمرے سے باہر نکل گیا۔

"صاحبزادے چھت سے اتر کر گلی میں گھومنے لگے۔" ڈیڈی کی آواز آئی۔

میں الٹے پاؤں واپس آگیا۔ میری بدقسمتی کہ پڑوسن کی لڑکی اوشا دروازے کی دہلیز پر کھڑی تھی۔ جرم ثابت ہوا اور پھر کمرے میں واپس۔

میں اور اوشا بچپن میں ساتھ ساتھ کھیلتے تھے۔ ساتھ ساتھ پڑھتے تھے۔ کبھی بھی ڈیڈی نے کچھ نہ کہا۔ نہ معلوم انہیں ایک روز کیا دورہ پڑا۔ حکم صادر کر دیا۔ اوشا سے اس طرح ہنس ہنس کر باتیں مت کیا کرو۔ اپنا دھیان پڑھنے میں لگاؤ۔ اوشا بُری لڑکی نہیں تھی۔ اور نہ ہی ان کے ماں باپ سے ہمارا کوئی بیر تھا لیکن اچانک یہ حکم نامہ ملا۔ بڑا تعجب ہوا، اور جب سے یہ پابندی لگائی گئی، نہ جانے کیوں مجھے اوشا اچھی لگنے لگی ہے۔ میں نے ایک بار اسے چھت پر شام کو دیکھا تھا وہ میری طرف پیٹھ کرکے کھڑی ہوگئی۔ اس نے پرنٹ قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کے شانوں پر پڑا دوپٹہ ہوا میں اڑ رہا تھا۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ اس کی کمر کتنی پتلی تھی۔ معلوم نہیں اسے دیکھ کر مجھے کیا ہوا۔ میں دھیرے دھیرے سیٹی بجانے لگا۔ میری آواز سن کر وہ مڑی۔ ہائے یہ اوشا تھی۔ اوشا بالکل بدل گئی تھی۔ اس کے بال بڑے ہوگئے ہیں۔ اس کی آنکھیں بڑی ہوگئی ہیں۔ اس کا چہرہ گلاب کے پھول کی طرح سرخ اور کھلا ہوا ہے۔ اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرا دی اور پھر نیچے چلی گئی۔ میں بڑی دیر تک چھت پر ٹہلتا رہا۔ شاید پھر وہ نظر آجائے مگر وہ اوپر نہ آئی۔ شاید وہ گھر کے کام کاج میں لگ گئی تھی۔ اب میں ہر روز شام کو کتاب اٹھاتا اور اوپر چلا جاتا۔ اوشا آتی، کبھی کپڑے جمع کرنے کے لئے، کبھی بستر بچھانے کے لئے، کبھی اپنے چھوٹے بھائی کو کھلانے کے لئے، وہ چاند کی طرف اشارہ کرتی اسے ہنساتی، اور ہوا میں اچھالتی اور اس کے گال چومتی اور میں کتاب سے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھتا اور پھر کتاب پڑھنے لگتا۔ میرے سامنے کتاب پر الفاظ مدہم مدہم ہوتے مٹ جاتے اور ہوا میں بچے کو اچھالتی اوشا کا چہرہ اس پر چھا جاتا۔ میری خواہش ہوتی کہ میں اوشا کو اٹھا کر ہوا میں اچھال دوں۔ وہ ڈر سے چیخے اور پھر میں اسے اپنے بازوؤں میں سنبھال لوں۔ کیسے بُرے بُرے خیال آتے ہیں۔ کسی لڑکی کے بارے میں سوچنا کہ اس کے گال چوم لوں۔ اگر ڈیڈی کو پتہ چل گیا تو! میں نے کئی بار ان خیالوں سے چھٹکارا پانے کے لئے کتاب پڑھنا شروع کی لیکن جتنا میں اوشا کے خیال سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتا اتنا ہی وہ بار بار یاد آتی۔ سڑک پر چلتی ہوئی لڑکیوں کے بارے میں کئی بار مجھے ایسے ہی خیالات آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر لڑکی مجھے اپنی طرف بلا رہی ہے لیکن اوشا ان سب سے زیادہ حسین ہے۔ زیادہ جاذب ہے زیادہ جوان ہے۔

ایک روز اوشا چھت پر ٹہل رہی تھی۔ اور میں پڑھنے کے بہانے اس کی طرف دیکھ رہا تھا کہ ڈیڈی چھت پر آگئے۔ اور آتے ہی مجھ پر برس پڑے

"تو یہ پڑھائی ہو رہی ہے ناہنجار؟"

میں ایک دم چونکا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو ڈیڈی تھے۔ میری روح کانپ گئی۔ ڈیڈی نے میرے کان کھینچے اور نیچے لے آئے۔ ڈانٹتے ہوئے بولے

"کان کھول کر سن لو، اگر پھر کبھی چھت پر گئے تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔"

"جی"

"نیچے کمرے میں بیٹھ کر پڑھا کرو، سمجھے؟"

"جی۔"

دوسرے دن سے نیچے کمرے میں بیٹھ کر پڑھنے لگا۔ پڑھنے میں من بالکل نہیں لگتا تھا۔ اوشا کا خیال بار بار آتا تھا۔ اس سے میں نے کئی دنوں سے بات نہیں کی تھی۔ جب سے میں نے اسے چھت پر دیکھا تھا اور وہ مجھے نئی سی اوشا نظر آئی تھی اس کے بعد تو کبھی اس سے بات بھی نہ ہو سکی تھی۔ ہمیشہ ڈر رہتا تھا کہ کوئی دیکھ لے گا۔ کہیں ڈیڈی نہ آ جائیں۔ بات نہ ہوئی اور ڈیڈی آ گئے۔ ایک روز میں بڑا اداس تھا۔ کالج کے لڑکے کسی نئی فلم کا تذکرہ کر رہے تھے۔ میرا بھی جی چاہا کہ چلو کوئی فلم دیکھیں۔ من بہل جائے گا۔ شام کو ہم سب دوست اکٹھے ہوئے اور فلم دیکھنے چلے گئے۔ عجیب سی فلم تھی۔ ریشمی ساڑھی۔ ایک مزدور کا مل مالک کی لڑکی سے عشق ہو جاتا ہے اور پھر درمیان میں منیجر کا لڑکا آ جاتا ہے۔ پھر وہ مکہ بازی ہوتی ہے، مزدور اور منیجر کے لڑکے میں۔ جی چاہتا تھا کہ ہال ہی میں

باکسنگ شروع کر دوں۔ جب ہم ہال سے باہر آئے تو آپس میں ہی باکسنگ کرنے لگے۔ بڑی دیر میں گھر پہنچا۔ کافی رات ہو گئی تھی۔ راستے میں ڈیڈی مل گئے۔

"کہاں تھے اتنی دیر تک۔ تلاش کرتے کرتے سارا شہر چھان مارا، پولیس اسٹیشن تک تو ہو آیا۔"

"ایک دوست کے گھر چلا گیا تھا۔"

"رات گئے تک دوستوں کے ساتھ مٹرگشت کرتے ہو، آوارہ، بدمعاش ..... لفنگوں کے ساتھ گھومتے گھومتے تم بھی لفنگے ہو گئے ہو۔" ڈیڈی نے ایک طمانچہ مارا اور پھر کان کھینچے اور گھسیٹ کر گھر لے آئے۔ گھر مکوں اور لاتوں سے ایسی تواضع کی کہ اب بھی کبھی یاد آتی ہے تو جسم درد کرنے لگتا ہے۔ جی چاہتا تھا کہ ڈیڈی کو بھی دو چار ہاتھ باکسنگ کے دکھا دوں، لیکن چپ رہا۔

"خبردار! جو پھر کسی لفنگے کے ساتھ تمہیں دیکھا تو۔" اور ڈیڈی نے دوستوں سے ملنا جلنا بند کر دیا۔

ایک روز کالج میں پھر کسی نئی فلم پر بحث چل پڑی اور شام کا شو دیکھنے کا پروگرام بننے لگا۔ میں نے جانے سے انکار کر دیا۔ ڈیڈی کی مار ابھی تک یاد تھی۔

"ارے یار، شام کو نہ سہی چلو میٹنی دیکھ لیتے ہیں۔"

"اتنی دیر باہر رہیں گے تو ڈیڈی کو شک ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

"ارے تم تو بڑے بدھو ہو، کہہ دینا پروفیسر صاحب نے ایکسٹرا کلاس بلالی تھی۔"

بہانہ بڑا اچھا تھا۔ اور کام چل گیا۔ پھر کیا تھا جب بھی کوئی نئی فلم آتی ہماری ایکسٹرا کلاس لگ جاتی۔ ان دنوں نادیا اور جان کاؤس کی فلمیں دیکھنے میں بڑا مزا آتا تھا۔ جی چاہتا تھا کالا نقاب پہن کر گھوڑے پر سوار امیروں کو لوٹوں اور غریبوں میں بانٹ دوں۔ ایک دن دیوداس دیکھی، سہگل کے گانے، الجھے ہوئے بال اور شراب پی کر مستی میں اس کا گانا، کئی بار جی چاہا کہ شراب پی کر دیکھیں۔ کیسے مزا آتا ہے۔ جب تک فلم دیکھتا رہا ایسے نظر آتا تھا کہ میں دیوداس ہوں اور اوشا پارو ہے۔ اور اس کے دروازے پر آ کر میں مر گیا ہوں۔ جب گھر آیا تو دل بڑا اداس تھا۔ ذہن میں طرح طرح کے خیال آ رہے تھے۔ اوشا کی شادی ہو گئی ہے۔ شادی کے وقت وہ بہت روئی ہے۔ اس کی یاد کو بھلانے کے لئے میں نے شراب پینا شروع کر دیا ہے۔ ایک روز میں خون تھوکنے لگا ہوں۔ ڈیڈی اور ماں بڑے گھبرا رہے ہیں۔ میں بستر پر پڑا دم توڑ رہا ہوں۔ ماں ڈیڈی سے کہہ رہی ہے، ناحق بچے کی جان لی۔ اگر اوشا سے اس کی شادی کر دیتے تو کیا جاتا۔ ڈیڈی خاموش رہے انہوں نے وہ فقرے نہیں دہرائے۔ کھتری خاندان میں شادی کر کے برادری میں ناک کٹواؤں۔ آنکھیں چار ہوئیں اور گھر میں لڑکی لے آئے اسے شادی کہتے ہیں۔ تم اس طرح آئی تھیں ہمارے گھر۔ لڑکا مر جائے پر شادی اس گھر میں نہیں ہو گی۔ اولاد نالائق نکلے تو ساری عمر کا رونا ہوتا ہے۔ اس سے تو اولاد پیدا ہی نہ ہو تو اچھا ہے۔ ایک بار ماں سے میں نے شادی کی بات چھیڑی تو ڈیڈی نے سارا گھر بار سر پر اٹھا لیا تھا۔ اور پھر مجھے ایسا خیال آیا کہ میں نے سیروں خون تھوکا ہے۔ اور میں مر گیا ہوں۔ ڈیڈی اور ماما دھاڑیں مار مار کر رو رہے ہیں۔ اتنے میں اوشا سسرال سے آ جاتی ہے۔ وہ روتی ہے چلاتی ہے اور مجھ سے لپٹ جاتی ہے اور پھر میری آنکھیں کھل جاتی ہیں اور میں زندہ ہو جاتا ہوں میرے خیال کی لہر ٹوٹ جاتی ہے۔

ایک روز ڈیڈی بھی اسی فلم کو دیکھنے پہنچ گئے، جو ہم دیکھ رہے تھے۔ ڈیڈی ماما سے کہہ کر گئے تھے کہ وہ اپنے پارٹنر سے حساب کرنے جا رہے ہیں۔

"میں سوچتا تھا کہ یہ روز روز ایکسٹرا کلاس کیوں لگ رہی ہے۔ آج سوچا فلم ہاؤس میں ہی دیکھ لوں صاحبزادے کو، تین گھنٹے برباد کرنے پڑے۔" ڈیڈی نے کہا اور مرمت شروع کر دی۔ اس روز کے بعد فلم دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی، کہیں ڈیڈی کو پھر تین گھنٹے برباد کرنے پڑیں۔ لیکن گھر میں پڑے پڑے عجیب عجیب خیال آتے تھے۔ فلمی رسالے پڑھ کر فلم دیکھنے کا مزا لینا پڑتا۔ رنگین شوخ تصویریں دیکھ کر من میں بڑی اکساہٹ ہوتی۔ فلم ستاروں

کے قصے پڑھ کر ہیرو بننے کی خواہش پیدا ہوتی۔ کبھی کبھی میں سوچتا کہ میں پرتھوی راج ہوں اور سنجوگتا کو گھوڑے پر اٹھا کر لے بھاگا ہوں۔ کبھی جی چاہتا خودکشی کروں۔ اور دیکھوں سب کیسے روتے ہیں۔ کبھی خیال آتا کہ تلوار سے مقابلہ کر رہا ہوں۔ میرے ارد گرد لڑکیاں کھڑی ہیں اور سب عش عش کر رہے ہیں۔ جب میں ڈاکوؤں کے چنگل سے اوشا کو چھڑا لیتا ہوں تو وہ میری طرف تحسین کی نظر سے دیکھتی ہے۔ دن بھر ایسے ہی خیال آتے رہتے۔ سنا ہے سگریٹ پینے سے دل کو بڑی تسکین ملتی ہے۔ ڈیڈی جب بھی کام سے تھکے ہارے آتے ہیں تو سگریٹ پیتے ہیں۔ میں نے ڈیڈی کی جیب سے سگرٹ نکالا۔ اور ماچس لگائی۔ کھانسی کا شدید دورہ پڑا اور آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ میں نے سگریٹ پھینک دیا لیکن بعد میں دوستوں کی محفل میں سگریٹ پینے میں بڑا مزا آتا تھا۔

امتحان قریب آرہے تھے اور تیاری کچھ بھی نہیں تھی۔ سوچا اوشا کو ایک خط لکھوں۔ ظالم مجھے پڑھنے دے۔ اور کھڑکی سے اس کے گھر میں پھینک دوں۔ ایک بار مجھے کالج کے راستے میں بس اسٹاپ پر مل جائے۔ اور پھر اسے جی بھر کر دیکھوں۔ اور —— میں نے خط لکھنا شروع کیا۔

“لبوں پر مہرِ خاموشی، دلوں میں یاد کرتے ہیں!
جنہوں کا عشق صادق ہے وہ کب فریاد کرتے ہیں”

میں نے خط کئی بار لکھا اور پھاڑ دیا۔ کتاب اٹھائی اور پڑھنے کی کوشش کی۔ نیند آئی۔ سو گیا۔ اس روز بڑا عجیب خواب دیکھا —— اوشا ندی میں ڈوب رہی ہے۔ میں اسے بچانے کے لئے ندی میں چھلانگ لگاتا ہوں اور جونہی پانی میں داخل ہوتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں۔ ایک جل پری ایک بن مانس کی گود میں بیٹھی ہے۔ جل پری کا چہرہ بالکل اوشا جیسا ہے۔ میں نے زور سے پکارا۔ اوشا، جب میری آواز گونجی تو بن مانس نے سر اٹھایا۔ میرے منہ سے چیخ نکلی۔ وہ تو ڈیڈی تھے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

“کیا بات ہے؟” ماما نے پوچھا

مجھے کچھ سمجھ نہ آیا کہ میں کیا کہوں۔ میں کہاں ہوں؟ میں پاگلوں کی طرح ماما اور ڈیڈی کے چہروں کی طرف دیکھتا دیکھتا سو گیا۔

ایک روز بازار سے گذر رہا تھا۔ ایک کتاب نظر آئی جس پر بن مانس کی تصویر تھی اور اس کے پنجوں میں ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ مجھے اپنا خواب یاد آگیا۔ میں نے فوراً کتاب کرائے پر لے لی اور پڑھنا شروع کیا۔ یہ ایک بن مانس کی کہانی تھی جو ایک شہزادی کو اٹھا کے لے جاتا ہے اور پھر کس طرح اس سے پیار کرتا ہے۔ کتاب بڑی دلچسپ تھی۔ بہرام ڈاکو والے ناولوں سے بھی زیادہ۔ اب میں ہر روز کوئی نہ کوئی کتاب لے آتا۔ اور اسے انگریزی یا تاریخ کی کتاب کے اوپر رکھ لیتا۔ اور پڑھنا شروع کر دیتا۔ کسی کو معلوم بھی نہ ہوا کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں۔ لیکن ڈیڈی کی نظر قیامت کی نظر تھی۔ ڈیڈی نے پوچھا

“کیا پڑھ رہے ہو؟”

“انگریزی پڑھ رہا ہوں۔”

“انگریزی! یہ کیسی انگریزی پڑھ رہے ہو۔ دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں۔”

میں گھبرا گیا اور میری گھبراہٹ نے سارا راز فاش کر دیا۔ ڈیڈی نے میرے ہاتھ سے کتاب چھین لی۔ اس دن پہلی بار میں یہ کتاب لایا تھا جس میں مادر زاد ننگے مرد اور عورتوں کی تصویریں تھیں جو باہم ہم کنار ہو رہے تھے۔ کتاب کسی فرانسیسی فاحشہ کی داستانِ عشق تھی۔ ڈیڈی نے کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے کہا۔

“کیوں صاحبزادے یہ فرانسیسی رنڈیوں سے کب سے عشق شروع ہو گیا۔”

میں چونکا۔ پیشتر اس کے کہ میں کوئی جواب دیتا۔ ڈیڈی نے تابڑ توڑ گھونسے جمانے شروع کر دئے۔

"صاحبزادے فلمی رسالے پڑھتے ہیں۔ طوائفوں کی فحش ننگی تصویریں چھپ چھپ کر دیکھتے ہیں۔"

ماما نے بیچ بچاؤ کرنے کی کوشش کی لیکن ڈیڈی نے اسے پرے کر دیا۔ ماما نے ایک دو بار کتاب کے بارے میں پوچھا بھی۔ لیکن ڈیڈی نے جھڑک دیا۔ شریف بہو بیٹیوں کے دیکھنے کی نہیں ایسی کتابیں۔

میں روتا رہا اور بستر پر لیٹ گیا لیکن جس کروٹ لیٹوں جسم درد کرتا تھا۔ ماما کہہ رہی تھیں، جاؤ جا کر معافی مانگ لو۔ میں نے بھی ضد پکڑ لی، کہ معافی نہیں مانگوں گا۔ کہیں بھاگ جاؤں گا، زہر کھا لوں گا۔ ڈیڈی ہیں کہ پولیس کے داروغہ، ہر وقت یہ نہ کرو وہ نہ کرو کے حکم جاری کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ماما کے بار بار اصرار کرنے پر میں ڈیڈی کے کمرے میں گیا اور پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔

ہائیں ——— میں چونکا، ڈیڈی کرسی پر بیٹھے وہی کتاب پڑھ رہے تھے۔ اور تصویریں دیکھ رہے تھے۔ میں ڈر کے مارے باہر آ گیا۔ کہیں ڈیڈی نے دیکھ لیا ہوتا تو زندہ نہ چھوڑتے۔

میرے دوست معلوم نہیں کہاں کہاں سے ڈھونڈ کے ننگی تصویریں اور عشقیہ ناول لے آتے تھے۔ فلم اسٹاروں کے معاشقے سناتے تھے۔ جی چاہتا تھا ان کی باتیں سنتا رہوں۔ کبھی کبھی جسم میں ایسی اینٹھن ہوتی۔ جیسے بالکل اکڑ جائے گا۔ جب کبھی میں کوئی تصویر دیکھتا تو اس کے سارے اعضا کو انگلیوں اور ہونٹوں سے ٹٹولنے میں بڑا مزا آتا۔ اور پھر ایسا محسوس ہوتا جیسے دریا میں پانی چڑھ رہا ہے۔ باڑھ آ رہی ہے اور پھر ایک دم پانی اتر آتا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا جسم کو لگنے لگتی۔ اوشا سے باتیں کرنے اور اس سے ہم کنار ہونے کی میری خواہش تیز تر ہو جاتی۔ اور جب میری خواہش پوری نہ ہوتی تو میں اپنے جسم کو کاٹتا اور اس وقت تک کاٹتا رہتا جب تک ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا جسم کو لگتی محسوس نہ ہوتی۔ مجھ پر ایسی ہی کیفیت طاری تھی۔ جب ایک شام اندھیرے میں مجھے اوشا اپنے گھر کی دہلیز پر کھڑی نظر آئی۔ میرے جسم میں جیسے آگ دوڑنے لگی۔ اوشا نے میری طرف دیکھا اور بال سینے پر گرا دیئے اور مسکرا دی۔ میں ایک لمحہ کے لیے رکا اور پھر ایک دم اس کی طرف لپکا اور اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ اوشا زور سے چیخی۔ میں گھبرا گیا اور بھاگنے لگا۔ لیکن اس دوران میں اس کے ماں باپ آ چکے تھے۔ اور انہوں نے مجھے پکڑ لیا۔ میرے ڈیڈی کو بلایا۔ گلی محلے کے اور لوگ بھی جمع ہو گئے۔

یہ ڈیڈی کی آخری مار تھی۔ اس کے بعد میرا گھر سے نکلنا بند ہو گیا۔ کالج چھوٹ گیا۔ اس دوران میں اوشا کی شادی ہو گئی۔ اور اس کے کچھ عرصے بعد میری بھی۔ شاید میری شادی کو پندرہ سولہ برس بیت گئے ہیں۔

"ڈیڈی، موہن مجھے چھت پر کھیلنے نہیں دیتا۔" میری چھوٹی بچی چلاتی ہوئی میرے پاس آئی۔

"کہاں ہے موہن؟" میں نے پوچھا

"چھت پر پڑھ رہا ہے۔"

میں چھت پر گیا۔ موہن سامنے والے مکان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس مکان کی کھڑکی میں کھڑی ایک لڑکی بالوں میں کنگھی کر رہی تھی میں نے موہن کو ڈانٹا۔ "کیوں صاحبزادے اس طرح پڑھا کرتے ہیں؟ کان کھول کر سن لو، اگر پھر کبھی چھت پر گئے۔ تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔" میں نے اس کے کان اینٹھتے ہوئے کہا۔

"جی"

"نیچے کمرے میں بیٹھ کر پڑھا کرو، سمجھے۔" میں نے کہا۔ وہ نیچے چلا گیا۔ میں نے سامنے والے مکان کی طرف دیکھا، کھڑکی بند ہو چکی تھی۔ میں نیچے آ گیا اور اخبار پڑھنے لگا۔

بابِ عفّت

اختر جمال

نوٹ:۔ یہ ایک قدیم چینی کہانی ہے۔ اس کہانی کو لن یوتانگ نے FAMOUS STORIES OF CHINA میں شامل کیا ہے۔ میں نے اس کہانی کو ڈرامائی لباس پہنایا ہے۔ اور وہ تبدیلیاں اور اضافے کئے ہیں جو کہانی کو ڈرامہ بنانے کے لیے ضروری تھے۔ اس ڈرامہ میں جو چینی نام ہیں۔ وہ آسانی سے پکارے جا سکتے ہیں۔ چند چینی اصطلاحات جو ڈرامہ میں استعمال ہوئی ہیں مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) تائی تائی (TAI TAI) گھرانے کی سب سے بڑی اور معزز خاتون کو کہا جاتا ہے۔
(۲) نینائی (NAINAI) گھر کی نوجوان مالکہ یا شادی شدہ نوجوان خاتون۔
(۳) شیوچیائی (HSIAOCHIEH) گھرانے کی کنواری لڑکی۔
(۴) می می (MEIMEI) سے بہن اور محبوبہ دونوں مراد ہو سکتی ہیں۔
(۵) لپاکو (LIPACHO) ایک قسم کا سوپ (PEA NUT SOUP)

کردار:۔ (۱) مسز وین ——— ایک ادھیڑ عمر کی خوبصورت بیوہ۔
(۲) تائی تائی ——— مسز وین کی ساس ایک ضعیف بیوہ۔
(۳) میہوا ——— مسز وین کی خوبصورت اور نوعمر لڑکی۔
(۴) لی سنگ ——— ایک نوجوان کیپٹن۔
(۵) چانگ ——— مسز وین کا پرانا مالی۔ ایک ادھیڑ عمر کا غریب آدمی۔ انتہائی سادہ لوح اور وفادار۔

مقام:۔ چین کا ایک قصبہ (HANCH WAN) ہانچ وان۔

(مناظر کی ترتیب اس طرح ہے)

ایکٹ اول ——— تین سین ہیں۔
ایکٹ دوئم ——— دو سین ہیں۔
ایکٹ سوئم ——— تین سین ہیں۔

ایکٹ اوّل

پہلا سین

(ایک کشادہ سا پرانی وضع کا ڈرائنگ روم۔ جس میں پرانی طرز کا فرنیچر ہے۔ صوفہ سیٹ کی بجائے آرام کرسیاں ہیں۔ ہر چیز سے سلیقہ اور نفاست ظاہر ہو رہی ہے۔ وسط کی گول میز پر ایک چینی گلدان ہے جس میں تازہ پھول ہیں۔ کمرے میں دائیں جانب کونے میں ایک پرانی سی شیلف ہے۔ جس میں موٹی موٹی جلدوں کی پرانی کتابیں ہیں۔ دیوار پر چینی کیلنڈر ہے۔ چند کشیدہ کاری کے خوبصورت نمونے فریم کر کے ٹانگے جا سکتے ہیں۔ جن میں کشیدہ سے کوئی خوبصورت منظر یا پھول وغیرہ ہوں۔ ایک آرام کرسی پر مسز وین بیٹھی ہے۔ وہ کروشیا کی بیل بنا رہی ہے۔ مسز وین پینتیس سال کی لمبے قد کی دبلی پتلی خوبصورت عورت ہے۔ جس کی ناک عام چینیوں کے برعکس لمبی اور پتلی ہے۔ اس کی جھکی ہوئی آنکھیں پر اسرار سی ہیں۔ وہ ایک ہلکے چینی رنگ کا گاؤن پہنے ہے۔ جس میں خوبصورت ریشمی ڈوریاں لٹک رہی ہیں)

پردہ اُٹھتا ہے

(اسٹیج کے پیچھے سے بینڈ کی آواز آرہی ہے۔ فوجی مارچ کر رہے ہیں۔ اس مقصد کے لیے فوجی بینڈ کا ریکارڈ بجایا جا سکتا ہے)

مسز وین۔ (کروشیا کی سلائی رکھ کر کھڑی ہو جاتی ہے اور اسٹیج کے داہنی جانب جا کر کھڑکی سے لگ کر پکارتی ہے) میہوا ——— ! میہوا !!

(میہوا اسی جانب کے دروازے سے داخل ہوتی ہے۔ وہ غیر معمولی طور پر خوبصورت ہے۔ دیہاتی لڑکیوں کی طرح صحت مند اور صاف گو ہے اس نے ایک پھولدار شوخ گاؤن پہنا ہے)

میہوا۔ (اندر آکر بلند آواز سے) اماں ——— اماں۔ فوجی مارچ کر رہے ہیں۔ دوسری لڑکیاں بھی دیکھ رہی ہیں۔!

مسز وین۔ میہوا۔ تم سمجھدار لڑکی ہو۔ دوسری لڑکیوں میں اور تم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہمارے گھرانے کی سی باعزت اور عفت مآب عورتیں اس قصبہ میں کتنی ہیں؟۔ اور پھر دوسری لڑکیاں میرے پاس پڑھنے آتی ہیں۔ تمہیں اس بات کا احساس ہونا چاہیئے۔ تمہیں تو ان سب کے لیے نمونہ بننا چاہیئے۔ نہ کہ تم ہر بات میں سب کے آگے ہو جاتی ہو۔ آوارہ گرد لڑکیوں کی طرح فوجیوں کو جھانک رہی ہو ——— !

میہوا۔ میں سب سمجھتی ہوں اماں ——— میں تو پردے کے پیچھے سے دیکھ رہی تھی۔ اور پھر ہماری گیلری اتنی اونچی ہے کہ نیچے چلنے والے کی نظر پڑ ہی نہیں سکتی۔ !

مسزوین۔ (کرسی پر بیٹھ جاتی ہے اور سر پکڑ لیتی ہے) اوہ لڑکی! تو مجھے قائل کرنا چاہتی ہے۔!

میہوا۔ (بات ٹالتے ہوئے) اماں اتنے آدمیوں کا دستہ تھا۔ نہ جانے یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں۔ اتنا اچھا بینڈ بج رہا تھا۔ اور اتنی تیز تیز قدم اٹھا رہے تھے۔ سچ اماں اسقدر مزا آیا۔!

مسزوین۔ میں نے سنا ہے نیلے پہاڑوں میں ڈاکوؤں کی ایک بڑی تعداد ہے۔ یہ دستہ انہی ڈاکوؤں کی سرکوبی کو آیا ہوگا۔ قصبہ بھر میں ان ڈاکوؤں نے لوٹ مار مچا رکھی ہے۔ خدا کرے یہ فوجی اس فتنہ کو ختم کر دیں۔

میہوا۔ اماں پھر تو یہ ہماری مدد کو آئے ہیں۔ ہمیں ان کی کامیابی کی دعا کرنی چاہیئے۔

مسزوین۔ میہوا — میری بچی اب تم جوان ہو گئی ہو۔ خدا کے لیے ذرا ذرا لونڈیوں کے ساتھ نہ دوڑا کرو۔

میہوا۔ (قریب آ کر مسزوین کے گلے میں باہیں ڈال دیتی ہے) اماں! آج چانگ نے بہت مزیدار کیکڑے پکائے ہیں۔ میں باورچی خانہ سے خوشبو سونگھتی ہوئی آ رہی ہوں۔

مسزوین۔ اچھا دیکھو تائی تائی سے پوچھو سینگ گھرانے کی لڑکیاں کس وقت پڑھنے آئیں گی۔ مجھے آج بازار جانا ہے۔

میہوا۔ (اسٹیج کے بائیں جانب جاتے ہوئے) ابھی آئی اماں۔

(میہوا کے جانے کے بعد مسزوین پھر کروشیا کی بیل بنانے لگتی ہے۔ دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز دور سے سنائی دیتی ہے۔ چند منٹوں بعد میہوا اندر آتی ہے۔ اس کا سانس پھولا ہوا ہے اور چہرہ سرخ ہو رہا ہے۔ وہ مسزوین کے قریب آ کر کچھ دیر خاموش کھڑی ہو جاتی ہے)

مسزوین۔ میہوا کیا بات ہے۔ تمہاری سانس ٹھکانے نہیں ہے۔ تم سرخ کیوں ہو رہی ہو —؟

میہوا۔ (دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر) اوہ اماں — اماں۔

مسزوین۔ اب تم بولو گی بھی یا نہیں — (اٹھتے ہوئے) کیا بات ہے؟

میہوا۔ (دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر) اوہ اماں — اماں!۔ (ہاتھ چہرے سے ہٹا کر) دروازے پر ایک فوجی کھڑا ہے۔ لمبا۔ چوڑا — خوبصورت — (رک کر) اس کے سر پر گھنے سیاہ بال ہیں۔ وہ خاکی وردی پہنے ہوئے ہے — اوہ۔ — اماں!۔

مسزوین۔ (غصہ سے نقل اتار کر) لمبا چوڑا۔ خوبصورت — گھنے سیاہ بال ہیں۔ وردی پہنے ہے۔ (اچانک چلا کر) میہوا —! بیوقوف لڑکی! میں کتنی دفعہ منع کر چکی ہوں کہ اس طرح مردوں کی شخصیت پہ روشنی نہیں ڈالنی چاہیئے۔ صرف اتنا کہنا کافی ہوتا کہ دروازے پہ ایک فوجی کھڑا ہے۔

میہوا۔ میں نے تو دور سے ہی دیکھا ہے۔

مسزوین۔ (سر پکڑ کر) میری سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ تم جا کر جلدی سے تائی تائی کو یہاں بھیجو۔ (میہوا چلی جاتی ہے مسزوین میز پر پڑا ہوا سرکا رومال اٹھا کر سر پہ باندھتی ہے۔ گاؤن کی شکنیں درست کرتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ دروازے کی طرف جاتی ہے۔ باہر جھانک کر کہتی ہے) اندر تشریف لے آئیے۔! (ایک فوجی نوجوان اندر آتا ہے۔ دوسری جانب سے دادی اندر آتی ہے۔ نوجوان دونوں

عورتوں کے سامنے جھک کر کورنش بجا لاتا ہے)

فوجی نوجوان - میرا نام لی سنگ ہے۔ مہربان خواتین میں نے آپ کو اس وقت بڑی تکلیف دی ہے۔

دادی - (رعشہ دار ہاتھ سے کرسی کی طرف اشارہ کر کے) آپ تشریف رکھیئے۔ (سب بیٹھ جاتے ہیں) کہیئے ہم لوگ آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں۔ ؟

فوجی نوجوان - میں یہاں اپنے دستہ کے ساتھ آیا ہوں۔ ہمیں نیلے پہاڑوں کے ڈاکوؤں کی سرکوبی کو بھیجا گیا ہے۔ ہانچ وان۔۔۔ (HANCH WAN) ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور یہاں رہائش گاہ کا انتظام بہت مشکل ہے۔ اگر آپ مجھے اپنے مکان میں ایک چھوٹا سا کمرہ کرائے پر دے دیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔ میں دن کو باہر رہوں گا۔ کبھی کبھی رات کو سونے آیا کروں گا۔ ہماری یہ مہم چند ماہ تک جاری رہے گی۔

(چند سیکنڈ تک خاموشی رہتی ہے۔ دادی اور مسز وین گہری سوچ میں ہیں۔ دفعتاً دادی فیصلہ کن لہجے میں بولتی ہے)

دادی - میں مرحوم وین کی والدہ ہوں۔ یہ میری بہو ہے۔ اس کی ایک لڑکی اور ایک بوڑھا نوکر چانگ بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ ہمارے گھرانے کی عفت اور عزت مشہور ہے۔ یہاں کبھی کوئی مرد قدم نہیں رکھ سکتا ہے ـــ مگر ہم آپ کو ایک کمرہ دے دیں گے اس لیے کہ آپ ڈاکوؤں کی سرکوبی کو آئے ہیں آپ کی خدمت ہمارا فرض ہے۔

لی سنگ - مہربان خواتین میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں آپ کو زیادہ تکلیف نہیں دوں گا۔ بس مجھے ایک اچھا بستر، نہانے کی جگہ اور کبھی کبھی ایک پیالی چائے کی ضرورت ہو گی۔

مسز وین - یہ گھر آپ کے لائق نہیں ہے۔ مگر جب تک آپ کا یہاں قیام ہے۔ آپ ہمارے مہمان رہ سکتے ہیں۔

دادی - ہم آپ کو باہر کا مردانہ کمرہ دے دیں گے۔

مسز وین - مردانہ کمرہ ـــ! نہیں نہیں میں وہ کمرہ نہیں کھولوں گی۔

دادی - بہو کوئی حرج نہیں ہے۔ مرحوم وین کی روح خوش ہو گی۔ (افسردگی سے) گذشتہ بیس سال سے اس کمرے میں کوئی نہیں سویا۔ وین کی موت کے بعد سے وہ کمرہ سونا پڑا ہے۔ بیس برس بعد آج میں تمہارے لیے وہ دروازہ کھول دوں گی۔ اس لیے کہ تم شریف اور باعزت معلوم ہوتے ہو۔ مرحوم وین کی روح تمہیں اپنے کمرے میں دیکھ کر خوش ہو گی۔ آج میں اس میں لوبان سلگاؤں گی اور اچھی طرح صفائی کرا دوں گی۔

لی سنگ - مجھے یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ آپ کے گھرانے میں کوئی مرد نہیں ہے۔ مجھے آپ اپنا ایک ادنیٰ خادم تصور کریں۔ (اٹھ کر) اچھا مجھے اجازت دیجیئے۔ میں رات کو اپنا مختصر سا سامان لے کر آؤں گا۔ آپ کی مہربانی کے لیے بہت شکر گزار ہوں۔

دادی - کپتان آپ ڈاکوؤں کی سرکوبی کو آئے ہیں۔ آپ کی خدمت ہمارا فرض ہے!

(دونوں عورتیں اٹھ کر کھڑی ہوتی ہیں۔ لی سنگ جھک کر سلام کرتا ہے۔ پھر اسٹیج سے چلا جاتا ہے۔ اسکے جانے کے بعد دونوں عورتیں پھر بیٹھ جاتی ہیں)

دادی۔ بہو میں سوچ رہی ہوں کہ لی سنگ اور میہوا کا جوڑا بہت مناسب رہے گا۔!

مسزوین۔ میں بھی یہ سوچ رہی تھی مگر تائی تائی ہمارے گھرانے میں وہی شادی کرے گا جو اپنی موت کا آرزومند ہوگا۔ ہانچ وان کے لوگ میہوا اور بیہ گی کو لازم و ملزوم سمجھتے ہیں ——— آہ میری بچی! دادی آخر ہمارے خاندان میں مرد کیوں نہیں جیتے!

دادی۔ خدا کی مصلحت خدا ہی جانے۔! بہو غم نہ کرو خدا مالک ہے۔ اگر میہوا کی قسمت میں بر ہے تو اسے مل جائے گا!

(میہوا اندر داخل ہوتی ہے۔ اس کے گالوں پر ابھی تک سرخی ہے۔ ماں کے پاس آکر
دونوں ہاتھ اس کے گلے میں حائل کر دیتی ہے)

میہوا۔ اماں ——— وہ کس لیے آیا تھا!

مسزوین۔ (ہاتھ ہٹا کر) تمہاری دادی نے اسے باہر کا سروانٹ کمرہ دے دیا ہے۔ وہ رات کو کبھی کبھی سونے آیا کرے گا۔ تمہیں اب یہ بچپنا چھوڑنا پڑے گا! تم صرف ہماری موجودگی ہی میں اس کے سامنے آسکتی ہو۔ میں سوچتی ہوں۔ شاید اس کا یہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔ لوگ خواہ مخواہ کی باتیں نہ کریں۔

دادی۔ نہیں بہو میری اور چانگ کی موجودگی میں کسی کو نام رکھنے کی جرأت نہ ہوگی۔ اور پھر سب ہمارے گھرانے کو جانتے ہیں؛

میہوا۔ تائی تائی آج بہت مزیدار کیکڑے پکے ہیں۔

مسزوین۔ تو ہمیشہ ننھی بچی ہی رہے گی۔

میہوا۔ دادی میں نے آپ کے لیے لپاکو (LAPACHO) بھی تیار کیا ہے۔

دادی۔ (خوش ہو کر) اچھا ——— تب تو جلدی سے کھانے کے لیے چلنا چاہیے۔

(سب اٹھتے ہیں۔ پردہ گرتا ہے)

دوسرا سین

منظر:۔

(وہی ہال نما کمرہ ترتیب بھی وہی ہے۔ میہوا ایک بڑی سی کرسی پر بیٹھی کتاب پڑھ رہی ہے۔ دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ میہوا کتاب بند کر کے بائیں جانب اسٹیج پر جا کر پردے کے باہر جھانکتی ہے۔ شرما کر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیتی ہے۔ پھر ایک دفعہ جھانکتی ہے۔ دروازے پر دوبارہ دستک ہوتی ہے۔ اسٹیج پر دوسری جانب سے مسزوین کی آواز سنائی دیتی ہے۔ میہوا پردہ چھوڑ کر تیزی سے دوسری جانب بھاگتی ہے۔ مسزوین تعجب سے اس کی یہ حرکت دیکھتی ہے۔ دستک سن کر مسزوین دروازہ کھولتی ہے اور لی سنگ اندر داخل ہوتا ہے)

لی سنگ۔ (تعظیم کے لیے جھک کر بیٹھ جاتا ہے۔ عورتیں بھی بیٹھ جاتی ہیں) میں ابھی ابھی کیمپ سے آ رہا ہوں۔ رات میں یہاں بہت آرام سے سویا اور مزیدار چائے پی۔ میں آپ کا بہت ہی شکر گزار ہوں۔

مسز وین۔ ہمیں شرمندہ نہ کریں۔!

لی سنگ۔ (میز پر رکھی ہوئی کتاب اٹھا کر بلند آواز سے نام پڑھتا ہے) "عورتوں کے فرائض" یہ آپ پڑھ رہی تھیں؟

مسز وین۔ جی نہیں میہوا پڑھ رہی ہوگی۔ مجھے بھی پان چاؤ کا انداز تحریر بہت پسند ہے۔

لی سنگ۔ میں نے پان چاؤ کی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ (شیلف کے پاس جا کر کتابیں دیکھتا ہے)

مسز وین۔ اگر آپ کوئی کتاب پڑھنا چاہیں تو بڑے شوق سے لے لیں۔ یہ میرے شوہر کی کتابیں ہیں۔

لی سنگ۔ اس میں کنفیوشنزم کی بہت سی کتابیں ہیں۔ میں بڑے شوق سے پڑھوں گا۔ نیچے کے خانے میں تو بچوں کی بھی بہت سی کتابیں ہیں۔!

مسز وین۔ (انکساری سے) میں بہت زیادہ پڑھی لکھی تو نہیں ہوں۔ مگر میں عورتوں اور بچیوں کو پڑھاتی ہوں۔

لی سنگ۔ کیا آپ اس طرح اپنے اخراجات پورے کر لیتی ہیں؟

مسز وین۔ انسان کسی نہ کسی طرح زندگی گزار ہی لیتا ہے۔ میں پڑھاتی ہوں اور میہوا کشیدہ کاری کرتی ہے۔ سب گھرانے اپنی لڑکیوں کو یہاں پڑھنے کے لیے بھیجنا پسند کرتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ میں صحیح اخلاقی سبق دیتی ہوں۔ اچھا میں دادی کو آپ کے آنے کی خبر کر دوں اور چانگ سے چائے کا بھی کہتی آؤں۔

(اٹھ کر دائیں جانب چلی جاتی ہے۔ دوسری جانب کے پردے کو جنبش ہوتی ہے اور میہوا اندر آتی ہے۔ وہ لی سنگ کو تنہا دیکھ کر جھجکتی ہے)

میہوا۔ اماں کہاں ہیں۔ میں سمجھی وہ یہاں ہیں! (جانے کو مڑتی ہے)

لی سنگ۔ آپ نہیں جا سکتی ہیں (کتاب رکھ کر اٹھتا ہے) یہ بتائیں آپ مجھے دیکھ کر بھاگ کیوں گئی تھیں!

میہوا۔ (شرما کر نظریں جھکا لیتی ہے)۔ نہیں تو!

لی سنگ۔ تمہیں معلوم ہے میں تمہارے گھر کیوں آیا ہوں۔

میہوا۔ (شرما کر) کیوں آئے ہو؟

لی سنگ۔ مارچ پاسٹ والے دن میں نے تمہیں گیلری میں دیکھا تھا۔ تم اتنی خوبصورت نظر آ رہی تھیں۔ جیسے کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہو۔

میہوا۔ ایسی باتیں نہ کیجئے۔

لی سنگ۔ کیا تم نے مجھے دیکھا تھا۔

میہوا۔ اتنی آدمیوں کے دستے میں بھلا میں ایک شخص کو کیسے دیکھتی؟

لی سنگ۔ جھوٹ مت بولو۔ تم نے مجھے دیکھا تھا۔ ہماری نظریں آپس میں ملی تھیں۔

میہوا۔ (دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر) ہاں دیکھا تھا۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟۔

لی سنگ۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ میں تمہارے گھر قیام کروں گا۔ (اس کے دونوں ہاتھ چہرے پر سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے) میری طرف دیکھو!

میہوا۔ اماں آتی ہوں گی (کمرے سے بھاگ جاتی ہے)

لی سنگ۔ (اپنے آپ سے) کتنا پیارا نام ہے۔ میہوا! — میہوا!!

میہوا۔ (اچانک بائیں جانب کے دروازے کے پردے سے جھانک کر) چپ رہو۔ کوئی سن لے گا! (لی سنگ اسی جانب پردے کے پاس آجاتا ہے)

لی سنگ۔ کیا تم کبھی میرے سامنے نہیں آؤ گی۔ مجھ سے بات نہیں کرو گی!

میہوا۔ (اسی طرح باہر سر نکال کر بات کرتی ہے۔ باقی جسم پردے کے اندر چھپا ہوا ہے) آؤں گی مگر دادی اور اماں کے سامنے! ان کا حکم ہے کہ میں تم سے تنہائی میں بات نہ کروں۔

لی سنگ۔ چند ماہ بعد میں "سوچو" چلا جاؤں گا۔

میہوا۔ کیا تم ڈاکوؤں کو پکڑ سکو گے۔ بہت مشکل کام ہے۔

لی سنگ۔ ہاں دن رات جان خطرے میں ڈالنا پڑتی ہے۔ کیونکہ وہ دوبدو آکر نہیں لڑتے۔

میہوا۔ (پردے سے نکل کر ایکدم سامنے آجاتی ہے) اوہ — تو پھر تم اس کام کو چھوڑ دو — وہ تمہیں مار ڈالیں گے۔

لی سنگ۔ (ہنس کر) واہ یہ میرا فرض ہے۔

(قدموں کی چاپ سن کر میہوا پھر بھاگ جاتی ہے۔ دادی اور مسز دین داخل ہوتی ہیں)

لی سنگ۔ (دادی کے سامنے جھک کر) آداب عرض کرتا ہوں نائی تائی!

دادی۔ بیٹے بیٹھ جاؤ۔ خیریت سے ہو۔ میں تمہاری حفاظت اور کامیابی کی ہر روز دعا کرتی ہوں۔

لی سنگ۔ میں آپ کے گھر کو اپنا گھر سمجھتا ہوں۔ اور یہاں بہت آرام سے ہوں۔

دادی۔ کیپٹن ہم لوگ بھی تمہیں پسند کرتے ہیں۔ عام فوجی افسروں کی طرح تمہارے اندر جھوٹی شان بگھارنے اور ڈینگیں مارنے کی عادت نہیں ہے۔

(دروازے کے پردے ہٹا کر بائیں جانب سے چانگ داخل ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں چائے کی ٹرے ہے۔ وہ ایک معمولی سا دھاری دار قمیص اور سفید ڈھیلا پاجامہ پہنے ہوئے ہے۔ اس کی عمر تقریباً پینتالیس سال ہے۔ وہ گٹھے ہوئے جسم کا مضبوط اور لمبا چوڑا آدمی ہے۔ اس کے سر پر چوٹی ہے جو اس نے گول گھما کر عام چینی دیہاتیوں کی طرح باندھ رکھی ہے۔ وہ شکل سے ہی نیک اور ایماندار معلوم ہوتا ہے۔ مسز دین پیالیاں اٹھا کر میز پر رکھتی ہے۔ چانگ خالی کشتی لے کر لوٹ جاتا ہے)

مسز وین۔ یہ ہمارا بوڑھا مالی چانگ تھا (چائے بنانے لگتی ہے) جب ہمارے باغ میں تربوز۔ ککڑیاں۔ اور دوسری ترکاریاں پیدا ہوتی ہیں تو چانگ۔ انھیں بیچ کر اچھے خاصے روپے کما لاتا ہے۔ بڑا ایماندار اور شریف ہے۔ باغ ہی میں ایک جھونپڑی کے اندر رہتا ہے۔

دادی۔ میں کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ اس کے بغیر ہم کیا کرتے وہ تنخواہ بھی نہیں لیتا۔ صرف کھانا کپڑا اور رہنے کی جگہ۔ اس کا دنیا میں اور کوئی نہیں ہے۔ جب تک اس کی ماں زندہ تھی وہ بھی ہمارے پاس رہی۔

مسز وین۔ گذشتہ سال سردیوں میں میں نے اس کے لیے ایک جیکٹ بنایا تھا اور وہ اس نے بڑی مشکل سے لیا تھا۔ بیچارہ جتنا کام کرتا ہے اتنا معاوضہ اسے نہیں ملتا۔

لی سنگ۔ ہاں چانگ شکل سے ہی شریف ایماندار اور محنتی معلوم ہوتا ہے!

(مسز وین چائے بنا کر دادی اور لی سنگ کو دیتی ہے۔ اسی وقت میہوا اندر آتی ہے)

میہوا۔ میں اندر آجاؤں!

دادی۔ میہوا آؤ۔ آؤ۔ کیپٹن تمہارے بھائی کی طرح ہیں (کیپٹن سے)۔ بڑی شرمیلی لڑکی ہے۔ (میہوا ایک کرسی پہ بیٹھ جاتی ہے۔ مسز وین اسے بھی ایک پیالی دیتی ہے)

لی سنگ۔ آپ یہ کتاب پڑھ رہی تھیں (میز پر اشارہ کرکے)

میہوا۔ جی ہاں۔ (سر جھکا لیتی ہے۔ اور آہستہ آہستہ چائے کے گھونٹ لیتی ہے)

لی سنگ۔ "می می" کیا آپ سارا دن پڑھا کرتی ہیں؟

میہوا۔ نہیں تو کبھی کبھی کشیدہ کاری کرتی ہوں۔ کبھی باغ میں جا کر چانگ کے ساتھ کام کرتی ہوں۔

لی سنگ۔ اوہ تب تو آپ کا بہت اچھا وقت گزرتا ہوگا۔!

میہوا۔ آپ نے ہمارا باغ دیکھا ہے۔

مسز وین۔ آج ہم آپ کو باغ دکھائیں گے۔ ہم نے مرغیاں بھی پالی ہیں۔ چانگ ان کی بھی دیکھ بھال کرتا ہے۔ آپ کے لیے چائے اور بناؤں؟

میہوا۔ لائیے میں آپ کو چائے دوں۔

(جواب کا انتظار کیے بغیر لی سنگ سے پیالی لے آتی ہے اور خود چائے بنا کر اسے دیتی ہے۔ پھر خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھ جاتی ہے)

دادی۔ (چائے کی پیالی تپائی پر رکھ کر) کیپٹن آپ کے والدین کہاں ہیں؟

لی سنگ۔ میرے والدین "سوچو" میں ہیں۔ بڑے بھائی "ہانگ کو" میں اور ایک چھوٹی بہن ہے۔ جو ابھی کنواری ہے۔

مسز وین۔ آپ نے تعلیم کہاں حاصل کی ہے؟

لی سنگ۔ پی یانگ ملٹری اکیڈمی میں۔ مجھے کمیشن لیے بارہ سال ہو گئے ہیں۔

مسز وین۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔ آپ نے اتنی کم عمر میں اتنی ترقی کر لی۔

لی سنگ۔ میری چھوٹی بہن بالکل می می کے برابر ہے۔ (پیالی رکھتا ہے)

دادی۔ چلیئے ہم آپ کو باغ دکھائیں۔ آپ نے ہمارے سنسان گھر میں رونق پیدا کر دی۔ کتنے عرصے بعد ان دیواروں نے مردانی ہنسی سنی ہے۔ ہمارا خاندان بہت بدقسمت ہے۔ آیئے باہر چلیں۔

(سب اٹھتے ہیں)

تیسرا سین

منظر:۔

(چانگ کی بانس کی جھونپڑی۔ اسٹیج کے بائیں جانب گویا باغ کی طرف راستہ کھلتا ہے۔ اس طرف ٹاٹ کا ایک پردہ لٹکا ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے باغ کو جانے والا راستہ نظر نہیں آتا۔ اس پردے کے قریب اسٹیج کے بائیں جانب چند گملے وغیرہ رکھ کر باغ کا راستہ دکھایا جا سکتا ہے۔ جھونپڑی میں فرش پر ایک میلی سی پرانی دری ہے۔ ایک طرف ایک تختہ لگا ہوا ہے۔ جس پر کچھ چینی اور تامچینی کے برتن ہیں۔ ایک پلنگ بچھا ہوا ہے۔ جس پر پرانا سا بستر ہے۔ چانگ ایک ڈھیلا سا گاؤن پہنے ہے۔ جس میں کئی جگہ پیوند ہیں۔ چانگ کے ہاتھ میں ایک گلاس ہے اور وہ دری پر بیٹھا ہوا چائے پی رہا ہے۔ اسی وقت کیپٹن لی سنگ اندر آتا ہے)

(پردہ اٹھتا ہے)

لی سنگ۔ چانگ کیا ہو رہا ہے۔ میں ابھی ابھی تمہارے باغ کی سیر کر کے آ رہا ہوں۔ تربوز تو خوب آ رہے ہیں۔

چانگ۔ کیپٹن میں آپ کے لیے چائے بناتا ہوں (کھڑا ہو جاتا ہے)

لی سنگ۔ اس وقت نہیں پھر کبھی پی لوں گا۔

چانگ۔ (چارپائی کی طرف اشارہ کر کے) تشریف رکھیئے۔ اگر چائے نہیں پیتے تو پھر تربوز ہی کھائیے۔ میں ابھی آپ کے لیے اچھا سا تربوز توڑ کر لایا۔ (اٹھتا ہے)

لی سنگ۔ نہیں چانگ اس وقت نہیں! میں تم سے باتیں کرنے آیا ہوں۔ تم بیٹھ کر اپنی چائے پیو اور ہم باتیں کریں۔

چانگ۔ (بیٹھ جاتا ہے) کیپٹن تم بہت اچھے آدمی ہو تائی تائی اور بیناٹی بھی تمہیں پسند کرتی ہیں۔ کیپٹن یہ بہت باعزت گھرانا ہے۔ یہاں میری ماں کا بڑھاپا بھی بہت آرام سے گزرا۔ میں ان کا بہت احسان مند ہوں۔

لی سنگ۔ مجھے بھی یہ گھرانا بہت پسند ہے۔

چانگ۔ کیپٹن جب تائی تائی کے شوہر کا انتقال ہوا تو ان کی عمر بیس برس کی تھی۔ انھوں نے دوسری شادی نہیں کی۔ بڑی محنت مشقت کرکے بیٹے کو پالا تھا۔ جب اس کی شادی کی تو عجیب بات ہے ایک دن وہ کنگھا کرتے ہوئے اچانک زمین پر گرا اور مرگیا۔ شاؤچین کی موت کے بعد یہ گھرانا دوسری مرتبہ اجڑ گیا۔ (گہرا سانس لے کر) نینائی کی عمر اس وقت اٹھارہ سال کی تھی اور اس کے ہاں بچہ ہونے والا تھا۔ شاؤچین کی موت کے ایک ماہ بعد یہ لڑکی پیدا ہوئی۔ تم توقع نہیں کر سکتے کہ اس عمر میں کوئی عورت بیوگی کاٹے جبکہ اس کے لڑکا بھی نہ ہو۔ لیکن نینائی نے بیوگی کے بیس برس کاٹے ——!

لی سنگ۔ انھوں نے کسی لڑکے کو گود لے لیا ہوتا!

چانگ۔ تائی تائی نے بہت کوشش کی کہ کسی لڑکے کو گود لے لیں تاکہ ان کی بہو خاندان کی مقدس، آگ کے سامنے بیوہ رہے۔ لیکن کوئی انھیں بچہ دینے پر تیار نہیں ہوا۔

لی سنگ۔ (حیرت سے) یہ کیوں ——؟

چانگ۔ لوگ کہتے ہیں اس خاندان کے مرد بد قسمت ہوتے ہیں۔ وہ جیتے نہیں۔ اسی لیے میہوا کا کوئی رشتہ نہیں آتا۔ وہ جوان ہے۔ اور شادی کی عمر کو پہنچ گئی ہے —— مجھے اپنی بیٹی کی طرح پیاری ہے۔

لی سنگ۔ تعجب ہے اتنی خوبصورت اور پیاری لڑکی سے کوئی شادی نہیں کرتا ہے۔

چانگ۔ (خوش ہو کر) تم ایسا کہتے ہو۔ مگر لوگ سمجھتے ہیں کہ دو بیوائیں گھر میں موجود ہیں۔ وہی قصہ تیسری دفعہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے میہوا سے جو شادی کرے گا وہ گویا خودکشی کرے گا۔

لی سنگ۔ اوہ —— فضول سی بات ہے۔

چانگ۔ کیپٹن میہوا اتنی اچھی لڑکی ہے وہ جس کی بیوی بنے گی اسے بہت خوش رکھے گی۔ تم —— تم میہوا سے شادی کیوں نہیں کر لیتے ہو!

لی سنگ۔ (مسکرا کر) میں —— میں میہوا سے شادی کر لوں!

چانگ۔ (بات کا جواب نہ دے کر) کیپٹن یہ بہت باعزت گھرانا ہے۔ اب میری دونوں بیگموں کی عزت اور توقیر کے لیے باب عفت تعمیر ہوگا۔

لی سنگ۔ باب عفت —— باب عفت کیا؟

چانگ۔ تمہیں نہیں معلوم ویشان جھیل کے قریب جو بڑی سڑک ہے اس پر جو بڑے بڑے عالیشان دروازے ہیں۔ وہ بڑے بڑے مشاہیر اور باعفت و باعصمت عورتوں کی یادگاریں بنائے گئے ہیں۔ باب عفت کی تعمیر شہنشاہ کے خاص حکم سے ہوتی ہے۔ ہمارے قصبے میں صرف (ہو) ہو گھرانے کی ایک ایسی عمارت ہے۔ وین خاندان کے لوگ اس بات پر حسد کیا کرتے تھے۔ اب وین خاندان کے لوگوں نے شہنشاہ کے استاد وین کو ان دو بیواؤں کے بارے میں لکھا ہے۔ تائی تائی نے بیوگی کے چالیس سال گزار لیے اور نینائی نے بیس برس کاٹ لیے۔ شہنشاہ نے ان کی عزت کے لیے باب عفت تعمیر کرانے کی درخواست منظور کر لی ہے۔

لی سنگ۔ اوہ — کیا یہ سچ ہے!

چانگ۔ ہاں کیپٹن بھلا میں اس بات میں مذاق کر سکتا ہوں۔ کتنی بڑی بات ہے کہ شہنشاہ خود کسی عورت کی عزت کرے۔ باب عفت کی تعمیر کے ساتھ ایک ہزار تولہ چاندی بھی ملتی ہے۔ خدا کرے میہوا کی شادی ہو جائے۔ نینائی اس کے بیٹے کو گود دے گی۔ اس طرح وین خاندان کا نام چلتا رہے گا۔

لی سنگ۔ باب عفت تو بہت توقیر کی چیز ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں اتنی مشہور اور باعزت عورتوں کا مہمان ہوں۔

چانگ۔ میں اپنی زندگی ان کے دروازے پر کاٹ دوں گا۔ اب میرا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔

لی سنگ۔ تم نے شادی کیوں نہیں کی۔؟

چانگ۔ میری والدہ جب تک زندہ رہی۔ وہ شادی کا ذکر چھیڑتی رہی مگر اس وقت ہمارے پاس روپیہ نہیں تھا — ماں کی موت کے بعد میں نے کبھی شادی کا نہیں سوچا نہ میرے پاس اتنے پیسے ہی ہوئے اور اب تو میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔

لی سنگ۔ پینتالیس سال کی عمر میں تو انسان بوڑھا نہیں ہوتا ہے۔

چانگ۔ (ہنس کر) مگر مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔

لی سنگ۔ اچھا اب میں چلتا ہوں — مجھے آج رات جنگلوں میں پھرنا ہے۔ ان ڈاکوؤں کا سراغ لگانا بہت مشکل کام ہے۔ (کھڑا ہو جاتا ہے)

چانگ۔ تم ہوشیاری سے کام کرنا ڈاکوؤں کا سردار بہت خطرناک آدمی ہے۔ لوگوں نے اس کا نام بھیڑیا رکھا ہے۔ وہ موذی اور خونخوار ہے!

لی سنگ۔ تم فکر نہ کرو۔ میں ہوشیاری سے رہتا ہوں۔ اچھا چلتا ہوں۔ خدا حافظ۔

(چلا جاتا ہے)

چانگ۔ (کھڑا ہو جاتا اسے دور تک جاتا ہوا دیکھتا ہے۔ اتنے میں میہوا اندر بھاگی ہوئی آتی ہے اور آتے ہی چانگ سے لپٹ جاتی ہے)

میہوا۔ چانگ — چانگ! ابھی — ابھی! وہ تمہارے پاس آیا تھا۔؟

چانگ۔ (اسے غور سے دیکھ کر) ہاں — آیا تھا!

میہوا۔ (چانگ کو چھوڑ کر پلنگ پر بیٹھ جاتی ہے اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر کہتی ہے) اوہ چانگ — چانگ تم نے اسے روکا نہیں۔ وہ رات بھر جنگل میں رہے گا۔ اس نے کیا کہا تھا —؟

چانگ۔ تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو شیہو چائی۔؟

میہوا۔ (سر جھکا کر) اوہ چانگ — میں اب تمہیں کیا بتاؤں۔؟

چانگ۔ میں سب جانتا ہوں۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ تم سے شادی کر لے۔

میہوا۔ چانگ تم کتنے اچھے ہو (کھڑی ہو جاتی ہے اس کا ہاتھ پکڑ کر) اس نے کیا جواب دیا۔

چانگ۔ مسکرا کر چپ ہو گیا تھا۔ میرا خیال ہے۔ نائی تائی اور نینائی بھی یہ بات سمجھتی ہیں کہ تم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو۔

میہوا۔ (دوبارہ پلنگ پر بیٹھ جاتی ہے اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ آدھا چھپا کر) اوہ! چانگ۔ وہ مجھ سے کہہ چکا ہے کہ وہ مجھ سے شادی کرے گا! اسے اور کوئی لڑکی پسند نہیں ہے۔ یہاں سے واپسی پہ سوچو جا کہ وہ اپنے والدین کو بتا دے گا۔ مگر دیکھو تم کسی سے یہ بات نہ کہنا۔

چانگ۔ نہیں کہوں گا۔ لیکن شیوچائی تم آج کل شام کو باہر کیوں جاتی ہو۔ خاص کر ان دنوں میں جب کیپٹن یہاں نہیں ہوتا۔

میہوا۔ (سر جھکا کر) چانگ میں یہ بات نہیں بتاؤں گی۔

چانگ۔ میں کسی سے نہیں کہوں گا۔

میہوا۔ اوہ چانگ — وہ میرا مندر کے پاس انتظار کرتا ہے۔ پھر ہم اکٹھے گھومتے ہیں اور جھیل کے کنارے نکل جاتے ہیں۔ مجھے اس کے ساتھ گھومنا بہت اچھا لگتا ہے۔ چانگ وعدہ کرو تم یہ بات کسی سے نہیں کہو گے۔

چانگ۔ اور سب سمجھتے ہیں کہ کپتان یہاں نہیں ہے۔ شیوچائی تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ اپنی والدہ اور دادی کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ قصبہ والوں نے تمہیں اس کے ساتھ گھومتے دیکھ لیا تو گھرانے کی بدنامی ہو گی۔ تمہاری دادی اور ماں کے لیے باب عفت تعمیر ہو رہا ہے۔

میہوا۔ اوہ چانگ میں — میں کیا کروں۔ مجھ سے رہا نہیں جاتا۔

چانگ۔ تمہیں وعدہ کرنا ہوگا کہ تم اس سے گھر سے باہر جا کر آئندہ کبھی نہیں ملو گی۔

میہوا۔ (چپ رہتی ہے)

چانگ۔ میں کپتان کو پسند کرتا ہوں۔ شاؤچائی وہ برا آدمی نہیں ہے۔ مگر ایک جوان لڑکی اور لڑکے کا تنہا گھومنا اچھی بات نہیں ہے۔ تم اب بچہ نہیں ہو۔ اس خاندان کی عزت کے لیے میں اپنی جان دے سکتا ہوں۔ شیوچائی تم وعدہ کرو آئندہ ایسا نہیں کرو گی۔ نہیں تو میں زہر کھا لوں گا۔

میہوا۔ (اٹھ کر چانگ کو پکڑ لیتی ہے) اوہ چانگ — میں وعدہ کرتی ہوں۔

(پھر اچانک دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگتی ہے اور روتی ہوئی فرش پر گر جاتی ہے)

چانگ۔ (اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیر کر) شیوچائی رو بیٹے نہیں! اوہ اوہ سنو تو میں نے آج ایک بہت بڑا تربوز توڑا ہے۔ بالکل شہد کی طرح میٹھا برف کی طرح ٹھنڈا —! اور ہاں آج میں کیکڑے پکاؤں گا۔

میہوا۔ (کھڑی ہو جاتی ہے اور آنسو پونچھ کر مسکراتی ہے) تم مجھے ہمیشہ ننھی بچی سمجھتے رہو گے۔ میں بوڑھی ہو جاؤں گی تب بھی — چانگ وہ شام کو میرا انتظار کرے گا — اوہ چانگ میں کیا کروں — مگر میں نہیں جاؤں گی — نہیں جاؤں گی چانگ نہیں جاؤں گی۔

(اداسی سے بائیں جانب چلی جاتی ہے۔ پھر پلٹ کر آتی ہے)

چانگ ایک بات پوچھوں؟

چانگ۔ (آگے بڑھ کر) پوچھو!

میہوا۔ تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے۔

چانگ۔ (ہنستا ہے) محبت وحبت تو پیٹ بھروں کی باتیں ہیں۔ مگر شیو چائی میں نے اپنی آنکھوں سے دنیا تو دیکھی ہے میں تمہارے بھلے کے لیے کہتا ہوں۔

میہوا۔ اچھا ٹھیک ہے چانگ میں کہہ چکی ہوں میں اس سے ملنے نہیں جاؤں گی۔ مگر چانگ میں ان عفت کے دروازوں کی قائل نہیں ہوں!

چانگ۔ (حیرت سے) شیو چائی!

میہوا۔ ہاں چانگ میں ان عفت کے دروازوں کی قائل نہیں ہوں۔

(دوبارہ بائیں جانب چلی جاتی ہے)

چانگ۔ اوہ میری مرغیاں۔ آج میں نے ڈربہ نہیں کھولا!

(تیز تیز قدم بڑھاتا ہے۔ پردہ گرتا ہے)

ایکٹ دوم

پہلا سین

منظر:۔

(وہی ڈرائنگ روم جو ایکٹ اول کے پہلے سین میں ہے۔ دادی اور مسز وین پریشان بیٹھی ہیں۔ مسز وین کے چہرے سے ایسا لگتا ہے۔ جیسے ابھی رو چکی ہے۔ چانگ خاموش کھڑا کھڑکی سے باہر دیکھ رہا ہے)

مسز وین۔ چانگ! میہوا ابھی تک نہیں آئی۔ آج رات اُس نے جانے کہاں گزاری ہے! (اپنا سر پکڑ کر سسکیوں سے روتی ہے)

دادی۔ بہو—! تم پھر رونے لگیں۔ تم رو رو کر اپنے آپ کو ختم کر لو گی۔ یہ سب میری غلطی ہے۔ مجھے کیپٹن کو گھر میں نہیں رکھنا چاہیئے تھا۔ آہ ہمارے گھرانے کی عزت خاک میں مل گئی۔ وین گھرانے کی لڑکی کل شام سے غائب ہے۔ رات خدا جانے کہاں گزاری ہے۔ اور اب بھی اس کا پتہ نہیں ہے — قصبہ والے ہمارے منہ پر تھوکیں گے بہو— ہم کہیں منہ دکھانے کے نہ رہیں گے۔ (آنسو پونچھتی ہے)

چانگ۔ گھبرانے کی بات نہیں ہے تائی تائی میہوا بُری لڑکی نہیں ہے۔ وہ کوئی غلط بات نہیں کر سکتی۔ اس میں بچپن زیادہ ہے۔ کیپٹن اچھا آدمی ہے۔

مسز وین۔ (چلا کر) چانگ میرے سامنے اس منحوس کا نام مت لو۔ وہ شیطان — چانگ تم ساری دنیا کو اپنی طرح سمجھتے ہو۔ وہ کیسا منحوس لمحہ تھا جب اس شیطان نے میرے دروازے پر قدم رکھا تھا۔ (سر پیٹ کر روتی ہے)

دادی۔ بہو ہمت سے کام لو — آہ میہوا نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔ چلو بہو اندر کمرے میں چل کر لیٹ جاؤ۔ تم رات بھر سے رو رہی ہو۔ میہوا کے انتظار میں رات کس طرح گزری ہے۔ اف! چلو اٹھو۔

(مسز وین کو پکڑ کر اٹھاتی ہے۔ دونوں کمرے سے نکل جاتی ہیں)

چانگ۔ (اپنے آپ سے) یہ کس کے قدموں کی چاپ ہے۔ شاید میہوا ہے۔

(اسٹیج کے بائیں جانب اس طرح جاتا ہے جیسے دروازہ کھولنے جا رہا ہے۔ بائیں جانب کا پردہ ہٹا کر میہوا اندر آتی ہے۔ چانگ اس کے ساتھ ہے)

چانگ۔ شیوچائی — یہ تم نے کیا کیا؟

میہوا۔ اماں اور دادی کہاں ہیں؟ (چانگ سے پلٹتے ہوئے) چانگ میں اس کے پاس گئی تھی۔ وہ گھوڑے سے گر گیا ہے۔ اس کے چوٹیں آئی ہیں۔ مجھے جیسے ہی یہ بات معلوم ہوئی۔ میں اتنی پریشان ہوئی کہ کسی سے بغیر کہے سنے سیدھی بازار سے ہی چلی گئی۔ وہ بدھ کے مندر میں ہے۔ چانگ میں رات بھر مندر میں رہی ہوں۔ (رونے لگتی ہے۔ اپنا سر چانگ کے بازو سے لگا دیتی ہے)

چانگ۔ (ملائم ہو کر اس کے سر پر ہاتھ رکھتا ہے) شیوچائی مت رو۔ میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گا۔ میں نینائی اور نانائی کو سمجھا لوں گا۔ مت رو شیوچائی مت رو،

میہوا۔ (آنسو پونچھ کر) چانگ تم کتنے اچھے ہو۔ تم نے مجھے معاف کر دیا۔ مگر تم اماں اور دادی کو نہیں جانتے —!

(اسی وقت پردہ ہٹتا ہے اور دائیں جانب سے مسز وین اندر آتی ہے۔ دادی اس کے پیچھے ہے۔ میہوا دوڑ کر ماں سے لپٹ جاتی ہے اور رونے لگتی ہے)

دادی۔ بے شرم لڑکی ڈوب مرو۔ ساری رات گھر سے باہر رہ کر اب تم کس منہ سے آئی ہو — ؟

مسز وین۔ (میہوا کو الگ دھکیلتے ہوئے) بے شرم لڑکی تم مر کیوں نہ گئیں —! ہماری عفت اور عصمت کی شہرت دور دراز ہے۔ تم نے ہمارے منہ پر کالک لگا دی۔ ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔ وین خاندان کے لوگ کیا کہیں گے — دوسرے خاندان ہم پر ہنسیں گے — آہ تم نے ہمیں برباد کر دیا۔

(دونوں عورتیں بیٹھ جاتی ہیں۔ میہوا اور چانگ کھڑے ہیں)

میہوا۔ (آنسو پونچھ کر دلیری سے) میں نے کوئی گناہ نہیں گیا ہے۔ میں لوگوں سے نہیں ڈرتی۔ کیپٹن زخمی ہو گیا ہے میں اس کے پاس گئی تھی۔

مسز وین۔ زبان مت چلاؤ بے شرم لڑکی!

میہوا۔ یہ میں مانتی ہوں کہ مجھ سے غلطی ہوئی مگر میں گنہگار نہیں ہوں۔ میں پاک دامن ہوں۔ ایک زخمی کی خبرگیری گناہ نہیں ہے۔

چانگ۔ تائی تائی میہوا اپنی غلطی مان رہی ہے۔ اسے معاف کر دو۔ اس نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ بدھ کے پاس رحم ہی رحم ہے! بدھ نے کہا ہے "تم اپنی غلطی محسوس کرو اور بدھ کا دھیان کرو تو اسی لمحہ تم خود بدھ بن جاؤ گے"۔

مسنزوین۔ چانگ تم بدھ کے سیدھے سادے چیلے ہو۔ تم دنیا کو نہیں جانتے! اگر یہ بات مشہور ہو گئی تو ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔ باب عفت تعمیر نہیں ہو گا!

میہوا۔ ہونہہ۔ باب عفت ——! ماں کیا تمہارے سینے میں سچ مچ دل نہیں ہے؟ اس حادثہ کی خبر سن کر مجھے کیا کرنا چاہیئے تھا۔

مسنزوین۔ (طنز سے) تمہیں ایک آوارہ گرد لڑکی کی طرح دوڑ جانا چاہیئے تھا۔ حالانکہ میں اور دادی بھی اس کی خبر لے سکتے تھے!

میہوا۔ اس کی خبر کوئی نہیں لے سکتا تھا۔ تمہارے سینوں میں دل نہیں۔ تم عفت کے دروازے کے سہارے جی رہی ہو۔ (چلا کر) مگر میں عفت کے دروازے کے لیے نہیں جی سکتی۔ آہ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو میں کیا کرتی۔ (رک کر) اس کے جسم پر بہت چوٹیں آئی ہیں۔ وہ بیہوش تھا۔ میں رات بھر اس کے سرہانے بیٹھی رہی۔ اس کے منہ میں تھوڑی دیر بعد پانی کے قطرے ڈالتی رہی۔ آدھی رات کو جب اسے ہوش آیا اور اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا تو اسے اتنی خوشی ہوئی کہ وہ اپنی ساری تکلیف بھول گیا۔ میں نے اس کا سر دبایا۔ باتیں کیں۔ یہ کوئی گناہ نہیں ہے۔ مگر ماں تم اور دادی یہ باتیں نہیں سمجھ سکتی ہو!

(چانگ کچھ سوچ کر باہر چلا جاتا ہے)

دادی۔ تم نے گناہ نہیں کیا۔ مگر دوسرے لوگ —— وہ کیا کہیں گے۔ تم انھیں کیسے یقین دلاؤ گی۔ اگر یہ افواہ پھیل گئی تو کیا شہنشاہ باب عفت تعمیر کروائے گا۔؟

میہوا۔ مجھے دنیا کی پروا نہیں ہے۔ میرا دل پاک ہے۔

دادی۔ اس کا دماغ خراب ہے۔ میں اس سے زیادہ بات نہیں کرنا چاہتی۔

(چلی جاتی ہے)

میہوا۔ (مسنزوین سے) ماں۔!

مسنزوین میہوا —— آہ تم نے یہ کیا کہا۔ تم نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا باب عفت!

میہوا۔ (اس کے قریب آ کر گلے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے) ماں میں باب عفت پر یقین نہیں رکھتی۔ یہ سب بکواس ہے۔ دادی نے چالیس برس بیوگی کے کاٹے اور تم بیس برس گزار چکی ہو۔ کیا تم باب عفت کے سہارے بیس برس اور گزارو گی؟ ماں تم اب بھی خوبصورت اور جوان ہو۔ آخر تم شادی کیوں نہیں کر لیتی ہو۔؟

مسنزوین۔ (میہوا کے ہاتھ ہٹا کر چلاتے ہوئے) آہ لڑکی میری قسمت میں تجھ سے یہ نصیحت سننا تھا۔ تیری زبان پر بجلی گرے! تیری زبان کٹ جائے۔ اوہ ——! (بے بسی سے روتی ہے)

میہوا۔ میں سچ کہتی ہوں ماں۔ سوچو تو تم ایک پتھر کے دروازے کے لیے زندگی بھر بیوگی کاٹو گی۔ ان گنت سال —— دادی بوڑھی ہو گئی ہیں۔ کتنے دن اور زندہ رہیں گی۔ میرا بیاہ ہو جائے گا۔ تم اکیلی کس طرح جیو گی ——؟ ماں تم نے بڑی

غلطی کی۔ تم اپنے زمانے کی حسین ترین عورت تھیں۔ تم سے ہر شخص خوشی سے شادی کر لیتا بیچارہ یو آن میں نے سنا ہے۔ وہ تم سے محبت کرتا تھا۔ اس نے تمہارے پیچھے جان دے دی۔

مسز وین۔ (خاموشی سے میہوا کو دیکھ رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں اب تک آنسو ہیں) میہوا!

میہوا۔ میں اب چپ نہیں رہوں گی۔ تم نے یو آن کو ٹھکرا دیا تاکہ تم ایک معزز بیوہ کہلاؤ۔ اونہہ باب عفت ——— (اس کے گلے میں باہیں ڈال کر) ماں باب عفت سے زیادہ اچھا ہوتا اگر تم یو آن سے شادی کر لیتیں۔ وہ تم سے بہت محبت کرتا تھا۔ میرے بہت سے بھائی بہن ہوتے۔ اور آج تم کتنی ہنس مکھ اور خوش مزاج ہوتیں۔ اور اب تمہارے پاس سوائے باب عفت کی آرزو کے اور کیا ہے۔؟

مسز وین۔ بس کرو ——— بس کرو میہوا ——— (پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے)

میہوا۔ اوہ ——— ماں ——— ماں مجھے معاف کر دو۔ مجھے معاف کر دو ماں!

مسز وین۔ (آنسو پونچھ کر) آہ میری اپنی لڑکی آج یہ کہہ رہی ہے۔ اتنی قربانیوں کا مجھے یہ انعام ملا ہے۔

میہوا۔ ماں مجھے تو اس پاکیزہ بیوگی میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔

مسز وین۔ میہوا تو نے آج کیسی بھیانک اور صدمہ پہنچانے والی باتیں کی ہیں۔ تو نے مجھے بہت دکھ دیا ہے ——— تو یہ باتیں بھی سوچ سکتی ہے!

دادی۔ (اندر آ کر) کیا ابھی تک اس کا دماغ درست نہیں ہوا۔

مسز وین۔ سن لو تمہاری پوتی کیا کہہ رہی ہے۔ آہ میں اس کی باتیں سننے کو کیوں زندہ رہی ———!

دادی۔ اب گھر سے باہر تمہارا قدم نہیں نکل سکتا۔ بوڑھے چانگ نے محلہ والوں سے جھوٹ بول کر ہماری عزت کی حفاظت کی ہے۔ اس نے کہا ہے وہ تمہیں خود جا کر تمہاری ایک دوست کے گھر چھوڑ آیا تھا۔ چانگ کتنا نیک ہے۔ اگر وہ ہماری مدد نہ کرتا تو ہم برباد ہو جاتے۔ سن لیا اب تم کہیں نہیں جاؤ گی۔

میہوا۔ چانگ کو میرے ساتھ کر دو ——— وہ زخمی ہے۔ میں شام کو اسے دیکھنے جاؤں گی۔

مسز وین۔ (چلا کر) نہیں جاؤ گی ——— کہیں نہیں جاؤ گی ——!

میہوا۔ ماں مجھ پر ترس کھاؤ ——— (کرسی پر بیٹھ کر رونے لگتی ہے)

دادی۔ چانگ ——— چانگ ———! (چانگ اندر آتا ہے) اندر کا بڑا کمرہ کھول کر میہوا کو بند کر دو اور تالا ڈال دو۔ میرے حکم کے بغیر تالا نہیں کھولا جائے گا۔

چانگ۔ تائی تائی وہ اب نہیں جائے گی۔

میہوا۔ نہیں چانگ میں جاؤں گی ——— تم مجھے اس کے پاس لے کر چلو۔ چانگ مجھے لے چلو ——— آہ وہ نہ جانے اب کیسا ہے۔

دادی۔ تم اس دروازے سے زندہ نہیں جاؤ گی ——— جا کر دیکھو۔

(دادی اور مسز وین میہوا کو پکڑ کر کھینچتی ہوئی اندر لے جاتی ہیں)

اسے کمرے میں بند رہنے دو — چانگ تالا لاؤ — بڑا تالا! (میہوا روتی جاتی ہے) •

پردہ گرتا ہے

دوسرا سین

منظر:-

(وہی ڈرائنگ روم۔ شام کا وقت ہے۔ کمرے میں بڑا سا لیمپ روشن ہے۔ مسز دین کتاب پڑھ رہی ہے۔ دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ مسز دین دروازہ کھولنے کو اسٹیج کے بائیں جانب جاتی ہے۔ چند لمحوں بعد لی سنگ کے ہمراہ اندر آتی ہے)

لی سنگ۔ میں دو دن سے آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر ڈاکٹر نے مجھے اٹھنے نہ دیا۔ آج میں چل ہی پڑا۔

مسز دین۔ آپ کی طبیعت اب ٹھیک ہے۔

لی سنگ۔ جی ہاں — آپ کی دعا سے اب چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا ہوں۔ ہاں — یہ بتایئے — ٹی می کہاں ہے۔

مسز دین۔ لی سنگ میں آپ کے سوال کی منتظر ہی تھی۔ آخر آپ کیا چاہتے ہیں؟ کیا آپ کو ہمارے گھرانے کی عزت کا ذرا بھی پاس نہیں ہے۔

دادی — (اندر آکر) مسٹر سنگ آپ اپنے ٹھہرنے کا کسی اور جگہ انتظام کر لیں —! (سنگ تعظیم کے لیے اٹھ کر جھکتا ہے۔ دادی کے بیٹھنے کے بعد جگہ پر بیٹھ جاتا ہے)

لی سنگ۔ کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔

دادی۔ آپ نے ہمارے اعتماد اور خلوص کا غلط استعمال کیا ہے۔

(دائیں جانب سے زور زور سے دروازہ پیٹ کر چلانے کی آواز آتی ہے "دروازہ کھولو — "دروازہ کھولو")

لی سنگ۔ (کرسی سے اٹھ کر دائیں جانب دوڑتا ہے۔ مسز دین اٹھ کر اس کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے) یہ کیا تماشہ ہے؟ میہوا — میہوا —!

مسز دین۔ لی سنگ! تم آگے قدم نہیں بڑھاؤ گے! (اسٹیج کے دائیں جانب سے دروازہ پیٹنے کی آواز برابر آ رہی ہے — "سنگ سنگ تم آگئے — دروازہ کھولو — دروازہ کھولو۔ پکار کر پھر دروازہ پیٹنے کی آواز)

لی سنگ۔ میہوا کو کس لیے بند کیا ہے۔ دروازہ کھولیئے! دروازہ کھولیئے!!

(دائیں جانب سے آواز آتی ہے "سنگ سنگ مجھے بچا لو۔ میں مر جاؤں گی۔ یہ سب مجھے مار ڈالیں گے۔ مجھے بچا لو۔ یہاں آؤ" دروازہ پیٹتی اور روتی ہے)

لی سنگ ۔ میہوا ۔۔۔ میہوا ۔۔۔ تم کہاں ہو؟ (مسز وین سے) خدا کے لیے دروازہ کھول دیجئے۔

مسز وین ۔ سنگ کیا تم اس لڑکی سے شادی کرو گے یا ۔۔۔؟

سنگ ۔ (چلاتے ہوئے) ہاں ہاں میں اس سے شادی کروں گا ۔۔۔ میں اس سے شادی کروں گا ۔۔۔ اوہ اسے کھول دو۔

(دادی اٹھ کر اندر جاتی ہے)

مسز وین ۔ تم نے یہ بات پہلے کہی ہوتی تو میہوا کو اتنی سختیاں برداشت نہ کرنی پڑتیں ۔۔۔ میری غریب بچی۔ (دادی میہوا کو ساتھ لے کر آتی ہے)

لی سنگ ۔ (میہوا کی طرف بڑھتے ہوئے) میہوا ۔۔۔ میہوا!

میہوا ۔ سنگ مجھے یہاں سے لے چلو۔ میں مرجاؤں گی (اچانک مسز وین رونا شروع کر دیتی ہے۔ سسکیاں بڑھتی جاتی ہیں۔ سب خاموش ہیں۔ سنگ اس کے پاس آتا ہے)

لی سنگ ۔ اماں خدا کے لیے مجھے معاف کر دیجئے۔ سب میری وجہ سے ہوا۔ (اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر بوسہ دیتا ہے) میری پیاری اماں ۔۔۔!

دادی ۔ (متاثر ہو کر رومال سے آنسو خشک کرتے ہوئے) بہو نہ رو۔ سنگ تمہارا بیٹا بن چکا ہے۔ اب تک جو کچھ ہوا ہمیں بھول جانا چاہیئے۔

مسز وین ۔ (سنگ کے سر پر ہاتھ رکھتی ہے) خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے! (رومال سے آنکھیں پونچھتی ہے)

لی سنگ ۔ آج مجھے چھٹی مل گئی ہے میں "سوچو" جا کر اپنے والدین سے کہتا ہوں کہ وہ جلد شادی کا انتظام کریں۔ میں ایک ماہ کے اندر میہوا کو دلہن بنا کر لے جاؤں گا۔

(میہوا اماں کے پاس آتی ہے۔ اس کے چہرے پر خوشی کی چمک ہے اور آنکھوں میں آنسو ہیں وہ ماں کے گلے میں باہیں ڈال کر دونوں گالوں پر پیار کرتی ہے۔ مسز وین اس کی پیشانی چومتی ہے)

(دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر سسکیاں بھرتی ہیں۔ پردہ گرتا ہے)

ایکٹ سوم

پہلا سین

منظر:

(رات کا وقت ہے۔ چانگ کی جھونپڑی کا اندرونی حصہ اسٹیج پر دکھائی دے رہا ہے۔ چانگ اپنے بستر پر ایک چادر اوڑھے بے خبر سو رہا ہے۔ ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز آتی ہے۔ چاند

کی روشنی چانگ کے بستر پر پڑ رہی ہے۔ پردہ اٹھتا ہے)

آواز۔ چانگ ـــــ! چانگ!

چانگ۔ (بستر سے ہڑبڑا کر اٹھتا ہے اور ماچس جلا کر موم بتی روشن کرتا ہے۔ مسز وین اسٹیج کے بائیں جانب کھڑی ہے۔ چاند کی روشنی چانگ کے مضبوط جسم پر پڑ رہی ہے۔ اس کے بازوؤں کی ابھری ہوئی مچھلیاں نظر آ رہی ہیں۔ مسز وین آگے بڑھ کر اسے غور سے دیکھتی ہے) کیا کسی چیز کی ضرورت ہے شیو جانی۔ کہیں موم بتی گل نہ ہو جائے۔ (ہاتھ سے ہوا کی آڑ کر لیتا ہے)

مسز وین۔ اتنی صاف چاندنی میں موم بتی کی کیا ضرورت ہے! چانگ تم بہت گہری نیند سوتے ہو۔ میں نے مرغیوں کے چلانے کی آواز سنی ہے۔ شاید کوئی پہاڑی بلی اندر گھس کر مرغی پکڑ رہی تھی۔

چانگ۔ میں نے تو آواز نہیں سنی۔ میں نے ڈربہ بھی اچھی طرح بند کیا تھا۔

مسز وین۔ میں تو گھنٹے بھر سے آوازیں سن رہی ہوں۔ سوچا کہ اٹھ کر دیکھوں کیسا شور ہے۔

چانگ۔ میں ابھی جا کر ڈربہ دیکھتا ہوں۔ (آگے بڑھتا ہے)

مسز وین۔ نہیں باہر نہ جاؤ۔ تم بنیان بھی نہیں پہنے ہو۔ باہر سردی ہے۔ سبزہ شبنم سے بھیگا ہوا ہے۔ میں نے ڈربہ بند کر دیا ہے۔ آئندہ خیال رکھنا۔

چانگ۔ فکر نہ کریں آئندہ ایسا نہ ہو گا۔

مسز وین۔ چانگ میہوا کے جانے کے بعد میرا دل بہت گھبرانے لگا تھا اور اب جب سے تائی تائی کا انتقال ہوا ہے۔ مجھے رات بھر وحشت کے مارے نیند نہیں آتی ہے۔ اچھا اب میں جاتی ہوں۔

چانگ۔ چلئے میں آپ کو چھوڑ آؤں۔

مسز وین۔ نہیں نہیں تم سردی میں نہ آؤ۔ میں چلی جاؤں گی (جاتی ہے پلٹ کر آجاتی ہے) ہاں میں تمہیں یہ بتانا بھول گئی کہ کل استاد وین پھر آئے تھے۔

چانگ۔ باب عفت کی تعمیر کا حکم تو عرصہ ہوا ہو چکا ہے۔ اب تعمیر کا کام کب شروع ہو گا۔ استاد وین نے کچھ بتایا ہے؟

مسز وین۔ اوہ باب عفت کا ذکر چھوڑو ـــــ ہاں استاد وین دادی کے مقبرے کے لیے ایک سو تولہ چاندی دے گئے ہیں۔

چانگ۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب باب عفت کی تعمیر میں کوئی شبہ نہیں رہا ہے۔ نینائی مجھے آپ پر فخر ہے۔

مسز وین۔ چانگ میں بہت اداس رہتی ہوں۔ مجھے رات رات بھر نیند نہیں آتی۔

چانگ۔ میہوا کو بلا لیں۔ دادی کے انتقال پر بھی سنگ تنہا آیا تھا۔

مسز وین۔ میہوا کا آنا ابھی ممکن نہیں ہے۔ اس کے ہاں بچہ ہونے والا ہے۔ اور پھر تم جانتے ہو۔ ازدواجی زندگی کی مسرت ملنے کے بعد لڑکیوں کو والدین کے گھر کی پروا نہیں ہوتی ہے۔

چانگ۔ آج کل میں تربوز دیکھ کر میہوا کو بہت یاد کرتا ہوں۔

مسز وین۔ اُف یہ تنہائی۔ یہ بھائیں بھائیں کرتے ہوئے کمرے مجھے کاٹتے ہیں۔!

چانگ۔ جب آپ بہو کے بچہ کو گود لے لیں گی تو آپ کے خوشی کے دن ایک بار پھر لوٹ آئیں گے۔ وین خاندان کا نام روشن رہیگا۔

مسز وین۔ اچھا اب میں چلتی ہوں۔ تم بیٹھو۔

(چلی جاتی ہے)

دوسرا سین

منظر:

(پردہ اٹھنے پر۔ چاند کی ہلکی روشنی چانگ کے بستر پر پڑ رہی ہے۔ چانگ سو رہا ہے اس نے ایک چادر اوڑھی ہے۔ اوپر کا جسم ننگا ہے۔ جو کھلی ہوئی چادر میں سے روشنی میں چمک رہا ہے۔ مسز وین داخل ہوتی ہے۔ چند لمحہ تک مبہوت ہو کر چانگ کو دیکھتی ہے پھر اس کی چادر کھینچ کر اس کا جسم اچھی طرح ڈھکتی ہے اور قریب آکر زور زور سے آواز دیتی ہے۔ "چانگ۔ چانگ"!)

(چانگ ہڑبڑا کر اٹھتا ہے۔ دونوں کے سائے چاندنی میں صاف نظر آ رہے ہیں)

چانگ۔ نینائی کیا بات ہے؟

مسز وین۔ او چانگ میں نے ایک جنگلی بلا دیکھا ہے۔ وہ دیوار سے کود کر بھاگ گیا۔ مرغیوں کا شور سن کر میری آنکھ کھل گئی تھی۔

چانگ۔ میں نے تو مرغیوں کے چلانے کی آواز نہیں سنی۔ برا ہو اس نیند کا! (اٹھ کر کونے میں رکھی ہوئی لالٹین اٹھا کر جلاتا ہے اور اسے تپائی پر رکھ دیتا ہے) میں ابھی جا کر ڈربہ دیکھتا ہوں۔ آپ یہاں بیٹھئے باہر سردی ہے۔ (چلا جاتا ہے)

مسز وین۔ (تپائی کے پاس آکر لالٹین کی روشنی میں اپنے ہاتھ دیکھتی ہے۔ اس کے ہاتھ خون میں بھرے ہوئے ہیں۔ گاؤن پر بھی جگہ جگہ خون کے دھبے نظر آ رہے ہیں وہ کبھی ہاتھ دیکھتی ہے اور کبھی جھک کر گاؤن۔ اسی وقت چانگ اندر آتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک مرغی ہے۔ جس کے خون بہہ رہا ہے)

چانگ۔ نینائی مجھے معاف کر دیجئے۔ یہ سب میرا ہی قصور ہے۔ نہ میں اتنی گہری نیند سوتا نہ بلا مرغی کو مارتا۔ مجھے بہت افسوس ہے۔ (اسی لمحہ اس کی نظر مسز وین کے ہاتھوں اور لباس پر پڑتی ہے)

مسز وین۔ (اپنے دونوں ہاتھ پیٹھ کی طرف کر کے چھپانے کی کوشش کرتی ہے) اوہ یہ تو کوئی بات نہیں ہے۔ ہم کل دوپہر کے کھانے پر اس مرغی کو پکائیں گے۔ شکر ہے وہ لے نہیں گیا۔ مجھے دیکھتے ہی بھاگ گیا۔

چانگ۔ ڈربہ میں ایک بڑا سا سوراخ ہے۔ بلے نے اپنے پنجوں سے اتنا بڑا سوراخ کیسے بنا لیا۔ یہ بڑے تعجب کی بات ہے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔ نینائی آپ گھر میں چلئے۔ میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتا ہوں۔ آپ کو میری غفلت کے سبب سردی

میں نکل کر پریشان ہونا پڑا۔

مسز وین۔ نہیں مجھے تو یہاں اچھا لگ رہا ہے۔ ہلکی سی چاندنی اور باغ کی ہوا ـــــ تم چائے بناؤ میں یہیں بیٹھ کر پیوں گی۔

چانگ۔ میں ابھی منٹوں میں چائے لایا (باہر جاتا ہے)

مسز وین۔ گھبراہٹ کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اطمینان سے بناؤ۔ (چانگ کے بستر پر بیٹھ جاتی ہے اور چند لمحوں تک خاموشی سے چانگ کی چیزوں کا جائزہ لیتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد چانگ ہاتھ میں چائے کی کیتلی لے کر آتا ہے۔ تختہ پر سے پیالی اٹھا کر مسز وین کے لیے چائے نکالتا ہے۔ اور اس کی طرف چائے بڑھاتے ہوئے اس کے ہاتھوں کو دیکھ کر رک جاتا ہے)

چانگ۔ نینائی آپ کے ہاتھوں پر خون ہے۔ آپ ہاتھ دھو لیں۔

مسز وین۔ (ٹھٹک کر ہاتھ پیالی کی طرف لے جاتے ہوئے رک جاتی ہے) اوہ! میں نے ابھی مرغی چھو کر دیکھی تھی۔ اس میں سے گوشت تو کافی نکل آئے گا۔ (چانگ کونے میں رکھی ہوئی لٹیا اٹھا کر لاتا ہے۔ مسز وین اٹھتی ہے اور ایک برتن میں ہاتھ دھوتی ہے۔ چانگ ہاتھ دھلا کر لٹیا رکھ دیتا ہے۔ اور چائے کی پیالی مسز وین کو دیتا ہے۔ مسز وین بستر پر بیٹھ کر آہستہ آہستہ چائے کے گھونٹ لیتی ہے)

مسز وین۔ چانگ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہارا بستر اتنا پرانا اور خراب ہے میں تمہیں کل ہی ایک نیا بستر دوں گی۔

چانگ۔ نہیں نینائی یہ بستر میرے لیے ٹھیک ہے۔ یہ تو زندگی بھر میرا ساتھ دے سکتا ہے۔

مسز وین۔ نہیں نہیں! تمہیں یہ بستر بدلنا ہوگا۔ کافی میلا ہو گیا ہے۔ میں سویرے ہی تمہیں دوسرا بستر دے دوں گی۔

چانگ۔ آپ کی مہربانی ہے۔

مسز وین۔ تم چائے نہیں پیو گے۔ تم بھی پی لو۔ سردی میں باہر گئے تھے۔

چانگ۔ (مسز وین کے اصرار پر اٹھ کر ایک گلاس میں اپنے لیے چائے ڈالتا ہے اور فرش پر بیٹھ کر پینے لگتا ہے) چائے بہت گرم ہے۔ آپ کو اس وقت آرام دے گی!

مسز وین۔ بہت مزیدار چائے ہے! ہاں تم ڈربہ کی مرمت کر دینا ورنہ بلا پھر آ جائے گا۔

چانگ۔ میں سویرے ہی مرمت کر دوں گا۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔

مسز وین۔ اس میں شرمندگی کی کیا بات ہے۔ کل کھانے پر ہمیں اتنی اچھی مرغی ملے گی ـــــ ہاں میرا خیال ہے بلا کل بھی آئے گا۔ کیونکہ جو کچھ وہ چاہتا تھا آج اسے نہیں ملا ہے (ہنستی ہے) اچھا اب میں چلتی ہوں۔ تم آرام کرو ـــــ (اس کی طرف غور سے دیکھتی ہے۔ چانگ اس کے پیچھے ہے)

چانگ۔ میں آپ کو چھوڑ آؤں ـــ چلیے۔

(پردہ)

تیسرا سین

(چانگ کی جھونپڑی کے اندر کا منظر ہے۔ لالٹین جل رہی ہے۔ چانگ بستر پر بیٹھا ہے۔ نیند کی شدت سے جمائیاں لے رہا ہے۔ کمرے میں آج چاندنی زیادہ ہے۔ مسز وین

سفید لباس پہنے آ رہی ہے۔ چاندنی میں وہ اتنی بھلی لگ رہی ہے جیسے کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہے)

مسز وین۔ (قریب آکر) چانگ — چانگ! تم جاگ رہے ہو۔ آج تو بلا نہیں آیا۔

چانگ۔ (بڑبڑا کر کھڑا ہو جاتا ہے) نہیں نینائی ابھی تک تو بلا نہیں آیا۔ آج میں ساری رات رکھوالی کروں گا۔ آج سویا ہی نہیں —!

مسز وین۔ اتنی پیاری چاندنی میں بھلا تم لال ٹین کیوں جلایا کرتے ہو!"

چانگ۔ تاکہ اگر بلے کی آواز سنوں تو لال ٹین لے جاکر ڈربا اچھی طرح دیکھ سکوں۔

مسز وین۔ مجھے یقین ہے آج بلا ضرور آئے گا۔ ہم یہاں بیٹھ کر اس کا انتظار کریں۔

چانگ۔ نہیں نینائی آپ گھر میں جاکر آرام کریں۔ آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں۔

مسز وین۔ مجھے نیند ویسے بھی کہاں آتی ہے (اس کے بستر پر بیٹھ کر) ہاں تمہیں نیا بستر پسند آیا؟

چانگ۔ نینائی یہ چادر اتنی سفید ہے کہ اس پر بیٹھنے کی ہمت نہیں پڑتی ہے۔

مسز وین۔ (ہنستی ہے) تب تو تمہیں ضرور بیٹھنا ہوگا (اس کا ہاتھ پکڑ کر) آؤ تم بھی بیٹھو۔

چانگ۔ (کانپ کر ہٹتے ہوئے) نہیں نینائی میری کیا مجال ہے جو آپ کے برابر بیٹھوں۔ میں زمین پر بیٹھ جاؤں گا۔ (زمین پر بیٹھ جاتا ہے)

مسز وین۔ (جھک کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتی ہے) نہیں چانگ تمہیں یہاں بیٹھنا ہوگا۔ تم ہمارے عزیزوں کی طرح ہو۔ تم نے ہمارے خاندان کے لیے کیا کچھ نہ کیا۔ میں تمہاری مہربانیوں کا بدلہ نہیں ادا کر سکتی۔ اگر تم نہ ہوتے تو خدا جانے ہمارے گھر لنے کا کیا حشر ہوتا۔

چانگ۔ نینائی بھلا میں کس قابل ہوں۔ میں نے تو اپنا فرض ادا کیا ہے۔

مسز وین۔ اٹھو چانگ یہاں بیٹھو — تم میں اور مجھ میں نوکر اور آقا کا رشتہ بھلا کب تھا۔ تم ہمارے عزیزوں کی طرح ہو (چانگ اس کے اصرار پر اٹھ کر مسز وین سے دور ہو کر چارپائی کے کونے پر بیٹھ جاتا ہے)

مسز وین۔ چانگ آج کتنی خوبصورت چاندنی ہے — باغ میں لالہ کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ ارے تم اتنی دور کیوں بیٹھے ہو (اس کے قریب سرک کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔ چانگ کے چہرے پر گھبراہٹ سی ہے) ہاں چانگ ہمیں اس مرتبہ ترکاریوں سے کتنی آمدنی ہو جائے گی۔ مجھے میہوا کے اور اس کے بچے کے لیے نئے کپڑے بنانے ہوں گے۔ وہ دو سال بعد گھر آ رہی ہے۔

چانگ۔ کافی آمدنی ہو جائے گی۔ شہنشاہ کے پاس درخواست گئے ہوئے کئی سال ہو گئے ہیں۔ کئی مرتبہ سننے میں آیا کہ انھوں نے باب عفت کی منظوری دے دی ہے۔ آپ نے اپنی طرف سے خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔ ورنہ آپ کو ہزار تولہ چاندی بھی اب تک مل گئی ہوتی۔

مسز وین۔ ہاں ہم کوشش کرتے تو اب تک چاندی مل ہی جاتی۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ میں عورت ذات مبتلا ان

بانوں کے لیے کیسے دوڑ دھوپ کروں ۔

چانگ ۔ میہوا اور سنگ کے آنے کے بعد مجھے چند روز کی چھٹی دے دیں ۔ میں استاد وین سے مل کر باب عفت کی تعمیر کا حکم جلد حاصل کر دوں گا اور ہزار تولہ چاندی کی منظوری بھی لے آؤں گا ۔ جب یہ بات طے ہو گئی ہے کہ باب عفت بننا چاہیئے تو اس میں دیر صرف ہماری خاموشی سے ہو رہی ہے ۔

مسز وین ۔ (موضوع بدلتے ہوئے) چانگ کیا تم نے اتنے برسوں میں کبھی شادی کے متعلق نہیں سوچا ۔۔۔ ! (چانگ ذرا الگ ہٹنے کی کوشش کرتا ہے ۔ مسز وین ہاتھ چھوڑ دیتی ہے)

چانگ ۔ نینائی آپ جانتی ہیں میں کتنا غریب ہوں ۔ میں بھلا ایک کنبہ کا بوجھ کیونکر سنبھالوں گا ۔ آپ کی خدمت میں زندگی گزار دوں گا ۔ آدھی گزر گئی ہے جو باقی ہے وہ بھی گزر جائے گی ۔

مسز وین ۔ چانگ تم عجیب آدمی ہو ۔۔۔ ! تمہارے اندر وہ ساری باتیں موجود ہیں جو ایک اچھے انسان میں ہونا چاہئیں ۔ تم مضبوط اور جفاکش ہو ۔ اتنے نیک اور ایماندار ہو بھلا تم سے شادی پہ کون رضامند نہ ہو گا ۔

چانگ ۔ مگر نینائی اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں ۔

مسز وین ۔ (ہنستی ہے چاند کی روشنی اس کے چہرے پر صاف پڑ رہی ہے ۔ اس کی آنکھیں چمک رہی ہیں)

چانگ ۔ (خوفزدہ سا ہو کر اسے دیکھتا ہے) نینائی !

مسز وین ۔ تم اتنے ڈرے ہوئے کیوں لگ رہے ہو ۔

چانگ ۔ میں سوچ رہا ہوں کہ آپ کہیں ماکو پری تو نہیں ہیں جو سفید کپڑے پہن کر چیت کے مہینے میں آتی ہے ۔ جس کی آنکھیں سنا ہے ہیروں کی طرح چمکتی ہیں ۔ (دونوں ایک دوسرے کی طرف غور سے دیکھتے ہیں)

مسز وین ۔ کیا میں ماکو پری کی طرح خوبصورت ہوں ؟ (چانگ جواب نہیں دیتا)

مسز وین ۔ چانگ میں نینائی ہوں ۔ میں عورت ہوں ۔۔۔ مجھے چھو کر دیکھو ! (اپنا بازو اس کی طرف بڑھا کر) دیکھو چانگ میں تمہاری نینائی ہوں !

چانگ ۔ (مبہوت ہو کر چپ بیٹھا ہے جیسے وہ انسان نہیں پتھر کا بت ہے) نینائی ! میری سمجھ میں نہیں آتا ۔۔۔ میں ۔۔۔ میں !

مسز وین ۔ چانگ بتاؤ کیا تمہارے خیال میں ماکو پری محبت کر سکتی ہے ؟ شادی کر سکتی ہے ۔ جیسے عورت اور مرد ہمیشہ سے رہتے آئے ہیں ۔ ماکو پری اس طرح رہ سکتی ہے ؟

چانگ ۔ مجھے کیا پتہ ۔۔۔ میں کیسے کہہ سکتا ہوں ۔ میں کبھی ماکو پری سے نہیں ملا ؟

مسز وین ۔ اچھا اگر آج رات تم اس سے ملو تو کیا کرو ؟ ۔۔۔ کیا تم اس سے محبت کرو ۔ (چپ رہ کر) تم مجھے عورت دیکھنا چاہتے ہو یا ماکو پری ؟

چانگ ۔ نینائی آپ مذاق کر رہی ہیں ۔ بھلا میری یہ کیسے ہمت ہو سکتی ہے ۔

مسز وین ۔ ہاں چانگ ۔ اگر ماکو پری تم سے شادی کرنا چاہے تو تم کیا کرو گے ؟ میں مذاق نہیں کر رہی ۔ میں سنجیدہ ہوں ۔ میں چاہتی

ہوں ہم ہمیشہ ساتھ رہیں —— میاں بیوی بن کر —— !

چانگ ۔ نینائی مجھے آپ کی باتوں پر یقین نہیں آتا —— (کھڑا ہو جاتا ہے) —— میری حیثیت ہی کیا ہے ۔ میں آپ کا ادنیٰ خادم ہوں اور —— اور پھر بابِ عفت ؟

مسز وین ۔ اوہ بابِ عفت کا ذکر چھوڑو —— مجھے تمہاری ضرورت ہے ! ہم دونوں بڑھاپے تک خوشی اور سکھ سے ساتھ رہیں گے ۔ مجھے لوگوں کے کہنے سننے کی بھی پروا نہیں ہے ۔ میں نے بیس برس بیوگی کے کاٹے ہیں ۔ یہ میرے لیے کافی ہیں ۔ دوسری عورتوں کو بابِ عفت کا حقدار بننے دو ۔ میں بابِ عفت نہیں چاہتی ۔ (کھڑی ہو جاتی ہے اور اپنا سر چانگ کی چھاتی سے لگا دیتی ہے) میں بابِ عفت نہیں چاہتی ۔ (چانگ پتھر کا بت بنا کھڑا ہے) چانگ ، کیا تمہارا جی نہیں چاہتا کہ مجھے پیار کرو .... (رک کر طنز سے) در اصل تمہارے جیسے آدمیوں کے لیے ایک بابِ عفت ہونا چاہیے ۔

چانگ ۔ نینائی اوہ —— نینائی ! (الگ ہونا چاہتا ہے ۔ مسز وین ہٹ کر کھڑی ہو جاتی ہے)

مسز وین ۔ چانگ —— میری طرف دیکھو ! میرے چانگ ! (اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے ۔)

(چانگ مسز وین کا ہاتھ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پکڑ کر اس کے ہاتھ کو بوسہ دیتا ہے ۔

مسز وین اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیتی ہے)

چانگ ۔ مگر نینائی لوگ کیا کہیں گے ؟ لی سنگ اور میہوا —— یہ سب لوگ کیا سوچیں گے ۔

مسز وین ۔ چانگ میہوا بہت خوش ہو گی ۔ وہ کہے گی ۔ صبح کا بھولا اگر شام کو واپس آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے ۔

چانگ ۔ نینائی —— !

مسز وین ۔ نینائی نہیں —— مجھے مانیا کہو —— میرا نام لے کر پکارو —— پکارو چانگ —— مجھے مانیا کہہ کر پکارو ۔ (اس کا بازو ہلاتی ہے)

چانگ ۔ اوہ —— میری تو ہمت نہیں پڑتی ہے ۔ آپ نے مجھے زمین سے اٹھا کر آسمان تک پہنچا دیا ہے ۔ مگر میں آپ کا ایک ادنیٰ اور وفادار خادم ہی رہوں گا ۔

مسز وین ۔ نہیں چانگ —— تم نے میری بہت دلی خدمت کی ہے ۔ تم نے اپنا حق ادا کر دیا ہے ۔ اب میری باری ہے ۔ اب میں تمہاری خدمت کروں گی —— اور تم بڑھاپے تک خوشی اور آرام سے رہو گے ۔

چانگ ۔ میں ایک غریب اور جاہل آدمی ہوں ۔ نہ جانے کس جنم کے کیے کا میں نے اچھا پھل پایا ہے —— !

مسز وین ۔ (محبت سے اس کا بازو چھوتی ہے) تم نے اس جنم میں ہی دیوتا کی سی پاک زندگی گزاری ہے —— یہ سب تمہارے اسی جنم کا انعام ہے ۔ (رک کر) چانگ ۔ میہوا اور لی سنگ آنے والے ہیں ۔ تم ان سے بات کر سکتے ہو ؟

چانگ ۔ نینائی —— میں لی سنگ سے اس بارے میں بات کروں گا ۔

مسز وین ۔ (خوش ہو کر اپنا سر پھر ایک دفعہ اس کے سینے سے لگا دیتی ہے ۔ چانگ جذبات سے مغلوب ہو کر مسز وین کے چہرے پر جھکنا چاہتا ہے ۔ مسز وین اچانک علیحدہ ہو کر) اچھا چانگ تم اب سو جاؤ میں چلتی ہوں ۔

جانگ۔ خدا حافظ نینانی۔ میں آپ کو چھوڑ آؤں۔

مسز ڈین۔ نہیں — نہیں تمہارا سینہ کھلا ہوا ہے ہوا نہ لگ جائے۔ میں چلی جاؤں گی —— اور ہاں مجھے مانیا کہا کرو —— مانیا —!

(چلی جاتی ہے۔ جانگ اس کے جانے کے بعد آپ ہی آپ مسز ڈین کا نام دہراتا ہے۔ "مانیا — مانیا —!" پھر اچانک اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیتا ہے۔ جیسے کوئی بہت عجیب بات منہ سے نکل گئی ہے۔ پھر وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں ملتا ہے۔ اپنی کلائی پر چٹکی بھرتا ہے کہ کہیں یہ سب کچھ خواب تو نہیں —— چاروں طرف جھونپڑی میں گھومتا ہے۔ اور گرد رکھی ہوئی چیزوں کو چھوتا ہے۔ جیسے وہ اپنے اس یقین کو مضبوط کرنا چاہتا ہے کہ وہ جاگ رہا ہے اور خواب نہیں دیکھ رہا ہے۔ پھر لالٹین میں پھونک مار کر اسے بجھاتا ہے۔ چاند کی روشنی خوب تیز ہے وہ ایک انگڑائی لیتا ہے۔ اور بلند آواز سے کہتا ہے "اب جنگلی بلا کبھی نہیں آئے گا" پھر لیٹ کر چادر کھینچ کر اوڑھ لیتا ہے)

(پردہ)

ارے

طاہرہ

جنابِ مدیر نقوش، تسلیم

مجھے یہ کہتے ہوئے کوئی جھجک نہیں محسوس ہو رہی کہ میں ایک بنگالن ہوں۔ جی ہاں ایک بنگالی لڑکی۔ لیکن میں بنگلہ پڑھ تو سکتی ہوں، لکھ نہیں سکتی۔ مجھے نہیں معلوم یہ میرے لئے شرم کا مقام ہے یا فخر کا۔ میرے خاندان والوں کا کہنا ہے یہ میرے لئے شرم کا مقام ہے۔ خیر جو کچھ بھی ہو مجھے اردو زبان سے ایک لگاؤ ہے اور میں اپنے ہم جماعت آفتاب کی ممنونِ احسان ہوں کہ اس نے مجھے ٹوٹی پھوٹی اردو لکھنا سکھا دی۔ مجھے بنگال کی تہذیب اور زبان سے اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی گاندھی جی کو فلم سے تھی۔

یہ تو تمہیدی باتیں ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ میں ایک افسانہ "ارے" آپکی خدمت میں نقوش کے لئے پیش کرتی ہوں۔ بہت ممکن ہے اس افسانے کو پڑھتے ہی آپ "ارے" کہہ کر ردی کی ٹوکری کی ہوا کھلا دیں۔ ہو سکتا ہے میرا افسانہ معیارِ نقوش پر پورا نہ اترتا ہو یا اس میں املا کی غلطیاں ہوں۔ بہرحال یہ سب چیزیں تو افسانہ پڑھنے کے بعد معلوم ہو سکتی ہیں۔ پتہ نہیں کیوں مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک بنگالی لڑکی کا مضمون ایک اردو رسالے میں شائع نہیں ہو سکتا۔ یہی وسوسے میرے افسانے کو لچر اور بھونڈا بنا کر میرے سامنے پیش کرتے ہیں۔ جس دن میرا افسانہ نقوش میں شائع ہوگا وہ میرے لئے ایک یادگار دن ہوگا۔ والسلام

طاہرہ

(میرا بنگالی نام طاہرہ بیگم ہے لیکن بیگم مجھے پسند نہیں)

وہ کالج سے میرا پیچھا کر رہا تھا۔ لیکن یہ کوئی بات نہ تھی۔ وہ روزانہ اپنا سائیکل میرے رکشا کے پیچھے ڈال دیتا اور بڑی پابندی سے میرا تعاقب کرتا۔ میں صرف پیچ و تاب کھا کر رہ جاتی۔ جیسے ہی میرا رکشا جیمس وارن کمپنی والے چوراہے سے گزرتا وہ سائے کی طرح میرے پیچھے نظر آتا۔ پہلے تو وہ رکشا کے پیچھے ہی رہتا تھا۔ لیکن آج کئی بار وہ اپنا سائیکل رکشا سے آگے نکال چکا تھا جہاں ہجوم ذرا کم ہوتا وہاں وہ اپنا سائیکل رکشا کے برابر لے آتا۔ آج اُس

کے تیور بھی بدلے ہوئے تھے۔ جیسے ہی ٹبالی روڈ شروع ہوئی اس کا سائیکل میرے رکشا کے برابر چلنے لگا۔ میں نے اس لفنگے کا علاج پہلے ہی سوچ رکھا تھا اب وہ رکشا کے بہت ہی قریب نظر آرہا تھا اس کے سائیکل کا اگلا پہیہ رکشا کے پچھلے پہیے کے ساتھ چکر کھا رہا تھا دفعتاً وہ مسکرایا اور اس نے غالب کے ایک شعر کا ستیاناس کر دیا ؎

اس سے غرض مذاق ہے کس روسیاہ کو
جاں نذر کر دوں، ایک اشارہ ہی چاہیے

اس شعر کے شروع ہوتے ہی میرا ہاتھ اپنے بیگ کے اندر رینگ گیا۔ دوسرا مصرع ختم نہ ہونے پایا تھا کہ ایک انڈا زور سے اس کے گال پر پڑا اور اس کا سوٹ تک رنگین ہو گیا۔ میں ایک دو انڈے اپنے بیگ میں ضرور رکھ لیا کرتی تھی اور ایسا کرنے پر مجھے اس لفنگے نے مجبور کر دیا تھا اس نے بڑی پھرتی سے رومال نکال کر اپنا گال صاف کیا۔ پھر ایک نظر اپنے سوٹ پر ڈالی جو بری طرح داغدار ہو چکا تھا۔ وہ ہر روز نئے سوٹ میں ملبوس نظر آتا تھا شاید کسی بڑے خاندان کا بگڑا نوجوان تھا لیکن تعاقب میں آسانی پیدا کرنے کے لئے ہمیشہ سائیکل ہی استعمال کرتا تھا اب وہ رکشا کے عقب میں تھا۔ دفعتاً پھٹے ہوئے بانس کی طرح اس کی سرگوشی سنائی دی: "میں آج گھر تک چلوں گا۔" میں دوسرا انڈا تول رہی تھی کہ وہ طرح دے گیا۔ اور اس نے بڑی صفائی سے بریک مار کر سائیکل کا ہینڈل گھمایا۔ انڈا سڑک پر گرا اور ٹوٹ گیا۔ لوگ معنی خیز نگاہوں سے میرے رکشا کی طرف دیکھنے لگے۔

میرا موڈ نہایت بدمزہ ہو چکا تھا۔ آج میرا رکشا والا رحیمو نہ آیا تھا۔ اسی لئے مجھے دوسرے رکشا میں آنا پڑا تھا۔ شاید رحیمو کی غیر حاضری ہی سے اس لونڈے کو اتنی جرات ہو گئی تھی۔ ورنہ میں رحیمو سے رکشا رکوا کر اسے ضرور پٹواتی۔ اس نئے رکشا والے کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا۔ جی تو چاہا سارا غصہ اسی پر اتار دوں لیکن زبردست مجبوری تھی۔ رکشا والے لڑکیوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا اپنا حق تصور کرتے ہیں۔ اس لئے اس پر غصہ اتارنا بھی حماقت تھی۔

میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ خبیث نظر نہ آیا۔ اس کا مکروہ چہرا ابھی تک میری آنکھوں کے سامنے پھر رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں، پچکے ہوئے گال، ابھری ہوئی ہڈیاں، پریشان بال۔ شاید اس نے دلیپ کمار بننے کی کوشش فرمائی تھی۔ میرا غصے سے برا حال تھا آج تک کسی نے اس طرح میری توہین نہ کی تھی۔ رہ رہ کے خیال آتا تھا کہ لوگ میری نسبت کیا کہتے ہوں گے! اتنے میں گھر آگیا۔ میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ رحیمو کی خوب درگت بناؤں گی دروازے کے قریب ہی وہ تھیلوں سے لدا پھندا نظر آیا۔

"آج تو کہاں مر گیا تھا؟" میں نے رکشا سے اترتے ہی غرا کر کہا

"سرکار! بڑے بابو نے آما کے باجار بھیجی چھیلیں[1]۔ آج کو لو[2] مہمان آشیں[3] جے ہاں۔" رحیمو نے بوکھلا کر جواب دیا۔

مہمان کی آمد کی خبر سن کر میں چونکی۔ ہمارا ایسا کون سا رشتہ دار ہے جس کے لئے اتنا اہتمام کیا جاتا ہے؟ گھر میں صرف میں اور بھائی جان رہتے ہیں۔ ہمارے پاس کون آنے والا ہے؟ ہوگا کوئی بھائی جان کا شناسا۔ میں نے یہ سوچ کر ذہن کو جھٹکا دیا۔ پھر گرج کر رحیمو سے پوچھا۔

"تو تم کیوں بازار گئے تھے؟ خانساماں کہاں مر گیا تھا؟"

"کھانساماں! او کے[4] اڈشنک[5] ہوتا سرکار!" رحیمو نے گھبرا کر کہا۔

---

[1] بھیجا تھا [2] کوئی [3] آئیں گے [4] اسکو [5] بخار

"کیا اس کو پہچانتے ہو؟" میں نے مڑ کر رکشا والے کی طرف اشارہ کیا۔

"جی ہاں" رحیمو نے جواب دیا۔

"تو اس کی ہڈیاں توڑ دو" میں نے رحیمو کو حکم دیا۔

"ابھی لیجئے" یہ کہہ کر رحیمو سامان کا تھیلا زمین پر رکھ کر رکشا والے کی طرف بڑھا۔

"ارے باپ رے" رکشا والا چیخا اور بغیر کرایہ لئے رکشا پر چڑھ کر بھاگ گیا۔

میں بڑبڑاتی ہوئی مکان کی طرف بڑھی سامنے بھائی جان آتے ہوئے دکھائی دئے وہ بڑی جلدی میں تھے۔

"دیکھو صفیہ! تم کھانا پکانے میں رحیمو کی مدد کرنا۔ میں مہمان کو لانے ہوائی اڈے پر جا رہا ہوں۔ کم بخت خانساماں بھی آج بیمار پڑ گیا۔" وہ اتنی ساری باتیں ایک ہی سانس میں کہتے ہوئے باہر نکل گئے۔ میں رک گئی اور مڑ کر بھائی جان کی طرف دیکھنے لگی۔ مجھے آج ان پر بھی غصہ آ رہا تھا۔

"مہمان! چولہے بھاڑ میں جائے مہمان!" میں بڑبڑائی۔ میرا دماغ کھول رہا تھا۔ میرا ذہن ابھی تک اس لفنگے کے متعلق سوچ رہا تھا۔ مجھے رہ رہ کر اس پر غصہ آ رہا تھا۔ یہ ساری گڑبڑ اسی مہمان کی وجہ سے ہوئی۔ نہ آج مہمان آتا نہ رحیمو بازار جاتا۔ پھر میں اس مہمان کے متعلق سوچنے لگی جس کی آمد اتنی تہلکہ خیز تھی۔ بھائی جان کا ہوائی اڈے پر جانا اس امر کی دلیل تھی کہ مہمان ہوائی جہاز سے آ رہا تھا۔

میں سر پکڑ کر اپنے کمرے میں بیٹھ گئی۔ میں نے کپڑے بھی تبدیل نہ کئے۔ موڈ ابھی تک خراب تھا۔ "آج گھر تک چلوں گا۔" اس کا یہ جملہ بار بار مجھے کچوکے دے رہا تھا۔ "میں ہڈیاں چور چور کر دوں گی۔" مٹھیاں بھینچ کر میں نے خود سے کہا۔ اچانک کسی کی آواز کانوں میں آئی۔ کوئی بھائی جان کا نام لے کر پکار رہا تھا۔ میں نے دریچے سے جھانک کر دیکھا۔ میرا رنگ اڑ گیا۔ وہی لفنگا رکشا سے اتر رہا تھا۔ آخر گھر تک آ ہی گیا۔ مجھے اس کی جرات پر حیرت ہوئی۔ وہ پھر نئے سوٹ میں آیا تھا۔ مجھے ان سب چیزوں نے پاگل بنا دیا۔

میں تیر کی طرح باہر آئی۔ اتنے میں وہ برآمدے میں داخل ہو چکا تھا۔ مجھے دیکھ کر ٹھٹکا۔ پھر ایک قدم آگے بڑھ کر اس نے کہا "آداب عرض" شاید وہ گلا دبا کر بول رہا تھا کیونکہ آواز کچھ کمزور سی معلوم ہو رہی تھی۔ جواب میں میرا زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر پڑا۔ میری گھڑی کلائی سے اتر کر فرش پر جا پڑی۔ اس نے بوکھلا کر زبردست ایکٹنگ کی اور جھک کر گھڑی کی طرف ہاتھ بڑھایا دوسرے ہی لمحے میرا بھاری ایڑی والا سینڈل اس کی انگلیوں پر تھا۔ میں نے پوری قوت سے انگلیوں کو دبایا اور کچل کر رکھ دیا۔ اس نے ایک لمبی "سی" کر کے اپنا ہاتھ کھینچا۔ اس کی انگلیوں سے خون رس رہا تھا۔ مجھے ذرا بھی ترس نہ آیا۔ غصے نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔ میں نے ارادہ کیا، رحیمو کو آواز دے کر اس کی ساری شیخی اتروا دوں۔ لیکن سزا کافی مل چکی تھی۔ پھر وہ خود ہی واپس ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے ایک نظر اپنی کچلی ہوئی انگلیوں پر ڈالی۔ پھر بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ نہ جانے کیوں اس کی آنکھیں پہلے سے کسی قدر مختلف نظر آئیں۔ اور اس کی یہ ادا دل کو کچھ بھلی معلوم ہوئی لیکن میں نے دل کو جھٹک دیا اور گرج کر کہا۔

"بھاگتے ہو یا اور خاطر کروں؟"

"بس اتنی ہی کافی ہے۔" اس نے سہم کر جواب دیا۔ اور واپس مڑ گیا۔

ملا ابھی لیجئے

شام ہو چکی تھی۔ میں اپنے کمرے میں آکر بیٹھ گئی۔ رحیم کی مدد کرنا بھی میں نے مناسب خیال نہ کیا۔ مجھے اس کے صحیح سلامت نکل جانے پر افسوس ہو رہا تھا۔ خیر اب کے تو جو کچھ ہوا سو ہوا۔ آئندہ اس نے یہاں آنے کی جرات کی تو کسر پوری کر دی جائے گی۔ میں نے یہ سوچ کر دل کو تسلی دی۔

آدھ گھنٹے کے بعد بھائی جان آئے اور ان کے ساتھ کوئی اور شخص بھی تھا کیونکہ ایک دوسری آواز آ رہی تھی۔ شاید وہ مہمان کو لے کر آ گئے تھے۔

"کمال ہے۔ میں ہوائی اڈے پر چکر لگاتا رہا۔ اور تم مزے سے ہوٹل میں بیٹھے رہے۔" بھائی جان مہمان سے مخاطب تھے۔

"جی ہاں! کراچی سے ڈھاکہ تک تو ہوائی جہاز ہی سے آیا۔ لیکن ڈھاکہ سے یہاں تک ریل سے پہونچا۔" مہمان نے جواب دیا۔

"مگر تم تو آج چاٹگام آنے والے تھے۔ پر تمہاری باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ تم کل ہی وارد ہو گئے۔"

"جی ہاں۔ اس طرح اچانک آ کر میں آپ کو متحیر کرنا چاہتا تھا لیکن یہاں آ کر مجھے خود متحیر ہونا پڑا۔"

"وہ کس طرح؟ لیکن ذرا ٹھہرو ——" بھائی جان شاید اٹھ کر میرے کمرے کی طرف چل پڑے تھے مجھے مہمان سے کوئی دلچسپی نہ تھی میرے ذہن پر اب تک وہ لفنگا سوار تھا۔ میں نے سوچا بھائی جان سے یہ ساری باتیں کہہ دوں! لیکن شرم مانع تھی۔ اتنے میں بھائی جان میرے کمرے میں داخل ہوئے۔

"ہائیں۔ اندھیرے میں اکیلی کیوں بیٹھی ہو؟ چلو مہمان سے ملو۔" انہوں نے بلب روشن کرتے ہوئے کہا۔ میں بے خیالی میں بجلی بھی تو جلانا بھول گئی تھی۔

"جی میں آتی ہوں۔ ذرا لباس تبدیل کر لوں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ بھائی جان مجھے عجیب نظروں سے دیکھنے لگے۔ میری پوزیشن واقعی کمزور تھی۔ کسی لڑکی کا اس طرح خیالوں میں گم ہونا کوئی اچھی علامت نہ تھی۔ پھر بھی میں نے دل پر زور دے کر دبی زبان سے کہہ ہی دیا کہ "میرا مہمان سے ملنا کیا ضروری ہے؟"

"ارے واہ! کیوں ضروری نہیں۔" وہ انگلی نچا کر بولے۔

بھائی جان کے کہنے پر میں اٹھی۔ لیکن مجھے ڈرائنگ روم کے دروازے پر ہی رک جانا پڑا۔ وہی لفنگا صوفے پر بیٹھا اپنی کچلی ہوئی انگلیاں سہلا رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟" بھائی جان نے میرے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ کو دیکھ کر کہا۔

"میں اس کا سر توڑ دوں گی۔" میں چیخ کر ڈرائنگ روم کے دروازے سے اس لفنگے پر جھپٹی۔ وہ بھی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"کس کا سر توڑ دو گی؟" بھائی جان میری طرف مخاطب ہوئے۔

میں رک گئی۔ میں نے بھائی جان سے کہا۔

"یہ آپ کا جو کوئی بھی ہو، روز میرے رکشا کا تعاقب کرتا ہے۔"

"کیا پاگل ہو گئی ہے؟ یہ تو شوکی ہے۔ کل ہی رات یہاں آیا ہے! کیا تم شوکی کو اتنی جلدی بھول گئیں؟" بھائی جان زور سے بولے۔

شوکی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے گھور رہا تھا۔

میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں اب پاگل ہو جاؤں گی۔

(باقی صفحہ ۲۰۸ پر)

سپیڈومیٹر

ایوب جاوید

شاکر شریف تھا یا بدمعاش، یہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ اس میں شرافت بھی تھی جس کی میں قدر کیا کرتا تھا۔ مگر میں اُس کی اُن حرکتوں کا بھی رازدان تھا۔ جو صرف ایک بدمعاش ہی سے سرزد ہو سکتی تھیں۔ ایسا بدمعاش جو اپنی الٹی سیدھی عادات کے تسلسل سے کٹّر اور اکھڑ بن چکا ہو۔ غلط باتیں اس کی شخصیت کا لازمی حصہ بن چکی تھیں۔ بلکہ میں انہی باتوں سے اُسے پہچان لیا کرتا تھا کہ یہ میرا بگڑا ہوا یار شاکر ہے۔

اس کے ذرائع وسیع اور موثر تھے۔ پھر جن جن طریقوں سے وہ اپنی شرافت کی منادی کیا کرتا تھا۔ وہ معاشرے کے مزاج اور پسند کے مطابق تھے۔ حقیقت تو یہ ہے۔ کہ وہ اپنے لیے دو قبائیں رکھتا تھا۔ جیسا موقعہ ویسی قبا۔

شاکر نے اپنی مصروف زندگی کے اندر ایک پختہ دیوار چن کر اسے دو حصوں میں بانٹ رکھا تھا۔ دیوار کے اس طرف وہ نماز، روزے میں کوتاہی نہیں کرتا تھا۔ نماز قائم کرنے میں، استقلال، خیرات میں باقاعدگی، اس کی زندگی کے معمول تھے۔ ریزگاری دن بھر اُس کے ہاں بٹتی رہتی۔ گو خیرات کی مقدار قلیل ہوتی۔ مگر جو بھی آتا خالی ہاتھ لوٹ کر نہ جاتا۔ وہ اپنے جان پہچان والوں کو اس قدر منہمک اور مصروف رکھتا۔ کہ کسی کو یہ خیال تک نہ آتا کہ سیڑھی لگا کر دیوار کے اُس طرف دیکھ لے۔ سچ تو یہ ہے کہ دیوار جتنی اونچی ہوتی ہے نگاہیں اسی قدر جھکی رہتی ہیں۔ وہ دیواریں اونچی کرتا گیا۔ اور نگاہیں جھکتی گئیں۔ لوگ اُسے شریف سمجھتے۔ بظاہر وہ خدا ترس ضرور تھا مگر میں جانتا ہوں کہ یہ صرف ریاکاری تھی۔ دینی اور دنیاوی طور طریقوں میں اُسے کمال حاصل تھا۔ اس کے باوجود میرے نزدیک وہ شریف کم اور بدمعاش زیادہ تھا۔ اگر وہ بدمعاش نہیں تھا۔ تو میں اُسے شریف کہنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوں۔

ظاہر ہے کہ میرے اس یارِ غار میں دو متضاد قسم کے رجحانات سختی اور جبر کی حد تک تھے۔ اور انھیں یکجا دیکھ کر میرا ذہن کبھی کبھی ٹھٹک سا جاتا اور میں کسی نہ معلوم سے دھماکے کا انتظار کرنے لگتا۔ چلیئے میں نئے سرے سے پھر سوچتا ہوں کہ آخر یہ شاکر ہے کیا بلا؟

لمبا تڑنگا، عمودی ساخت، پختہ عمر، مانا ہوا پارسا، تندرست جسم اور صحت مند چہرے پر خوشخط داڑھی، اس سیاہ کلک کی طرح تھی جسے ابھی ابھی بنا کر قط دیا گیا ہو۔ اس قط کے اندر شگاف قدرے لمبا تھا۔ مگر بے داغ اور نامعلوم سا، سیاہ چمکتے ہوئے بالوں کی ہموار تراش ——— یوں دکھتا ہے جیسے داڑھی چہرے پر اُگی نہیں۔ بلکہ دھو دھا کر اور کاٹ چھانٹ کے بعد، قرینے سے جما دی گئی ہو۔ باریک لمبی اور ستواں ناک میں خاصی اٹھان تھی۔ جیسے کوئی معمار گنیا اٹھا کر چلدیا ہو۔ ناک اپنی بنیادوں پر شتر پشت کی طرح نمایاں تھی۔

شاکر کے ٹھاٹھ دار چہرے میں انفرادیت ہی انفرادیت تھی۔ بیضوی چہرے کی دیوار پر لمبی ناک اس طرح ٹنگی ہوئی تھی جیسا کہ

اٹھ کر سونگھنے کی کوشش میں مصروف ہو۔ چہرے پر کھسیانے تبسم کا تقدس رہتا۔ جہاں کسی نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ناک پر پسینے کے قطرے ابھر آتے تانبے کی طرح چمکتا ہوا چہرہ، گنجان اور موٹی بھوئیں اور ان کے نیچے بھنچی بھنچی، دبی اور جھکتی ہوئی آنکھیں جن میں کھلا تجسس۔ چھپی شرارت اور متوازن مسکراہٹ ہر وقت موجود رہتی۔ یوں معلوم ہوتا جیسے شاکر کسی جانے پہچانے چہرے کو ڈھونڈ رہا ہو۔ یا فرصت پاتے ہی کوئی شرارت کر بیٹھے گا۔ وہ صف میں کھڑا ہو تو نمازیوں کی جگہ لیتا۔ مسجد کے باہر ایک ہی وقت میں دو عورتوں کو سینے سے لگا لیتا۔ پھر بھی تیسری کی گنجائش رہ جاتی۔ چہرے پر تطہیر اور تقدس برساتی۔ اور اس کے رطوبت زدہ بھپکی زدہ قہقہوں سے جان پڑ جاتا۔ جیسے درونِ مسجد کوزے ٹکرا رہے ہوں۔ وہ جانے پہچانے مجمع میں خاصا خاموش اور تنہائی میں پُر زور قہقہے لگانے کا عادی تھا۔ اس کے قہقہوں میں مجھے تشنج اور جھٹکے محسوس ہونے اور جب ان کی تعداد اور جھلک میری برداشت سے بڑھ جاتی تو میں کہتا "شاکر! تم بڑے بدمعاش ہو۔"

"بدمعاش؟ —— اور میں"

"ہاں ہاں تم"، میں اسے نگاہوں میں تولتے ہوئے کہتا "تم بدمعاش ہی نہیں بلکہ بدمعاشی تمہارا ذریعۂ معاش بھی ہے اور فطرت بھی"۔

وہ بھوئیں سکیڑ لیتا۔ اور اس کی آنکھیں اور اندر دھنس جاتیں "میں بدمعاش ہوں —— بتاؤ تو ذرا، مجھ میں اور تم میں کیا فرق ہے مولانا!"

"فرق؟ —— بہت فرق ہے۔ میں جو کچھ ہوں عیاں ہوں۔ مگر تمہاری طرح کھلا خط اور سربمہر لفافہ نہیں ہوں۔"

"ہو سکتا ہے تم ٹھیک کہتے ہو" شاکر ایک موٹی سی گالی بک کر کہتا "ہمارے سوچنے کا انداز مختلف اور رسائی کی نوعیت مختلف ہو سکتی ہے —— مگر بیٹا، غرض اور مدعا ایک ہے۔"

یہ سن کر میں چپکا ہو جاتا۔ شرافت اور ذلالت کی ڈگریوں، درجوں اور حد بندیوں پر سوچنے لگتا۔ اُس لائن کو تلاش کرتا۔ جو انہیں دو مختلف منطقوں میں جدا کرتی ہے۔ دونوں منطقے ذہن میں دست و گریباں نظر آتے۔ دو مختلف رنگدار لٹوؤں کی طرح گھومتے۔ ٹکراتے الجھتے اور اتنی تندہی سے گھومتے کہ ان کی رنگت اور جسامت مدھم ہوتے ہوتے نظروں سے اوجھل ہو جاتی۔ اور یہ تمیز ذہن میں گڈمڈ سی ہو جاتی کہ شرافت کسے کہتے ہیں اور ذلالت کسے، کس کا آغاز، کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کس نقطے پر ختم ہوتا ہے۔

کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ شاکر کا دھندا کیا ہے۔ وہ کیا کام کرتا ہے۔ اور وہ کونسا کاروبار ہے جس کے لیے وہ منہ اندھیرے اٹھ کر جاتا ہے اور دن ڈھلے لوٹتا ہے۔ اس کے عالی شان شش منزلہ مکان، جس پہ نمایاں حروف میں "ہٰذا من فضل ربی" لکھا تھا۔ اس کے سامنے بڑی بڑی کاریں کہاں سے آ کر رکتی ہیں اور کیوں رکتی ہیں۔ شاکر یہ دھلے دھلائے بے داغ اجلے کپڑے پہن کر ہر روز کدھر جاتا ہے۔ یہ آتے جاتے سپاہی اُسے جھک جھک کر کیوں مودبانہ سلام کرتے ہیں۔ یہ آئے دن اُس کے ہاں کونسی تقریبیں منائی جاتی ہیں۔ یہ دعوتیں اور پارٹیاں کس رچاؤ کو منانے، کون سے تہوار کو "جشنانے" اور کس رسم کو "رسمانے" کے لیے ترتیب دی جاتی ہیں۔ محلے والوں کے لیے اس کے کاروباری اور نجی معاملات کا جاننا اس لیے بھی دشوار تھا کہ اُس کے مکان کی دیواریں اونچی، اس کی کاریں نئی، اور وہ مخیر تھا۔ خدا ترس اور خدا پرست تھا۔ گو وہ خود حج کو نہیں گیا تھا۔ مگر ہر سال اس کے نوکر حج کو باقاعدگی سے آتے جاتے تھے۔ خاکِ شفا کی ڈلیاں، آبِ زمزم کی ڈبیوں کے علاوہ بہت کچھ لاتے تھے۔ اسکی تقسیم کی ہوئی تسبیحاں قریباً ہر گھر میں پھیری اور گھمائی جاتیں تھیں۔ اس کی دی ہوئی ڈلیاں اور ڈبیاں، ہر میت پر صرف ہوتیں۔ اور شاکر کی یاد دلاتیں۔ اور پہروں اس کے چرچے رہتے۔

شاکر نے اپنے لیے رولکس کی گھڑی اور مسجد کے لیے کلاک منگوایا۔ اپنے لیے نئے ماڈل کی کار اور مسجد کے لیے ملتان سے چٹائیاں

منگوائیں۔ اگر وہ اپنے لیے کراکری اور کٹ گلاس لایا تو مسجد کے لیے جھاڑ اور کوزے منگوانے بھی نہ بھولا۔ اگر وہ ڈنر اور پارٹیاں آئے دن دیتا تو امام مسجد کا کھانا بھی ہر روز شاکر کے گھر سے جاتا۔ غرض مسکینوں، یتیموں اور امام مسجد سے شاکر کا برابر کا یارانہ تھا۔ یتیموں سے تعلقات نبھاتا۔ اور یتیموں کی پوری توجہ اور انہماک سے خدمت کرتا۔

یقین جانئے شاکر کو اپنی بیوی سے بھی بے اندازہ محبت تھی۔ صرف محبت کرنا ہی کافی نہیں۔ وہ اپنی بیوی پہ مرتا تھا۔ اس کی بیوی کوئی شعلۂ جوالہ تو نہ تھی۔ مگر شاکر نے اسے بننے سنورنے کے لیے کیا کچھ لا کر نہیں دیا تھا۔ چہرے کے لیے گلسرین اور لیمو کے ولایتی مرکب، سمگل شدہ فونڈیشن کریم، کولڈ اور وینشنگ کریم، کیوٹیکس اور پوڈر، مختلف تدریجی رنگوں کی لپ اسٹک، پف پوڈر، عطر پاش بوتلیں، چہرے کے لیے موچنے اور بھوؤں کے لیے نوچنے لا لا کر دیئے۔ پہننے کے لیے چوری اور چور بازاری کے نائیلون، جارجٹ اور کریپ کے تھانوں کے تھان لا کر دیئے۔ ان لوازمات کے سہارے شاکر کی بیوی اس بازاری عورت کی طرح سجی سجائی بنی سنوری رہتی۔ جسے پورا یقین ہو کہ موت اور گاہک کا کوئی اعتبار نہیں۔ وہ جوان تو تھی ہی۔ اُس کا رس بھرا تناپا، کپڑوں کی بہترین کاٹ میں پھنسا اور بولتا ہوا دکھائی دیتا کوئی اسے دیکھتا تو نظروں میں ڈپکا سا لگتا۔ دل میں ہوک اور انگ انگ میں ہوس جاگ اٹھتی۔ یہی بات تھی کہ شاکر اپنی بیوی پہ مرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے، اُسے ایک اونچے چبوترے پہ بٹھا رکھا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے قدِ آدم آئینے اُس کی جانچ پڑتال پر متعین رہتے۔ وہ جس طرف بھی پلٹ کر دیکھتی۔ آئینے میں جسم کا ہر طرفہ تاثر اور ابھار جی اٹھتا۔

بیوی سے دوری یا تنہائی، شاکر کے بس کی بات نہیں تھی۔ اپنے کاروباری سلسلے میں گھر سے باہر اُسے کتنی ہی آسائش کیوں نہ ہو۔ مگر وہ رات رکنے کے لیے تیار نہ ہوتا۔ اُس نے زیادہ فاصلہ پر کئی سودمند کاموں میں شمولیت سے صرف اسی وجہ سے انکار کر دیا تھا کہ وہ گھر سے باہر ایک رات بھی صبر نہیں کر سکتا۔ دنیا کی کوئی دلچسپی اور منافع اسے گھر سے باہر شب باشی کے لیے روک نہیں سکتا تھا۔ رات کو اپنے گھر پہنچنا، اس کا ایک طے شدہ اور یقینی عمل تھا۔

بیوی، شاکر کی زندگی کا وہ مرکز تھی جس کے گرد شاکر کی ہر چیز گھومتی تھی۔ اس کی ہر وقت کوشش رہتی کہ جس قدر ممکن ہو وہ بلاؤز کی طرح اپنی بیوی سے چپکا رہے۔ شاکر کی مسجد سے وابستگی، بیوی پہ فریفتگی اور کاروبار سے دلبستگی ایسی چیزیں تھیں۔ جن کے باعث محلے والے شاکر کو مولانا کہتے۔ اس کی شرافت اور گھر کے لیے محبت کے چرچے ہوتے۔ اڑوس پڑوس میں یہی تذکرہ رہتا کہ شاکر کس قدر شریف پڑوسی اور شیدائی شوہر ہے۔ اس زمانے میں اس جیسا انسان ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔ بڑے بوڑھے اپنے بگڑے ہوئے بچوں سے کہتے کہ شاکر کو دیکھو۔ صحت ہے، تعلقات ہیں، پیسہ ہے، دوست یار ہیں، اچھے بروں سے ملنا ملانا ہے۔ مگر شراب، جوا، سگرٹ کوئی بری عادت نہیں۔ باقاعدگی سے مسجد جاتا ہے۔ صبح اُس کے گھر سے تلاوت کی خوش الحان آواز آتی ہے۔ حدیث اور مسئلے مسائل شوق سے کہتا اور دلچسپی سے سنتا ہے۔ دین کا پابند اور دنیا کے جھگڑوں میں بھی تاک، پتلون پہنتا ہے مگر ننگے سر بھی نہیں گھومتا۔ ٹائی باندھتا ہے۔ مگر شلوار پہننے میں عار نہیں سمجھتا۔ صوم و صلوٰۃ کا پابند ہے اور اپنے کاروبار میں محنت کرتا ہے۔

یہی چرچے سنتے رہی شہرت تھی جس نے شاکر کو اپنے طور طریقوں اور نشست و برخاست میں بے لوچ اور سخت گیر بنا دیا تھا۔ گھر سے لے کر مسجد تک، اور مسجد سے لے کر اپنے دفتر تک وہ اپنی تمام سماجی اور اخلاقی ذمہ داریوں کو پوری طرح نبھاتا تھا

شاکر سب کچھ تھا جو محلے کے بڑے بوڑھے کہا کرتے تھے وہ عبادت میں غفلت نہیں کرتا تھا۔ وہ دین دار تھا اور دنیادار [illegible] تھا۔ مگر میں جانتا ہوں کہ جہاں دونوں وقت ملے، شاکر دھلے دھلائے کپڑے پہن، سو دو سو جیب میں ڈال موٹر لیے میرے پاس آ جاتا۔

"چلو بیٹا۔ شکار پر چلیں۔"

ایک سڑک اس کی سب سے بڑی شکارگاہ تھی۔ جس جگہ اُسے شکار کم وقت، اور بغیر تردد کے مل جاتا تھا۔ شاکر موقع ملتے ہی اپنی طہارت کی تیاری کرتا۔ سر پر رکھی ہوئی ٹوپی کی اُلٹی سیدھائی کو ۵۴° ڈگری کے زاویہ پر رکھ دیتا۔ اس کے نزدیک شرافت اور ذلالت میں صرف اتنا ہی فرق تھا۔

'چلو شکار پر چلیں' وہ تقاضا کرتا اور مجھے انکار کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ شکار شکاری کا ہوتا اور میں پٹے ہوئے پست ہمت ہانکے کی طرح اس گشت میں شریک ہو جاتا۔ جسمانی تھکاوٹ اور ذہنی کوفت میری دوست پروری کا معاوضہ بنتی۔

کراچی وہ شہر ہے۔ جو شاکر کو بے حد محبوب تھا۔ تیس لاکھ کی آبادی اور ہزاروں گلی کوچوں میں گھوم پھر کر درونِ مسجد اور بیرونِ مسجد؛ وہ زندگی کو اپنی مرضی سے بسر کرتا تھا۔ اتنے بڑے شہر میں صبح کا بھولا شام کو گھر آجائے تو اسے بھولا کون کہے گا! ایسے وسیع رقبہ کی کثیر آبادی میں اگر کوئی اپنی زندگی کا ڈھب ایک گلی سے نکل کر دوسری سڑک پر بدل لے۔ تو پہلی گلی والوں کو برسوں اس تبدیلی کا پتہ نہیں چلتا۔ چنانچہ شاکر آج پھر آیا اور کہنے لگا۔ "چلے چلو!"

اور یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ اس شہر کا ہر بنیا بھڑوا اور پرانا دلال، بقول اس کے شاکر کا اپنا آدمی تھا۔ اور دلال اُسے سیٹھ جی کہا کرتے تھے۔ کراچی میں جو کاروبار اور موٹر رکھتا ہو۔ یقیناً سیٹھ جی کہلاتا ہے۔ دلال اس کی ویسی عزت کرتے جو کمیشن ایجنٹ اپنے اچھے اور باقاعدہ گاہک کی کرتے ہیں۔

شاکر خاص خاص ٹھکانوں کے علاوہ گلی کوچوں کے ان اندھیرے کونوں سے بھی بخوبی واقف تھا۔ جہاں دلال سگرٹ پیتے، پیک تھوکتے، چہل قدمی کرتے ملا کرتے تھے۔ پان سگرٹ کی دکانیں اور ہوٹلوں کے مخصوص سایے بھی وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ جن کے اندھیرے تھڑوں اور شہ نشینوں پر دلال انتظار میں اکڑوں بیٹھے، شکرے ایسی تیز نگاہوں میں کھنگال ڈالتے۔ اور جہاں کسی نے کار روکی یا رک کر دائیں بائیں دو چار بار دیکھا تو وہ باز کی طرح جھپٹ کر آتے۔ اور بے جھجک بات چھیڑ دیتے۔ اور بغیر رسمی تعارف یا شناختی کارڈ دکھائے وہ آپس میں یوں ملا کرتے جیسے خاصا پرانا تعلق ہو۔

ہم شکار پر نکلے۔ روڈ پر پہنچے۔ بجلی کے کھمبے سے آگے شاکر نے کار بڑھائی۔ کھڑکی کا دروازہ کھولا۔ ٹوپی کو سرکا کر اُس کا زاویہ بقدرِ ضرورت بڑا کیا۔ ایک دلال جو تاک میں بیٹھا تھا۔ اُس نے بیڑی کا آخری دَم لگا کر اُسے اچھال دیا۔ بیڑی کیرم کی گٹیوں کی طرح ٹھوکر کھا کر نالی کی پاکٹ میں جا گری اور وہ بڑے بڑے ڈگ بھرتا شاکر کے قریب آیا۔

"سیٹھ سلام۔"

"کون ہو؟"

"فجو"

"ارے فجو! تم ——— سناؤ۔ کیا حال ہے۔ بہت مدت کے بعد نظر آئے۔"

"بس سیٹھ۔ مزے سے ہوں۔"

"مال ہے؟"

"سیٹھ۔ مال ؟ بہت۔ تجوری کی بجر چاہیے۔"

"وہ حمیدہ حرام زادی آج کل کہاں ہے۔ دس سال ہو گئے اُسے یہ دھندا کرتے مگر عورت ہے۔ کہ فولاد، وہی رنگ وہی ڈھنگ، اگر ہسپتال کی آہنی چارپائی بھی ہوتی تو اس عرصہ میں مریضوں کا بوجھ سہارتے سہارتے اس کے بھی سارے سپرنگ ڈھیلے ہو جاتے"

"سیٹھ صاحب" دلال نے پیک تھوکی اور کہنے لگا۔ "سالا ایک نمبر عورت ہے۔ سیٹھ! حرام جادی سیٹھ لوگ کو کھوش رکھنا جانتا ہے۔ ہنسی مذاق میں فس کلاس ہے۔ ٹیم خوب پاس کرتا ہے۔"

شاکر نے دلال کے کندھے کو تھپتھپایا، اُسے پکڑا اور ذرا جھنجھوڑ کر کہنے لگا۔ "کیوں فجو۔ اور کوئی نیا مال ؟ رامی۔ آج کوئی نیا ماڈل دکھاؤ۔ اختری رنگزار۔ حمیدہ۔ ناجی سب بکواس ہیں۔ نیا دانہ ہے تو دیکھوں گا!"

دلال نے بنڈل سے چن کر نئی بیڑی نکالی۔ اور سلگائی۔ دو تین لمبے لمبے کش لگا کر چٹکی بجائی اور شاکر کے قریب آ کر رازدانہ انداز میں کہنے لگا۔

"سیٹھ۔ مال بالکل تاجا۔ ابھی ابھی لاہور سے آیا ہے۔ مگر سستا نہیں جائیگا۔ پندرہ سال کا چھوکری ہے۔ پندرہ سال کا۔"

"کیسا ہے۔"

"فس کلاس۔"

"کون ہے۔"

"سیٹھ یہ تو ہم نہیں جانیں۔ مگر ایک نمبر ہے۔ ایک نمبر"

"اُس کا جگہ ہے۔"

"سیٹھ جگہ ؟ ــــ اس کے مالک نے اپنا کوٹھی لیا ہے۔ اپنا نوکر ہے۔ اپنا چاکر ہے۔ موٹر ہے۔ ایسا ویسا تھوڑا ہی ہے سیٹھ لوگ کے واسطے بڑا لوگ ہے۔"

شاکر نے مزید پوچھا۔ دلال نے اور تفصیلات بتائیں اور قدرے دیر کے بعد شاکر کی کار بڑا لوگ کی کوٹھی پر رُکی۔ دلال نے کوٹھی کا گیٹ کھولا اور دبے پاؤں اندر چلا گیا۔ برآمدے کی مدھم روشنیوں میں لمبے لمبے تاریک سائے ادھر ادھر آنے جانے لگے۔ کچھ کھسر پھسر ہوتی رہی۔ اور پھر دلال نے مخصوص انداز میں سیٹی بجائی۔ اور کہنے لگا۔

"سیٹھ صاحب آئیے۔"

اور شاکر پرائی کوٹھی میں اس طرح داخل ہوا جیسے کہ پرانی جان پہچان ہو۔ یا کسی نے دعوت نامہ بھیج کر ڈنر پہ بلایا ہو۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا۔ اور بھاری پردے پھڑپھڑاتے۔ پردوں میں سے تیز روشنیاں نکل نکل کر خیر مقدم کرنے لگیں۔

سامنے صوفے پر دلال کی چھوکری بیٹھی تھی سہمی ہوئی۔ اُس کبوتر کی طرح جو ابھی بچی اور پہلی اڑان اڑا ہو اور باز کی جھپٹ کا خوف کھا کر اور پھڑپھڑا کر نیچے آ گرا ہو۔ اس کی آنکھوں میں دبا ہوا ڈر اور بھینچی ہوئی دہشت تھی۔ وہ کسی آنے والے خطرے کے احساس سے اپنی ساڑھی کے پلو کو مروڑے جا رہی تھی۔ شاکر نے دیکھا تو ایک لمبا سانس لے کر اپنی بادن انچ چھاتی کو پھلایا۔ آنکھیں اپنی غاروں سے چمک کر ابھر آئیں۔ پھڑکتی پلکیں تھرک کر ایک جگہ رک گئیں۔ اور وہ ناگ کی طرح ٹھٹھک کر اپنے شکار کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے نتھنے پھیلنے لگے۔ ناک پر پسینے کے قطرے

ابھر آئے۔ بھویں کھنچ گئیں۔ پیاسی زبان ہونٹوں کو تر کرنے لگی۔ شاکر نے بٹوہ نکال، دو چار نوٹ دلال کے ہاتھ میں دیئے اور ایک گہرا تسلی بخش گھڑگھڑاتا ہوا قہقہہ لگایا۔ چھوکری کو بھی آداب محفل کا خیال آیا۔ وہ ساڑھی کا پلو چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ اور انگلیوں کو مروڑنے اور چٹخانے لگی۔ نائیلون کی باریک ساڑھی کے اندر اس کی مختصر چولی پھولنے، سکڑنے اور ہانپنے لگی۔ امید و بیم کی کپکپاہٹ سے اس کی طفلانہ آنکھوں میں معصومیت اور دہشت گڈمڈ ہو گئی۔ اس نے آنکھیں اٹھائیں اور بچھا دیں۔ پھر اٹھائیں اور سمیٹ لیں۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"ستارہ"

"بھئی خوب نام ہے اور بڑا پیارا۔" ست تارہ!!

اتنا چمکتا ہوا ستارہ تو مدت کے بعد دیکھا ہے تمہارے چاند ستارے کس خوبصورتی سے اپنی اپنی جگہ پر ٹکے ہوئے ہیں۔ ان میں ارتعاش اور حدت ہے۔ جلد کتنی ملائم اور تنی ہوئی ہے۔ جیسے کسی نے مخمل خوبصورتی سے کھینچ کر پھٹوں پہ منڈھ دی ہو۔ اتنا کھنچاؤ طبلے میں ہوتا۔ تو اس کا بھی چمڑہ پہلی تھاپ پر پھٹ جاتا ——— اور یہ بھی خوب ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ٹینس کے یہ وہ دو بال ہیں جنھوں نے ابھی تک ریکٹ کی ضرب نہیں کھائی اور پھر تازہ دھلی ہوئی شفاف آنکھیں، چمکتے، گنگھریالے بال، پیاری سی تنی ہوئی بھوئیں، لرزتے مگر پکے ہوئے رس بھرے ہونٹ ———"

شاکر کے بازوؤں کی مضبوط گرفت میں وہ اس فاختہ کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی جس کے شہ پر کسی نے سختی سے باندھ کر مضبوط گرہ لگا دی ہو اور جیسے وہ شکرے کی جھپٹ میں آئے ہوئے پرندے کی طرح، خوف اور اعصابی درد کے باعث پلٹ پلٹ کر رحم اور درگزر کی بھیک مانگ رہی ہو۔ پہلو سے بڑی سی آنکھ کھلی ہوئی پرکار کی طرح دکھائی دینے لگی۔ اندر کا متوحش دبیز ڈھیلا ابھر آیا۔ اوپر کی اٹھی ہوئی اور نیچے کی گری ہوئی خمیدہ پلکوں نے زیادہ اٹھ کر اور مزید گر کر آنکھ کا زاویہ بڑا اور فراخ سا کر دیا۔ ابروئیں کھنچ کر اور تھرا کر رہ گئیں۔ پلکیں اٹھ اٹھ کر اکڑے ہوئے ابروؤں کو چھونے لگیں۔ شاکر جب اس کا چہرہ الٹتا پلٹتا تو کانوں کی لوئیں سرخ اور لٹکتے ہوئے آویزے دھڑکنے لگتے۔ آنکھ کی پتلیاں سہم کر دائیں بائیں دیکھتیں۔ آنکھیں بے نم اور ہونٹ بے آب اور بے بس ہو کر رہ گئے۔ میں بت بنا بیٹھا تھا۔ اور شاکر کی مصروفیت بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ گھنٹہ بھر محققانہ انداز میں کل پرزے ٹٹولتا رہا۔ اس کے تقدس کے پہیے مائل بہ نشیب تھے۔ طہارت کی سخت پرتوں کی گرفت ذرا ڈھیلی ہوئی تو ذہنیت کا دباؤ بڑھا اور لپکتے شعلے اور بھڑکتی چنگاریاں رگڑ کھا کر نکلیں۔ ستارہ کی چوڑیاں ٹوٹتی رہیں۔ مانگ بار بار الجھتی رہی۔ لپ سٹک کی رنگت مدھم اور کپڑوں کی شکنیں بڑھتی گئیں۔ شاکر گوریلے کی طرح بھرتا اور باز کی طرح جھپٹتا رہا۔ وحشت اور درندگی جب اس حد کو پہنچی جہاں مخصوص جگہ کی تلاش ہوتی ہے تو شاکر نے پینترہ بدلا اور ستارہ کو جھٹکا دے علیحدہ ہو گیا۔ جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر ستارہ کے بلاؤز میں اٹکا دیا اور مجھ سے کہنے لگا۔

"چلو چلیں۔"

وہ الجھی ہوئی پتنگ کی طرح پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ وحشت سے اس کے چہرے کا ایک ایک بال تنا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں چوبی کوئلوں کی طرح دہک رہی تھیں۔ ناک کا پسینہ خشک ہو گیا اور اس کی چھوڑی ہوئی چکناہٹ چمکنے لگی۔ اور وہ بھوکے بھیڑیئے کی طرح کوٹھی سے لڑکھڑاتا ہوا باہر نکلا۔

"شاکر۔" وہ لڑکھڑاتا جا رہا تھا۔

"شاکر میں کہتا ہوں کہ روز کی اس حرام زدگی کا آخر مطلب کیا ہے۔"

"تم نہیں جانتے۔" اس نے کار کا دروازہ کھولا، سیٹ پر بیٹھا۔ اور پورے دھماکے سے دروازہ بند کر دیا۔ اس نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے پاکٹ سے چابی نکالی۔ ٹوپی کا زاویہ درست کیا۔ پورا ایکسیلیٹر دے کر کار سٹارٹ کی۔

"میں نہیں جانتا —— مگر میں جاننا چاہتا ہوں۔ تمہاری اس حماقت سے تمہیں کونسا اطمینان اور کیسا سکون ملتا ہے؟"

"یہی تو کہتا ہوں۔" اس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے چباتے ہوئے کہا۔ "تم نہیں جانتے۔ تم نہیں جان سکتے۔"

"آج میں مصر ہوں۔ اور جاننا چاہتا ہوں —— آخر تم ایسا کیوں کرتے ہو؟"

"خدا جانتا ہے۔ کہ میں بدکار نہیں۔"

"تم —— تم بدکار نہیں۔ تو پھر کیا ہو؟"

"بالکل شریف۔ تمہاری طرح۔ بلکہ تم سے بہتر۔"

"بکتے ہو۔"

"یہی تو کہتا ہوں۔ پاجی کہ تم نہیں جانتے۔"

"تم بدمعاش ہو۔ شاکر تم یقیناً بدمعاش ہو۔" میں نے نفرت کی شدت سے چیخ کر کہا۔

شاکر نے ششدر ہو کر پلٹ کر دیکھا۔ میں بہت کچھ ضرور ہوں مگر بدمعاش نہیں —— شاکر بدمعاش نہیں، میں عورتیں کرائے پر لے کر ٹٹولتا ہوں۔ اور مزید کچھ بھی نہیں کر پاتا —— اور تمہیں حیرت ہوتی ہے۔

اُس نے رومال نکالا۔ ناک سے چکناہٹ اور آنکھوں سے نمی پونچھی، پلکیں جھپکائیں اور اس کی طنزیہ ہنسی ایک زوردار قہقہہ بن گئی۔ اُس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور میری ران پر زوردار ہاتھ مارا۔ "بھیا! کرائے کی عورتیں ڈھونڈھتا ہوں۔ اُن سے مل کر ازدواجی وحشت خریدتا ہوں۔ انھیں ٹٹولتا ہوں۔ اُس سے میرا دبا ہوا جنسی رجحان بڑھتا ہے۔ ان سے لپٹ کر میری اشتہا زور پکڑتی ہے۔ یہ میرا فرار اور ذہنی اضطراب ہے۔ اس سے اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہوں۔" (اس نے ٹوپی کو پیچھے سے دھکیل کر پیشانی پر بڑھا دیا۔ اور اُس کا زاویہ ٹیڑھا کرتے ہوئے کہنے لگا) "اور تم تو جانتے ہی ہو۔ کھانا صرف اُس وقت مزہ دیتا ہے جب بھوک اور گرسنگی انتہا پر ہوتی ہے، دیکھو! اب میں گھر جاؤں گا۔ اور بند دروازوں پر چیخوں گا۔ ان پہ مکے ماروں گا۔ دروازہ کھلتے ہی سیدھا بیڈروم کی طرف جاؤں گا اور اس کی چوکھٹ پر دیوار بن کر کھڑا ہو جاؤں گا۔ میرے بازوؤں میں دست پناہ ایسی گرفت ہو گی اور پھر وہ پرکار کی طرح گھومیں گے اور —— اُس نے ہونٹ دانتوں تلے دبا لیے اور ایک بڑا ہی گہرا سانس لے کر چپ ہو گیا۔

"اور پھر"

شاکر خاموش تھا۔

"بولو پھر کیا ہوتا ہے؟"

بھوک جب شدت پر ہوتی ہے (شاکر تھوک نگلتے ہوئے کہنے لگا) "تو کھانا اپنے گھر پہ ہی کھاتا ہوں۔"

میں نے سپیڈومیٹر کی طرف دیکھا تو کار ۶۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہی تھی۔

نوحۂ فکر

جوشؔ ملیح آبادی

فِقہ کی گرمیٔ بازار رہے گی کب تک
دشتِ مَجذوب میں تلوار رہے گی کب تک

آخر اِس معرکۂ نفس کُشی کی رَو میں
قوم کی قوم خود آزاد رہے گی کب تک

دِجلۂ حق میں نہ آئے گی رَوانی تاچند
موجِ باطِل کی یہ رَفتار رہے گی کب تک

سَقفِ تحقیق میں تاچند نہ گونجے گا رَباب
کُنجِ تقلید میں چہکار رہے گی کب تک

ذہنِ انساں کو جو دیتی ہے سَلاسِل سے نجات
پابزنجیر وہ گفتار رہے گی کب تک

حرفِ تہذیب کی آواز رُندھی جاتی ہے
چنگِ وحشت میں یہ جھنکار رہے گی کب تک

مُردہ اقوال کے رِسیلے ہوئے تہ خانوں میں
زندگی، نقشِ بدیوار رہے گی کب تک

کچھ بتاؤ تو سہی، عِلم فروشانِ جلیل
جہل کی رَونقِ بازار رہے گی کب تک

مُشتری، ارض و سماوات ہیں جس کے وہ نظر
سنگ ریزوں کی خریدار رہے گی کب تک

جنسِ کاسِد کو، گھنی چھاؤں میں رکھنے والو
دھوپ میں دولتِ بیدار رہے گی کب تک

نور کو، خضر کا منصب نہ ملے گا تا چند
تیرگی، قافلہ سالار رہے گی کب تک
عقل ہے مشعلِ ایوانِ تمدن، کہ جنوں ؟
عصرِ حاضر میں یہ تکرار رہے گی کب تک
قصرِ بشکستۂ اقوال کی بیٹھی آواز
نوجواں ذہن کی معمار رہے گی کب تک
حلقۂ علم سے بھاگے ہوئے دیوانوں کی
قلعۂ فکر پہ یلغار رہے گی کب تک
آخر ان شب پرہ چشمانِ زبوں کے ہاتھوں
زندگی، نور سے بیزار رہے گی کب تک
تاکجا، سینۂ مشرق میں نہ پھوٹے گی کرن
اے بصیرت! یہ شبِ تار رہے گی کب تک
آخر اے ولولۂ وحدتِ نوعِ انساں
چشمکِ سبحہ و زنّار رہے گی کب تک
نے، یہ کون فن ہے، اے ذوقِ جدالِ انساں
فقط اپنوں ہی سے پیکار رہے گی کب تک
آخر اوہامِ خرد سوز کی پیری کے حضور
دنگ، برنائیِ افکار رہے گی کب تک
بول، اے غیرتِ اندیشہ و ناموسِ نظر
تخت پر عشق کی "سرکار" رہے گی کب تک
بول، اے غلغلۂ عدل کہ گلبانگِ شعور
رہ نمائے رسن و دار رہے گی کب تک
پیشِ اقرار تہی کاسہ و شمشیر بکف
بے زباں جراءتِ انکار رہے گی کب تک
ارضِ مشرق کی یہ اشراق پرستی اے جوش
وہمِ آبا میں گرفتار رہے گی کب تک ؟

حمد

فیض احمد فیض

ملکۂ شہرِ زندگی تیرا، شکر کس طور سے ادا کیجے
دولتِ دل کا کچھ شمار نہیں، تنگدستی کا کیا گِلا کیجے
جو ترے حسن کے فقیر ہوئے اُن کو تشویشِ روزگار کہاں
درد بیچیں گے، گیت گائیں گے اس سے خوش وقت کاروبار کہاں
ساز چھیڑا تو جم گئی محفل، منّتِ طبعِ غمگسار کسے
اشک ٹپکا تو کھل گیا گلشن رنجِ کم ظرفیِ بہار کسے
خوش نشیں ہیں کہ چشم و دل کی مُراد، دیر میں ہے نہ خانقاہ میں ہے
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں، ہر صنم اپنی بارگاہ میں ہے
کون ایسا غنی ہے جس سے کوئی نقدِ شمس و قمر کی بات کرے
ہم سے شوقِ نبرد ہو جس کو، جائے تسخیرِ کائنات کرے

فراقؔ گورکھپوری

○

نغمہ ہے مئے ہے مستی ہے
ساقی پھر بھی کوئی کمی ہے
میخانے کی رگ، جو دُکھی ہے
شیشے کو بھی چوٹ لگی ہے
چشمِ سیہ جو سمٹی ہوئی ہے
میخانے کی رات وہی ہے
دے دے ہم اہلِ دل کو دو عالم
یہ تو ہماری کم طلبی ہے
دیس کو دیکھا دیس ہمارا
کتنا بڑا ہے کتنا دُکھی ہے
لٹ چھٹکائے بال سنوارے
یاد تری دل سے گزری ہے
کہتی ہے جو تری خاموشی
اے لبِ جاناں بات وہی ہے
پچھلا پہر ہے میخانے میں
نرگسِ میگوں جاگ رہی ہے
کیا کہنا زلفوں کی درازی
یار، بڑوں کی بات بڑی ہے
ساغر اک اے چشمِ خماریں
میخانے میں صبح ہوئی ہے
اُس نے گیسوئے پُرخم کھولا
دنیا میں اب رات ہوئی ہے
سر کو جھکائے بیٹھے رہیے
لب کھلنا بھی بے ادبی ہے
کہتے چلو افسانۂ ہجراں
اب بھی رات کی رات پڑی ہے
کون بتا سکتا ہے یہ دھرتی
کس محور پر گھوم رہی ہے
کون اُٹھا دنیا سے شبِ غم
جیسے کوئی شمع بجھی ہے
اب تو آجا۔ اب تو آجا
ہوتے ہوتے رات ہوئی ہے
سُن کے فراقؔ کہانی تیری
فطرت کی آنکھوں میں نمی ہے

قطعہ ہم طرح غزل

اثرؔ لکھنوی

کھائیں تری تلاش میں در در کی ٹھوکریں
مجھ کو لیے پھرا دلِ مائل کہاں کہاں
دے دے جواب صاف کہ دیدار ہے محال
آواز دے تجھے ترا سائل کہاں کہاں

غزل

ابھرا ہے ڈوب ڈوب کے یہ دل کہاں کہاں
ڈھونڈا ہے بحرِ عشق کا ساحل کہاں کہاں
ناکام آرزو ہوں باندازِ آرزو
کوئی نکالے جادے سے منزل کہاں کہاں
رسوا کرے گا آپ کو اپنی تلاش میں
ہنگامہ زارِ شوق میں اے دل کہاں کہاں
گلزارِ ہست و بود و ہجومِ نجوم میں
آراستہ ملی تری محفل کہاں کہاں
ہر منزلِ حیات کو ٹھکرا کے بڑھ گیا
اور آزمائیں حوصلۂ دل کہاں کہاں
اپنی نگاہِ شوق کے قربان جائیے
ہر رنگ میں ملا ہے وہ شامل کہاں کہاں
منزل سے دور اور کبھی منزل کے آس پاس
لوٹا گیا ہے قافلۂ دل کہاں کہاں
سمجھا ہے جس کو بحر وہ موجِ سراب ہے
اے دل فریب خوردہ ساحل کہاں کہاں!
شوریدگیٔ قیس کا چارہ نہیں کوئی
لیلیٰ اٹھائے پردۂ محمل کہاں کہاں
شاید تلاش جس کی ہے وہ میں ہوں خود اثرؔ
اپنا ہوا ہوں مدِ مقابل کہاں کہاں

احمد ندیم قاسمی

○

کچھ دل سے نگاہ بدگماں ہے
کچھ منظرِ یاد پر دھواں ہے
جب تک نہ جلے چراغ دل کا
ہر شے کا جمال رائگاں ہے
تو میرا شعور، میرا وجدان
تو میرا وجود، میری جاں ہے
تُو اتنا قریب ہے کہ تجھ سے
میں پُوچھ رہا ہوں، تُو کہاں ہے
شاہد ہے مری وفا شعاری
انسان بلا کا سخت جاں ہے
ٹوٹی ہوئی شاخ ہو کہ دل ہو
ہر زخم، بہار کا نشاں ہے
اِک جست کا فاصلہ ہے شر تک
لیکن ترا پیار درمیاں ہے
میں عشق ہوں اور جاوداں ہوں
تو حُسن ہے اور بیکراں ہے
تو ہو کہ ندیم ہو کہ یزداں
جو کچھ بھی ہے، زیرِ آسماں ہے

بارش

احمد ندیم قاسمی

رات بارش نے سقفِ زنداں پر
اس تسلسل کے ساتھ دستک دی
کہ اندھیرے کے انجماد کو بھی
یہ صدا گونج بن کے چیر گئی

ہر طرف پھیلتی، سمٹتی ہوئی
سر کشیدہ فصیل کی سوگند
میں تو سمجھا تھا، کنجِ زنداں میں
زیست کی ہیں تمام راہیں بند

آج، لیکن حیات گاتی ہے
بند قفلوں کے اِس دیار میں بھی
حسن، فن کار کو پکارتا ہے
سنگ و آہن کے اس حصار میں بھی

(۳۱ دسمبر ۱۹۵۸ء) (سنٹرل جیل راولپنڈی)

اختر انصاری

○

پُر کیف ضیائیں ہوتی ہیں، پُر نور اُجالے ہوتے ہیں
جب خاک بسر دل ہوتا ہے اور عرش پہ نالے ہوتے ہیں

ہنستے ہیں دہانِ زخم سے ہم، گاتے ہیں فغاں کے بربط پہ
آشفتہ سروں کی دُنیا کے سب ڈھنگ نرالے ہوتے ہیں

کیا قہر برستا ہے دل پر ساون کی شبوں میں کیا کہئے
کچھ درد کی پھواریں ہوتی ہیں، کچھ یاس کے جھالے ہوتے ہیں

ان اجڑے ہوئے ارمانوں کو کس شوق سے دل نے سینچا تھا
برباد مگر ہوتے ہیں وہی جو ناز کے پالے ہوتے ہیں

چاہت کے ستم برداشت کریں، مر مر کے جئیں اور مر نہ سکیں
کیا جانیے کس مٹی کے بنے یہ چاہنے والے ہوتے ہیں

دل تنگ نہ ہو اے رہروِ غم! کانٹوں کے لیے تو کم سے کم
مانند نویدِ ابرِ کرم یہ پاؤں کے چھالے ہوتے ہیں

اُف رے وہ نزاکت لہجے کی، باتیں جو نکلتی ہیں منہ سے
یا چاند کی کرنیں ہوتی ہیں یا برف کے گالے ہوتے ہیں

یہ دردِ جنوں، یہ سوزِ جگر، ان کیفیتوں کے گرد اختر
تسخیر کے حلقے ہوں کہ نہ ہوں، تقدیس کے ہالے ہوتے ہیں

مجروح سلطان پوری

○

اہلِ طوفاں آؤ دل والوں کا افسانہ کہیں
موج کو گیسو، بھنور کو چشمِ جانانہ کہیں

دار پر چڑھ کے لگائیں نعرۂ زلفِ صنم
سب ہمیں باہوش سمجھیں چاہے دیوانہ کہیں

یارِ نکتہ داں کدھر ہے پھر چلیں اس کے حضور
زندگی کو دل کہیں اور دل کو نذرانہ کہیں

سرخیٔ مے کم تھی میں نے چھو لیے ساقی کے ہونٹ
سر جھکا ہے جو بھی اب اربابِ میخانہ کہیں

تشنگی ہی تشنگی ہے کس کو کہیے میکدہ
لب ہی لب ہم نے تو دیکھے کس کو پیمانہ کہیں

پارۂ دل ہے وطن کی سرزمیں مشکل یہ ہے
شہر کو ویران کہیں یا دل کو ویرانہ کہیں

اے رخِ زیبا بتا دے اور ابھی ہم کب تلک
تیرگی کو شمعِ تنہائی کو پروانہ کہیں

آرزو ہی رہ گئی مجروحؔ کہتے ہم کبھی
اک غزل ایسی جسے تصویرِ جانانہ کہیں

تلوک چند محروم

○

بشر کے ساتھ غم ہی غم نہیں ہے
خوشی بھی ہے یہاں اور کم نہیں ہے

جو غم تھا اُس میں رونا ہے اُسی کا
دلِ مرحوم کا ماتم نہیں ہے

چمن میں رات بھر رویا ہے کوئی
اُسی کے اشک ہیں، شبنم نہیں ہے

نہیں مشکل شکستِ دامِ ہستی
شکنجِ گیسوئے پُرخم نہیں ہے

وہی ہے فصلِ گُل جب کھل گیا دل
بہار آنے کا اک موسم نہیں ہے

ہمیں باعث ہیں اس کی برہمی کے
مزاجِ زندگی برہم نہیں ہے

سُنائیں حالِ دلِ محروم کس کو
کوئی مونس، کوئی ہمدم نہیں ہے

قطعہ

بڑی شے ہے ترا یہ جام ساقی   مسلّم بات ہے، مبہم نہیں ہے
ہے نام اُس کا طفیلِ جام باقی   ہوئیں صدیاں، جہاں میں جم نہیں ہے

در منعِ شکار

تلوک چند محروم

شغل اچھا نہیں شکار نہ کر   بے زبانوں کو دلفگار نہ کر
کھیل اس کو سمجھ نہ اے ناداں   کھیلنا جان پر نہیں آساں
جن کو ہے خوفِ خالقِ برتر   رحم کرتے ہیں بے زبانوں پر
ہے جو انسان رحم سے عاری   نہیں درخورِ رحمتِ باری
جانِ شیریں عزیز ہے سب کو   حق نے بخشی یہ چیز ہے سب کو
تو اگر جان دے نہیں سکتا   حق نہیں تجھ کو جان لینے کا
جس طرح تو ہے سرد و گرم شناس   جانور کو بھی ہے یونہی احساس
تو ہو بیتاب نوکِ نشتر سے   اس کو تڑپائے تیر و خنجر سے
اک پٹاخے سے تیری تڑپے جان   اس کو گولی سے تو کرے بے جان
بربریت نہیں تو کیا ہے یہ
سربسر جورِ ناروا ہے یہ
اس سے باز آ کہ ناصواب ہے یہ   ترکِ آزار کر ثواب ہے یہ
ہاں، درندہ جو سوئے آبادی   آگیا بن کے وجہِ ناشادی
ختم اسے گر کیا ہے، ظلم نہیں
جرم کی یہ سزا ہے، ظلم نہیں
ہوں اگر ناپسند یہ اشعار   اور ان سے رکے نہ عزمِ شکار
خوب تر شعر ہیں گرامی کے   عدل و رحم و کرم کے حامی کے
اس معانی طرازِ یکتا نے   شاعرِ حق شناس و دانا نے
اپنے اک دوست کو لکھا ہے یوں
درسِ لطف و کرم دیا ہے یوں
"دل منہ بر شکار، کار است ایں   دل بہم بر مزن، شکار است ایں
نکتۂ نغز و دلپذیر آمد   سخت میر آنکہ سخت گیر آمد
جانور را کہ جاں ز تن بردی
جانِ من، آہ، جانِ من بردی"

عدم

جو تیرے راز داں تھے بڑے معتبر ملے
کچھ نیم آشنا ملے، کچھ بے خبر ملے
ملتے ہیں یوں وہ صبح کے ہنگام جس طرح
بے ساختہ جزائے نماز سحر ملے
مجھ کو جوابِ خط کی ضرورت نہیں مگر
صورت تو اُس کی دیکھ لوں گر نامہ بر ملے
پاسِ تکلفات میں عمریں گزر گئیں
اک دن تو بے دریغ نظر سے نظر ملے
کب تک یہ بار اٹھائے پھریں اپنے دوش پر
اب سر ٹیک نہ دیں۔ جو کوئی سنگِ در ملے
سوچا تھا کوئی بات کریں گے جچی تُلی،
ہم کو مسیح و خضر بھی شوریدہ سر ملے
وہ رہزنِ حسیں نہ ملا اتفاق سے
ویسے تو راستے میں بڑے ہم سفر ملے
تیزی سے اپنے گھر کی طرف جا رہا ہوں میں
وہ اپنے گھر ملے نہ رقیبوں کے گھر ملے
ہم تو گزر چکے ہیں حدِ بازگشت سے
شاید تمھیں ہی کوئی ہماری خبر ملے
پھولوں کی طرح نرم۔ سبو کی طرح حسین
کیا ہرج ہے جو زندگی مختصر ملے
راہِ عدم طویل ہے نبضِ حیات سُست
ساقی سفر دراز ہے زادِ سفر ملے

عدم

ساقی کے گیسوؤں کی ہوا کھا رہا ہوں میں
اور اس ہوا کے ساتھ کہیں جا رہا ہوں میں
بے شک حضور ایسے ہی کرتے ہیں دل لگی
جی۔ ہاں حضور۔ ٹھیک ہے فرما رہا ہوں میں
اے ناخدا سفینے کی قسمت ترے سپرد
ساحل سے بات کر کے ابھی آ رہا ہوں میں
کرتے رہے ہیں میرا تماشا بھی چند لوگ
اِس بیخودی سے محوِ تماشا رہا ہوں میں
جیسے گناہ کرنا کوئی سخت عیب ہے
ایسے گناہ کرنے سے ڈرتا رہا ہوں میں
مجرم نہیں کہ حشر میں ہو زرد رُخ مرا
اک اور ہی خیال سے گھبرا رہا ہوں میں
نکلا تھا اک حسین کے تعاقب میں پیار سے
اب تک اُسی نشے میں چلا جا رہا ہوں میں
یا ناصحوں کی بات بھی لگتی تھی دل کو زہر
یا آج اپنے آپ کو سمجھا رہا ہوں میں
اے گلستاں کے آخری غنچے! لہو نہ رو
لوٹا کے فصلِ گُل کو ابھی لا رہا ہوں میں
جھوٹی تسلیوں کا بھی اب اتنا قحط ہے
اے روزِ حشر! تجھ پہ یقیں لا رہا ہوں میں
یا رب نئے نقوش نہ تخلیق کر ابھی
مٹتے ہوئے نقوش کو چمکا رہا ہوں میں
دیر و حرم کی گرد بہت دور رہ گئی
شاید کہ میکدے کے قریب آ رہا ہوں میں
دل سی حقیر چیز تری بارگاہ میں؟
اے دوست اپنے عجز سے شرما رہا ہوں میں
ہر چند تیری بزم سے جانا ہے دل کی موت،
لیکن تو خوش نہیں تو ابھی جا رہا ہوں میں

یوں اُس کی اک نظر نے کیا ہے عدم خراب
جیسے کہ رات بھر کہیں پیتا رہا ہوں میں

فضلی

○

ذکر میرا کبھی آتا بھی نہیں
بے خبر مجھ سے ہوں، ایسا بھی نہیں
دل دھڑکتا ہے ابھی سے اتنا
اور اس نے ابھی دیکھا بھی نہیں
ہاں، کیا تم نے ستم کب ہم پر
ہاں، ستم تو تمھیں آتا بھی نہیں
ہو چلا تھا میں کرم کا خوگر
بے رُخی آپ کی بیجا بھی نہیں
کیا کریں ان کے تلوّن کا گلہ
حال پہلا سا ہمارا بھی نہیں
غم نہ ہوگا تو جئیں گے کیسے
اور تو کوئی سہارا بھی نہیں
ایک ہی در سے تعلق رکھیے
وہ جو سب کا ہو کسی کا بھی نہیں
سامنے ڈوب رہا تھا کوئی
دوستو! تم نے پکارا بھی نہیں
یا وطن میں تھے سبھی لوگ اپنے
یا کوئی جاننے والا بھی نہیں
مر مٹے راہِ وفا میں ہم تو
اور اس شوخ نے جانا بھی نہیں
ہائے وہ دن کہ وہ رہتے تھے خفا
آہ! اب رنجش بیجا بھی نہیں
کہیے کیا بیکسیٔ عشق کا حال
ہم سے پوچھے کوئی اتنا بھی نہیں
اور آجائے گی آفت فضلیؔ
حال ان سے کہیں کہنا بھی نہیں

میکش اکبرآبادی

◆

مجھے چمن میں جو آتی ہے عمرِ رفتہ یاد
ہے ان گلوں میں مگر میری نکہتِ برباد
کسے تھا ہوش ترے گیسوؤں کے سائے میں
ملی ہے تجھ سے جو فرصت تو آئی ہے تری یاد
یہاں مزاجِ زمانہ سے کون واقف ہے
دھڑک گیا مرا جی کوئی دل ہوا جب شاد
گزر گئے ہیں دلوں میں خلش چھپائے ہوئے
شہید تیرے کرم کے نہ کر سکے فریاد
نہ زحمتِ در و بام اور نہ منتِ معمار
خدا ہمیشہ رکھے خانۂ جنوں آباد
کمالِ عقل و جنوں ہے مقامِ قید و بند
ہزار قید سے بنتا ہے ایک مردِ آزاد
زمانہ صفحۂ سادہ ہے اور کچھ بھی نہیں
یہ تیرا دل اسے ویراں بنا دے یا آباد
گدائے خلق نہیں صاحبانِ فکر و نظر
نہ زندہ باد کی خواہش نہ خوفِ مردہ باد
نہ جانے کتنے حسینوں کا شاہکار ہے یہ
بہت عزیز ہے مجھ کو مرا دلِ برباد
مجھے عزیز نہیں جان لیکن اے میکش
خلافِ رسمِ محبت ہے شیوۂ فرہاد

موجِ صبا

مجید امجد

قاصدِ مست گام ، موجِ صبا
کوئی رمزِ خرام، موجِ صبا
وادیٔ برف کا کوئی سندیس
میرے اشکوں کے نام، موجِ صبا
کوئی موجِ خیال میں بہتی
منزلوں کا پیام ، موجِ صبا
تیرے دامن کی خوشبوؤں میں گم
سو سہانے مقام، موجِ صبا
سو سمٹتی مسافتوں کا طلسم،
تیری کروٹ کا نام، موجِ صبا!
آئی پت جھڑ کے ساتھ لوٹتے وقت
اک بہاریں پیام، موجِ صبا،
اک نویدِ نگاہ! پیکِ حبیب!
اک جوابِ سلام! موجِ صبا!

مغرب[°] کی اذاں

ابنِ انشا

رات کی بات ہے، شہر سُنسان تھا، جی پریشان ہے
ایک جھونکا ہوا کا کسی دُودکش سے گزرتا ہُوا
ایک سِسکی بنا، ایک گھایل صدا — میں ہوں الجیریا

آج اِنتوں کو فوجوں نے زخمی کیا — آج اِتنے مرے
صبح دم خوں چکاں سرخیوں کے جلَو میں سیہ حاشیے
میں تو حِصّہ ہوں روزانہ اخبار کا — میں ہوں الجیریا

اپنے اپنے غم و عیش کی کشتیوں میں رواں دوستو
ہیں کہ مغرب سے آیا مسافر ہوں، جاؤں کہاں دوستو
کوئی بتلاؤ اہلِ وفا کا پتا — میں ہوں الجیریا

(۲)

دفعتہً گرد کے زرد بادل اُٹھے، چاند پر چھا گئے
پھر افق تا افق پھیلتے پھیلتے آپ گہنا گئے
ان پہ سرخی کے حرفوں میں تحریر تھا — میں ہوں الجیریا

ایک ریلے میں خلقت کی آواز اُٹھی — زندگی، زندگی
حرّیت کا نشانِ جلی چھیدتی، گولیوں کی جھڑی
پھر وہی اک بھیانک خلا کی صدا — میں ہوں الجیریا

[°] مغرب یا المغرب — مراقش، ٹیونس اور الجزائر کے خطّے کا اصطلاحی نام ہے

ایک جھگڑے میں نوبت نفیری لڑائی کی بجتی ہوئی
ایک ابرِ دماں، لاکھ توپیں دمادم گرجتی ہوئی
شورِ طوفاں سے لپٹی کسی کی بُکا — میں ہوں الجیریا

(۳)

ایک مسجد کے روشن منارے اُبھرتے ہیں ظلمات سے
منبر و صحن کانٹوں کی باڑوں کے پیچھے ہیں سُونے پڑے
گونجتی ہے مگر ماذنے میں صدا — میں ہوں الجیریا

اے خداوندِ افلاکیاں، خاکیاں — تا بکے، تا بکے
اب کہ سیلابِ خوں ہے گراں "تا گراں" — اور کیا دیر ہے
کوئی درمانِ دردِ منِ مبتلا — میں ہوں الجیریا

اور کب تک یہی بے اماں بیڑیاں، جھُولتی پھانسیاں
بستیوں، کھیتیوں، چاک سینوں سے اُٹھتا سلیٹی دھواں
یہ چھٹا سال ہے جہد و پیکار کا — میں ہوں الجیریا

(۴)

ارضِ انسانیت کی حدیں سرحدیں ہیں کہاں دوستو
جہدِ اسپین بھی تو بہت دُور تھی مہرباں دوستو
کوریا بھی تو اک اجنبی دیس تھا — میں ہوں الجیریا

چیخ اُٹھتے ہو فریاد فریاد، وحشت سے مغلوب ہو
کوئی ہنگامہ دھرتی کی چھت پہ، سر رودِ ڈینیوب ہو
میں مسلمان ہوں اور میری خطا؟ — میں ہوں الجیریا

آؤ افواجِ قاہر کا سیلِ ہزاراں بھی موجود ہے
بالمقابل صفِ غازیانِ دلفگاراں بھی موجود ہے
آؤ ساماں ہے تازہ کروسیڈ کا، میں ہوں الجیریا

دکن میں چند روز

جگن ناتھ آزاد

میں یوں دکن سے دادِ سخن پا کے آگیا
دل پر اک اور تیرِ نظر کھا کے آگیا
گفتار تھی کہ نغمۂ باراں کا زیر و بم
رفتار تھی کہ جس پہ فدا بادِ صبحدم
شبنم کی آب و تاب سے چہرہ دُھلا ہُوا
یا تھا مری نگاہ میں قرآں کھُلا ہُوا
زلفیں سیاہ رات کا جادو لیے ہوئے
فردوس کے ریاض کی خوشبُو لیے ہوئے
برسا رہی تھیں کیفیتِ سحر دم بدم
زلفیں جو تھیں کسی کے مقدر کا پیچ و خم
گردن کی لوچ میں خمِ چوگاں لیے ہوئے
اور خم بھی وہ کہ گوئے دل و جاں لیے ہوئے
جلوہ دکن میں چشمِ تماشا کو جو مِلا،
شاید مری تمام دعاؤں کا تھا صلا
کچھ مسکرا کے، جھک کے ذرا سا حیا کے ساتھ
اُس نے مجھے سلام کیا کس ادا کے ساتھ

اب کیا کہوں میں کون سا عالم نظر میں ہے
اک تیر تھا کہ آہ ابھی تک جگر میں ہے

طوفان سے شباب کا عالم گزار کے
یہ سیلِ زندگی میں کئی بار ہار کے
میں سوچتا تھا زخم کوئی اب نہ کھاؤں گا
اب میں نگاہِ حسن کی زد پر نہ آؤں گا
اب ختم ہے فسوں کی کشاکش مرے لیے
خالی ہے آج حسن کا ترکش مرے لیے
لیکن جو حادثہ نہ خیال و گماں میں تھا
وہ ایک تیر بن کے ابھی تک کماں میں تھا

دل پھر ہے آج لذتِ پیکاں لیے ہوئے
"سامانِ صد ہزار نمکداں لیے ہوئے"

میں سوچتا تھا دورِ جنوں کا گزر چکا   نشۂ شباب میں جو چڑھا تھا، اُتر چکا
اب صرف حسرتِ دلِ صد چاک رہ گئی   میں سوچتا تھا آگ بجھی خاک رہ گئی
لیکن خبر نہ تھی کہ اسی خاک میں ابھی   اک موجِ آتشیں بھی کہیں ہے دبی ہوئی
مجھ کو خبر کہاں تھی کہ اک قطرہ خون کا   کل جس کا نام دل تھا وہ طوفاں جنون کا
زندہ ہے آج بھی غمِ پنہاں لیے ہوئے   میری نئی شکست کا ساماں لیے ہوئے
بھولی ہوئی سی ایک کہانی بنا ہُوا
زندہ ہے اب بھی دشمنِ جانی بنا ہُوا
مجھ کو خبر نہ تھی کہ یہ ٹوٹا ہوا سا دل   ماضی کی ایک یادِ تمنائے مضمحل
گزرے ہوئے دنوں کا فسانہ جو بن چکا   بھولا ہُوا سا ایک ترانہ جو بن چکا
پھر مجھ کو آرزوؤں کی منزل میں لُوٹے گا   پھر یہ ”طوافِ کوئے ملامت“ کو جائے گا
”پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے“
”سب کچھ نثارِ شوقِ فراواں کیے ہوئے“
مجھ کو خبر نہ تھی کہ یہ قلبِ حزیں مرا   بجھ کر بنے گا پھر نفسِ آتشیں مرا
مجھ کو خبر نہ تھی کہ جو مرجھا چکا ہے پھول   جس کو سمجھ رہا ہوں میں افسردہ و ملول
زندہ کرے گا پھر سے تمنائے رنگ و بو   مہکے گا پھر نظر میں تماشائے رنگ و بو
پھر بجلیوں کی زد پہ مجھے لے کے آئے گا   میری نظر میں مجھ کو تماشا بنائے گا
جلوہ نیا دکھا کے سرِ رہگزر کہیں   پھر بیٹھنے نہ دے گا مجھے عمر بھر کہیں
پھر ایک آرزوؤں کی محفل سجا کے یہ   آئے گا چشمِ خشک میں طوفاں اُٹھا کے یہ
ماضی کا دور پھر مری دنیا میں لائے گا   دن کا سکون رات کی نیندیں اُڑائے گا
یوں عمر بھر دلائے گا مجھ کو دکن کی یاد
جیسے اُجاڑ راہ میں آئے چمن کی یاد

غلام ربانی تاباں

○

جنوں کے نقشِ قدم بے نمود گھر کے لیے
یہ پھول کھلتے ہیں دامانِ رہگزر کے لیے

یہ سوچتا ہوں کہ دستورِ آشیاں بندی
پیامِ مرگ نہ بن جائے بال و پر کے لیے

حریفِ غم ہوس کم سواد کیا ہوتی
بنی ہے تیری جفا عشقِ معتبر کے لیے

وہ منزلیں بھی جنھیں گردِ رہگزر کہیے
چراغِ راہگزر تھیں کبھی سفر کے لیے

مرا خلوصِ تمنّا ترا خلوصِ جفا
یہ تجربہ مجھے کافی ہے عمر بھر کے لیے

روش روش گل و لالہ کے شوخ نظارے
ہزار دام بچھے ہیں مری نظر کے لیے

صبا کی چھیڑ پہ گل مسکرا پڑے تاباںؔ
خطائیں عشق کی ہوتی ہیں درگزر کے لیے

عبد المجید حیرت

کس نے اُن کا شباب دیکھا ہے
جس نے دیکھا ہے خواب دیکھا ہے
آسماں پر ابھی تو دنیا نے
ایک ہی آفتاب دیکھا ہے
دیکھنے کو تو حُسن، ہم نے بھی
اک سے اک انتخاب دیکھا ہے
چند ہی قلب تھے، جنھیں ہم نے
صَرفِ صد اضطراب دیکھا ہے
سُننے والے بھی جس کو سُن نہ سکیں
ہم نے وہ انقلاب دیکھا ہے
جب سے بدلی ہے وہ نگاہِ کرم
ہر نظر میں عتاب دیکھا ہے
ایک دنیا کو ہم نے اپنے خلاف
بر سرِ احتساب دیکھا ہے
پھر جواب الجواب دے نہ سکا
جس نے اُن کا جواب دیکھا ہے
اس طرف اُن کا التفات تو کیا
ہاں، مگر، اجتناب دیکھا ہے
ہم نے دلدادگانِ اُلفت کا
حال اکثر خراب دیکھا ہے
ہم نے اپنا تو جذبِ دلِ حیرتؔ
شاذ ہی کامیاب دیکھا ہے

جنم جنم کے ساتھی

نور بجنوری

مدتوں سے تخیل کے صحراؤں میں   کوئی وحشی نہ تھا کوئی آہو نہ تھا
روح کو ڈس چکی تھی گھنی تیرگی   کوئی شعلہ نہ تھا کوئی جگنو نہ تھا
میری آنکھوں کے اجڑے ہوئے شہر میں   کوئی تارا نہ تھا کوئی آنسو نہ تھا
پا بجولاں مرے شوخ افکار تھے
میرے لب مسکراہٹ سے بیزار تھے

دفعتہً تیری یادوں کی پروائیاں۔   برق بن کر رگ و پے میں لہرا گئیں
چیخ اٹھا امنگوں کا آتش فشاں   آندھیاں ہر طرف آگ برسا گئیں
ہر جگہ ہر طرف زلزلے جاگ اُٹھے   ہر گلی ہر نگر بدلیاں چھا گئیں
وہ زمیں پھٹ گئی آسماں شق ہوا
وہ جدائی کا کوہِ گراں شق ہوا

اور برگد کی میٹھی گھنی چھاؤں میں   گوری گوری سبک چاندنی سو گئی
وقت کا سامری دم بخود رہ گیا   اک حسیں دھند میں رہگزر کھو گئی
کون پہرے بٹھاتا خیالات پر   ہونے والی جو تھی بات وہ ہو گئی
ہر طرف جل اُٹھے جگنوؤں کے دیئے
پھول کھلنے لگے دو دلوں کے لیے

اور ہم ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے　　جھلملاتے اندھیروں میں چلتے رہے
اس جہاں سے پرے کہکشاں سے پرے　　گیت اُڑتے رہے سائے ڈھلتے رہے
کتنے لمحوں نے مہکائے آتشکدے　　کتنی صدیوں کے پتھر پگھلتے رہے
میری جاں پھر کہاں یہ انوکھے سماں
یہ نگر یہ جہاں پھر کہاں پھر کہاں

یہ فضاؤں سے کندن برستا ہُوا　　یہ زمیں یہ دُلہن جگمگاتی ہوئی
ایک افسوں میں اشجار کھوئے ہوئے　　ٹہنیوں میں ہوا سرسراتی ہوئی
تیرے آنچل کا پرچم دمکتا ہُوا　　تیری زلفوں کی شب جھلملاتی ہوئی
یہ ازل سے نئی صبح کی جستجو
جانے کب سے پریشاں ہیں میں اور تو

ہم نے پینگیں بڑھائیں کبھی دار پر　　زہر کے جام ہم نے چڑھائے کبھی
کوہساروں میں گونجی ہماری صدا　　وادیٔ نجد میں گنگنائے کبھی
پتھروں سے کبھی خیر مقدم ہُوا　　آگ کی بارشوں میں نہائے کبھی
دیپ بجھتے رہے دیپ جلتے رہے
ہم مری جاں مگر ساتھ چلتے رہے

آج لیکن جنوں کے نئے موڑ پر　　تو کھڑی کیوں ہے گردن جھکائے ہوئے
سرخ ہونٹوں پہ آہوں کی پرچھائیاں　　زرد کلیاں نظر میں سجائے ہوئے
عارضِ شوخ پر یاس بکھری ہوئی　　حوصلوں کے قدم ڈگمگائے ہوئے
دیکھ ظلمت کا یہ آخری وار ہے
دو قدم اور سورج کا مینار ہے

منتظر ہے محبت کہ دو من چلے　　بڑھ کے مجبوریوں کا فسوں توڑ دیں
وقت زادوں سے جینے کا حق چھین لیں　　سنگ و آہن کے دریا کا رُخ موڑ دیں
کتنے غنچے مہکنے کو بیتاب ہیں　　کس طرح دامنِ آرزو چھوڑ دیں
خود کو پہچان لے کون ہے کیا ہے تو
سوہنی ہے، جمیلہ ہے سیتا ہے تو

سلام مچھلی شہری

○

خود کو اب، پُوج رہا ہوں شاید
ایک ناکام خدا ہوں شاید

حاصلِ زعمِ تخیّل مت پوچھ
اپنے خوابوں کی سزا ہوں شاید

چاند تارو! مری یہ ہار معاف
اب تو خاکِ کفِ پا ہوں شاید

لوگ ہو جاتے ہیں جب دیوانے
اُسی موسم کی فضا ہوں شاید

جس بیاباں میں ہوئی قیس کی موت
اسی صحرا کی صدا ہوں شاید

شکریہ، آپ مجھے جانتے ہیں
میں ہی کچھ بھول گیا ہوں شاید!

دعویِ حسنِ زباں، خوب۔ سلام!
لکھنؤ میں بھی رہا ہوں شاید!

شکستِ تخیّل

سلام مچھلی شہری

— یہ تازہ خبر شاید تم نے بھی سُنی ہو گی :
کل شب، کسی شاعر نے، جب چاندنی چھائی تھی
ہنستے ہوئے خود اپنے اشعار جلا ڈالے،
اُس شہرِ نگاراں کے مشہور مصوّر نے
اپنی ہی محبّت کے شہ کار جلا ڈالے!

کچھ لوگ یہ کہتے ہیں، بس وجہ یہی ہو گی :
یا سازِ محبّت کے نغمے نہ وہ چھُو پایا،
یا اُس کی محبّت بھی مجروح محبّت تھی،
یا فن کی بلندی بھی کچھ اس کو نہ دے پائی

(۲)

اُن لوگوں میں اک ایسا مجذوب بھی تھا شاید
بے کیف نظر جس کی ہر بات پہ مجھ پر تھی
جیسے کہ وہ میرا ہی ناگفتہ فسانہ تھا
جیسے کہ وہ دیوانہ یہ خوب سمجھتا تھا
جو کچھ تھا وہ میرا ہی جینے کا بہانہ تھا

اُس وقت تھا کچھ میں بھی گھبرایا ہوا شاید
بے ساختہ ہونٹوں سے اک بات نکل آئی :

اس دور میں شاعر کا انجام یہی ہوگا
گھبرا کے حقیقت سے آئیں گے تخیّل تک
پر دردِ تخیّل کا انعام یہی ہوگا

(۳)

خیر، اپنی کہو، یہ تو ہر روز ہی ہوتا ہے
اس سوز کی دنیا میں، اس ساز کی دنیا میں
کچھ ہار کے جیتے ہیں، کچھ جیت کے مرتے ہیں
تم اپنے ہی گیسو کے انداز ذرا دیکھو
ہر رات سنورتے ہیں، ہر صبح بکھرتے ہیں!

کچھ بات کرو، آخر یہ تم کو ہُوا کیا ہے؟
کل رات کا افسانہ میرا ہی فسانہ تھا،
اب اور نہ کچھ سوچو، میں اب بھی تمھارا ہوں
شہزادۂ خوباں تھا اور آج بھی ہوں شاید
ہاں، اپنے تخیّل کی پرواز سے ہارا ہوں ——!!

شاعر لکھنوی

○

عشق جاگ اُٹھتا ہے یادِ لب و رخسار کے بعد
آنکھ لگتی ہے کہاں صبح کے آثار کے بعد

ہائے یہ سادگیٔ پاسِ ادب کیا کہیے
اُن کو دیکھا نہ گیا جراٗتِ دیدار کے بعد

ہم تو سمجھے تھے کہ ہے عشق یہیں تک محدود
منزلیں اور بھی آئیں رسن و دار کے بعد

اتنی فرصت تو میسّر ہو کہ ہم ایک نظر
دل کی رفتار بھی دیکھیں تری رفتار کے بعد

کوئی مجروحِ تبسّم کوئی پامال نگاہ
ہم نے ہر پھول کو دیکھا ترے رخسار کے بعد

آج پہلو میں ہے اک حسنِ سراپا شاعرؔ
اور کیا چاہیے اس جنّتِ بیدار کے بعد

○

اب کے اس رنگ سے کچھ یادِ چمن آئی ہے
ہر نفس پر تری خوشبوئے بدن آئی ہے

زلف کی چھاؤں بھی تھی سایۂ رخسار بھی تھا
عشق کو نیند سرِ دار و رسن آئی ہے

کیا ملا خاک کے ذرّوں کو نیا کوئی مقام
کیوں مہ و مہر کے ماتھے پہ شکن آئی ہے

رنگِ رفتارِ جنوں دیکھیے کیا ہو کل تک
آج صحرا کی صدا تا بہ چمن آئی ہے

رقص کرتے ہوئے جاتے ہیں کہاں دیوانے
کیا بہار اب کے سرِ دار و رسن آئی ہے

اُن کے رخسار کو چھوتی ہوئی گزری ہے نگاہ
پھول کو چوم کے سورج کی کرن آئی ہے

دیکھیں کس رند کا ایمان ہے کتنا مضبوط
فصلِ گل اب کے بہت توبہ شکن آئی ہے

وہ کچھ اس رنگ سے آئے ہیں مقابل شاعرؔ
اعتمادِ نگہِ شوق پہ بن آئی ہے

دُوسری مُلاقات

خلیل الرحمن اعظمی

کہہ نہیں سکتا۔ کہاں سے آئے ہو، تم کون ہو
ایسا لگتا ہے کہ یہ صورت ہے پہچانی ہُوئی

خاک میں روندا ہوا چہرہ مگر اک دلکشی
آنکھ میں ہلکا تبسم، دل میں کوئی ٹیس سی
پاؤں سے لپٹی ہوئی بیتے ہوئے لمحوں کی گرد
پیرہن کے چاک میں گہرے غموں کی تازگی

پرسشِ غم پر بھی کہہ سکتا نہ اپنے جی کا حال
کچھ کہا تو بس یہی کہ تم پہ کچھ بیتی نہیں
راہ میں چلتے ہوئے ٹھوکر لگی اور گر پڑے
یونہی کانٹے چبھُ گئے ہیں، پھٹ گئی ہے آستیں

یاد آتا ہے کہ تم مجھ سے ملے تھے پہلی بار
اک کہانی میں (نہ جانے کس کی تھی لکھی ہوئی)
اور میں نے اِس طرح کے آدمی کو دیکھ کر
دل میں سوچا تھا کہ اس سے آج کر لوں دوستی

سکوتِ مضطرب

حمایت علی شاعر

دیدۂ نم، دلِ آشفتہ بجنوں کی توہین
شکوۂ غم، تپشِ جذبِ دروں کی توہین
دامنِ چاک، شعورِ غمِ دل کی توہین
پاسِ ادراک، تقاضائے جنوں کی توہین
دل کو آزادِ رسومات کروں یا نہ کروں
اے غمِ دوست، تری بات کروں یا نہ کروں

کیسی گمبھیر اداسی ہے فضا پر طاری
کتنی سنسان نظر آتی ہے دنیا ساری
ذہن ساکت، نظر آوارہ، سخن بے مفہوم
کس کو معلوم، یہ لمحات ہیں کتنے بھاری
تجھ سے منسوب یہ لمحات کروں یا نہ کروں
اے غمِ دوست تری بات کروں یا نہ کروں

آج وہ کیفیتِ غم ہے کہ جی جانتا ہے
دل میں سوزاں وہ جہنم ہے کہ جی جانتا ہے
گرچہ آئینہ در آئینہ ہے ہر سو رُخِ دوست
ایسی تنہائی کا عالم ہے کہ جی جانتا ہے
نذر کچھ اشکوں کی سوغات کروں یا نہ کروں
اے غمِ دوست تری بات کروں یا نہ کروں

رات ہنس ہنس کے مجھے آئینہ دکھلاتی ہے
اشک بن بن کے ہر اک یاد امڈ آتی ہے
وہ ملاقات کا عالم، یہ جدائی کا سماں
اِک چھُری ہے کہ رگِ جاں پہ چلے جاتی ہے
آج بھی شکوۂ حالات کروں یا نہ کروں
اے غمِ دوست تری بات کروں یا نہ کروں

اب کہ یہ دہر بجز حدِّ نظر کچھ بھی نہیں
اب کہ یہ زیست بجز دردِ جگر کچھ بھی نہیں
اب کہ ہر صبح ہے اک شعلۂ بے دود کا نام
اب کہ ہر شام بجز دیدۂ تر کچھ بھی نہیں
اب بھی میں دل کی مدارات کروں یا نہ کروں
اے غمِ دوست تری بات کروں یا نہ کروں

ہمزاد

سیّد فارغ بخاری

خزاں زدہ پیڑ کی طرح میں
اداس تنہائیوں کے جنگل میں
جانے کب سے کھڑا ہوا ہوں

نہ کوئی ساتھی نہ کوئی ہمدم
نہ کوئی مونس نہ کوئی محرم
سوائے اک بے زبان ساتھی کے
جس سے میں محوِ گفتگو ہوں
جو سنتا ہے بولتا نہیں ہے

ازل سے جس کے سیہ لبوں پر
لگی ہے یوں مہرِ خامشی کی
جو فن کی قوت سے اور حدت
سے بھی پگھلتی نہ ٹوٹتی ہے

یہ کون ہے کوئی کیا بتائے
جو مدّتوں ہمرکاب رہ کر
بھی آج تک اجنبی رہا ہے

مجسمہ ہے کہ بھوت ہے یہ
خدائے شہرِ سکوت ہے یہ
میری انا کا ثبوت ہے یہ

رفعت سلطان

○

دیکھ کر حسن گلعذاروں کا
دل دھڑکنے لگا بہاروں کا

اُس نظر میں بھی التفات نہیں
میں بھی قائل نہیں سہاروں کا

یوں اُفق پر ہیں سرمئی بادل
سلسلہ جیسے کوہساروں کا

دُور لے چل کہیں سفینے کو
کچھ بھروسہ نہیں کناروں کا

جب سے وہ لوٹ کر نہیں آئے
دل سلگتا ہے رہگذاروں کا

میری آنکھوں میں آگئے آنسو
ذکر جب چھڑ گیا بہاروں کا

اک حسیں نقشِ لازوال ہو تم
چاندنی رات کے نظاروں کا

رفعتؔ اب دل ہی وہ نہیں ورنہ
ہائے مفہوم اُن اشاروں کا

○

نادان دل فریبِ محبت نہ کھا کبھی
دنیا میں کس نے کی ہے کسی سے وفا کبھی
بیٹھا ہوں اس امید پہ اک رہگذار پر
لے آئے اس طرف تجھے شاید خدا کبھی
اے دل یہ میرا حسنِ سماعت نہ ہو کہیں
تو نے بھی کیا سُنی ہے وہ آوازِ پا کبھی
گو مدتیں ہوئی ہیں مگر اب بھی یاد ہے
اِک بے وفا سے ہم نے بھی کی تھی وفا کبھی
مطرب پھر آج کوئی محبت کا گیت گا
محفل میں دل جلے بھی ہیں اور سینہ چاک بھی
اس حسنِ اعتماد سے اُن کو ملے ہیں ہم
جیسے نہ ہوں گے حشر تلک پھر جدا کبھی
اس رشکِ گل کے ساتھ گئی تھی خرام کو
پھر لوٹ کر ادھر نہیں آئی صبا کبھی
جس کی تلاش ہے نہیں ملتا وہ ہم سفر
ہم ہو گئے ہیں راہِ محبت میں خاک بھی
تیری ہر ایک بات ہے ناصح بجا، مگر
دل کے معاملے میں بھی سوچا ہے کیا کبھی
رفعتؔ غموں کی تیز ہواؤں کے باوجود
دل کا چراغ ہم نے نہ بجھنے دیا کبھی

جمیل ملک

○

تری جستجو میں نکلے تو عجب سراب دیکھے
کبھی شب کو دن کہا ہے، کبھی دن میں خواب دیکھے

مرے دل میں اس طرح ہے تیری آرزو خراماں
کوئی نازنیں ہو جیسے، جو کھلی کتاب دیکھے

جسے میری آرزو ہو، جو خراب کُو بکُو ہو
مجھے دیکھنے سے پہلے، تجھے بے نقاب دیکھے

جسے کچھ نظر نہ آیا ہو جہانِ رنگ و بُو میں
وہ کھِلا گلاب دیکھے، وہ ترا شباب دیکھے

دو جہاں کو لا ڈبوئے وہ ذرا سی آبجُو میں
تری چشمِ سرمگیں کو جو کوئی پُرآب دیکھے

یوں ٹھہر ٹھہر کے گزری، شبِ انتظار، یارو
کہ سحر کے ہوتے ہوتے کئی ہم نے خواب دیکھے

مجھے دیکھنا ہو جس نے، مرے حال پر نہ جائے
مرا ذوق و شوق دیکھے، مرا انتخاب دیکھے

آغا صادق

○

سینا کو ہے غرور ذرا سامنے تو آ!
اے رشکِ برقِ طُور ذرا سامنے تو آ!
سینے میں تُو شعور میں تو شاہ رگ میں تُو!
آنکھوں سے کیوں ہے دُور ذرا سامنے تو آ!
میخانۂ حیات کا ہر جام توڑ دوں!
خود مے کو ہو سرور ذرا سامنے تو آ!
مانا کہ دل ہے ذوقِ تصوّر سے فیضیاب
اے لذّتِ حضور، ذرا سامنے تو آ!
ہر ذرّے کو نقاب کی صورت اُلٹ ہی دے
پردہ بھی کیا ضرور! ذرا سامنے تو آ!
میرا دلِ گداز جہاں سے جدا نہیں
ہر شے میں ہے ظہور! ذرا سامنے تو آ!
بے تاب ہو رہے ہیں ترے انتظار میں
چشم و دل و شعور ذرا سامنے تو آ!
محفل میں کوئی غیر نہیں آ کے دیکھ لے
دل میں ہے کس کا نور ذرا سامنے تو آ!
ذرّوں کے سامنے ہے ستاروں کے سامنے
میرا ہی کیا قصور ذرا سامنے تو آ!
صادق سے تو قریب سہی آشنا سہی
صادق ہے تجھ سے دور ذرا سامنے تو آ

مظہر امام

○

ہو گئی بُت شکنی عام صنم خانوں میں
ایک کہرام ہے کعبے کے نگہبانوں میں

نام میرا بھی ہے ان سوختہ سامانوں میں
تذکرے جن کے ہوا کرتے ہیں ایوانوں میں

سوچتا ہوں تو حقیقت کا گماں ہوتا ہے
جانے کیا بات ہے احباب کے افسانوں میں

ایک گلشن ہے سو آباد ہے برسوں سے، مگر
پھول کھلتے ہوئے شرماتے ہیں ویرانوں میں

جتنے دیوانے ہیں شہروں میں نکل آئے ہیں
اہلِ دانش نظر آتے ہیں بیابانوں میں

جن کی تعبیر نہ تھی حسرت و وحشت کے سوا
خواب دیکھے گئے ایسے بھی، شبستانوں میں

یوں تو ہونے کو فرشتے بھی ہیں شیطان بھی ہیں
کاش ہوتا کوئی انسان بھی انسانوں میں

اپنی ہی طرح سمجھتے ہیں مجھے بھی احباب
عقل کا شائبہ ملتا نہیں فرزانوں میں

جن کی ہر ایک ادا حسنِ قبائے تہذیب
ایسے کچھ لوگ بھی ہیں چاک گریبانوں میں

غور سے دیکھو تو سائے بھی نظر آئیں گے
میری اُمّید کے تپتے ہوئے میدانوں میں

مشترک سوزِ محبّت بڑی نعمت ہے امامؔ
کچھ رقابت نظر آتی نہیں پروانوں میں

کوثر نیازی

○

اب کیا ہو گی آس
غم بھی نہ آیا راس

ہونٹوں پر شکوے
دل میں اُن کا پاس

اب کانٹوں کے مول
پھولوں کی بُو باس

راون تخت نشیں
رام کو ہے بن باس

دل والوں سے پُوچھ!
نعمت ہے احساس

دل میں ہوس مت رکھ
بیل ہے یہ آکاس

شاہوں سے بڑھ کر
کوثر اُن کے داس

○

اب تیری جفا باعثِ آزار نہ ہو گی
ہم سے یہ خطا اے نگہِ یار نہ ہو گی
واعظ! یہ تری شوخیِ گفتار نہ ہو گی
جو بات ہے منبر پہ سرِ دار نہ ہو گی
جب تک نہ ہو اُس چشمِ فسوں گر کا اشارہ
ہم کو تو کبھی جرأتِ اظہار نہ ہو گی
اب تم بھی میرے درد کا درماں نہ بنو گے
اب تم سے بھی تسکینِ دلِ زار نہ ہو گی
پھولوں کی طلب اور غمِ دامنِ صد چاک؟
دنیا تو کبھی گلشنِ بے خار نہ ہو گی
تم یاد جب آؤ گے تو پڑ جائیں گے چھینٹے
بارش مرے اشکوں کی لگاتار نہ ہو گی
جس ملّتِ خفتہ کے لیے محوِ فغاں ہوں
ہو جائے اگر حشر تو بیدار نہ ہو گی
اے ہم سفرو! مل کے یہ پتوار سنبھالو
ملّاح سے تو ناؤ کبھی پار نہ ہو گی
دُنیا کی طرح چھوڑ کے آ جائیں گے کوثرؔ
جنت بھی اگر کوچۂ دلدار نہ ہو گی

انور معظّم

○

ہمیں بھولا نہیں افسانہ دل کا
ابھی ہاتھوں میں ہے پیمانہ دل کا
دھواں اٹھتا نظر آتا ہے ہر سُو
ابھی آباد ہے ویرانہ دل کا
جہاں بکھری ہے اب خاکسترِ دل
اسی جا تھا کبھی کاشانہ دل کا

ابھی تک یاد ہیں وہ دن کہ جب تھا
ہر اک آوارہ غم دیوانہ دل کا
وہ امیدوں کا اک ہلکا تبسم
دھڑک اٹھنا وہ بے تابانہ دل کا

کسی آنسو کی گم ہوتی صدا پر
لرزنا ، ڈوبنا ، گھبرانا دل کا

غمِ دوراں ، غمِ جاناں ، غمِ جاں
ہر اک منزل پہ تھا نذرانہ دل کا
کھلے جاتے تھے گُل ہر ہر قدم پر
کہیں بھی قافلہ ٹھہرا نہ دل کا
طلسمِ رنگ و بُو تھا ٹوٹنے تک
ٹھکانہ پھر نہ تھا گل کا نہ دل کا

اِدھر ارماں ، اُدھر احساسِ حرماں
چھٹا کس موڑ پر یارانہ دل کا
ہمیں بادہ کشِ دردِ تمنّا
ہمیں پر بند ہے میخانہ دل کا

بشیر بدرؔ

○

قدم سے آگے آگے چل رہی ہے
مسافر کو گلی پہچانتی ہے
رلا کر ہائے آنسو پونچھتی ہے
ارے یہ زندگی ہے زندگی ہے
عجب شوخی بھری سنجیدگی ہے
لبوں پر مسکراہٹ سو رہی ہے
کہانی زندگی کی یوں سُنی ہے
کہ ساری داستاں اشکوں بھری ہے
محبت جس نے کی ہے یہ وہی ہے
بڑی حیرت سے دنیا دیکھتی ہے
کبھی اک رات ان آنکھوں میں دیکھو
کہ حسرت کس طرح دم توڑتی ہے
ترے بیمار کا اب تب لگا ہے
یہ حالت گفتنی کم دیدنی ہے
اُٹھا میں جب بھی خاکِ راہِ جاناں
مرے قدموں سے لگ کر رو پڑی ہے
یہ کچھ جاگی ہوئی پرخواب آنکھیں
کہانی کوئی سوتی جاگتی ہے
بہاروں کو نہ دو الزام یارو!
سرشتِ عشق میں آوارگی ہے
یہ دل کے ساتھ جاں لے کر رہے گی
کہیں یہ آگ اشکوں سے بجھی ہے
اگر دل میں خلوصِ عاشقی ہو
گناہوں میں بڑی پاکیزگی ہے
چمک کیوں ماند ہو دردِ جگر کی
یہ کوئی چار دن کی چاندنی ہے
نہ جانے کس طرف سے آ رہی ہیں
ہواؤں میں بڑی افسردگی ہے
سحر کے قافلے یہ جانتے ہیں
ابھی اک رات کی منزل پڑی ہے

○

اُدھر جا کر کوئی واپس نہ آیا
پلٹ جاؤ اسی میں بہتری
کسی کو وہ نہیں پہچانتے اب
زمانے کی ہوا ایسی لگی ہے
یہ کوئی بات کہنا چاہتے ہیں
ستاروں کے لبوں پہ کپکپی
تری آواز کا جادو جگا ہے
فضا میں چاندنی جھکی ہوئی
شکایت بے وفائی کی غلط ہے
یہ دنیا ہے یہاں سب کچھ ہنسی
ابھی کچھ زندگی کا آسرا ہے
چراغوں میں ابھی کچھ روشنی
کہو یارو۔ ڈبو دوں کفر و ایماں
ابھی ساغر میں اتنی بچ رہی
تجھے جانِ وفا سمجھا ہے لیکن
شکایت بے وفائی کی بھی کی
وہی آنسو، ہنسی، فریاد و نغمہ
غزل بھی اک مکمل زندگی
وہ آنکھیں نیلی نیلی گہری جھیلیں
جبیں کیا چودھویں کی چاند
صبیح و نو شگفتہ عارضوں پر
گلابوں کی مہکتی تازگی
کشیدہ قامتی یہ چھب یہ سج دھج
کہ جیسے شاخ پھولوں سے لد
گماں تجھ پر یہ اکثر ہو گیا ہے
مرے شعروں کو صورت مل گ
سنو اے بدرؔ قولِ عاشقاں ہے
جوابِ ناصحاں بس خامشی ہے

شکستِ ساز

جلیل حشمی

صدائیں آتی ہیں گم کردہ رہگذاروں سے
ہوائیں آتی ہیں چھوڑے ہوئے کناروں سے

جنم جنم کے دکھوں کی کہانیاں اے دل!
کہوں گا آج میں آتش بجاں چناروں سے
بھروں گا جھولی میں کانٹے لیے روش بہ روش
جو دل کے پھول پہ بیتی، کہوں گا کیاروں سے
گلے ملوں گا میں دیوانہ پیڑ پیڑ سے آج
کہ میں بچھڑتا چلا آ رہا ہوں یاروں سے
کروں گا سبزۂ خود رَو سے جا کے سرگوشی
چھپاؤں گا نہ کوئی زخم لالہ زاروں سے
کروں گا جھیل کنارے کنول کنول سے کلام
نشیمنوں سے، شگوفوں سے، شاخساروں سے،
اُفق سے، ٹیلوں سے، پگڈنڈیوں سے، امبر سے،
کرن کرن سے، شعاعوں سے، ابر پاروں سے،
ہوا سے، پتّوں سے، چھاؤں سے، کھِلی دھوپوں سے،
چمکتے پانیوں سے، پنچھیوں کی ڈاروں سے
سِلوں سے پھُوٹتے جھرنوں سے، بھیگے پتھروں سے
صنوبروں سے، سفیدوں سے، دیوداروں سے،
مچلتی لہروں سے، قوسِ قزح سے، ندّیوں سے،
اُچھلتے نالوں سے، موجوں سے، آبشاروں سے،

بنوں سے، وحشی غزالوں سے، دشت و صحرا سے،
اُبلتے جھاگ سے، مہتاب سے، نظاروں سے،
سحر سے، شام سے، دوپہریوں سے، راتوں سے،
وسیع کھیتوں سے، ذی شان کوہساروں سے،
جنم جنم کے دُکھوں کی کہانیاں اے دل!
کہوں گا آج میں فطرت کے رازداروں سے
مجھے کسی سے شکایت؟ نہیں یہ بات نہیں
ابھی تو آدمی وابستہ ہے ستاروں سے!

صدائیں — سنتے ہی جن کو اُمڈ پڑیں چہرے
وہ چہرے، شاخوں نے مانگا جنھیں بہاروں سے
وہ چہرے، دشمنِ ایمان و رہزنِ تمکیں،
خدا کو بھی جو کسی طور سونپے جائیں نہیں،
وہ چہرے، جن کے تصور سے بستیاں آباد
وہ چہرے — سینے میں اُتری ہوئی کٹاروں سے
مگر میں بھُولے ہوئے سپنے دیکھنے کے لیے
جلا سکوں گا نہ ہرگز کنارِ آب دیے
ہوائیں — جن میں ہے خوشبو مرے رفیقوں کی
ملے ہیں راگ جنھیں میرے ٹوٹے تاروں سے،
صدائیں آتی ہیں چھوڑے ہوئے کناروں سے
بتاؤ! پلٹوں میں اُن سخت منزلوں کو جہاں،
وفا ہوئی نہ مرے دلنواز یاروں سے
سفینہ موڑوں پھر اُن ساحلوں کی سمت، کہو!
جہاں ملے ہیں تہی سیپ اُچھلتے دھاروں سے
جہاں کسی سے نہ پونچھے گئے مرے آنسو
میں آ رہا ہوں انھی اجنبی دیاروں سے!!

خالد مینائی

جنونِ عشق جاناں عقل کے ماروں سے کیا کہتا
ان اصنامِ خیالی کے پرستاروں سے کیا کہتا

محبت کھولتی ہے رازِ ہشیاری و مستی کے
نہ کھلتے یہ تو میں ان کے طلب گاروں سے کیا کہتا

جفا سے اس کا مقصد دل جگر کا پاسِ خاطر تھا
وفا کرتا تو غم کے ناز برداروں سے کیا کہتا

سُنا کرتا سدا باتیں اگر بقراط و لقماں کی
تو پھر اس بزمِ ہستی کے طرح داروں سے کیا کہتا

جہاں بردوش تھے ہر چند جلوے مہرِ تاباں کے
یہیں رُکتا تو شب کے چاند اور تاروں سے کیا کہتا

جو رندوں میں نہ جاتا محفلِ وعظ و نصیحت سے
تو میگوں چشم، مستِ ناز، مہ پاروں سے کیا کہتا

حیاتِ منزل کے حُسن سے ناآشنا رہتا
تو بن اور کوہ کے انسان بیزاروں سے کیا کہتا

اگر دیکھی نہ ہوتی نامرادی اہلِ دولت کی
تو اپنے ملک کے نومید ناداروں سے کیا کہتا

کرشمہ ہر قدم پر دامنِ دل تھامے لیتا تھا
کہیں رُکتا اگر خالد تو پھر یاروں سے کیا کہتا

آنند نرائن مُلّا

○

جنوں کا دور ہے کس کس کو جائیں سمجھانے
اِدھر بھی ہوش کے دشمن اُدھر بھی دیوانے

ہر انقلاب کی سرخی انھیں کے افسانے
حیاتِ دہر کا حاصل ہیں چند دیوانے

کرم کرم ہے تو ہے فیضِ عام اس کا شعار
یہ دشت ہے وہ گلستاں سحاب کیا جانے

خدا نے ہر دو جہاں خوب ہے تری تقسیم
زمیں پہ دیر و حرم اور فلک پہ میخانے

الجھ کے رہ گئی حسنِ نقاب میں جو نظر
وہ حسنِ جلوۂ زیرِ نقاب کیا جانے

کسی میں دم نہیں اہلِ ستم سے کچھ بھی کہے
ستم زدوں کو ہر اک آ رہا ہے سمجھانے

بشر کے ذوقِ پرستش نے خود کیے تخلیق
خدا و کعبہ کہیں اور کہیں صنم خانے

نہ پوچھ دورِ حقیقت کی سختیوں کو نہ پوچھ
ترس گئے لبِ افسانہ گو کو افسانے

فصیلِ باغ سے یہ آندھیاں رکیں گی کہیں
چمن کی سمت بڑھے آ رہے ہیں ویرانے

نظامِ میکدہ ساقی چلے گا یوں کب تک
چھلک رہے ہیں سبو اور تہی ہیں پیمانے

الگ الگ سے افق پر ہیں چھوٹے چھوٹے غبار
یہ کارواں کو مرے کیا ہوا خدا جانے

ابھی تمام نہیں داستانِ محفلِ شب
چراغِ کشتہ کے باقی ہیں چند پروانے

ہماری جا بھی کہیں ہے خدائے دیر و حرم
حرم میں غیر ہیں اور بتکدے میں بیگانے

یہ جبرِ زیست محبت پہ کب تلک آخر
کہ دل سلام کریں اور نظر نہ پہچانے

کسے حقیقتِ ہستی کا ترجماں سمجھوں
جہاں ہیں جتنی زبانیں ہیں اُتنے افسانے

محبت آج بھی ہے حاصلِ حیاتِ بشر
حقیقتِ ابدی انقلاب کیا جانے

اس ارتقائے تمدن کو کیا کہوں مُلّا
ہیں شمعیں شوخ تر آوارہ تر ہیں پروانے

۲

○

دل کی دل کو خبر نہیں ملتی　　جب نظر سے نظر نہیں ملتی
نکل آتے تو ہیں قفس میں بھی پر　　طاقتِ بال و پر نہیں ملتی
نگہِ چاک زن ہزار - کوئی　　نگہِ بخیہ گر نہیں ملتی
سجدہ اوّلیں کی سر مستی　　کبھی بارِ دگر نہیں ملتی
سحر آئی ہے دن کی دھوپ لیے　　وہ نسیمِ سحر نہیں ملتی
جھوٹے موتی اُڑا تو لیتے ہیں آب　　مگر آبِ گہر نہیں ملتی
جتنے لب اُتنے اُس کے افسانے　　خبر معتبر نہیں ملتی
دلِ معصوم کی وہ پہلی چوٹ　　دوستوں سے نظر نہیں ملتی
یا تو آتی ہے خود وہ چشمِ کرم　　یا کسی دام پر نہیں ملتی
ہے مقامِ جنوں سے ہوش کی راہ　　سب کو یہ رہگزر نہیں ملتی
زیست کی تیرگی میں شمع کوئی　　دل سے تابندہ تر نہیں ملتی

نہیں مُلّا یہ اُس فغاں کا اثر

جس میں آہ بشر نہیں ملتی

۳

○

وہ چارۂ ستمِ روزگار کر نہ سکے
جو زندگی کو غمِ خوش گوار کر نہ سکے
وہ گُل پرست گلستاں سے پیار کر نہ سکے
جو خار کو بھی گلوں میں شمار کر نہ سکے
بس ایک پھیکی ہنسی لب پہ تھی سو دے ڈالی
کچھ اور خدمتِ فصلِ بہار کر نہ سکے
اُنھیں کے دل کی دبی آگ سے ڈرے محفل
جو کُھل کے بات سرِ رہگزار کر نہ سکے
چمن کو بادِ خزاں ہی کے پھر سپرد کیا
بہار آئی تو جشنِ بہار کر نہ سکے
جو ہارے وہ بھی جیتے حیف ہے تو اُن پر ہے
جو نقدِ دل سے کوئی جیت ہار کر نہ سکے
تو ہی رہے گا نہ میخانہ تیرا اے ساقی
یہ تشنہ کام اگر انتظار کر نہ سکے
بشر ہے بندۂ الفت غلامِ جبر نہیں
جو اہلِ دل نے کیا تاجدار کر نہ سکے
وہ اُس کے عشق کا منصب نہ پا سکے مُلّا
جو اُس کے نام پہ دشمن کو پیار کر نہ سکے

۴

○

کیوں نہ ہو ذکرِ محبّت کا مرے نام کے ساتھ
عمر کاٹی ہے اسی دردِ دل آرام کے ساتھ
مجھ کو دنیا سے نہیں اپنی تباہی کا گلہ
میں نے خود ساز کیا گردشِ ایّام کے ساتھ
تجھ سے شکوہ نہیں ساقی تری صہبا نے مگر
دشمنی کوئی نکالی ہے مرے جام کے ساتھ
منعِ تقصیر کہوں۔ دعوتِ تقصیر کہوں
نگہِ نرم بھی ہے گرمیِ الزام کے ساتھ
زیست کے درد کا احساس مٹائے نہ مٹا
دن خوشی کے بھی کٹے اک غمِ بے نام کے ساتھ
اپنی اس آج کی طاقت پہ نہ یوں اتراؤ
مہر اُٹھّا تھا ہر اک صبحِ شبِ انجام کے ساتھ
جو کرے فکرِ رہائی وہی دشمن ٹھہرے
اُنس ہو جائے نہ طائر کو کسی دام کے ساتھ
میں ترا ہو نہ سکا پھر بھی محبّت سے میں نے
جب بھی دنیا کو پکارا تو ترے نام کے ساتھ
کاخ و ایواں بھی گذرے ہوئے دوراں کے نہ ہوں
گردشیں آئی ہے کچھ دامنِ ایّام کے ساتھ
میں تجھے بھول چکا ہوں مگر اب بھی اے دوست
آسی جاتی ہے نگاہوں میں چمک شام کے ساتھ
خلد اُجڑی ہے تو اب اپنے فرشتوں کو بُلا
ہم سے کیا ہم تو نکالے گئے الزام کے ساتھ
حجرۂ خلد ہے حورِ شرر اندام نہیں
ساقیا آتشِ رنگیں بھی ذرا جام کے ساتھ
آ گیا ختم پہ صیّاد ترا دورِ فسوں
اب تو دانہ بھی نہیں ہے قفس و دام کے ساتھ
اب بھی کافی ہے یہ ہر شور پہ چھانے کے لیے
کوئی الفت کی اذاں دے تو ترے نام کے ساتھ

میری کوشش ہے کہ شعروں میں سمو دوں مُلّا
صبح کا ہوش بھی دیوانگیِ شام کے ساتھ

۵

○

دشتِ ظلمت میں ہے وہیں پہ ابھی
گامِ انساں ہے راہ کیں پہ ابھی
کینہ جو دل بنیں گے جام فروش
جی رہے ہیں اسی یقیں پہ ابھی
ناتواں ہو نہ اس جہاں میں کوئی
ہر بلا چرخ کی زمیں پہ ابھی
ہیں اشارے ہر آستانے سے
داغ کوئی نہیں جبیں پہ ابھی
نہیں جاتی ہے خاک کی آواز
آسمانوں کی شہ نشیں پہ ابھی
آہِ دل بے اثر ہے۔ غم ہیں مگر
کچھ کمی رہ گئی کہیں پہ ابھی
چھائی پھر دل پہ کیا گھٹا کوئی
برق کوندی تھی آستیں پہ ابھی
حسن بے پردہ کس نے دیکھا ہے
بحث ہے پردۂ حسیں پہ ابھی
دلِ معصوم حسن کیا کہیے
نام کوئی نہیں نگیں پہ ابھی
نکتہ چینی ہے اہلِ چرخ پہ اور
پاؤں ٹکتے نہیں زمیں پہ ابھی
حرفِ دل لب پہ آ نہیں پاتا
اک شکن ہے کسی جبیں پہ ابھی
جی رہی ہے اسی پہ امن کی آس
گفتگو ہے تو ہاں نہیں پہ ابھی
دورِ ظلمت تو ہے دیے لیکن
جل رہے ہیں کہیں کہیں پہ ابھی
زنگِ طوفاں سے میں نہیں مایوس
ہے یقیں موجِ تہ نشیں پہ ابھی
رند کہتے۔ اب ہیں رہ نما مُلّا
اُنگلیاں اُٹھتی ہیں تمہیں پہ ابھی

۶

○

ہموار کیا یوں گلشن بھی ویرانے بنا کر چھوڑ دیے
کانٹوں پہ تو کچھ بس چل نہ سکا شاخوں سے شگوفے توڑ دیے

اک شورِ سلاسل ہے ہر سُو۔ اب نغمہ و گُل کی بات کہاں
اس دام و قفس کی دُنیا نے آدابِ نشیمن چھوڑ دیے

ہونٹوں پہ رہا پیغامِ سحر۔ مٹی پہ قدم تاروں پہ نظر
راتوں میں کٹی راتوں میں مگر خوابوں کے اُجالے جوڑ دیے

تصویرِ حقیقت کھنچ نہ سکی مجھ سے مانا پھر بھی میں نے
وہ ٹیڑھے میڑھے خط ہی سہی خاکے تو بنا کر چھوڑ دیے

اک خوف کی ماری دنیا پھر اُس مردِ خدا کی جویا ہے
اِک موجِ تبسم سے جس نے رُخ طوفانوں کے موڑ دیے

اس عدلِ مغاں کا کیا کہنا۔ جابر پہ کرم بیکس پہ ستم
شحنہ کے سبو محفوظ رہے۔ رندوں ہی کے ساغر توڑ دیے

صدیوں قرنوں میں انساں نے جینے کے طریقے کچھ سیکھے
جینے کے طریقے جب آئے۔ جینے کے ارادے چھوڑ دیے

آزاد جہاں میں کوئی نہیں سب قیدی ہیں بس فرق یہ ہے
کس نے کتنے اس زنداں کی دیواروں میں روزن چھوڑ دیے

تاریخِ بشر بس اتنی ہے۔ ہر دور میں پوجے اس نے صنم
جب آئے نئے بُت پیشِ نظر اصنام پُرانے توڑ دیے

اب آگے تیری قسمت ہے اے قافلۂ گمراہِ بشر
میں نے تو اندھیری راہوں میں کچھ دیپ جلا کر چھوڑ دیے

اس بحث کو چھوڑو خود مُلّا پہنچا کہ نہ پہنچا منزل تک
لیکن اُس نے یاروں کو نئی کچھ راہیں دیں کچھ موڑ دیے

۷

○

شب کی تاریکی تو ہاں کم ہے مگر کافی نہیں
ہر کرن دھندلی سی ہے نورِ سحر کافی نہیں

اُس تمنا ہی کا شاید بڑھ کے حسرت نام ہے
جس تمنا کے لیے خونِ جگر کافی نہیں

مشعلِ دل بھی تو سینہ میں فروزاں چاہیے
راہِ منزل میں چراغِ رہگزر کافی نہیں

عارضی سی اک تڑپ محفل کو کیا دے گی فروغ
نور بننا ہے تو دل رقصِ شرر کافی نہیں

پائے کیا تسکین مریضِ غم تری آنکھیں ہیں خشک
نرم گفتاری فقط اے چارہ گر کافی نہیں

ذوقِ چنگیزی کو ہے دُنیائے نو کی اب تلاش
یہ جہانِ ہفت بحر و ہفت بر کافی نہیں

شوق کو دیوانہ کر پائے طلب رکھنے سے قبل
پھر تجھے روکے کوئی زنجیرِ در کافی نہیں

اشک بن کر آئی ہیں وہ التجائیں چشم تک
جن کے کہنے کے لیے حرف و نظر کافی نہیں

اِس فضا میں تجھ کو جینا ہے تو اے طائر ذرا
تیز رکھ منقار و ناخن۔ بال و پر کافی نہیں

دن سے گرمی چھیننی ہے رات سے تاریکیاں
اِس غمستاں میں ابھی شام و سحر کافی نہیں

کیوں کسی ایماں سے مانگوں شمعِ راہِ زندگی
کیا بشر کے واسطے حُبِّ بشر کافی نہیں

اس جہانِ تیرہ میں جشنِ چراغاں کے لیے
سوزِ آدم لا۔ فرشتوں کی نظر کافی نہیں

وہ تصورِ خلد کا دوزخ بھی جس کے ساتھ ہو
میری جنت کے لیے خاکم بہ سر، کافی نہیں

ضبطِ دل بھی چاہیے۔ تہذیبِ لب بھی چاہیے
جلوہ گاہِ حُسن میں ذوقِ نظر کافی نہیں

اپنے شعروں کو ابھی کچھ اور دے دل کا لہو
ہے تو ان میں زندگی قدرے مگر کافی نہیں

۸

○

گل کام نہ دے گی تری ناکردہ گناہی
گلچیں کی عدالت ہے تو کانٹوں کی گواہی
ہیں راہِ طلب میں نہ اوامر نہ نواہی
اکثر تو ہوئی راہ نما لغزشِ پا ہی
گلزارِ تمنا کی ہے ضامن تپشِ غم
بخشی ہے اسی نے مجھے شاداب نگاہی
وہ دادِ و ستد دل کی نہ وہ بزم نہ وہ رند
انساں کی جگہ آج ہے وردی میں سپاہی
یہ بزمِ مغاں ہے یہاں سکوں کا نہیں کام
چلتی ہے فقط نرگسِ ساقی کی اُگاہی
دو عشق کو اقدامِ ہوس کا تو نہ الزام
وارفتہ نگاہی نہیں گستاخ نگاہی
یوں دل میں چھپائی ہے ترے غم کی امانت
دامن پہ نشاں کوئی نہ تاروں کی گواہی
کچھ آس بڑھا اور کہ دل کے لیے کب تک
بس ایک سہارا تری بیگانہ نگاہی
ہم نے تو اندھیروں میں بھی ڈھونڈے ہیں اجالے
ملتی رہے اوروں کو اجالوں میں سیاہی
ہیں نالہ بلب اجڑے نشیمن پہ نہیں ہوں
دیکھی نہیں جاتی ہے گلستاں کی تباہی
ملتی ہے نظر اب بھی کبھی اُس سے مگر یوں
جیسے کہ سرِ راہ گزر جاتے ہیں راہی
ممکن ہے کہ ہونٹوں کو تو ہیں سی بھی لوں لیکن
لے جاؤں کہاں آنکھوں کی افسانہ نگاہی

محفل میں ہے خود داریِ مُلّا کا فسانہ
جاں دے دی مگر نیم نگاہی بھی نہ چاہی

۹

طوفانِ دل ہے اب آرمیدہ   اے وائے فصلِ مژگان و دیدہ
جورِ بتاں کے قصے نہ چھیڑو   آج اک جہاں ہے مردم گزیدہ
لایا چمن پر اک شر تباہی   اک فتنۂ گل باغ آفریدہ
مطرب نہ انتہا۔ کتنے یہاں ہیں   لب پر لیے گیت اک ناشنیدہ
بے حرف و بے صوت پیغامِ الفت   سینہ بہ سینہ دیدہ بہ دیدہ
نرمی بھی گرمی بھی اُس کی نظر ہیں   اک تارِ شبنم شعلہ دویدہ
مدت کے بچھڑے اُن سے ملے تھے   دہرائے قصے کچھ چیدہ چیدہ
ملتا نہیں آج محفل میں ساقی   اک بادہ کش باصفا خوش عقیدہ
کیا تجھ پہ گزری بامِ فلک پر   اے ماہتابِ خاک آفریدہ
توڑی گئیں کتنی کلیاں رکھلانب   اک دلبرِ گلستاں خوش دمیدہ
جاتے ہیں دُور اور مُڑ کر تبسم   آتے ہیں پاس اور دامن کشیدہ
دو دوست باہم ملتے تھے اور ہم   کیا جانے کیوں ہو گئے آبدیدہ
میخانہ مسجد زاہد کو یکساں   ہے گرم و سردِ دوراں چشیدہ
اللہ ری علم کی حشر گامی   شب تک گماں صبح کا ہر عقیدہ
انجام تیرا اک داغِ دامن   اے تاجِ مژگاں۔ اے نورِ دیدہ

کیا جانے کب ٹوٹ جائے یہ تارا
مُلتا ہے اشکِ مژگاں رسیدہ

۱۰

○

ساحل نہ صدا دے مجھ کو کہ میں آسودۂ طوفاں ہو بھی چکا
اے چشمِ کرم تکلیف نہ کر دل خوگرِ حرماں ہو بھی چکا

ہر سبزہ و گُل کی نس نس میں اک ریشۂ جنباں ہو بھی چکا
اب کون مٹا سکتا ہے مجھے میں خاکِ گلستاں ہو بھی چکا

بے رنگیِ گلشن کیا بخشے دیں سینہ خالی نظریں ویراں
جو کچھ بھی نگاہ و دل میں تھا تاراجِ بہاراں ہو بھی چکا

اک آخری ماتم باقی ہے یہ بھی کر لے بزمِ ہستی،
تاریخِ جہاں میں خاتمہ افسانہ انساں ہو بھی چکا

منہ زور ہیں کچھ گندے نالے اور خاکِ چمن سُوکھی سُوکھی
کیا جانے کہاں برسی یہ گھٹا سنتے ہیں کہ باراں ہو بھی چکا

اہلِ گلشن کی تسکیں کو یہ نعرۂ نو ہے گلچیں کا
پھولوں کی بھی باری آئے گی کانٹوں پہ تو احساں ہو بھی چکا

لوہے کی سلاخیں ویسی ہی دیوارِ زنداں اب بھی وہی
سب جامِ رہائی پی بھی چکے اور جشنِ اسیراں ہو بھی چکا

اظہارِ تمنّا مشکل تھا تو سب کے لیے مشکل ہوتا
یہ کیا کہ مجھے مشکل ہی رہا دنیا کو یہ آساں ہو بھی چکا

پیمانِ وفا پھر باندھیں گے دو دل اور پھر توڑیں گے اسے
سو بار یہ پیماں ہوگا ابھی سو بار یہ پیماں ہو بھی چکا

یہ منزلِ غم طے ہو بھی چکی اے دیدۂ نم بس رہنے دے
وہ سیرِ چراغاں کر بھی چکے میں لالہ بداماں ہو بھی چکا

انسان کے دل کی لَو کو مگر راس آتی نہیں نیکی کی ہوا
جنّت میں دیا تک جل نہ سکا دوزخ میں چراغاں ہو بھی چکا

کیوں بیٹھے ہو مُلّا جاؤ محفل میں تمھارا کوئی نہیں
ہر کلمۂ تحسیں یاروں کا میراثِ حریفاں ہو بھی چکا

۱۱

ترک ہر رسم کرو وجہ یہ کافی تو نہ تھی
نگہِ شوق خطا تھی مگر ایسی تو نہ تھی
اُٹھ گئی آپ نظر۔ آنکھ ملائی تو نہ تھی
بھول کہہ لو اسے۔ دانستہ گناہی تو نہ تھی
آ کے میخانے میں رندوں سے الجھنا واعظ
اور جو کچھ بھی ہو شائستہ مذاقی تو نہ تھی
نگہِ لطف بدلنے کا یہ ہنگام نہ تھا
لب پہ آنے کو ہنسی تھی ابھی آئی تو نہ تھی
محتسب ٹھیک تو ہی۔ میں ہی غلط۔ مے ہے حرام
غم میں دو گھونٹ مگر بادہ گساری تو نہ تھی
آ کے دیکھا درِ ساقی سے تو یہ راز کھلا
حرم و دیر میں ایسی کوئی دوری تو نہ تھی
لطفِ احباب سے کچھ مٹ تو گئی سختیِ زیست
ان میں ہاں وہ تری آغوش کی نرمی تو نہ تھی
ایک مجبورِ محبت کی وفاؤں پہ نہ جا
جنسِ الفت کی بہا نیم نگاہی تو نہ تھی
کیوں خفا ہے مرے انکار پہ ذی ہوش ہے تو
بات ناصح تری فرمودۂ ساقی تو نہ تھی
خوش نہ ہو حسنِ محبت نے وفا کی بھی تو یہ
کاہلی ذہن کی تھی۔ دل کی غلامی تو نہ تھی
پیتے پیتے ہی تو پینا ہیں یہ زہراب کے گھونٹ
اشک آنکھوں میں تھے ساغر میں صبوحی تو نہ تھی
ہاں یہ مُلّا کو ملا۔ ناز مگر کیا کرتا
منصب و جاہ ترے در کی گدائی تو نہ تھی

۱۲

○

پھر ان گردوں نشینوں کو زمیں کی بات کہنے دے
انھیں پہلے ذرا زیرِ فلک کچھ روز رہنے دے

مِرا قصّہ ہی سننا ہے تو کیوں سُن غیر کے لب سے
مجھے اپنی طرح میں کہہ سکوں جیسے بھی کہنے دے

جہاں کے غل میں دبنے دے نہ آوازِ ضمیر اپنی
جہاں تک ہو سکے کانوں میں یہ آواز رہنے دے

تجھے مردِ یقیں یہ ساحلِ آسائی مبارک ہو
مجھے شک ہی کی ہمّت آزما موجوں میں بہنے دے

لگا کر لب سے رکھ لوں گا بھرم تیرا میں اے ساقی
مرے آگے بھی خالی ہی سہی اک جام رہنے دے

بہت دلچسپ تقریرِ مسلسل ہے تری ناصح
مگر کب تک سُنے جاؤں مجھے بھی کچھ تو کہنے دے

غمِ دوراں اجازت دے بدل لوں ذائقہ منہ کا
ترا کیا حرج ہے اس میں غمِ جاناں بھی سہنے دے

قدم رکھ شوق سے تپتی ہوئی راہِ حقیقت پر
مگر اک کہکشاں بھی سامنے نظروں کے رہنے دے

یہ خوش باشوں کی بزمِ نغمہ دے ہے یہاں ساقی
حقیقت کون سُنتا ہے کوئی افسانہ کہنے دے

ہوائے تازہ سے زنداں نشیں اتنا ہراساں کیوں
کوئی دیوارِ بوسیدہ اگر ڈھہتی ڈھئے دے

محبت مرہمِ دردِ دلِ انساں تو بن جائے
مگر ذہنِ بشر انساں کو جب انسان رہنے دے

غمِ دل کہہ نہ آنکھوں سے۔ نہ آہوں سے۔ نہ اشکوں سے
نہ جی کھو کر۔ نہ بت بن کر تنک ظرفوں کو کہنے دے

سمجھ میں کچھ نہیں آتا بھلا کیا ہے۔ بُرا کیا ہے
بدل اے دورِ نو قدریں مگر پہچان رہنے دے

دیے جا خاص اپنا رنگ ہر تخلیق کو مُلّاؔ
نہ اس کی فکر کر دنیا کو جو چاہے وہ کہنے دے

ساغر نظامی

○

پھر فصلِ جنوں کو دعوت دے پھر جشنِ بہاراں ہونے دے
ہوتے ہیں جو صبح و شام نشے میں دست و گریباں ہونے دے
ہر بات پہ حیراں ہو جانا دنیا کی پرانی عادت ہے
بے ربطیٔ کفر و ایماں نے تقسیم کیا انسانوں کو
یہ موسمِ گل اے وحشتِ دل کیوں ہوش میں بیتا جاتا ہے
شاخوں پہ یہ دھیمی دھیمی سی اک شمع جلی کس نے دیکھی
ہر خار پہ اپنا دل رکھ دے ہر پھول میں خونِ جگر بھر دے
سوتی ہیں حجابِ خاک میں جو مہکے ہوئے پھولوں میں آ کر
میں تو ابھی ساری محفل میں دریا ہی بہا دوں نغموں کا
کیا آبادی، کیا ویرانی، پرچھائیاں جانی پہچانی
صبحیں ہیں مری دھندلی دھندلی راتیں ہیں مری پیاسی پیاسی

زنجیر کے نغمے چھڑنے دے زنداں کو غزل خواں ہونے دے
تو اپنے چاند سے مکھڑے پر زلفوں کو پریشاں ہونے دے
اے جانِ تماشا فکر نہ کر دنیا کو حیراں ہونے دے
ہر ایماں کفر پہ قرباں کر ہر کفر کو ایماں ہونے دے
ہونے دے گریباں کو دامن دامن کو گریباں ہونے دے
اٹھ آج چمن سے صحرا تک اک جشنِ چراغاں ہونے دے
بلبل ہے تو گوشہ گوشہ میں گلشن کے چراغاں ہونے دے
ان تازہ بہاروں کی خاطر گھر اپنا بیاباں ہونے دے
گران کی نگارہ نغمہ شکن محفل میں غزل خواں ہونے دے
ہوتا ہے جو اپنا گھر ویراں، دل کھول کے ویراں ہونے دے
ان الجھی الجھی زلفوں کو کچھ اور پریشاں ہونے دے

ہاں خاکِ درِ بت خانہ سے اُٹھا ہے خمیر اپنا ساغر
ہم آج مسلماں ہو جائیں، فطرت جو مسلماں ہونے دے

۲

○

ان سے پھر کچھ معاہدات ہوئے   پھر وہ مائل بہ التفات ہوئے
پھر اسیرِ توہمات ہوئے   پھر ہلاکِ تصورات ہوئے
حاصلِ رمزِ کائنات ہوئے   جو نظر سے مکالمات ہوئے
چشمِ نم یہ جھکی جھکی نظریں   از سرِ نو معاملات ہوئے
دل کے جذبے سمٹ کے راز بنے   اور جو بکھرے تو کائنات ہوئے
تیرے رُخ کی ضیا سے صبح ہوئی   تیرے گیسو بکھر کے رات ہوئے
چند پرتو ترے تبسم کے   ماہ و خورشیدِ کائنات ہوئے
ان کا ملنا بڑی قیامت ہے   یوں تو دن رات حادثات ہوئے
چند لمحے جو ان کے ساتھ کٹے   وہ بھی نذرِ غمِ حیات ہوئے
دل کی بربادیوں کا رونا کیا   ایسے کتنے ہی واقعات ہوئے
پھر کہیں اہتمامِ طور کرو   ہو گئی عمر ان سے بات ہوئے
چند پرتو بکھر کے حسن بنے   چند جلوے سمٹ کے ذات ہوئے

دورِ ساغر کو انقلاب نہیں
ورنہ کتنے تغیرات ہوئے

۳

○

صدیوں کی شبِ غم کو سحر ہم نے بنایا
ذرّات کو خورشید و قمر ہم نے بنایا

تخلیق اندھیروں سے کیے ہم نے اُجالے
ہر شب کو اک ایوانِ سحر ہم نے بنایا

خود بڑھ کے ڈھلے نور کے سانچوں میں اندھیرے
یادوں کو نئی شمعِ سفر ہم نے بنایا

رفتار کو کھلتے ہوئے غنچوں کی صدا دی
ہر گام پہ اک خلدِ نظر ہم نے بنایا

گیسو کو ترے کب تھا بکھرنے کا سلیقہ
شائستہ اربابِ نظر ہم نے بنایا

ہر رُخ سے ترے حسن کی ضو پھوٹ رہی ہے
کیا زاویۂ فکر و نظر ہم نے بنایا

ہر قاب کے سینے میں کیا ہم نے چراغاں
ہر موجۂ دریا کو شرر ہم نے بنایا

شبنم سے نہیں رنگ دیا دل کے لہو سے
ہر خار کو برگِ گلِ تر ہم نے بنایا

بے خونِ جگر شبنم بے رنگ تھے آنسو
آنسو کو مگر لعل و گہر ہم نے بنایا

جب برق ہوئی شعلہ فگن لالہ و گل پر
ہر پھول کی پتی کو سپر ہم نے بنایا

حسرت سے جسے دیر و حرم دیکھ رہے ہیں
وہ خم کدۂ فکر و نظر ہم نے بنایا

ہٹ کر روشِ عام سے اک راہ نکالی
کانٹوں سے بھرا راہگزر ہم نے بنایا

گر شوقِ تصادم ہے تو ٹکرائے زمانہ
اک عمر میں پتھر کا جگر ہم نے بنایا

ڈھلتے ہیں جہاں بادۂ تجدید کے ساغر
وہ میکدۂ فکر و نظر ہم نے بنایا

۴

○

جو رہینِ تغیّرات نہیں
موت ہے موت وہ حیات نہیں
دل نہیں آج یا حیات نہیں
ہم نہیں یا یہ کائنات نہیں
وہ کرم اور وہ التفات نہیں
اب وہ ان کی توجہات نہیں
دن نہیں نور میں نہائے ہوئے
بوئے گل میں بسی وہ رات نہیں
وہ تبسّم ہے اور نہ وہ آنسو
مسکراتی ہوئی حیات نہیں
ان سے انجم تھے ان سے لالہ و گل
وہ نہیں ہیں تو کائنات نہیں
نہ گریباں ہے اور نہ دامنِ چاک
اب وہ آرائشِ حیات نہیں
کچھ بہاروں ہی پہ نہیں موقوف
میری وحشت کو بھی ثبات نہیں
تشنہ ہم اور وہ ماہیٔ بے آب
حادثے ہیں یہ واقعات نہیں
مسئلے حسن کے بھی ہیں نازک
عشق ہی کے معاملات نہیں
وہ وفا کے کنول جلائے ہوئے
اب بھی ملتے ہیں پر وہ بات نہیں
اس طرح بزم میں وہ بیٹھے ہیں
جیسے باہم تعلّقات نہیں
عشق میں بے تعلقی کے سوا
کوئی شرطِ تعلّقات نہیں
یہ اندھیرے کرن کے گیسو ہیں
اہتمامِ سحر ہے رات نہیں
مرحبا نکہتِ لب و رخسار
دور تک اب غمِ حیات نہیں
شاخِ گل ہے کہ گردنِ مینا
میرے ہاتھوں میں ان کا ہات نہیں
مہک اٹھی ہے وادیٔ انجم
اک مہکتا کنول ہے رات نہیں
آئینہ اٹھ کے بار بار نہ دیکھ
میری نظروں کو بھی ثبات نہیں
مدتوں میں یہ راز دل پہ کھلا
زندگی دل کے بس کی بات نہیں
کعبہ و دیر کو ثبات ہے کب
میکدہ کو اگر ثبات نہیں
فن ہے دل کے لہو کا نقش تمام
فن کا پرتو تصوّرات نہیں

حسن ہے کائنات ہے ساغرؔ
عشق بنیادِ کائنات نہیں

۵

○

وہ دردِ عشق دے کہ ظرفِ ہستی آزماتے ہیں
ہم اس بارِ گراں کو زندگی کہہ کر اٹھاتے ہیں
تلاطم ہی نہیں اے ہمتِ دل وجہِ غرقابی
کہ اکثر بے تلاطم بھی سفینے ڈوب جاتے ہیں
کبھی جب یاد آجاتی ہے ماضی کے اندھیروں کی
دلِ ویراں میں لاکھوں ماہ و انجم مسکراتے ہیں
شگفتِ گل کنایہ ہے ترے لب ہائے نازک کا
اشارہ پا کے تیرا ماہ و انجم مسکراتے ہیں
دکھاوے کے تغافل سے کہیں چھپتا ہے محفل میں
وہ جذبہ جس کو مشکل سے وہ آنکھوں میں چھپاتے ہیں
تصور جب کبھی اس پیکرِ نوریں کا آتا ہے
ہزاروں پیرہن تاریکیوں میں سرسراتے ہیں
کئی راتیں تری فرقت میں ایسی بھی گزرتی ہیں
نہیں ہوتا اک آنسو اور دو عالم ڈوب جاتے ہیں
چمن اس کا بہار اس کی ہے شب بیداریاں اس کی
جسے ساغر نسیمِ زلف کے جھونکے جگاتے ہیں
ابھرتے ہیں جمالِ زندگی بن کر مرے فن میں
زمانے کے وہ نشتر جو جگر میں ڈوب جاتے ہیں
ہمارے ظرف سے مربوط وجدان و خرد ساغر
ہماری لغزشِ پا پہ دو عالم ڈگمگاتے ہیں

٦

○

مدد کہ ہمّتِ بے چارگی نہیں ہوتی — وہ سامنے ہیں مگر بات ہی نہیں ہوتی
نہیں مدام مرے جام ہی میں موجِ شفق — ان انکھڑیوں میں بھی مے کی کمی نہیں ہوتی
ہم اور خدا کی عبادت ندیم ہم سے تو — بتانِ دیر کی بھی بندگی نہیں ہوتی
زر و جواہر و لال و گہر لٹا کر بھی — ترے خزانۂ لب میں کمی نہیں ہوتی
کبھی فراق میں یوں بھی بہار آتی ہے — کہ پھول ہوتے ہیں اور تازگی نہیں ہوتی
کبھی بہار کی راتوں میں یوں بھی ہوتا ہے — کہ شمع ہوتی ہے اور روشنی نہیں ہوتی
کبھی کبھی تو چمن یوں بھی مسکراتا ہے — کہ رنگ ہوتے ہیں اور دلکشی نہیں ہوتی
رباب و چنگ پہ اک وقت یہ بھی آتا ہے — کہ تار ہوتے ہیں اور نغمگی نہیں ہوتی
کبھی کبھی تو محبت میں یوں بھی ہوتا ہے — کہ ان سے مل کے بھی آسودگی نہیں ہوتی
ہزار پیراہنِ نور سرسراتے ہیں — ترے فراق میں جب چاندنی نہیں ہوتی
کفِ خزاں سے چھلکنے لگا ہے خوں پھر بھی — فروغِ لالہ و گل میں کمی نہیں ہوتی
جو شب کو صورتِ پروانہ رقص کرتی ہے — سحر کی گود میں وہ خاک بھی نہیں ہوتی
وہ بات جس کے لیے خود ہے ان کو بیتابی — ادا زباں سے وہ بات ہی نہیں ہوتی

جگر کے خون سے ہوتی ہے شاعری ساغر
عروض ہی سے فقط شاعری نہیں ہوتی

۷

◆

سبو و جام تو کیا ڈوب جائیں میخانے
چھلک پڑیں جو مری تشنگی کے پیمانے
گزر چکا ہیں حدوں سے کھڑے ہیں فرزانے
کب آئے ہیں مری دیوانگی کو سمجھانے
تہی تہی سے گلستاں اجاڑ ویرانے
نکل گئے یہ کسی اور سمت دیوانے
کب آدمی کو ملے عافیت خدا جانے
ہمیں تو مار ہی ڈالا امیدِ فردا نے
کہاں ڈھلے یہ غمِ آدمی خدا جانے
کہ ایک جانِ حزیں اور ہزار پیمانے
شکست دل کو شکستِ حیات کیوں سمجھیں
ہے میکدہ جو سلامت ہزار پیمانے
کبھی نگاہِ کرم بھی نہ کہہ سکی ان کو
تری نگاہِ خفی کہہ گئی جو افسانے
فلک پہ کوکب و انجم زمیں پہ لالہ و گل
ہیں میرے ہاتھ سے چھلکے ہوئے یہ پیمانے
مری وفا بھی ہوس کا لطیف جوہر ہے
یہ رمزِ حسنِ محبت نواز کیا جانے
انھیں کی خاک سے ابھرے گا ایک کعبۂ نو
دبے ہوئے ہیں تری روح میں جو بت خانے
یہ میرا کام ہے میں زندگی کو پہچانوں
حیات ہوش میں کب ہے جو مجھ کو پہچانے
بلند نغمۂ آدم ہے بزمِ انجم میں
کب اک ستارۂ نو ہنس پڑے خدا جانے
حیات ابھی ہے فقط اک حیوانیت کا پرتو
ابھی حیات کو سمجھا ہی کیا ہے دنیا نے
وہ حسن و عشق کے وجداں سے فزوں تر ہیں
سبق جو ہم کو دیے ہیں نگارِ دنیا نے
اثر نہ پوچھ مری لذتِ خموشی کا
تڑپ رہے ہیں وفورِ بیاں سے افسانے

مرا وجود ہے اک داستاں سراسر
نفس نفس میں ہیں غلطاں ہزار افسانے

۸

○

بے مایہ عہدِ سیاست کے جو حاشیہ برداروں میں نہیں
اے اہلِ خبر اس کی گنتی اس عہد کے فن کاروں میں نہیں

کیا رقصِ سلاسل کا وہ جنوں زنداں کے طرحداروں میں نہیں
پہلا سا وہ نغموں کا طوفاں زنجیر کی جھنکاروں میں نہیں

کیا عشوہ گرِ آزادی سے زنداں کی فضا محروم ہوئی
ہر گام پہ اک بجتی پائل زنجیر کی جھنکاروں میں نہیں

دنیا سے جو پنجہ کش ہو کر جینے کا بڑھاوا دیتی تھی
وہ روحِ ستم دشمن میں نہیں وہ خوئے وفا یاروں میں نہیں

جو تیرے لبوں پہ خنداں ہے اسرار کی اک معصوم کرن
وہ دوشیزہ کلیوں میں نہیں پھولوں میں نہیں تاروں میں نہیں

قربت نے نمایاں کر ہی دیا معصوم غزالی آنکھوں میں
وہ ہوش جو ہشیاروں میں نہیں وہ کیف جو میخواروں میں نہیں

جب عشق تمنا کرتا ہے جب دل کے زخم چٹختے ہیں
چپکے سے وہ فرما دیتے ہیں یہ شخص وفاداروں میں نہیں

احباب کے پھول سے ہونٹوں میں جو امرت بن کر پنہاں ہے
اے دوست وہ زہرابِ کامل تیروں میں نہیں خاروں میں نہیں

چھینٹے مرے دل سے اڑ اڑ کر پہنچے ہیں بساطِ انجم تک
یہ خونِ جگر سے گل کاری زنداں ہی کی دیواروں میں نہیں

جینے سے اگر اٹھ جائے یقیں دنیا ہی علاج اس کا ہے نہ دیں
آزار ہمارا چارہ گرو جانے ہوئے آزاروں میں نہیں

کرتا ہے جنونِ شوق مرا محرابِ تلاطم ہی سجدے
طوفاں! یہ عقیدہ رکھتا ہوں ساحل کے پرستاروں میں نہیں

ہے کفر شریعت میں میری ٹوٹے ہوئے سازوں کا ماتم
میں مطربِ فردا ہوں سازِ غمِ ماضی کے عزاداروں میں نہیں

۹

○

داد بے چارگاں ملے نہ ملے
حشر میں بھی اماں ملے نہ ملے
پھر یہ عمرِ رواں ملے نہ ملے
دولتِ رائگاں ملے نہ ملے
صحبتِ گل رخاں ملے نہ ملے
خلوتِ مہ وشاں ملے نہ ملے
زندگیٔ گل فشاں ملے نہ ملے
میکدہ یوں جواں ملے نہ ملے
یہ نگارِ طرب رہے نہ رہے
مطربِ نغمہ خواں ملے نہ ملے
بزمِ سیمیں تناں جمے نہ جمے
جلسۂ عاشقاں ملے نہ ملے
ایک دو کو خدا بنا ڈالیں
یہ ہجومِ بتاں ملے نہ ملے
کس نے دیکھے ہیں کوثر و تسنیم
دادِ تشنہ لباں ملے نہ ملے
ہے یہ خندہ وہ بھی داستاں سن لیں
حاصلِ داستاں ملے نہ ملے
ان کے گیسو سنوار دو کوئی
میرے دل کو اماں ملے نہ ملے
چشمِ افسانہ گو زباں خاموش
ہم سا افسانہ خواں ملے نہ ملے
پھول ہی آشیاں کو سلگا دیں
برق کو آشیاں ملے نہ ملے
یوں نہ ٹھکرا دلِ شکستہ کو
پھر یہ جنسِ گراں ملے نہ ملے
رہزنوں ہی پہ اکتفا کر لیں
رہبرِ کارواں ملے نہ ملے
ہالۂ دشمناں غنیمت جان
حلقۂ دوستاں ملے نہ ملے
کاش سجدے میں دم نکل جائے
پھر ترا آستاں ملے نہ ملے
ہم تو ان پر نثار ہوتے ہیں
صلۂ امتحاں ملے نہ ملے
اس کو لاکھوں گماں ہونے دے
اس طرح بدگماں ملے نہ ملے

ہے غنیمت معیتِ ساغرؔ
فخرِ آوارگاں ملے نہ ملے

اُردُو کے تاریخی ناوِل

عبدالماجد دریابادی

بات چیت سننے سے پہلے ایک بار پھر یہ سن لیجئے کہ عنوان ہے کیا: "تاریخی ناول"۔ کہیں ناول کو تاریخ نہ سمجھ لیجئے گا، جی! اس دنیا میں کاریگر اور ہنرمند ایسے ایسے بھی گذرے ہیں جنہوں نے قصہ کہانی، افسانہ و رومان کو تاریخ بنا دیا۔ اور جھوٹ کو عین مین سچ کا جامہ پہنا دیا۔ تو اس وقت گفتگو ایسے یارانِ شاطر کے باب میں نہیں۔ اس وقت کچھ کہنا سننا اس کے بالکل برعکس، ان باکمالوں کے بارے میں ہے، جنہوں نے تاریخ کو ناول بنا دیا۔ یعنی باتیں سنائیں تو سچ ہی سچ، اور کہیں پتے ہی پتے کی، لیکن بات کہنے کا رنگ ڈھنگ اور طور طریقہ کچھ ایسا رکھا کہ جیسے کوئی محض گپ ہانک رہے ہوں۔ اور خلقت سے داد اپنی خلاقی کی لینے بیٹھے ہوں! لیکن صاحب یہ ممکن کیوں کر ہے؟ جھوٹ جھوٹ ہی ہے اور سچ سچ ہی ہے دونوں کے شیر و شکر ہو جانے کی آخر صورت کیا ہے؟ ـــــ جی یہی تو فن کا کمال ہے۔ کیا نمک اور شکر کو آپ نے ایک ذات ہوجاتے دیکھا سنا نہیں! اور متنجن کا ذائقہ کبھی چکھا نہیں؟ پلاؤ کا پلاؤ اور زردے کا زردہ! ایک ہی لقمۂ تر میں دونوں کا مزہ! تو اب کیا فن کار کا قلم، باورچی کے کفگیر یا چمچے سے بھی گیا گزرا ہوا؟ ماضی کی انگوٹھی پر حال کا نگینہ وہ اس خوبی سے جڑتا ہے کہ تاریخیت خود اس پر جھوم اٹھتی ہے اور حقیقت اس لباس مجاز کے ہاتھ آجانے پر پھولے نہیں سماتی!

کہنے والے کہتے ہیں کہ قلمی نقاشی اور تصویر کشی کی اس نادر صنعت کو اوّل بار دنیا میں چمکانے والا ایک برطانوی ہوا ہے، سر والٹر اسکاٹ، انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں اپنا نام پیدا کرنے والا، اور پھر جو اس کے چراغ سے چراغ جلنے شروع ہوئے، تو فرانس میں الگزنڈر روما، اور وکٹر ہیوگو اور دیس دیس میں فلاں اور فلاں کتنے، اور اپنے اپنے نام کی مشعل روشن کر گئے اور جب یہ فن سمندر پار کر کے ہندوستان پہنچا تو یہاں اس کا استقبال کرنے والوں اور اپنے سر اور آنکھوں پر بٹھانے میں بنگالے دیس کے بنکم چندر چٹرجی پیش پیش رہے اور خیر ساری زبان اور بولیوں سے ہم کو آپ کو غرض کیا، ہماری اپنی اردو میں اسے ہاتھوں ہاتھ مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی، نے لیا۔ یہ ولایت فرنگ کی بھی سیر کر آئے تھے۔ اور برسوں کے ریاض میں اس فن کو اپنا کر کے چھوڑا۔

لکھنؤ کی سرزمین کو تو ناول نویسی سے جیسے ایک فطری مناسبت تھی، ادھر فسانۂ آزاد والے سرشار اپنی قدرت زبان اور زبان آوری دونوں کے زور سے اس میدان میں اپنا جھنڈا گاڑ ہی چکے تھے۔ کہ ادھر ظہور شرر صاحب کا ہوا، ناول نویسی میں وہ کچھ انیلے نہ تھے۔ "دلچسپ" دو حصوں میں، "دلکش" تین حصوں میں، اور اور مختلف ناموں سے وہ اپنے قلم کی جولانیاں دکھا ہی چکے تھے اب وہ عام عاشقانہ ناولوں کے کوچے سے کتراتے ہوئے، اپنا دامن بچاتے ہوئے مڑ کر تاریخی ناول کے راستہ پر پڑ لیے، یکبار غضب کے تھے۔ بسیار نویس بھی اور زود نویس بھی اور قلم کے چلت پھرت کے ماہر۔ ناول پر ناول، یہی تاریخ کا ٹھپہ لگائے ہوئے، دھڑا دھڑ ان کے قلم سے نکلنے لگے۔ حسن انجلینا، منصور موہنا، ملک العزیز ورجنا، دیا دو

علاوہ، فلورا فلورنڈا، فلپانا، ماہ ملک، بابک خرمی، زوال بغداد، فردوس بریں، قیس و لبنیٰ، مقدس نازنین، لعبت چین، ایام عرب، شوقین ملکہ، خیر جانے دیجیے، ساری فہرست کوئی کہاں تک سنائے، اور کوئی کب تک سنے!

مولانا ملکوں ملکوں کی تاریخ پڑھے ہوئے تھے۔ اور جغرافیہ چپے چپے کا جانتے تھے۔ تاریخ اور ضمناً جغرافیہ، کبھی ان کے مطالعہ کا خاص موضوع تھا۔ عربی کے تو خیر عالم ہی تھے انگریزی کا مطالعہ بھی خاصہ وسیع رکھتے تھے اور اپنے رنگ کی فرنچ کتابوں سے بھی ناآشنا نہ تھے۔ خاص الخاص موضوع ان کا اسلامی تاریخ تھا۔ کثرت سے ان کے تاریخی ناول تاریخ اسلام ہی کے کسی نہ کسی دور سے متعلق ہیں۔ مصر، عراق، شام، حجاز، ٹرکی، اسپین، ترکستان، اور خود ہندوستان کے، اسلامی عہد کے جلوے انہوں نے اسلامی تاریخ کے طالب علم کے لئے اچھے خاصے فراہم کر دئیے ہیں اور کچھ کچھ جھلکیاں عرب قدیم، روما قدیم، اور مسیحیت قدیم کی بھی دکھا دی ہیں ـــــ شہرت عام کے لحاظ سے مولانا کے ناولوں کا سرتاج فردوس بریں ہے اس میں حسن بن صباح کے پیروؤں یعنی فرقہ باطنیہ والوں کی حیرت انگیز کارستانیوں اور لرزہ خیز کارروائیوں کی ساری داستان سمٹ آ گئی ہے ـــــ ناقدوں اور مبصروں نے اسے مولانا کا شاہکار قرار دیا ہے اور یہ خیال بے جا بھی نہیں، بڑے جاندار کردار اس ناول کے ہیں۔ لیکن تاریخی ناول کی جانچ پرتال کا معیار اگر یہ رکھا جائے کہ فلاں زمانے کے فلاں ملک کی عام معاشرتی ـــــ تمدنی، اور جغرافیائی حالت کی تصویر کشی میں کوئی ناول نویس کہاں تک کامیاب ہوا ہے تو پھر شرر صاحب کے ناولوں میں نمبر اول پر جگہ ایام عرب کو دینا پڑے گی۔

کتاب دو جلدوں میں ہے اور اس میں دو شریف خاندان عرب نوجوانوں عمرو اور زہیر کے عشق کے قصے درج ہیں۔ ایک کی محبوبہ ملک غسان کی شاہزادی تھی، اور دوسرے کی ملکہ حیرہ کی شاہزادی، غسان کا ملک عرب کے شمال و مغرب میں تھا، روم و شام کی مسیحی سلطنت سے متصل اور حیرہ کا ملک عرب کے شمال و مشرق میں تھا، عراق و ایران کی مجوسی سلطنت سے ملحق۔ افسانہ کا زمانہ دور جاہلیت عرب کا بالکل آخری دور اور عین ظہور اسلام کا وقت ہے۔ ناول کی سیر ایک بار بھی اگر کر جائیے تو کتنی ہی باتیں ایک ساتھ آپ کو معلوم ہو جائیں گی۔ عرب اور اس کے اڑوس پڑوس کی جغرافی حالت کیا تھی۔ آب و ہوا کیسی تھی۔ ان جغرافی اور طبعی حالات کا اثر تمدن و معاشرت پر کیا پڑا، کھانے پینے کو کیا ملتا تھا، رہنے سہنے کے ڈھنگ کیا تھے، شادی بیاہ کے طریقے کیا تھے۔ عرب کی قبیلہ وار زندگی کے خصوصیات کیا تھے۔ میلے ٹھیلے کی رنگینیاں اور شراب کے دور ان کی زندگی کا جزو کہاں تک بنے ہوئے تھے۔ پھر سیاسی حالات کیا تھے، دونوں ملکوں کے آپس کے تعلقات کیسے تھے، عرب کے مذہبی عقیدے کیا کیا تھے، دینی و اخلاقی زندگی کس قسم کی تھی، صلح و جنگ کے معیار کیا تھے، نامور قبیلے کون کون سے تھے۔ یہ اور اسی قسم کے بیسیوں دوسرے سوالوں کے جواب دے کر یہ ایک کتاب، آپ کو تاریخ کی بہت سی کتابوں سے بے نیاز کر دے گی۔ اور پھر تاریخ کی خشکی کا کہیں نام و نشان نہیں، کتاب دلچسپ اتنی کہ آپ اسے پڑھیں یا نہ پڑھیں، وہ خود اپنے کو آپ سے پڑھوا کر رہے گی۔

افسانہ کی دلآویزی کا تعلق تو خود کتاب کے حسب فرصت و اطمینان پڑھنے سے ہے البتہ جہاں تک کتاب کے دئے ہوئے معلومات کا تعلق ہے، اس کی ایک آدھ جھلک اس رواروی میں دیکھتے چلئے یا سنتے چلئے، خیر اب اسے چاہے بگوش چشم سننا کہہ لیجئے، چاہے بچشم گوش دیکھنا۔ بہرحال کتاب شروع یوں ہوتی ہے۔

ہجرت نبوی سے تقریباً چالیس سال پہلے ذی قعدہ کی ۱۵ر تاریخ مکۂ معظمہ سے دس میل کے فاصلے پر شہر طائف اور قصبہ نخلہ کے درمیان عکاظ نامی ایک چھوٹے سے دشت میں قبائل عرب ہر طرف سے آ آ کر جمع ہوئے ہیں۔ اور جاہلیت کا وہ مشہور بازار لگا ہوا ہے جسے سوق عکاظ کہتے ہیں۔ یہ وہ بازار تھا جس کے ذریعے سے لین دین اور خرید و فروخت کے علاوہ اہل عرب میں مبادلۂ مذاق و عادات بھی ہوا کرتا تھا۔ جس ریگستانی میدان

میں یہ بے شمار مخلوقِ خدا اپنے کمبلوں اور دہستوں کے خیمے تان کر فروکش ہوئی ہے۔ اس کے گرداگرد سیاہ و بے گیاہ پہاڑیوں کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ جن کی چوٹیاں اس وقت دوپہر کی دھوپ میں جو بقول رسول مقبول صلعم کے فیحِ جہنم کا نمونہ دکھا رہی ہے۔ دوزخ کے فرشتوں کی طرح ایک کے پیچھے ایک سر اٹھائے ہوئے ان درشت مزاج ابنائے بادیہ کو گھور رہی ہیں۔ بادِ سموم کے جھونکے گرد کو اڑا اڑا کے آسمان کی فضا کو میلا کرتے ہیں۔ وہاں قریب کی چٹانوں کو بھی خاکساری کا ملگجا خلعت پہنا رہے ہیں"۔

یہ اقتباس کتاب کے بالکل شروع کا تھا اور انہیں چند سطروں میں آپ نے دیکھ لیا کہ کتنی تاریخی اور جغرافی حقیقتوں پر روشنی پڑ گئی۔ اس ناول میں ایک جگہ ذکر کوہ قاف کے علاقے کا آگیا ہے۔ منٹ بھر کے لئے ذرا اس کی بھی دل کش سینری سے لطف اٹھاتے چلیے۔ یہ اقتباس جلد ۲ ص۱۱۱ سے شمار ہو ہوں۔

"چھوٹی چھوٹی نہریں پہاڑوں کے پہلوؤں سے ناچتی ہوئی اور کودتی ہوئی نیچے اتری ہیں۔ جو اس وادی کے تمام پودوں میں ہر طرف ہر پھر کے اور چکر لگا کر پانی پہنچا رہی ہیں۔ اور تھوڑی دور اور آگے بڑھ کر قدیم دریائے فرا میں جسے اب دریائے سغر کہتے ہیں مل گئی ہیں۔ طیور ہر طرف نازک شاخوں پر بیٹھے ہیں اور پھولوں سے چہچہیں ملا ملا کر نغمہ سنجی کر رہے ہیں۔ کوہستانوں کی خوب صورت و تندرست لڑکیاں اپنے گلّوں کے چرانے کو آئی ہیں۔ انہیں کے قریب اور تھوڑے فاصلے پر وحشیان صحرا ہرن اور چیتل نیل گائیں اور گورخر بے خوف و خطر آتے ہیں۔ پانی پی پی کر سیراب ہوتے ہیں اور ادھر ادھر چرنے لگتے ہیں ..... ناگہاں پہاڑی کوتے ایک شور مچاکے اڑے۔ ہرن جو اطمنان و بے ہراسی سے ادھر ادھر چر رہے تھے چوکنا ہو ہو کے چاروں طرف دیکھنے لگے گوڈریوں کی خوب صورت لڑکیاں سہم گئیں گھبرا گھبرا کے بھاگیں اور کوہستان کے گھونگھٹوں میں چھپنے لگیں کہ کوئی شخص آکر پکڑ نہ لے جائے۔"

ایامِ عرب کے بعد پھر شرر کے تاریخی ناول میں نمبر دوم پر قیس و لبنیٰ ہے یہ شاعری کی دنیا کے مشہور قیس عامری نہیں بلکہ ایک دوسرے قیس قبیلۂ بنی عذرا کے ہیں اور ان کی محبوبہ لیلیٰ نہیں، لبنیٰ تھیں۔ یہ ان کے عشق کا اور صحابہ رسول کے آخری زمانہ میں سچا قصہ ہے اس کے بعد شرر کا ناول رومتہ الکبریٰ ہے جو پانچویں صدی کی مسیحیت کا فوٹو ہے جب مسیحیت روما کا سرکاری مذہب بن رہی تھی۔ شرر صاحب نے اپنا اصل کمال ایک اور کتاب میں دکھایا ہے اس کا نام جویائے حق ہے اس میں سیرت نبوی کے سامنے اہم پہلو ایک عجمی نو مسلم کی زبان سے ناولانہ پیرائے میں بیان کر دئے ہیں غرض یہ کہ جناب شرر اس میدان میں آکر ایسا ایسا چکے ہیں کہ نام کے تو چنگاری رہے لیکن مات شعلے کو دے گئے۔

شرر کے معاصر ایک صاحب حکیم محمد علی طبیب گذرے ہیں انہوں نے بھی تاریخی ناول شروع کئے اور اپنے زمانے میں خاصے مقبول بھی رہے ان کے ناولوں میں نسبتاً سب سے زیادہ شہرت جعفر و عباسہ نے پائی۔ خلیفہ ہارون الرشید کے عہد کی ایک چلتی ہوئی داستان ہے لیکن تمام تر غیر مستند، ایسی ہی بے سند داستانوں میں ایک قصہ اکبر بادشاہ کے زمانے کا ایک شاہی کنیز انار کلی کے نام سے ہے اس پر بھی اردو میں لکھا جا چکا ہے لیکن ایسے بے سند قصوں کو تاریخی ناول کا لقب دینا تاریخ پر ظلم کرنا اور اس کے نام کو بٹا لگانا ہے اسی زمانے میں کچھ تاریخی ناول انگریزی سے ترجمہ ہو کر آئے ان میں سب سے زیادہ مشہور و مقبول رینالڈز کا LOVES OF THE HAREM رہا ہے حرم سرا کے نام سے دو جلدوں میں ریاض خیرآبادی نے اپنا لیا ہے لیکن اس میں تاریخیت برائے نام ہی ہے افسانویت ہی اس پر اول سے آخر تک غالب ہے۔

شرر کے بعد ان کا کوئی جانشین اس حیثیت سے ہندوستان میں نہ پیدا ہو سکا کچھ لوگ اب بھی اسلامی تاریخ پر ناولانہ انداز میں قلم چلا رہے ہیں لیکن انہیں کوئی خاص امتیازی حیثیت حاصل نہیں۔

کیا میرؔ کی شاعری میں فکر و نظر کی کمی ہے؟

اثؔر لکھنوی

میں نے ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کا عالمانہ مقالہ "کلام میر میں فکر و نظر کا عنصر" بڑے شوق سے اور اپنی بساط بھر غور سے پڑھا جناب موصوف نے میرؔ کی شاعری کا مطالعہ اور تجزیہ ایک نئے زاویۂ نظر سے کیا ہے جو دعوتِ غور و تامل دیتا ہے۔ مجھے اُن کے بعض فرمودات سے اختلاف ہے جس کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ مجموعی حیثیت سے مقالے کی اہمیت و افادیت مسلم ہے۔

اُن کا ارشاد ہے کہ ــــــ

> "میرؔ عقلی تجزیہ کی اُس استعداد سے بہرہ مند نہ تھے جو غالبؔ سے مخصوص ہے۔ غالب حقائق کی دریافت اور حقائق کی ترتیب میں میرؔ سے زیادہ ذہن رسا رکھتے تھے۔ اس کے برعکس میرؔ کے یہاں عقلی تجزیہ کی صرف ابتدائی صورتیں ملتی ہیں .... ابتدائی جستجو کے عناصر پائے جاتے ہیں مگر انکشاف حقائق میں اُن کی کامیابیوں کی حد محدود معلوم ہوتی ہے۔ اُن کا بظاہر عقلی تجزیہ بھی عام حالات میں بالآخر ایک جذباتی اُلجھاؤ پر ختم ہو جاتا ہے اور اکثر اُن کا استدلال جلد ہی منطق کا دامن چھوڑ کر پھر جذبات کے سائے میں دم لیتا ہے۔"

کاش ڈاکٹر صاحب اپنے دعوے کے ثبوت میں میرؔ اور غالبؔ کے چند اشعار بالمقابل پیش کر دیتے کہ غور کرنے کا موقع ملتا اور فیصلہ ہو سکتا کہ کہاں محض لفاظی اور مضمون آفرینی ہے اور کہاں حقیقت کی عقدہ کشائی ہے، مشاطگی ہے، آرائش ہے اور "ناظورۂ ہزار شیوہ" کے پیکر میں پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے منطقی استدلال پر زور دیا ہے حالانکہ شعر کی منطقی زنجیرہ بندی اس کی لطافت و اثر اندازی کو ملیامیٹ کر دیتی ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ کوئی شاعر عظیم کہلانے کا مستحق نہیں ہوتا جب تک مفکر یا فلسفی بھی نہ ہو، مگر وہ کوئی نیا نظام فلسفہ مرتب نہیں کرتا بلکہ مسلمہ حقائق و معارف کو زبان شعر و نغمہ میں بیان کر دیتا ہے اور خود شعر میں اس کے انداز فکر کے شواہد موجود ہوتے ہیں۔ اس روشنی میں غالبؔ کا یہ شعر پڑھیے ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

حالیؔ کا بیان کردہ مطلب یہ ہے:۔

> "بالکل نئی طرح سے نیستی کو ہستی پر ترجیح دی ہے اور ایک عجیب توقع پر معدوم محض ہونے کی تمنا کی ہے۔ پہلے مصرعہ کے معنی تو ظاہر ہیں۔ دوسرے مصرعہ سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو دیکھنا چاہیئے کہ میں کیا چیز ہوتا۔ مطلب یہ ہے کہ خدا ہوتا کیونکہ پہلے مصرعہ میں بیان ہو چکا ہے کہ اگر کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا۔"

غالب کے علی الرغم اپنے آپ کو "ڈوبی ہوئی اسامی" سمجھیئے اور شکوہ سنج ہونے کے بدلے میر کس دھڑلے سے کہتا ہے ؎

اب ایسے ہیں کہ صانع کے مزاج اوپر بہم پہنچے
جو خاطر خواہ اپنی ہم ہوئے ہوتے تو کیا ہوتے

"صانع کے مزاج اوپر بہم پہنچے" کے ٹکڑے سے خیال میں نہ معلوم کتنی لطافتوں کا اضافہ کر دیا۔ اور تصور کی جولانی کے لیے کتنا سامان فراہم کر دیا۔ انسان اشرف المخلوقات ہے، احسن تقویم ہے۔ ہمارے رسول کریم کے لولاک لما خلقت الافلاک، قاب قوسین او ادنی کی طرف اشارہ ہو گیا۔ (آخر وہ بھی انسان تھے)، انسان کو مٹی کی مورت یا گھروندا فرض کرنے کے بجائے اس کی عظمت اور "انی جاعلٌ فی الارض خلیفہ" کی معنویت پر غور کرنے کا موقع ملا۔ اس پر مزید ترقی کرنا میر اور صرف میر کی طبع شگرف و نادرہ کار کا کام تھا۔ اب تو ایسے ہیں کہ صانع ہم پر ناز کرتا ہے اگر منشائے تخلیق میں ہمارا دخل ہوتا تو خدا سے جدا ہونا ہرگز قبول نہ کرتے، اُس نور مطلق سے واصل رہتے اور یہ نوبت نہ پہنچتی ؎

مری نمود نے مجھ کو کیا برابر خاک
میں نقش پا کی طرح پائمال اپنا ہوں

صرف اسی موضوع پر میر کی طبع وقاد نے نہ معلوم کیا کیا گل کھلائے ہیں، بخوف طوالت مزید مثالیں پیش کرنے سے دست کش ہوتا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

> "میر کا اولین ردعمل عجیب و غریب ہوتا ہے۔ اگر اس ذہنی ردعمل کے لیے کوئی خاص اصطلاح وضع کرنی ہو تو اس کو لفظ حیرت یا تحیر سے یاد کر سکتے ہیں۔"

جذبۂ حیرت جس کی ڈاکٹر صاحب تحقیر کرتے ہیں وہ جذبہ ہے جس سے غور و فکر و تجسس کا آغاز بھی ہوتا ہے اور اسی پر خاتمہ بھی ہوتا ہے۔ ایک طرف شیر خوار بچے کو رنگ، روشنی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے، ایک طرف نیوٹن (NEWTON) سا محقق اور سائنسدان حیران ہو کر چیخ اٹھتا ہے کہ "اب تک سمندر کنارے بیٹھا سیپیاں چن رہا ہوں۔" (بحر حقیقت کی غواصی کے بعد علم و عرفاں کے موتی رولنے کا تو کیا ذکر)

حیرت تصوف کی بھی ایک بلند منزل ہے جہاں قوت گفتار سلب ہو جاتی ہے۔ (میر)

رخصت جنبش لب عشق کی حیرت سے نہیں
مدتیں گزریں کہ ہم چپ ہی رہا کرتے ہیں

ڈاکٹر صاحب کا یہ بھی خیال ہے کہ

> "مشاہدات عالم و مظہر زندگی کے خلاف میر کے ذہن میں جو شدید ردعمل پیدا ہوتا ہے اگر صرف

اسی پر نظر ڈالی جائے تو محسوس یہ ہوگا کہ میرؔ کے یہاں کائنات کو سمجھنے اور غور و فکر کے شوق کی کمی نہیں مگر اکثر حیرت کی وادیوں میں کچھ ایسے گم ہو جاتے ہیں کہ ابتدائی تشکیک یا سوال یا استفہام کی لذت یا کرب ہی میں محو ہو کر اکثر غور و تامل کی اگلی سرزمینوں تک یا علل و اسباب تک نہیں پہنچ پاتے۔ یہی حیرت جو لذت بخش بھی ہے ان کے لیے اکثر حائل استدلال ثابت ہوتی ہے۔"

یہاں بھی کوئی مثال پیش نہیں کی گئی کہ غور کیا جاتا، مگر اتنا ضرور عرض کروں گا کہ شاعر کو استدلال یا بحث و مباحثہ سے کیا سروکار، وہ اپنے تاثرات کو تخیل کا ڈوب دے کر شعر کی صورت میں پیش کر دیتا ہے۔ خود شعر ہی میں اخذ کردہ نتائج کا استنباطی پہلو بھی ہوتا ہے۔ لوگوں کا اس کے قول کو بے چون و چرا تسلیم کرنا ہی حقیقت سے ہمکنار ہونے کا ثبوت ہے ؎

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات — کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

اس میں اسباب و علل کی تشریح کہاں ہے۔ مگر کون ہے جو گل کی بے ثباتی کے اس طریقۂ اظہار پر عش عش کرنے کے بجائے منطقی استدلال کا مطالبہ کرے گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ جسے ڈاکٹر صاحب میرؔ کے کلام میں تشکیک یا سوال یا استفہام سے تاویل کرتے ہیں۔ وہ اکثر و بیشتر تجاہلِ عارف ہوتا ہے جو شعر کی بلاغت میں اضافہ کرتا ہے۔

مزید فیصلہ یہ صادر کیا گیا ہے کہ میر نظام قدرت اور مظاہر فطرت دونوں پر حیرت کی نظر ڈالتے ہیں .... اُن کی نظر میں گلزار عالم کا کوئی پھول ایسا نہیں جس میں اُن کی آنکھیں اٹک نہ جاتی ہوں ؎

اس باغ کے ہر گل سے چپک جاتی ہیں آنکھیں
حیرت سے پڑی آن کے صاحب نظروں کو

ڈاکٹر صاحب نے نہ معلوم کس دُھن میں اور بغیر سوچے ہوئے کہ موجودہ صورت میں شعر بامعنی بھی ہے، لفظ جھپک کو چپک، "مشکل ہے بنی" کو "حیرت سے پڑی" سے بدلا، شعر معمّا نہ بن جائے تو کیا ہو۔ شعر دراصل یوں ہے ؎

اس باغ کے ہر گل سے جھپک جاتی ہیں آنکھیں
مشکل ہے بنی آن کے صاحب نظروں کو

اب شعر کا حاصل یہ ہوا کہ تمام عالم ایک باغ ہے جس میں گلہائے رنگ رنگ کھلے ہوئے ہیں اور دعوت نظارہ دے رہے ہیں، ہر پھول میں اس کے صانع کی جھلک ہے، رعنائی ہے، دلکشی ہے جس کی وجہ سے آنکھیں جھپک جاتی ہیں، چوندھیا جاتی ہیں اور ذوق نظارہ تشنہ رہ جاتا ہے۔ اس اسلوب ادا سے آشنائے راز ہونے کی دشواریوں کا اندازہ ہوا، حیرت کا شائبہ بھی نہیں جس پر ڈاکٹر صاحب زور دیتے ہیں۔

اس ضمن میں دوسرا شعر یہ کہہ کر درج کیا ہے کہ یہ دنیا اُن کے نزدیک عجب تماشے کی جگہ ہے ؎

ہوتا ہے یاں جہاں میں ہر روز و شب تماشا — دیکھا جو خوب تو ہے دنیا عجب تماشا

غریب میرؔ لفظ تماشا اس کے فارسی معنی دیدن و ہنگامہ میں استعمال کرتا ہے ؎

در بزم وصال تو بہنگام تماشا — نظارہ ز جنبیدن مژگاں گلہ دارد

ڈاکٹر صاحب غالب کے اتباع میں بازیچۂ اطفال کے معنی لیتے ہیں جیسے مداری کا تماشا ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اور تھوپتے ہیں میر کے سر حالانکہ اُس کے یہاں "دیکھا جو خوب" کا ٹکڑا موجود ہے جس کا یہ مطلب ہوا کہ دن رات کے مناظر و مظاہر پر غور کرنے کے بعد یہ راز کھلا کہ ہر شے دعوتِ نظارہ اس لیے دے رہی ہے کہ میرے متعلق غور و فکر کرو اور میرے پس پردہ جو کچھ ہے۔ اس کے سمجھنے کی کوشش کرو۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے میر کے کلام میں یہ فی نکالی ہے کہ میر کے حواس باطنی میں کسی خاص چیز کی کمی تھی جس کے باعث وہ حقائق کو اچھی طرح سمجھ نہیں پاتے تھے کچھ ایسے جیسے شور و غوغا کے درمیان کوئی بات ہی سمجھ میں نہ آسکے کہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ ان کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی حسِ سماعت خاصی اُلجھی ہوئی تھی، وہ اکثر بیکار سی گونجیں سنتے رہتے ہیں اور پتہ نہیں چلتا کہ یہ آوازیں کیا ہیں اور کہاں سے آرہی ہیں۔ انھوں نے اس کیفیت کو خود بھی کئی اشعار میں بیان کیا ہے ؎

عالم سیاہ خانہ ہے کس کا کہ روز و شب
یہ شور ہے کہ دیتی نہیں کچھ سنائی بات

گستاخی معاف! جب سیاہ خانہ کے معنی ہی معلوم نہ ہوں تو شعر کے مطلب تک رسائی معلوم۔ اس کے مندرجۂ ذیل معنی ہیں:-

سیاہ خانہ۔ خیمۂ صحرا نشینان عرب۔

جامی ؎	سیہ خانۂ دیدہ تا گہ نہ دور	خوش آئندہ چوں خال بر روئے حور
سلیم ؎	بوادی کہ من از شوق گم کنم کعبہ	سیاہ خانہ نشینے ازاں بیابانست

سیاہ خانہ کنایہ از بندی خانہ خصوصاً ہر خانہ کہ روزن نداشتہ باشد۔

درویش والہ ہروی ؎	از لفظ کشیدہ بر کرانہ	بر رسم عرب سیاہ خانہ
صائب ؎	مباش زیر سیہ خانۂ فلک صائب	برائے خویشتن از دود دل سما بساز

(منقول از بہار عجم)

تو صاحب! سیاہ خانہ سے میر کی مراد یہ دنیا ہے جس میں چین و آسودگی کا نام نہیں، ہر طرف نفسی نفسی کا شور ہے، ہائے وائے ہے نالہ و فریاد ہے، ایک ہنگامہ برپا ہے اور زندانیِ حیات منشائے حیات سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

دوسرا شعر جو ڈاکٹر صاحب نے میر کی حواس باختگی کے ثبوت میں پیش کیا ہے یہ ہے ؎

شور میرے جنوں کا جس جا ہے
دخل عقل اُس مقام میں کیا ہے

ارے صاحب شور کے ایک معنی دھوم یا شہرت کے بھی ہیں۔ حکیم زلالی ؎

خداوندے کہ شورِ معرفت در کشور ما زد   صلائے فیض خاص و عام را بر خوان یغما زد

میرؔ کے شعر کا حاصل یہ ہوا کہ میرے جنوں (عشق) کی دھوم یا غلغلہ اُن رفعتوں پہ ہے جہاں عقل کا گزر نہیں، عقل حلقہ بیرون در ہے۔ میرؔ کی (مفروضہ) بے تکی ہانکوں یا شور و فغاں سے ڈاکٹر صاحب نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ میرؔ کا تجزیۂ عقلی عموماً الجھ جاتا ہے اور یہ قیاس کرنا پڑتا ہے کہ حقائق میں سے اُن کو جو کچھ ملا متوازن راستے سے کم، جنوں و مجذوبی سے زیادہ ملا، اگرچہ یہ مجذوبی وہ چیز ہے جسے خود میں نے جنون باشعور کے نام سے یاد کیا ہے .

خوش ہیں دیوانگیٔ میرؔ سے سب
کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ

تاہم یہی سڑی خبطی میرؔ نیچر کے مشاہدات پہ غور کرتا اور ایسے نظریے قائم کرتا ہے جو ڈاکٹر صاحب کو ان الفاظ میں خراج تحسین ادا کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں :۔

"ان میں سے بیشتر نیچرل شاعری کی تنقید کا جز معلوم ہوتے ہیں مثلاً یہ نظریہ کہ حسن فطرت حسن مطلق کا عکس یا اُس کا پردہ ہے یا یہ خیال کہ فطرت کے پردے میں کوئی حسین جلوہ گری کر رہا ہے۔ ان خیالات کو بار بار مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے۔"

جلوہ ہے اُسی کا سب گلشن میں زمانے کے ؎
گل پھول کو ہے ان نے پردہ سا بنا رکھا

گل و رنگ و بہار پردے ہیں ؎
ہر عیاں میں ہے وہ نہاں ٹک سوچ

گہ گل ہے گاہے رنگ گہے باغ کی ہے بو ؎
آتا نہیں نظر وہ طرحدار اک طرح

آخری شعر قطعہ بند ہے۔ اس کا دوسرا شعر یہ ہے ؎

نیرنگ حسن دوست سے کر آنکھیں آشنا
ممکن نہیں وگرنہ ہو دیدار اِک طرح

جسے ڈاکٹر صاحب نا قابل اعتنا سمجھے اور درج نہیں کیا ورنہ حقیقت واضح ہوتی کہ میرؔ کے خیالات میں ترتیب و توازن ہے، وہ فکر و نظر کی نعمت سے وافی بہرہ رکھتا ہے اور عالم ظاہر و باطن کے ربط و تسلسل، ایک تصویر کے دو رُخ ہونے پر زور دیتا ہے، کثرت کی وحدت میں جذب کرنے کا گُر بتاتا ہے۔

ایک جگہ ارشاد ہوا ہے کہ خدا کے سلسلے میں اہم مسئلہ توحید کا ہے۔ میرؔ بھی عام صوفیوں کی طرح وحدت الوجود اور توحید محض کے بے انتہا معتقد ہیں ؎

تصوف میں جب ڈال دیتے ہیں بات
خدا رس کہے ہیں یہ توحید ہے

میرؔ نے عام صوفیوں کا راستہ کبھی نہیں اختیار کیا۔ اسی شعر کو اگر ڈاکٹر صاحب صحت کے ساتھ پڑھتے تو ایسا نہ فرماتے۔ میرؔ نے جو لفظ استعمال کیا ہے وہ تصوف نہیں تصرف ہے (راء مشدد بجائے واو مشدد) بات کو تصرف میں ڈال دینا کچھ کا کچھ بنا دینا ہے۔ تصوف میں ڈال دینا مہمل فقرہ ہے۔ شعر کا حاصل یہ ہے کہ لوگ خدا رس بنتے ہیں، مگر معنیٔ توحید سے بیگانہ ہیں، حقیقت کچھ ہے اُسے کچھ اور بنا دیتے ہیں۔

خدا رس طنزاً بجائے گمراہ یا بیگانہ استعمال ہوا ہے ۔ اگر اب بھی شک ہو تو میر کا دوسرا شعر حاضر ہے ؎

کچھ خبر ہوتی تو نہ ہوتی خبر　　صوفیاں بے خبر گئے شاید

اور ملاحظہ ہو ؎

گفتگو شاہد مے سے ہے نہ غیبت نہ گلہ　　خانقہ کی سی نہیں بات خرابات کی بات

خود ڈاکٹر صاحب کا دوسرا پیش کردہ شعر میری تائید میں ہے ؎

مظاہر سب اُسی کے ہیں ظاہر ہے وہ
تکلف سے جو یاں چھپاتے ہیں لوگ

یعنی موجودات، عالم خدا کے وجود کے شاہد ہیں مگر لوگ اس کی نفی کرتے ہیں اور خدا کے مظاہر ہونے سے الگ اشیائے عالم کا وجود بالذات مانتے ہیں ۔

اس قول کی تائید میں کہ میر کے نزدیک عالم ایک آئینہ ہے جس میں ذات حقیقی پرتو فگن ہے، عالم ظل ہی ظل ہے ۔ یہ شعر پیش کیا ہے ؎

عالم آئینہ ہے جس کا وہ مصور بے مثل　　ہائے کیا صورتیں پردے میں بناتا ہے میاں

پھر دوسرا شعر یہ کہہ کر پیش کیا ہے کہ اسی قضیئے کو اُلٹ دیا ہے ؎

یہ دو ہی صورتیں ہیں یا منعکس ہے عالم
یا عالم آئینہ ہے اُس یار خود نما کا

یہ قضیئے کو منقلب کرنا نہیں بلکہ مادیین کا مسکت جواب ہے ۔ عالم مادی ہے خود مادہ منعکس ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا، لہٰذا دوسری صورت رہ گئی ۔ عالم اُس یار خود نما کا آئینہ ہے ۔

اسی سلسلے میں میر نے انسان کی عظمت کا بھی اظہار کر دیا ہے اور شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہو کہ برکلے (BERKLEY) کا پورا فلسفہ میر کے اس شعر میں سمٹ آیا ہے ؎

آدم خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ　　آئینہ تھا تو مگر قابل دیدار نہ تھا

مشہود کے لیے شاہد کی ضرورت ہے اور وہ شاہد یا مدرک انسان ہے جو ہر شے میں شاہد حقیقی کے جلوے دیکھتا ہے ۔ دیگر مخلوقات کی اس نکتے تک رسائی نہیں ۔ اور اسی سے ثابت ہوا کہ انسان بہترین مظہر خداوندی ہے ۔ دیکھا گیا دیکھنے والا ہو گیا ہے ۔ ESSE HAS BECOME PERCIPE

یہ شعر سلسلۂ وحدانیت میں ایک اہم کڑی کا حکم رکھتا ہے ۔ میں نے میر کی متصوفانہ شاعری پر ایک مضمون علیحدہ قلمبند کیا ہے ۔ لہٰذا اس موضوع پر چند الفاظ تحریر کرنے کے سوا مزید خامہ فرسائی نہ کروں گا ۔ مسئلہ وحدت وجود کا خلاصہ یہ ہے کہ موجودات امکانیہ خارجیہ عکس یا پرتو یا ظل ہیں ۔ اعیان ثابتہ کے، لہٰذا وحدت الوجود یا ہمہ اوست سے یہ مراد ہوئی کہ کسی شخص یا چیز کا وجود خارجی مطابق اُس شخص یا چیز کے ہے جو علم باری میں ہے اور علم باری ذات باری سے علیحدہ نہیں ہے نہ ذات باری اور اُس کے اسماء و صفات میں مغائرت یا جدائی ہے ۔ اب میر کا شعر سنیئے ؎

جیسے پرچھائیں دکھائی دے کے ہو جاتی ہے گم
میرؔ بھی اُس کام جاں کا یوں ہی تھا سایا — گیا

کسی شخص یا شے کی فنا یا بقا سے ذات باری میں معاذ اللہ کمی بیشی نہیں ہوتی۔ یہی اصل تصوف ہے اور یہی ڈیکارٹ (DESCARTES) اور اس کے اسکول کے دیگر فلاسفر اسپنوزا (SPINOZA) وغیرہ کی تعلیم کا خلاصہ ہے۔

زندگی کا شاید ہی کوئی رُخ ہو جس پر میرؔ نے غور و تامل نہ کیا ہو اور اپنی شاعری کی جولانگاہ نہ بنایا ہو۔ اُس نے بالکل سچ کہا ہے۔ ؎

لطف مجھ میں بھی ہیں ہزاروں میرؔ
دیدنی ہوں جو سوچ کر دیکھوں

چند مثالیں ملاحظہ ہوں:—

غالباً ۱۹۲۸ء میں برگساں (BERGSON) نوبل پرائز کا مستحق ٹھہرا تھا۔ سائنس کے مقابلے میں فلسفہ کی تحقیر کی جانے لگی تھی۔ اُس نے فلسفے کی اہمیت کو سائنس کے موجودہ دور ترقی میں یہ ثابت کر کے دوبارہ استوار کیا کہ

THERE IS A VITAL SERGE RUNNING THROUGH THE UNIVERSE . SCIENCE EXPLAINS THE OUTER RELATIONS OF THINGS BUT IS UNABLE TO ACCOUNT FOR THIS INHERENT VITALITY HERE PHILOSOPHY STEP IN.

ترجمہ: کائنات میں توانائی کی ایک لہر دوڑی ہوئی ہے، سائنس اشیا کے خارجی یا سطحی روابط کی شرح کرتا ہے مگر اس بسیط اندرونی قوت یا حیاتیت کا حل پیش نہیں کر سکتا۔ یہاں فلسفہ قدم رکھتا ہے۔

اب میرؔ کا شعر سنیے ؎

ہستی ہے اپنے طور پہ جوں بحر جوشش میں
گرداب کیسا، موج کہاں ہے، حباب کیا

”موج کہاں ہے“۔ اس ٹکڑے کی بلاغت اللہ اکبر! جب تک اُس موج پر جو آپ کے زیر مشاہدہ ہے۔ آپ غور کریں وہ بہتی ہوئی نہ معلوم کہاں پہنچ جاتی ہے۔ وہ نہیں رہتی جس پر آپ غور کر رہے تھے۔ وقت اب تک قابل پیمائش سمجھا جاتا تھا اور یہی نظریہ ارتقا کا سنگ بنیاد تھا۔ مگر اب بربنائے روانی و گریز پائی۔ اس کی پیمائش بہت کچھ مشتبہ ہو گئی ہے۔ اس بدلتے ہوئے تصور نے فلسفیوں میں ایک ہیجان برپا کر دیا ہے اور انھوں نے دلائل پیش کیے ہیں مگر وہ سب ایک طرف اور ”موج کہاں ہے“ کا بلیغ ٹکڑا ایک طرف۔ اور ہم اس میرؔ کو کیا سمجھے؟ جذباتی الجھاؤ میں جیتا۔ غور و تامل میں ناقص منطق سے دامن چھڑانے والا۔ خود گم۔ حقیقت تک رسائی کے ناقابل۔ جو اس باطنی ہیں اختلال۔ کان بجا کرتے تھے۔ تجزیہ عقلی الجھا ہوا تاہم ہنکارتا اور حقارت آمیز لہجے میں کہتا ہے ؎

سہل ہے میرؔ کا سمجھنا کیا
ہر سخن اُس کا اک مقام سے ہے

تو بات کیا ہے کہ حضرت نے کہیں سن لیا تھا کہ ہر پیمبر، ہر نبی مرسل کا ایک مقام ہوتا ہے۔ کسی کا ابتلا، کسی کا صبر و رضا، کسی کا مجاہدہ و مکاشفہ، کوئی آئینہ جمال، کوئی ہلاک جلال۔ کوئی کچھ کوئی کچھ۔ آپ اپنی شاعری میں ان سب کی مصوری کرتے ہیں گویا بڑے پہنچے ہوئے ہیں۔ منطق کی الف بے سے واقف نہیں اور دعوے ایسے بلند آہنگ ـــ

سارے عالم پہ ہوں میں چھایا ہوا   مستند ہے میرا فرمایا ہوا

مگر صاحب اس مجذوب کی بڑ کبھی کبھی صحیح ثابت ہوتی ہے۔ علم الارض (GEOLOGY) ایک جدید علم ہے جس سے انکشاف ہوتا ہے کہ یہ کرۂ ارض لاکھوں برس پہلے وجود میں آچکا تھا۔ عام طور پر اس کی مدت، حیات چند ہزار سال سے زیادہ نہیں سمجھی جاتی تھی۔ میر ڈیڑھ سو برس اُدھر کہہ گیا ـــ

ہم جانتے تھے تازہ بنا ہے جہاں کو لیک   یہ منزل خراب ہوئی ہے کبھو کی طرح

"سراپا آرزو نے بندہ کر دیا ورنہ ہم خدا ہوتے" "نظم کو نثر کا جامہ پہنانے کی مصلحت سمجھ میں نہیں آئی۔ پورا شعر یوں ہے:۔

ـــ سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو
وگرنہ ہم خدا تھے گر دل بے مدعا ہوتے

پھر اعتراض کیا ہے کہ یہ میرؔ کی بھول ہے۔" در اصل وہ ساری کبریائی جس کا بار بار ذکر کر کے اپنی نوع کو فرشتوں پر افضلیت دیتے ہیں وہ اسی آرزو کی رہین منت ہے ورنہ انسان فرشتہ تو کیا حیوان (بہائم ؟) سے بدتر ہوتا۔ حضرت آدم نے روز ازل کے معرکے میں جس حوصلہ مندی کا ثبوت دیا تھا وہ عقل کے بل پر نہ تھی۔ دل کی قوت سے تھی...... دنیا میں صرف اپنی کوشش سے ترقی کرنے کا عہد جو آدم نے اپنی اولاد کی طرف سے اپنے خالق سے کیا تھا۔ ہماری شاعری اُس کو بار امانت سے تعبیر کرتی ہے۔" (خط میرا کھینچا ہوا ہے۔ اثرؔ)

پہلی بات تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب لفظ دل پر زور دیتے ہیں۔ مگر میرؔ کا شعر نقل کرنے میں اسی لفظ دل کو خارج کر دیتے ہیں۔

مجھے علم نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کا قول متعلق حضرت آدم کن واقعات، روایات یا دلائل پر مبنی ہے۔ اردو نیز فارسی شاعری میں تو بار امانت سے بلا اختلاف "عشق" مراد ہے۔ حافظ شیراز۔

آسماں بار امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

میرؔ ـــ سب پہ جس بار نے گرانی کی   اس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا
میرؔ ـــ جن و ملک زمین و فلک سب نکل گئے   بار گران عشق و دل ناتواں ہے اب

اور عشق کیا ہے؟ (میر کے سینکڑوں اشعار میں سے صرف ایک) ـــ

آرزوئیں ہزار رکھتے ہیں   تس پہ ہم جی کو مار رکھتے ہیں

روز میثاق یا روز ازل کے واقعہ کی تفصیل میرے ذہن میں یہ ہے کہ روحوں سے جو اُس وقت جسم و جسمانیت سے مبرا تھیں پوچھا گیا "الست بربکم"۔ سب نے متفقہ طور پر ہم نوا ہو کر جواب دیا "قالو بلیٰ"۔ حکم ہوا۔ "اہبطو" (زمین پر اترو اور اپنے اقرار عبودیت کا ثبوت دو)۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے انسان میں متضاد قوتیں ودیعت کی گئیں مگر اُس کے ساتھ تمیز نیک و بد اور ترک و اختیار کی آزادی بھی عطا

ہوئی۔ نیکی کے مقابل بدی ہے۔ صدق و صفا کی راہ کھوٹی کرنے والے کذب و ریا ہیں۔ رضا جوئی کے مخالف تمرد و سرکشی۔ سرخوشی و سرشاری و یکسوئی کے دشمن غم و غصہ و حرص و ہوا۔ محبت کی عناں گیر نفرت یا عداوت۔ مولوی روم کے الفاظ میں ؎

جانہائے خلق پیش از دست و پا
می پریدند از وفا سوئے صفا
ہچوں بامر اہبطوا بندی شدند
حبس خشم و حرص و خورسندی شدند

اور بقول میر ؎

صد گلستاں تہ یک بال تھے اُنکے جب تک
طائر جاں قفس تن میں گرفتار نہ تھا

نوٹ: - میر کے اس شعر نے مجھ سے ایک مسلسل غزل کہلوائی جو موجودہ موضوع سے غیر متعلق بھی نہیں ہے لہذا درج کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

یادِ ایام کہ جب غم سے سروکار نہ تھا
پھول ہی پھول تھے دامن میں کوئی خار نہ تھا
عشق بیگانہ تھا اندوہ تمنا سے ابھی
واقف درد نہ تھا خوگر آزار نہ تھا
دامن اشک نہ اُلجھا تھا سر مژگاں سے
شعلۂ آہ نہ تھا دیدۂ خونبار نہ تھا
عشق اک نقش تحیر تھا بآغوش جمال
جذبۂ شوق رہین لب اظہار نہ تھا
جلوۂ حسن خود آرا تھا فقط میرے لیے
جنس خوبی کا سوا میرے خریدار نہ تھا
آئینہ خانۂ دل تھا پئے آرائش حسن
عشق خود دار کو اندیشۂ اغیار نہ تھا
صورت راز تھا گنجینۂ دل میں پنہاں
ابھی رسوائے سر کوچہ و بازار نہ تھا
پردہ در ہوش نہ تھے عقل خبردار نہ تھی
لاکھ اسرار تھے دل واقف اسرار نہ تھا
نغمۂ شوق سے لبریز تھا ہر تار نفس
زخمۂ غم کی جراحت سے خبردار نہ تھا
کارفرمائی جلوہ تھی فقط میرے لیے
کون سا لطف تھا میں جس کا سزاوار نہ تھا
تھا وہ عالم جسے یوں میر بیان کرتا ہے
"طائر جاں قفس تن میں گرفتار نہ تھا"
یک بیک حسن خود آرا کو ہوا شوق نمود
دست وحشت سے یہاں جیب میں اک تار نہ تھا
ٹھوکریں کھائیں زمانے کی مصیبت جھیلی
خوار و ناچار نہ تھا زار کہ بیمار نہ تھا
دفعتہً دیدۂ دل وا ہوئے چمکا اک نور
وہ سماں دیکھا کہ جس کے لیے تیار نہ تھا
بجلیاں ٹوٹ پڑیں غش پہ غش آیا پیہم
ہوش آتے ہی وہ عالم سے سروکار نہ تھا
آخر کار ہوا رہبر دل ذوق فنا
بند آنکھیں تھیں مگر خواب گرانبار نہ تھا
روح پرور یہ صدا آتی تھی کانوں میں اثر
"ڈھونڈنے والے کو ملنا مرا دشوار نہ تھا"

ڈاکٹر صاحب نے کہیں توضیح نہیں کی کہ انھوں نے ترقی کا کیا مفہوم متعین کیا ہے اور ترقی کرنے کے عہد سے کیا مراد لی ہے "الست بربکم" کے پیش نظر منشائے حیات انسانی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے مساعی کو خدا کی رضاجوئی کا تابع کر دے۔ وہی کام کرے اور مآل سے بیگانہ ہو کر جس میں خدا کی خوشنودی ہو۔ جو کچھ ہو عنداللہ ہو۔ فلسفۂ اخلاق بھی قریب قریب یہی کہتا ہے:-

THE WAY TO ACQUIRE HAPPINESS IS NOT TO SEEK IT.

ترجمہ: آسودگی حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آسودگی کے حصول کی سعی نہ کی جائے۔ دوسرے الفاظ میں فکر آسودگی دشمن آسودگی ہے۔ میر کا "دل بے مدعا" سے یہی مقصد ہے۔ آرزوؤں میں نفس کا شمول نہ ہونا نہ کہ دل کا آرزوؤں سے یکسر خالی ہونا۔

خدا نے یہ سب کچھ کیوں کیا، وجہ تخلیق عالم کیا ہے، خدا کی کنہ ذات کیا ہے۔ یہ عقدہ آج تک حل ہوا ہے نہ آئندہ حل ہونے کی توقع ہے۔ بڑے بڑے فلسفیوں اور مفکروں کو اعتراف ہے کہ

MAN IS FINITE; GOD IS INFINITE; HOW CAN THE FINITE COMPREHEND THE INFINITE?

ترجمہ: آدمی محدود ہے، خدا لامحدود۔ محدود لامحدود کا احاطہ کیونکر کر سکتا ہے۔

رہا دل کی قوت کا سوال جس پر ڈاکٹر صاحب نے بہت زور دیا ہے۔ کیا اپنی آرزوؤں کو خدا کی مرضی کا تابع کرنا تاہم سرگرم عمل رہنا یہ کہہ کر کہ "السعی منی والاتمام من اللہ" دل کی قوت کا مظاہرہ نہیں۔ کیا دل کی اس قدرت وصلاحیت کی تاویل "دل بے مدعا" سے بہتر الفاظ میں ہو سکتی ہے۔ بندے اور خدا کے مابین یہی تو فرق ہے کہ ایک سراپا آرزو ہے اور دوسرا بے نیاز اور آرزو کا ہونا دلیل محتاجی و ناتمامی ہے۔

میر نے ایک دوسرے شعر میں بھی دل بے مدعا کی ترکیب استعمال کی ہے ؎

برنگ بوئے غنچہ نمط اک ہی رنگ میں گزرے
میسر میر صاحب گر دل بے مدعا ہووے

ایسا دل جو زمانے کی ہوا سے محفوظ ہو اور "باد فروش چمن" نہ ہو۔ غالب نے بھی دل بے مدعا کی آرزو کی ہے۔ نہ معلوم ڈاکٹر صاحب اس کے متعلق کیا فرمائیں گے، بھول یا چترائی ؎

گر تجھ کو ہے یقین اجابت دعا نہ مانگ　　یعنی بغیر یک دل بے مدعا نہ مانگ

میں نے ایک اُپج تو کیا سفیہانہ جسارت کی ہے۔ یعنی مولانا روم کی ضخیم مثنوی کا چند اشعار میں تلخیص! یہ بکواس بھی سن لیجئے، ممکن ہے کہ تصوف کے صحیح بنیادی اصول کی ایک جھلک موجود ہو۔

مسلک عرفاں

تجھ سے روشن دل کا خلوت خانہ ہے　　تو حقیقت ماسوا افسانہ ہے
وقت خود ہے تیرے ہونے کی دلیل　　جس طرح منزل کا رہبر سنگ میل
بحر ہستی میں تجھی سے جوش ہے　　قطرہ قطرہ محشر خاموش ہے

اس کی پہنائی کا پایاں ہی نہیں   کوئی پہنچے تہ تک امکاں ہی نہیں
ہاں مگر دانندہ ہیں اسرار کے   توڑنے والے بتِ پندار کے
عقل کو جس نے بنایا رہنما   کھو گیا ایسا نہ پھر پایا گیا
جو بھی اپنے نفس کا بندہ ہوا   آنکھوں والا ہوتے بھی اندھا ہوا
اک کسک تھی دل میں لب پر آہ آہ   قابلِ عبرت ہوا حالِ تباہ
یہ حقیقت ہے جہاں کی یہ جہاں   پردہ اور پردے پہ کچھ پرچھائیاں عہ
جزو و کل کا رابطہ کیا ہو آشکار   جب ہو نخوت جہل کی آئینہ دار
کوئی کیا حقانیت سے ہو دوچار   روح پر چھایا ہے غفلت کا غبار
آرزوئیں ڈیرے ہیں ڈالے ہوئے   آستینیں سانپ ہیں پالے ہوئے
نفس پر قابو جب انساں پائیگا   خواہشوں کا سر بھی کچلا جائے گا
عشق جس دن بر سرِ کار آئے گا   رنگِ دنیا کچھ سے کچھ ہو جائے گا
عشق کا شعلہ فروزاں جب ہوا   خواہشوں کے منہ کو ٹوکا دے دیا
اب نشاطِ بیکراں تھی زندگی   آپ اپنی رازداں تھی زندگی
نفسِ امارہ کی چھینکاریں نہ تھیں   سینے میں پیوست تلواریں نہ تھیں
گرم تھی اک محفلِ راز و نیاز   آنکھ بھی روشن جگر بھی پُر گداز
علم و عرفاں کی وہ دولت مل گئی   عقل نے جس کا نہ دیکھا خواب بھی
عاشقانِ حق کے دل میں آ گئے   جتنے بھی اسرار تھے کونین کے
مدعائے آفرینش کھُل گیا   اتحادِ جزو و کل آئینہ تھا
عشق تھا نغمہ طرازِ زندگی   ہر طرف بجتا تھا سازِ زندگی
زندگی جب حق سے وابستہ ہوئی   بزمِ یکتائی کا گلدستہ ہوئی
آدمی جتنا سنبھلتا جائے گا   زیست کا چشمہ اُبلتا جائے گا
وقت کا دھارا ہے اُسکے واسطے   موجزن دریا ہے اس کے واسطے
مہر و مہ مینا بدوش اُس کے لیے   کہکشاں انجم فروش اس کے لیے
نقشِ ہر فردا و دوش اس کے لیے
وقفِ نغماتِ سروش اس کے لیے
کیوں بدی سے رابطہ ہو آگاہ کو   نیکیاں محبوب ہیں اللہ کو

عہ میری ایک غزل کے شعر کا مصرع ہے۔ پورا شعر یہ ہے:
زندگی اور زندگی کی یادگار   پردہ اور پردے پہ کچھ پرچھائیاں

بے بدی نیکی کی ہے ایسی نمود　　　بے اندھیرے کے اُجالے کی نمود
عشق کہتا ہے مرے ہم راز ہو　　　تاکہ خود اشیا کی ضد غماز ہو
میں نے جو دیکھا ہے دیکھو تو کبھی　　　ہم بغل مجھ سے تو بڑھ کر ہو کبھی

میں جہاں ہوں کچھ نہیں میرے سوا
ابتدا بھی میں ہوں میں ہی انتہا

ہیں مدارج مختلف عرفان کے　　　منتہی کو دیتے ہیں پہچان کے
انبیا و اولیا ہیں پیش پیش　　　روح جتنی صاف اتنا نور بیش
ان کے ہی جادے پہ چلنا چاہیے　　　رخ نہ بھولے سے بدلنا چاہیے
اس میں ہو در پیش منزل یا مقام　　　پیروی لازم ہے اُن کی لاکلام
رہبری کو عشق حق آگاہ ہو　　　منزل سالک فقط اللہ ہو
عشق جس کا جادہ ہے تھکتا نہیں　　　وہ بھٹکتا یا بہک سکتا نہیں
کھینچتا ہے ذوق وجدانی اُسے　　　کیا کرے گی عقل زندانی اُسے
حسن لافانی کا دیوانہ ہوا　　　اس کی تابانی کا پروانہ ہوا
ایک چشمک ایک اشارا ہے بہت　　　شوق کو اتنا سہارا ہے بہت
حسن کی تابندگی بڑھتی گئی　　　عشق کی شوریدگی بڑھتی گئی
ماسوا سے جب فراغت ہو گئی　　　ہر مصیبت عین راحت ہو گئی
اب خودی خود آشنا ہونے لگی　　　تابع حکم قضا ہونے لگی
آئینہ تھا آئینے کے روبرو　　　آرزو تھی بے نیاز آرزو
رحمت حق نور برسانے لگی　　　خامشی پر بیخودی چھانے لگی
ہر نفس اک مژدہ اک پیغام تھا　　　مدعا بے کاہش انجام تھا
فرق حسن و عشق میں اصلا نہ تھا　　　طالب و مطلوب میں پردا نہ تھا

قطرہ جب دریا سے واصل ہو گیا
رنج دوری وہم باطل ہو گیا

کیا یہ سب "دل مدعا" کی شرح نہیں ہے جس کو ڈاکٹر صاحب میرؔ کی بھول کہتے ہیں۔ میں اُس کا یہ شعر پڑھتا ہوا رخصت ہوتا ہوں ؎

عالم کی سیر میرؔ کی صحبت میں ہو گئی!
طالع سے اپنے ہاتھ یہ بیدست و پا لگا

مسلمانوں کے ادب میں مزاح کے تنوعات

ڈاکٹر سید عبداللہ

السنۂ شرقیہ میں فکاہی ادب کا سرمایہ اچھا خاصا ہے مگر مذاق کی تبدیلی کو کیا کہیئے کہ اس فکاہی ادب کی قدر و قیمت کی صحیح تشخیص نہیں کی جاتی اور بعض اوقات تو سرے سے اس کے وجود ہی سے انکار کر دیا جاتا ہے۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ملک ایسا ہوگا جس کے لوگ ہنسی یا تبسم سے ناآشنا ہوں گے۔ اس دولت سے ہر فرد بشر اور ہر انسانی اجتماع کم یا بیش لازماً بہرہ مند ہوتا ہے پھر یہ کیوں باور کر لیا جائے کہ عرب یا ترک یا تورانی یا ہندی یا ایرانی اس سے بطور خاص محروم رہے ہوں گے۔ مگر جدید دور میں پچھلے ادبوں یا معاشرتوں کا ذکر کرتے وقت عموماً یہ غلطی سرزد ہو جاتی ہے کہ لوگ ان ادبوں کو نئے پیمانوں سے ناپنے لگ جاتے ہیں اور خالص مغربی سانچے استعمال کر کے عجیب عجیب نتیجے نکالتے ہیں۔ کچھ یہ بھی ہے کہ پرانے ادبوں کے مطالعہ پر فرصت کا پورا وقت صرف نہیں جاتا۔ حالانکہ یہ ماننا ہی پڑے گا کہ یہ ادب بہت وسیع ہیں اور ان کے پس منظر میں جو تہذیب و تاریخ ہے وہ بھی کثیر الاطراف اور متنوع ہے اور اس کا صحیح مطالعہ تبھی ممکن ہے کہ اس پر عمر کا معقول حصہ صرف کیا جائے اور پھر غور و فکر اور دل جمعی سے اس کے درخشاں اور تاریک پہلوؤں پر رائے زنی کی جائے۔ اس سلسلے میں ایک بات تو واضح ہے کہ مغربی ادبوں کا اور مغربی تمدن و معاشرت کا مزاج مشرقی ادبوں کے مزاج سے اگر متضاد نہیں تو مختلف ضرور ہے۔ اس کے علاوہ واقعات تاریخ نے مختلف ادوار میں ان ملکوں کی اجتماعی تہذیب کو جس جس طرح متاثر کیا وہ نوعیت اور اثر کے لحاظ سے مشرق کے تجربوں سے ہمیشہ نہیں تو بسا اوقات ضرور مختلف رہی ہے۔ اس لئے صرف مغرب کے اجتماعی تجربات کی روشنی میں مشرقی احوال کی سراغ رسانی شاید صحیح طریق کار نہیں ہوگا۔ مغرب کی ادبی اصناف ایک خاص اجتماعی ماحول اور ایک خاص پس منظر رکھتی ہیں لہٰذا یہ اعتراض کہ مشرق کی عام ادبی اصناف مغرب کی طرح کیوں نہیں خاصا غیر منصفانہ اعتراض ہے۔ پس ان معاملات میں صحیح طریق کار یہ نہیں کہ مشرقی ادبیات کو محض مغرب کے پیمانے سے ناپا جائے یا اس معیار پر پورا نہ اترنے کے باعث ان کو مذموم یا کمتر خیال کر لیا جائے بلکہ صحیح یہ ہوگا کہ ان کو اپنے ماحول میں دیکھ کر ان کے خصائص امتیازی کا پتہ چلایا جائے اور پھر فیصلہ کیا جائے کہ ان کی حقیقی قدر و قیمت کیا ہے؟ اس موقع پر ایک سوال نہایت اہم ہے۔ کیا کوئی ایسی شے بھی ہے جس کو اسلامی ظرافت یا اسلامی روح ظرافت سے تعبیر کیا جا سکے؟ اسلامی ظرافت یہ ترکیب ہی خاصی غرابت انگیز ہے مگر اس سوال کو اگر یوں بدل دیا جائے کہ ظرافت کے متعلق اسلام کا رویہ کیا ہے تو موضوع بہت نتیجہ خیز بن جاتا ہے۔ اس ضمن میں اولین سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم نے ظرافت کو کس نظر سے دیکھا ہے اور اس کی کیا حد

مقرر کی ہے؟ یہ سوالات بڑے برمحل اور موزوں ہیں۔ محض اسلامی ظرافت کا عنوان قدرے تشویش انگیز ہوگا کیونکہ مسلمان اقوام کے ادیبوں میں ظرافت کا جو رنگ پایا جاتا ہے ضروری نہیں کہ وہ اسلام کے ابھارے ہوئے اخلاق اجتماعی کے بھی مطابق ہو، یا ہر جگہ یکساں و یک رنگ ہو۔ تاہم اگر اسلامی ظرافت کی اصطلاح استعمال کر بھی لی جائے تو اس کی داستان بھی کم و بیش اسلامی تہذیب کی سرگزشت کی طرح ہے۔ جس طرح اسلامی تہذیب سے مراد مسلمان اقوام کی تہذیب ہے اسی طرح اسلامی ظرافت سے مراد مسلمان اقوام کی ظرافت ہے۔ لہٰذا اسلامی ظرافت کی کہانی دراصل عربوں کی ظرافت، ایرانیوں کی ظرافت، ترکوں کی ظرافت، غرض اس طرح کی جملہ اقوام کی ظرافت کی کہانی ہوگی جو اسلام کے حلقے میں داخل ہوئیں۔ البتہ یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ ان مقامی رنگوں پر زندگی کے اس نظریہ کا بھی کچھ نہ کچھ اثر ضرور پڑا ہوگا جو اسلام نے ان اقوام کو دیا یا فکر و ذوق کے ان مسلکوں اور مشربوں نے جو روح اسلامی کے اندر سے پیدا ہوئے۔

اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی ایسی یک جز روح ظرافت کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی جس کو خالصتاً اسلامی ظرافت کے نام سے یاد کیا جا سکے البتہ مخصوص قبائلی اور علاقائی رنگ ہائے ظرافت کے اندر ایک ہلکی سی لکیر ایسی ضرور نظر آتی ہے جس کو اسلامی ذوق ظرافت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور اس کی جزئیات کا سراغ بھی لگایا جا سکتا ہے مگر عموماً یہ لکیر نہایت باریک ہے جو بعض اوقات مدھم ہو کر گویا مٹ بھی گئی ہے۔ دراصل اسلامی تہذیب کی سب سے بڑی مشکل یہی رہی ہے کہ اس کو قدم قدم پر نئی قبائلی اور علاقائی عصبیتوں سے واسطہ پڑتا رہا جن کو جذب کرتے ہیں روح اسلامی کو بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لحاظ سے یہ سارا مضمون علاقائی یا قبائلی رنگ ہائے ظرافت پر مرکوز ہو جاتا ہے مگر ان علاقائی رنگوں کی تفصیل سے پہلے آیئے یہ بھی دیکھتے چلیں کہ ظرافت کے متعلق خود اسلام کا رویہ کیا ہے؟ اس میں کچھ شک نہیں کہ اسلام کی نظر میں زندگی ایک فریضہ اور جہاد ہے اور اس کے نتیجے کے طور پر مسلمانوں کی زندگی کو مسلسل سعی اور پیہم جد و جہد ہونا چاہیئے مگر اس کے باوجود اسلام نے انسان کی ذوقی ضرورتوں سے کہیں انکار نہیں کیا بلکہ ان ذوقی ضرورتوں کو زندگی کے ضروری پروگرام میں شامل کیا ہے۔ قرآن مجید میں بار بار انعام اور دنیوی نعمتوں کا ذکر آیا ہے اور بہشت کے متعلق جو ذوق تصور دیا گیا ہے وہ جہاد زندگی کو خوش گوار معجون بنا رہا ہے۔ عورت اور مرد کی ضرورتیں جنسی اور حیاتیاتی نوعیت کی بھی ہیں اور ذوقی نوعیت کی بھی — اسی طرح کھانے، پینے، لباس اور دیگر معاملات میں ذوق کی رعایتوں کو بڑی حد تک ابھارا گیا۔ خوشبو، رنگ، زیور، اچھا لباس، عورت کے لئے ضروری ہے۔ ان سب امور میں ذوق کی پاسداری موجود ہے اور یہ سب کچھ اس نظریہ جہاد کے باوجود ہے جو ہر مسلمان کی زندگی کا لازمی جزو ہے۔ اسلامی زندگی میں جہاں خوفِ خدا اور خوفِ عقبیٰ موجود ہے وہاں حزن، خوف اور غم و الم کی ممانعت بھی ہے۔ بلکہ مومنوں کی شان یہ بیان کی گئی ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْن — اس سے اس طرز حیات کی نفی ہوتی ہے جس میں ہر وقت غم زدہ رہنا ضروری سمجھ لیا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام نے لغو گفتگو اور واہی تباہی بکنے کو معیوب قرار دیا ہے اور "قول سدید" کی تاکید کی ہے مگر یہ "قول سدید" خشک اور عبوس ہونے کا نام نہیں — مسلمانوں کے نظریۂ حیات میں خشکی اور عبوست شاید بیرونی اثرات کی آمیزش ہے!

آنحضرتؐ کے سوانح نگاروں نے (احادیث کی سند سے) لکھا ہے کہ آنحضرتؐ مطائبہ کو پسند فرماتے تھے۔

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یمزحُ ولا یقول اِلّا حقاً۔ ترجمہ:۔ آنحضرتؐ مزاح کیا کرتے تھے مگر

مزاح کی بات سچائی پر مبنی ہوا کرتی تھی۔

ظاہر ہے کہ اسوۂ رسول کا یہ رنگ صحابہؓ کے یہاں بھی مقبول ہوا ہوگا۔ زندگی میں عمل کے شدید تقاضوں کے باوجود طبیعت کی یہ لچک جو ناگزیر بھی ہے ابتدائی زمانے کے مسلمانوں نے روا رکھی ہوگی — اور تفریح اور زندہ دلی کی حوصلہ شکنی کا رواج مسلمانوں میں اگر پیدا بھی ہوا ہوگا تو بہت بعد میں ہوا ہوگا جب زہد و ورع کے راہبانہ تصورات اسلامی تعلیم کے ساتھ گھل مل گئے ہوں گے۔ پھر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ زاہدانہ روش صرف ایک مختصر طبقے تک ہی محدود رہی۔ اور زندہ دلی کا رویہ بعض مخالفتوں کے باوجود ایک عام اجتماعی رویہ بنا رہا۔ جیسا کہ ان کتابوں سے معلوم ہوتا ہے جو قدرے بعد کے زمانے میں مرتب ہوئیں مگر جن میں اسی ابتدائی زمانے کے مزاح و مطائبہ کے نمونے اور واقعات منقول ہیں۔

مزاحیات پر اس قسم کا مواد ایک تو ابن الندیم کی کتاب الفہرست میں ہے اور کچھ اخبار سیبویہ المصری (لابن زولاق متوفی ۳۸۶ھ) میں ہے۔ الفہرست سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابن الندیم کے زمانے تک ظرافت کے موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی تھیں۔ ان میں صرفیوں اور نحویوں کے نوادر بھی شامل ہیں۔ چنانچہ تقریباً ہر بڑے نحوی نے نوادر کے نام سے حکایتیں اور کہانیاں لکھی ہیں۔ الفہرست میں بطّال (BUFFOONS) کے متعلق کتابوں کی بھی ایک لمبی فہرست ہے[۵]۔ ان کے علاوہ، حمقا کی کہانیاں، مغفلوں کی کہانیاں، بخیلوں کی کہانیاں (کتاب البخلا جاحظ) وغیرہ بھی ہیں۔ (ابن الجوزی کی کتاب الحمقا والمغفلین)۔

ابن بابا نے ظریفوں کی کتابوں کی جو فہرست دی ہے اس سے ظرافت کے پرانے مواد پر اور بھی روشنی پڑتی ہے۔ التعلقنزی جو بہت بعد کا مصنف ہے وہ بھی ظریفوں کے متعلق ہمیں معلومات بہم پہنچاتا ہے جن سے اسلام کے ابتدائی ادوار میں ظرافت کے رواج یا نوعیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

عربوں کے ظریفانہ مذاق کی یہ خاص صفت معلوم ہوتی ہے کہ اس کا رنگ مہمانداری کے احوال و متعلقات میں زیادہ کھلتا ہے۔ اسی سبب سے طماعوں، بخیلوں اور کنجوسوں کو کچھ زیادہ ہی موضوعِ تفریح اور نشانۂ تضحیک بنایا گیا ہے۔ اسی طرح تطفل اور بدحواسی کے لطیفے بھی بڑی اکثریت رکھتے ہیں۔ دراصل عربوں کی مہمان نوازانہ خصلت، اذیت دہی سے زیادہ معصوم مسرت بخشی پر زیادہ زور دیتی ہے اور قدرے شفقت و محبت کے پہلو لئے ہوئے ہے۔ البتہ رقابت، قبائلی عصبیت اور باہمی مقابلے کی سپرٹ جن صورتوں میں پیدا ہو جاتی ہے وہاں مخالفت کا جذبہ مشتعل ہو جاتا ہے۔ ان صورتوں میں عربی ظرافت طعن و تعریض سے مطمئن نہیں ہوتی بلکہ شدید دشنام طرازی اور فحش گوئی میں بھی بدل جاتی ہے۔ چنانچہ جریر اور فرزدق کے نقائض اور اس قسم کی دوسری ہجویات کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے! فحش گوئی کی بدمذاقی درباروں کے لاابالی امیروں اور شاہزادوں کی وجہ سے بھی بہت بڑھی اور الفیہ شلفیہ قسم کی کتابوں کی تخلیق کا باعث ہوئی۔

یہ تو تھی اس ظرافت کی کیفیت جس میں عربوں کا خاص رنگ جھلکتا ہے۔ اب آیئے بڑی قوم یعنی ایرانیوں کے مخصوص

---

[۵] ان مصنفوں میں الحوشب الاسدی، عروہ بن عبداللہ الغاضری، المخزومی، ابو عمر الاعرج، ضمضام المدینی کے نام دیئے گئے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ROSENTHAL کی کتاب عربوں کی ظرافت

رنگِ ظرافت کا کچھ جائزہ لیا جائے۔ ایرانی ظرافت کی تشخیص اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس کا اردو ادب پر خاص اثر پڑا۔ ہندوستان کا فارسی ادب اور اردو ادب یکساں طور پر ان خصائص سے جو ایرانیوں کے ذریعے یہاں پہنچے متاثر ہوا مگر یہ یاد رہے کہ ہم یہاں جن لوگوں کو ذہنی سہولت کے لئے ایرانی کہہ رہے ہیں ان کو دراصل "تمام فارسی لکھنے والے" کہنا چاہیئے یا پھر آغاز ہی سے ان کو دو حصوں میں تقسیم کر لینا چاہیئے ایک وہ جو ایرانی تھے۔ دوسرے وہ جو تورانی تھے، ہندوستان پر پہلے تورانیوں کا اثر ہوا اس کے بعد ایرانیوں کا۔ فارسی ادب کی ابتدا ہندوستان میں غزنویوں سے ہوئی اور غزنوی خاندان ترکی النسل تھا۔ دہلی کے پہلے حکمران خاندان بھی ترکی تھے۔ پھر افغان، پھر مغل، اور اسکا آخری خاندان کے زمانے میں صحیح معنوں میں ایرانیوں کا اثر بڑھا اگرچہ خود یہ لوگ ہرات و خراسان و ترکستان سے متعلق تھے۔ بہر صورت یہ دو الگ الگ رنگ ہندی فارسی ادب و ثقافت کی ہر شاخ میں کبھی مل جل کر کبھی الگ الگ نمودار ہو رہے ہیں۔ مگر ہمیں یہاں اس معاملے میں کچھ زیادہ تفصیل مطلوب نہیں۔

میں ترکی ادب سے زیادہ واقفیت نہیں رکھتا مگر ملا نصیر الدین وغیرہ کی کہانیوں اور لطیفوں سے آشنا ہوں۔ اس کے علاوہ گِب کی ترکی شاعری کی تاریخ کی وساطت سے جو کچھ معلوم ہوا اس کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ترکی کے متمدن ادوار میں بھی سپاہیانہ اور کوہستانی انداز ظرافت ہی غالب نظر آتا ہے۔ بجملہ ترک اور تورانی قوموں میں واشگاف اور جارحانہ قسم کی مزاحیہ لہر موجود رہی ہے جس میں محض خود کو خوش رکھنے کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے — خواہ اس میں "فنانہ ظرافت" کی تضحیک و تحقیر کے شدید رنگ کیوں موجود نہ ہوں۔ ایما اور کنایہ کی بلاغتوں سے ترکی ذہن شاید محفوظ نہیں ہوتا۔ ترکوں کے یہاں البتہ معمّا، لغز اور چیستان کی دقیق اور پیچیدہ شکلیں زیادہ مقبول نظر آتی ہیں۔ ترکی ذہن دقت اور پیچیدگی کو حل کرنے میں بڑا لطف لیتا ہے اور ذہنی خارا شگافی اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ یہی ذہنی اثرات اس فارسی ادب میں بھی ہیں جو ترکوں اور تورانیوں کے زیر اثر وجود میں آیا۔ اس میں معمّا کی کتابوں کی بھرمار ہے — اور اس میں بڑے بڑے مصنفوں نے دلچسپی لی ہے۔

مسلم ہے کہ فارسی ادب کے ابتدائی ادوار عربی کے اسالیب سے متاثر ہوئے۔ اور بعد میں اپنے مختلف رخ اختیار کرتے گئے۔ فارسی میں ہزل، پھکڑپن، تمسخر، ہجو، معمّا، حکایت، وہ مطائبہ، بذلہ سنجی، طنز و تعریض اور تحریف ادبی نکتہ آفرینی وغیرہ سبھی قسمیں پائی جاتی ہیں مگر تاریخ کا ہر دور اپنے اپنے امتیاز رکھتا ہے۔ سلجوقوں کے زمانے میں ہجو گوئی نے نہایت عریاں شکل اختیار کی۔ اس زمانے میں غالباً ترک فوجیوں کے زیر اثر ظرافت میں بدویانہ سادگی یا بغداد کے متمدن جنس آلود رنگ کی بجائے عسکریت کی بے تکلفی اور کرختگی محسوس ہوتی ہے۔ ہجو یہ فحش گوئی اور جنسیات کے متعلق صاف گوئی ایک خاص چیز معلوم ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ شہر آشوب کی صنف جو کچھ عجب نہیں کہ ہندوستان میں مسعود سعد سلمان وغیرہ کے ذریعے پہلے فارسی میں اور پھر ترکی میں اور بعد میں اردو میں پہنچی۔ اپنے ابتدائی ادوار میں بعض دفعہ جنسی موضوع اور بعض اوقات دوسرے فحش مضامین کے لئے وقف ہو گئی اور اس میں اصلاح اس وقت ہوئی جب اردو کے شاعروں نے اس کو سنجیدہ مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ حکیم سنائیؒ جیسے صوفی اور نظامی گنجوی جیسے حکیم اور ثقہ بزرگ بھی مذاق کی اس برہنگی سے بچ نہیں سکے۔ سنائی کے کارنامہ بلخ میں بعض عام باتیں بھی گالیوں کی صورت اختیار کر جاتی ہیں — یہ سب کچھ درباروں اور درباری امراء کے زیر اثر تھا جو ابھی تمدن کی نفاستوں میں ڈھل نہیں سکے تھے۔ اور زندہ دلی اور تفریح کی یہ صورتیں اختیار کر رہے تھے۔ سوزنی، انوری، خاقانی، ابو العلا گنجوی وغیرہ کی ہجویں بھی ہر طرح کے اخفا و ایما سے خالی ہیں — اور اس زمانے میں یہ برہنگی اتنی عام ہوئی کہ ایک عرصے تک مذاق

عامہ کا جزو بنی رہی یہاں تک کہ جب سعدی نے ذوق کی اصلاح کی اور ذہنی حکایات اور نکات و لطائف سے برہنگی کی جگہ نکتہ و ایما کی لطافتوں کو آشکارا کیا تب بھی برہنگی کا ذوقی مطالبہ اتنا شدید تھا کہ سعدی تک کو خبیثات و ہزلیات سے اعتنا کرنا پڑا۔ اور اس کا اثر بعد تک بھی رہا چنانچہ بعد کے زمانے بھی اس مذاق سے خالی نہیں۔

بایں ہمہ فارسی ادب اس ابتدائی زمانے میں بھی متوازن ظرافت سے خالی نہیں رہا۔ اور قطعات کی صنف ہر زمانے میں رچی ہوئی ظرافت سے لبریز رہی ہے۔ اس کے علاوہ صوفیوں کا ادب خصوصاً ان کی شاعری بھی سنبھلی ہوئی ظرافت سے بڑا کام لیتی رہی ہے۔ اس غرض کے لئے حکایت کا استعمال بڑی کثرت سے ہوا ہے۔ سنائی، عطار، نظامی، رومی، سبھی نے حکایت کا استعمال کیا ہے۔ رومی کے یہاں ظرافت کی برہنگی بھی پائی جاتی ہے اور واقعات زندگی کے مضحک پہلوؤں سے حکمت کا سبق بھی نکالا ہے۔ جانوروں اور پرندوں کی کہانیوں سے تعجب خیزی بھی کی ہے — اور اس قسم کا خاصا سرمایہ فارسی کی کتابوں میں ملتا ہے۔!

پرندوں کی کہانیوں میں جو نکتہ آفرینی ہے وہ سبق آموزی کے مقصد کی حامل ہے اور یہ عنصر ہندوستان کے ادب سے فارسی میں منتقل ہوا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی بنیادی فضا نرم اور لطیف ہے۔

فارسی میں مقاماتِ حریری اور مقاماتِ بدیعی کے انداز پر مقاماتِ حمیدی بھی لکھی گئی — اور دلچسپی پیدا کرنے والے کرداروں کے ذریعے تفریح و نصیحت کو ملانے کی سعی کی گئی ہے۔

فارسی شاعری میں عبید زاکانی، بسحق اطعمہ اور نظام الدین البسہ نے تحریف "یا تقلیب خندہ آور" کی جدتیں بھی کی ہیں جن کا حال سب کو معلوم ہے۔

غرض اس نوع کا خاصا ادبی سرمایہ فارسی میں موجود ہے جس سے ظرافت کی ایک اچھی خاصی روداد مرتب ہو سکتی ہے۔ پھر بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ ایرانی تصورات کی رو سے ظرافت کی اعلیٰ ادبی قسم شاید وہی سمجھی گئی ہے جو پردہ داری اور ایمائی لطافتوں کی آئینہ دار ہو اور برہنگی کی بجائے اشارہ و اخفا پر منحصر ہو یا کرختگی اور درشتی کی بجائے نفاست و لطافت سے بیان ہو — کھلی ہنسی یا خندۂ بے جا کی روایت اعلیٰ ایرانی ذوق کو شاید کبھی گوارا نہیں ہوئی — اور اگر کہیں فارسی میں موجود ہے تو اسے ترکی تورانی اثرات کا کرشمہ سمجھنا چاہیئے — اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ ایرانی ظرافت واقعہ کی مزاح انگیزی میں بھی زیادہ تسکین نہیں پاتی۔ اس کی اصل فضا گدگدی کی طرح نرم و نازک ہے جو مختصر لطیفے، یا رمزی اور ایمائی نکتے میں ہی شادابی حاصل کرتی ہے — اور بسا اوقات ایک ہی پہلو دار لفظ کے استعمال میں وہ مزا دے جاتی ہے جو لمبے ڈرامائی اظہارات سے بھی اسے نہیں ملتا یہی وجہ ہے کہ ایرانی ظرافت نثر میں زیادہ پھلی پھولی نہیں۔ پھر اس میں جزئیاتی تفصیل (Description) کی ظرافت بہت زیادہ ترقی پذیر نہیں ہوئی۔ گویا ایرانی ظرافت ایرانی بلاغتوں کے اس تصور سے زیادہ آشنا رہی ہے۔ بلاغت والوں نے یوں ادا کیا ہے "الکنایۃ اُبلغ من التصراحۃ" — لہٰذا لفظی نکتہ آفرینی (Wit) ہی ایران کا اصلی میدان کمال ہے۔ اور ایک خاص معنی میں ایرانی مزاح کی اعلیٰ ترین نمود غزل کے قماش میں ہوئی ہے جہاں طنز اور نکتہ آفرینی نے مل کر عجیب حسن دکھایا ہے اور یہ کوئی غیر متوقع امر نہیں کیونکہ غزل ہی کا مزاج اس پردہ داری کی رشح کو جذب کر سکتا ہے جس کا بہترین خارجی نمایندہ مغل ایرانی مذاق تھا۔

مسلمانوں میں ادبی اسلوب کی اساس ارسطو کی بلاغت پر رکھی گئی ہے۔ اسی سے علم بیان اور علم معانی وجود میں آئے

ـــ’ اس لئے کچھ حصے کوفہ وبصرہ کے نحویوں نے مرتب کئے جنھوں نے عرب کے عملی پیرایہ ہائے بیان کا جائزہ لے کر ان کی عقلی شیرازہ بندی کی ـــ بنو عباس کے زمانے میں بلاغت کا فن اور بھی ترقی پذیر ہوا اور یونانی اصولیات کی روشنی میں منطق سے لے کر ادب کی حدود میں داخل ہوا۔ عربوں نے ـــ یا ان ابتدائی عربی ادیبوں نے اظہار وبیان کی اکثر صورتوں کو مکتوب نگاری، ترسّل یا دبیری کے فنون میں آزمایا۔ مترسلین اور دبیروں نے دو باتوں کا خاص خیال رکھا، ایک بیان کی آرائش وزیبائش۔ دوسری حسب ضرورت ایما وتلمیح تاکہ ایجاز کی ضروریات پوری ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ عربی کی اعلیٰ انشاپردازی میں کنایہ اور استعارہ کو بہت فروغ نصیب ہوا اور تشبیہ وتمثیل سے اجتناب عموماً بے رنگی کی علامت سمجھی گئی ـــ استعارہ کو بیان کے ایجاز وبرجستگی قائم رکھنے کے لئے اور کنایہ کو مخفی معانی کے اشارات کے لئے استعمال میں لایا گیا۔ اسی وجہ سے عربی انشا میں مزاحِ ملیح سے زیادہ طنز کو فروغ ہوا ـــ اور نظم کی طرح بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ نثر میں طنز کو جذب کیا گیا ـــ’

مگر عربی روح ظرافت سمیٹنے اور چھپ کر وار کرنے سے گریزاں ہے۔ اس میں اسی لئے واشگاف اظہار اور برہنہ گوئی غالب ہے۔ اسی لئے جب مصنف ذرا بھی غیر محتاط ہو جاتا ہے تو بیان صاف صاف تمسخر کا انداز اختیار کر جاتا ہے۔ عربی ظرافت واقعات کے تضحیکی عناصر پر زیادہ انحصار رکھتی ہے اور اگر اس میں لفظی ظرافت ہے تو یہ ایرانی اثرات کے رہینِ احسان ہیں۔

مگر یہ یاد رہے کہ ادبی اسلوب میں ایمائی عنصر کا سلسلہ ہنسانے کے جذبے سے زیادہ چونکا دینے کے جذبے سے شروع ہوتا ہے ـــ جس کی آخری منزل تبسم یا زیادہ سے زیادہ خندہ دنداں نما تک پہنچتی ہے ـــ واشگاف ہنسی کے انداز ادبی اسلوب کے چہرے پر فارسی یا ایرانی نژاد عربی مصنفوں کو بھلے معلوم نہیں ہوئے اور ہنسی میں بھی توازن یا ثقاہت یا وقار کا خاص خیال رکھا گیا ہے تاکہ بات بھی ہو جائے اور بات کرنے والا غیر متوازن بھی نہ ہو ـــ یہ غایت ایرانی رنگ کی سنجیدہ ادبی روایت کا جزو تھی اور اسی کو ایرانی ذوق کا نمایندہ سمجھنا چاہیئے۔

فارسی بلاغت کی کتابوں میں اس سلسلے میں کچھ نکتے مل جاتے ہیں مثلاً ایک اچھے ادبی اسلوب کے لئے تین چیزوں کی بطور خاص ضرورت سمجھی جاتی ہے۔ برجستگی، نمکینی اور شوخی۔ ان اصطلاحوں کے معانی میں اختلاف ہو سکتا ہے مگر ان کے عملی استعمال کی صورتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ برجستگی ظرافت کے سلسلے کی اولین لہر ہے جو قاری کے دل میں بیان کے متعلق ایک آگاہی سی پیدا کرتی ہے اور بعض اوقات تو شاید یہ محسوس بھی نہیں ہوتا کہ اس بیان میں ظرافت کا کوئی انداز موجود بھی ہے۔ مگر اکثر اوقات ایک برجستہ بیان ظرافت کی چاشنی لئے ہوئے ہوتا ہے۔

نمکینی کی اصطلاح بھی بڑی بامعنی ہے۔ کلام میں نمک ہونے سے یہ مراد ہوتی ہے کہ اس سے سننے والے کی اسی طرح دل کشائی ہو جس طرح کھانے میں نمک سے ذائقے کو فرحت ہوتی ہے، کلام کی نمکینی دراصل انشاء پرداز کا یک طرفہ فعل نہیں بلکہ متعدی تغیر ہے ـــ اس میں عموماً وہ صورت ہوتی ہے جسے کسی اور لفظ کی عدم موجودگی میں wit کے نام سے یاد کر لیجئے۔ یہ بالعموم لفظوں کا کھیل ہوتا ہے، لفظوں کی پہلوداری سے معانی کی دلکشائی پیدا کی جاتی ہے ـــ نمکینی کا عمل سننے والے کو تبسم کی حدود تک پہنچا سکتا ہے ورنہ بالعموم اس کی کیفیت داخلی رنگ کی ہونی چاہیئے ـــ آنکھوں میں چمک اور چہرے پر اس کے آثار کا ظاہر ہونا یقینی ہے

شوخی ہماری فنی اصطلاحوں میں عجیب پہلودار لفظ ہے، یہ کہیں معصوم شرارت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے کہیں نازیبا

کا مفہوم رکھتا ہے۔ کہیں ستم ظریفی کے رنگ رکھتا ہے مگر یہ صفت ہے متعدی بغیر۔ وہ شوخی، شوخی نہیں جس سے دوسرا متاثر نہ ہو اس میں معصوم شرارت کا عنصر بھی موجود ہوتا ہے۔ اور اس کے ساتھ حسن یا لطف کا پہلو بھی شریک ہوتا ہے —، شوخی میں دراز دستی، جرأت اور بے باکی بھی ہوتی ہے مگر اس میں کینہ، غصہ، انتقام اور تعدی کا رنگ نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ کچھ ایسی دراز دستی ہوتی ہے جو بھلی ہی معلوم ہوتی ہے —!

شوخی بظاہر ایک لفظی عمل ہے مگر یہ در اصل ایک طرز احساس بھی ہے اور بیان کا لہجہ بھی۔ اس کا تعلق اسلوب بیان سے بھی ہے اور حسن معنی سے بھی بلکہ ہر حسین ادا سے (خواہ وہ لفظوں میں ظاہر ہو یا جمال انسانی کے انوکھے کرشموں میں یا فطرت کے کسی تعجب خیز اور انبساط خیز عمل میں)، بشرطیکہ اس سے طبیعت میں برجستگی اور احساس راحت پیدا ہوتا ہو۔ غرض یہ قدرے غیر متوقع مگر انبساط بخش عمل ہے جس میں تھوڑا سا جارحیت کا عنصر بھی شامل ہے مگر لطف خیز اور ہلکا ہلکا — تیز نہیں!

بہر صورت شوخی متعدی بغیر ہونے کے باوجود، اپنے نشانۂ موضوع، کے لئے قلبی اذیت دہی کے ارادے سے خالی ہوتی ہے — مگر ظرافت کے سلسلے میں آیندہ کی بیشتر صورتیں نشانۂ موضوع کی دل آزاری کے ارادے سے بھی ہو سکتی ہیں اور آزادی کا موجب بھی ہوتی ہیں — مثلاً شوخی کی ایک کڑی اور سخت صورت (طنز) خفا کے باوجود اذیت ہو سکتی ہے۔

ظرافت کے سلسلے کی ایک چیز ہجو بھی ہے مگر ہجو میں خفا یا پوشیدگی ضروری نہیں — اور اگرچہ نعمت خاں عالی کے وقائع حیدرآباد میں اورنگ زیب کے حملہ حیدرآباد کی تعریضی ہجو کی ہے مگر اس کو تعریض کی صف میں رکھنا مناسب ہوگا۔ ہجو عموماً ایک کھلی ڈلی چیز ہوتی ہے مگر ہجو کے لئے ضروری نہیں کہ اس میں کسی خاص شخص کا نام آئے، ہاں انداز اظہار کھلا ہوتا ہے۔ میر تقی میر نے اپنی نظم خواجہ سگ پرست میں جیسے نام لئے بغیر کسی شخص معلوم کی ہجو کی ہے۔ مگر سودا کی اکثر ہجویات کی طرح شخص متعین کی ہجو بھی ہو سکتی ہے مگر صفات مذموم میں تعریض کی جگہ برہنہ گوی کی گئی ہے۔

اس کے بعد ہزل کی صورتیں ہیں — جو بالارادہ غیر سنجیدہ اظہارات کا درجہ رکھتی ہیں۔ ہزل ضروری نہیں کہ کسی شخص کے خلاف ہو — نہ اس کی ماہیت میں ایذا کا عنصر ہے۔ ہزل وقتی اور ہنگامی تفریح کی چیز ہے جس میں مقصد فقط محظوظ کرنا ہے اس شخص یا گروہ کو جو اس قسم کے اظہار سے محظوظ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے — اور تجربے نے یہ ثابت کیا ہے کہ ثقہ لوگ بھی بعض لمحات میں اس قسم کی غیر ثقہ باتوں سے محظوظ ہوتے ہیں۔ ہزل کی ایک قسم الہزل بما یُراد بہ الجِدّ بھی ہے جو بظاہر ہزل ہوتی ہے۔ بعض اوقات اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔ کوئی بات بظاہر سنجیدہ ہوتی ہے مگر اس سے ایک غیر سنجیدہ پہلو نکلتا ہے۔

اردو فارسی ادب میں تحریف و تصحیف کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں۔ ان میں سے بیشتر کو ہزل میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ مسلمان سلاطین کے درباروں میں ندیمی اور مصاحبی کا ایک خاص بے قاعدہ یا باقاعدہ منصب ہوتا تھا۔ ان لوگوں کا کام مجلس آرائی ہوتا ہے جو اپنے بادشاہ یا امیر کو خوش رکھنے کے لئے ظرافت کی ہر صورت سے فائدہ اٹھاتے تھے — غالباً بادشاہ وقت کی استعداد اور مزاج کے مطابق۔ حکایت، لطیفہ، ہزل، استہزا، نکتہ سنجی، معمّا، چیستاں، شعر — جس سے بھی ضرورت پوری ہوتی تھی اس کو یہ کام میں لاتے تھے۔ ان کا یہ منصب یا ان کے فرائض ادب اور ادیب کے منصب یا فرائض سے بھی جا ملتے تھے — مگر یہ مسلم ہے کہ اعلیٰ درجے کے ادیبوں اور انشا پردازوں نے ظرافت کی ادبی روح کو ہمیشہ برقرار رکھا ہے۔ اور ان کے یہاں ظرافت کی وہی لطیف صورتیں زیادہ مقبول

رہی ہیں جو سنجیدہ سمجھی جاتی تھیں ——— اور جن کو میں نے گذشتہ صفحات میں اسلوب کی صفات کے طور پر پیش کیا ہے ——— اور یہ صفات ہیں برجستگی رنگینی اور شوخی۔ یہی صفات فارسی ادب میں بہت مقبول رہی ہیں اور ان کے صدہا اعلیٰ نمونے فارسی میں نظر آتے ہیں، جن کا انتخاب کوکانے اپنی کتاب فارسی مزاح و ظرافت میں کیا ہے۔

مگر یہ یاد رہے۔ ظرافت کی یہ سب مثالیں جو کوکانے اپنی کتاب میں جمع کی ہیں خالص ایرانی ذہنیت کی نمایندہ نہیں ان میں سب رنگ ملے ہوئے ہیں جن میں سے بعض کا سطور بالا میں ذکر آیا ہے۔ اردو میں ایک خاص زمانے تک ایرانی تورانی اطوار ظرافت رائج رہے بعد میں مغربی اثرات وارد ہوئے ان کے زیر اثر وہ تنوعات جلوہ گر ہوئے جو مغربی ادبوں میں موجود ہیں اس لئے اردو مزاح کی کہانی بھی مخلوط ہے تاہم اس پر فارسی کے اثرات مسلم ہیں اور قدرے ہندی کے بھی۔ مگر اردو مزاح کا بہت بڑا سرمایہ مغربی رنگ کا ہے اس کی عمدہ تفصیل ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی کتاب اردو ادب میں طنز و مزاح میں پیش کی ہے۔

میرا اپنا خیال یہ ہے کہ مغل ایرانی مزاح ایک ایسی سنبھلی ہوئی ظرافت کی نمایندگی کرتا ہے جو اپنے وقار اور سکون و اعتدال کے لئے اس توافقِ حیات کے زیادہ قریب ہے جو اسلام کا پیش کردہ ہے۔ اس میں بہت کھل کر ہنسنے اور ہنسانے کی بجائے محظوظ ہونے اور متبسم ہونے کی کیفیت ہے ——— پھر اس میں وہ پردہ داری بھی ہے جو اسلامی تمدن میں، معاشرہ کے ہر رنگ میں ہمیشہ موجود ہی ہے «برہنہ حرف نگفتن کمال گویائی است»، شاید اسی لئے بلاغت کو ایمائی خوبیوں میں منحصر سمجھا گیا۔ اور شاید اسی لئے غزل کی سب سے بڑی خوبی اس کے ایجاز کے علاوہ اس کے رمزیہ بیان پر موقوف رکھی گئی ہے۔ اس قسم کے اسباب سے مسلمانوں میں ڈرامے کو بھی ترقی نہیں ہوئی کیونکہ یہ سنبھلی ہوئی مزاحیہ کیفیت اور سنجیدہ تفریح کے منافی چیز سمجھی گئی۔

یہ صحیح ہے کہ بغداد عرب اقوام کا مرکز تھا اور ترک اور تورانی اسلام کے بڑے محافظ رہے ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ اسلامی روح ظرافت کی صحیح نمایندگی مغل ایرانی مذاق نے کی ہے کیونکہ وہی اس کے اصل تصور حیات کی ترجمانی کر رہی ہے ؎

مئے صافی ز فرنگ آید و شاہد ز تتار
ما ندانیم کہ بغدادے و بطحائے ہست

آنسوؤں کا ہار

علی عباس حسینی

ذیل کا مقالہ ایک ایسے مشاعرے میں پڑھا گیا تھا جو صرف ہزل گو شعرا پر مشتمل تھا۔ اصرار یہ تھا کہ ہزل گوئی کی تائید بھی کروں اور لکھنؤ کی ظریفانہ نثر کا نمونہ بھی پیش کروں۔ امتثالِ امر کا قلادہ گردن میں تھا۔ جو کچھ بن پڑا وہ حاضر ہے۔

حضرات!

شاعری کیا ہے؟ مجھے نہیں معلوم۔ نہ میں شاعر، نہ متشاعر، نہ غزل گو، نہ قصیدہ خواں، نہ ناظمِ نظم، نہ مرثیہ خواں، نہ بلبلِ ہزار داستاں، نہ طوطیِ شکرفشاں، نہ زمزمہ خوانِ بہار، نہ عکاسِ مہوشانِ نگار، نہ استادِ مانی و بہزاد، نہ ساحریِ سخن کا ہمزاد، نہ عاشقِ جگر نگار، نہ رقیبِ ناہنجار، نہ سگِ لیلیٰ، نہ خرِ عیسےٰ! نہ اس کے محل کا معمار، نہ اس کی ڈیوڑھی کا کہار! ــــ نہ میں دستِ صبا، نہ شعلۂ نوا، نہ کلامِ جلیل، نہ نقشِ جمیل، نہ زہرِ عشق، نہ پیامِ مشرق، نہ کلامِ ہزار، نہ خودی کے اسرار، نہ بانگِ درا، نہ گلِ رعنا، نہ بہارِ دانش، نہ عیارِ دانش، نہ گلزارِ نسیم، نہ ضربِ کلیم، نہ بستاں نہ گلستاں، نہ گلزارِ دبستاں، نہ سحر البیاں، نہ انوارِ سہیلی، نہ گیستاں جلی، نہ مسدسِ حالی، نہ باغِ نظم کا مالی، نہ شیخ چلّی، نہ میر زٹلّی! ــــ پھر مجھے اس شعر و سخن کے دربارِ دُربار میں بار دیا گیا تو کیوں؟ اور رسائی و پذیرائی پر اس قدر اصرار کیا گیا تو کیوں؟ غالب کے ساتھ سینہ زوری معاف!

حسنیِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند کتے ؛

آپ فرمائیں گے یہ حسینی کا حسنی بھی کیا خوب! تو میں عرض کروں گا کہ اسی کو ضرورتِ شعری بھی کہتے ہیں اور سرقہ و توارد کی معذوری بھی۔ آپ حضرات ماشاءاللہ سے پوتروں کے ادیب ٹھہرے۔ آپ دونوں حاجتوں سے اچھی طرح واقف ہیں دونوں صورتوں میں کچھ نہ کچھ گرتا اور چھوٹ جاتا ہے۔ پھر میرے پاس عربی تعلیل کی سپر بھی ہے جس میں "تعق" پر بریدہ ہو کر "ق" رہ جاتا ہے اور تیں نہیں کرتا! ــــ آپ کے زحافات کی ٹٹی بھی ہے جس کی آڑ میں گھٹانے بڑھانے کے ہزاروں کھٹکے لٹکے ہیں اور آج کل کی ترقی پسندی کا بڑا سا آرٹ بھی ہے۔ جس کے پیچھے زبان دانی کے کرتوں کی ایک پوری نئی دنیا ہے۔ ع کہو اردو کو چت کر دوں کہو اردو کو پٹ کر دوں رہا متحرک "س" کا سکون، تو جناب نہ میں اقبال کے فلسفۂ حرکت کا قائل اور نہ میرے نزدیک ہر حرکت قابلِ ذکر و اظہار۔ خلوت کے "کارِ دیگر" کو جلوت میں یہ بانگِ درا ایک اپچار کہنا حقیقت نگاری سہی، مگر شیوۂ شرفا نہیں! ــــ اور سو بات کی ایک بات تو یہ ہے کہ میں نے تجربہ کیا ہے اپنے نام کے ساتھ، اور ہر تجربہ جس میں اپنا نام ہے، خواہ وہ چاہِ زمزم کو مزدوج و مضاف ہی کرنے میں کیوں نہ ہو مستحقِ ثواب بھی ہے اور تمغۂ مردانگی بھی، بقول آتش ؎

نامرد اور مرد میں اتنا ہی فرق ہے
وہ نان کے لئے مرے یہ نام کیلئے

لیجئے آتش نے دو لفظوں میں مارکس اور فرائڈ کا باہمی جھگڑا چکا دیا! ــــ مگر یہ تو جملہ معترضہ تھا ــــ اب جو زندہ دلوں کی بزم میں "میں آپ آیا نہیں لایا گیا ہوں"

تو اس "مہازلہ" کی وجہ تسمیہ بھی سن لیجیے، مگر خدارا "مہازلہ" کو بروزن مناظرہ و مجادلہ و مقاتلہ نہ سمجھ لیجیے گا۔ جی نہیں، بلکہ یہ بھی اسی قبیلے سے ہے جس سے مشاعرہ و مقاصدہ و مسالمہ ہیں۔ یعنی اس میں بھی پھیکے سڑے، پھپھوندی لگے شعروں پر تعریف بھی کرنا پڑتی ہے۔ اور لطف گو ہازل کو تعریف سخن ناشناس پر کڑی کڑی بل کھا کر اور کیسے نکال کر سلام بھی کرنا پڑتا ہے۔ اور بانیِ محفل کو اس مجرے کے صلے میں "نقد و نسیہ" کی صورت میں بہت کچھ پیش کرنا اور جھکنا بھی پڑتا ہے ـــــ ہاں تو اس مہازلہ' کی وجہ انعقاد یہ ہے: رونے بسورنے سے اکتاہٹ! اور لطیفے - ہر نئے آنسو بہانے سے نفرت!

ہمارے شاعروں میں جسے بھی دیکھئے، ع "بیٹھے روتے ہیں ہاتھ ملتے ہیں" اور "جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو" کا وظیفہ رٹتے رہتے ہیں۔

آپ نے طوفان نوح کا حال تو سنا ہی ہوگا، جس میں ولی عہد بہادر خود بھی ڈوبے اور خاندانی عظمت بھی ڈبوئی۔ آپ نے رود نیل کے مد و جزر کے وہ احوال بھی پڑھے ہوں گے ہی جن میں ایک ہی موجِ موسوی کے لئے تختِ رواں بنا اور فرعون کے لئے گردابی ہنڈولا۔ آپ نے اکبر الہ آبادی کی نظم میں دریائے لڈر کے زور کا بھی نظارہ کیا ہوگا۔ آپ نے ظفر علی خاں کی نظم میں موسیٰ ندی کا سیلاب بھی ملاحظہ کیا ہوگا اور آپ نے اخباروں میں برہمپترا، گھاگھرا، گنگا، گومتی، کی بہنائیوں کی قہر سامانی بھی پڑھی ہوگی۔ مگر سچ مانئے ہماری غزلیہ شاعری میں آنسوؤں کا جو طوفان اٹھایا گیا ہے اس کے سامنے یہ ساری باڑھیں سچ مچ پانی بھرتی ہیں۔ بالکل چھوٹی ہانڈی کا ابال ہیں! ـــــ ہمارے بحرِ ناپیدا کنار کا نہ اور ہے نہ چھور۔ اس کا سوتا کہاں پھوٹتا ہے اس کا سراغ لگانے میں اکثر نے غوطہ کھایا۔ میں غواصی کے فن سے ناواقف، محققین کے آلاتِ غوطہ خوری بھی میرے پاس نہیں، پھر دم خم بھی اتنا ہی کہ پہلی ہی ڈبکی میں چیخ اٹھوں "ہم ڈوبے تو جگ ڈوبا" اس لئے نہ تو دیر تک غوطہ لگا سکا نہ تہہ کی مٹی لا سکا۔ بس سات سو برس کے اس شور پانی کو کہیں کہیں پایاب پایا ہے، وہیں سے کچھ گوہرِ آب دار جلدی جلدی چُنے ہیں۔ ظرافت کے نام پر خوش آب موتیوں کا یہ ہار آج کی بزم کے نثر کار کے گلے میں ڈالتا ہوں ـــــ

جب آنکھ سے اوجھل بھیا، تڑپن لگا میرا جیا ۔ حقا الٰہی کیا کیا، آنسو چلے بھر لائے کر! (امیر خسرو)

یہ تھے خالقِ باری سرجن ہار، کے مولف جو اپنے ظریفانہ چٹکلوں، پہیلیوں، دو سخنوں، کہ مکرنیوں کے لئے مشہور ہیں۔ مگر جب انہوں نے غزل میں قدم رکھا تو تحفہ لائے وہی کٹورا بھر آنسو! ـــــ اچھا صاحب! "رموزِ سلطنت خویش خسرواں دانند!" کہہ کر آگے بڑھئے۔ ایک ولی کے حجرے میں چلئے۔ ان کا ارشاد ہے۔

اے ولی ہونا سری جن پر نثار ۔ مدعا ہے چشمِ گوہر بار کا (ولی دکنی)

اب دکن سے دلی کا رخ فرمائیے ـــــ

جب سے آیا عدم سے ہستی میں ۔ آہ روتا ہی رہا تب کا! (تاباں دہلوی)

اتنا ہی نہیں ذرا اس سحر بیانی کو دیکھئے ؎

تیرا حسنؔ یہ رونا یونہی اگر رہے گا ۔ ظالم تو پھر کسی کا کاہے کو گھر رہے گا (میر حسن)

لیجئے ان کے قدم چومئے۔ صوفی صافی ہیں مگر زخم خوردہ دل نے میر درد بنا دیا ہے

دل بھی اے دردؔ قطرۂ خوں تھا ۔ آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا (درد)

اب اس کی سنئے جس نے اشک فشانی کو فن کا رتبہ دیا ہے اور جو "ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے۔" وہ کچی نیند سے جاگ کر یوں بسورا ؎

بھری آتی ہیں آج یوں آنکھیں ۔ جیسے دریا کہیں ابلتے ہیں! (میر)

اس چڑھتے پانی میں ہاتھ پاؤں مارنے میں پانی نے مختلف موکھوں سے اندر پہنچ کر پیٹ بھی پھلایا، وزن بھی بڑھایا اور قافیہ تنگ ہی نہ کیا بلکہ بگاڑا بھی۔ اس بدحواسی میں مشہور ہاجی، سودا یاد آئے۔ شاید وہی "انقباض کشادہ و انبساط آور" کوئی پھنکی دیں۔ لیکن انہوں نے حال تک نہ سنا اور قال تک نہ دیکھا۔ جھٹ دو دو سنانے لگے

مارے اللہ دونوں میں تاکیدِ اکید ہے کہ "شربتِ اشک امانہ نمودہ نوشند!"

سودا سے یہ پوچھا میں دل میں بھی کسی کو دوں؟   وہ کر کے بیاں اپنا رو داد بہت رویا!   (سوداؔ)
کبھو میں بات بن روئے نہیں کی اس سے پر اُن نے   نہ پوچھا کیوں سبب کیا ہے ترے ہر بار رونے کا   (سوداؔ)

جب بقول جرأت یہ دیکھا کہ ؎ ایسے دریا میں بہہ چلے ہیں آہ — جس میں تاب نہیں ہے ناؤ تیں ——— تو میں عزمِ راسخ کر کے عظیم آباد پہنچا۔ مگر وہاں کے عظیم المرتبہ شاعر نے بھی آنسو ہی بہائے۔

اپنا بھی ماجرائے دل اک مرثیہ سا ہے   بے اختیار روتے ہیں لوگ اس بیان پر!   (راسخ)

میں بھی ہمت ہار بیٹھا۔ بجز دیوانی کے علی الرغم، میں نے نہ تو "ٹوٹی ناؤ دیکھی نہ دریا کا بہاؤ" دیکھا، بسم اللہ مجریہا، کہا اور دھارے پر بہہ چلا۔ ——

اجی کیوں رلاتے ہو مجھ کو تمہیں کیا؟   نہیں رحم آتا مری چشمِ تر پر؟   (انشاؔ)
یاروں کو کیا دکھاؤں گا رونے کا اپنے رنگ   لختِ جگر تو اشک کے ہمراہ بھی نہیں   (مصحفی)
اب ترے رونے کا عالم حد سے گذرا ہے نظیر   اشک نے تیرے تو سب جل تھل نہل کر کر دیا   (نظیر اکبر آبادی)
کیونکر مرے رونے سے دل نرم ہو اس بت کا   پتھر میں کبھی پانی تاثیر نہیں کرتا   (ناسخ)
مزا غم کے کھانے کا جس کو پڑا!   وہ اشکوں سے ہاتھ اپنے دھویا کیا   (آتش)
دم بدم رونا ہمیں چاروں طرف تکنا ہمیں   وہ بھی رسوا ہو گیا جس نے کیا رسوا ہمیں   (مومن)

خیریت گذری کہ ان حضرت مومن نے اب کے برسات سے پہلے ہی رونے دھونے سے توبہ کر لی، ورنہ ہائیڈروجن بم کا لایا ہوا طوفان ان کے اٹھائے ہوئے طوفان کے سامنے پانی بھرتا۔ حکمتِ توبہ تو ملاحظہ ہو

دیوار کے گرتے ہی اٹھنے لگے طوفاں   اب بیٹھ کے کونے میں بھی رویا نہ کریں گے   (مومن)

اس بحث کو تو چھوڑیئے کہ "بے مار کی توبہ" میں زیادہ لذت ہے کہ شکستِ توبہ میں اور اشک فشانی کے لئے استاد ذوق کی بہانہ تراشی دیکھئے ؎

سامنے یار کے اے ذوق بہانا آنسو   ہے تو چاہت کے جتانے کو بہانہ اچھا   (ذوق)

ظفر نے کہا، استاد میرا بہانہ بھی ملاحظہ ہو ؎

ہم بہانے کو اشک آنکھوں سے   ڈھونڈھ لیتے ہیں اک بہانہ روز   (ظفر)

جلال نے فکر سے سر اٹھا کر کہا "اس بہانے پر لکھنوی آب بھی ملاحظہ ہو ؎

غرض تھی رونے سے اتنی تمہیں ہنسانا تھا   یہ آنسوؤں کا بہانا تو اک بہانا تھا

نظم کی لڑی میں بار بار نثر کی گرہ پڑ جاتی تھی، سوچا اسد اللہ کے پاس چلوں، شاید نام کی برکت سے وہی گرہ دل کی عقدہ کشائی کریں۔ آخر "حیوانِ ظریف" بھی تو ہیں لیکن صورت دیکھتے ہی انہوں نے صیحہ کیا ؎ ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ——— پھر شاید میرے چہرے پر ایک خجل مسکراہٹ دیکھ کر انہوں نے تیوریاں چڑھا لیں اور بڑے زور سے دہاڑے ؎

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں   روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں؟

میں نے جلدی سے مقطع کا پہلا مصرعہ تو "داشتہ آید بکار" کے طور پر اپنی نسبت میں رکھا۔ تقریر کی ابتدا میں اس کی حجامت بنا کر آپ کی خدمت میں

پیش بھی کر چکا ——— اور پانی پت کے میدان پر مردانہ وار تیغوں کی جھنکار سننے کی آرزو میں یلغار کیا۔ نظم جدید کے سالار، حالیؔ کا سامنا ہوا۔ ان کا حال بے حال نظر آیا۔ وہ پہلے ہی سے دو نالی بندوق بھرے بیٹھے تھے۔ دیکھتے ہی آتش فشانی کی جگہ گہر فشانی کرنے لگے۔ پہلے تو رو کے بحر میں غوطے دیئے، پھر ساحل پر کھینچ کر غالبؔ پر رونے رلانے لگے ؎

شہر میں جو ہے سوگوار ہے آج اپنا بے گانہ اشکبار ہے آج (حالیؔ)

میں نے جلدی میں ٹوپی تو انہیں کے قدموں میں پڑی رہنے دی اور دُرہائے ظرافت کی جستجو میں کالے پانی تک کی ڈبکی لگائی۔ قیدیوں کی جانگھیا اور بیڑی کے شکوہ کے ساتھ منیرؔ دکھائی دیئے۔ ہم قفسوں کو نئی قسم کی ڈرل کرانے میں یوں ہدایت دے رہے تھے ؎

شبِ فرقت میں اگر روئیں گے رونے والے پاؤں پھیلا کے کہاں سوئیں گے سونے والے (منیرؔ شکوہ آبادی)

گھبرا کر پلٹا تو ساحل پر بحرؔ نے بھی ایک موتی جیب میں ڈال دیا ؎

رونے دھونے سے فائدہ اے بحر کب یہ سینے کے داغ چھوٹتے ہیں (بحرؔ)

اس شعر پر داغؔ یاد آ گئے۔ وہ نواب بھی تھے بانکے بھی۔ ڈھارس بندھی۔ شاید ہنسی کا لعل شب چراغ اسی سرکار سے عطا ہو۔ ان کے محلسرا کے پھاٹک پر درویشانہ صدا دی "ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا!" ——— ٹکا سا جواب ملا "دوسرا دروازہ دیکھو!" ؎

آنسو نہ پیئے جائیں گے اے حضرتِ ناصح ہیرے کی کنی جان کے کھائی نہیں جاتی (داغؔ)

منزل میں ایک امیر کا آستانہ دکھائی دیا۔ اس کی ڈیوڑھی پر توکل و استغنا کی نوبت بجتی تھی۔ یقین آگیا کہ اس کے ہاں گریہ و فغاں کی تنگ دستی کی چھاؤں بھی نہ پڑی ہوگی۔ بڑی امیدوں سے ہانک لگائی۔ مگر اس کا خزانہ بھی الماسِ ظرافت سے خالی نکلا اور میرے کشکول میں "نان گرم" کی جگہ "آبِ گرم" ہی ڈال دیا گیا! ؎

ہر جگہ جوشِ محبت کا نیا عالم ہوا آنکھ میں آنسو جگر میں داغ دل میں غم ہوا (امیرؔ)

ایک صاحب نے خوش خبری سنائی دُرِ مراد شاد کے پاس ضرور ہوگا۔ تخلص کا پاس ضرور کیا ہوگا۔ اس کے آستان پر جبیں سائی کرو، پٹنے کو نہ ڈرا پٹنہ پہنچا، لیکن ان کی صورت دیکھتے ہی یقین آگیا "برعکس نام نہند زنگی کافور" ساری شادمانی غائب ہوگئی ؎

شاد کیا کیجئے دیکھا نہیں جاتا مجھ سے چہرہ اُترا ہوا، بہتا ہوا آنسو تیرا ! (شادؔ)

اب پرانے طبیبانِ سخن سے "مایوس علاج" ہوا۔ یقین آگیا ان کے پاس اس مرض کا کوئی مداوا نہیں۔ مجبوراً ادھر مطبِ جدید ہر عام مرجوعہ تھا مگر وہاں بھی مسیحا آپ ہی بیمار نکلے۔ حسرت، پُر حسرت طور پر خود ہی پھوٹ پھوٹ کر نہ رو رہے تھے بلکہ اس کو بھی رلا رہے تھے جس کے نہ رونے کی ہم سب دعائیں مانگا کرتے ہیں

گریۂ شوق سے تر ہیں جو تمہاری آنکھیں بن گئے ہیں فلکِ حسن کے تارے آنسو (حسرت موہانی)

اصغرؔ نے شاعرِ اکبر ہونے پر بھی بڑی بڑائی دکھائی تو یہی کہ ؎

اشک اب نہیں تھمتے، دل پہ اب نہیں قابو خود کو آزما بیٹھے مجھ کو آزمانے سے (اصغرؔ)

ظریفِ اکبرؔ سے فریاد کی، وہ منہ سکھا کے، آسمان کی طرف دیکھ کر بولے۔ ؎

ہر اک کے لائق ہے اس کی زینت، نہ ہے تری شان تیری قدرت کہ آنکھ کو اشک سے ہے بھرتی، گہر سے کرتی ہے آب پیدا (اکبر الٰہ آبادی)

صفیؔ بڑی صفائی سے بولے :

ٹپک پڑتے ہیں شبنم کی طرح بے اختیار آنسو! چمن میں جب کبھی گلہائے خنداں دیکھ لیتے ہیں (صفیؔ)

فانیؔ ہمیشہ سے مایوسی کی باتیں کرتے تھے، آنسو بہا کے بولے ؎

آج ہم پی سکے نہ وہ آنسو   اُن کے آگے جو بار بار آیا   (فانیؔ)

عزیزؔ نے جانِ عزیز کی پروا نہ کی، اصرار کرکے کہا ؎

ان سے کرتا ہے دمِ نزع وصیت یہ عزیزؔ   خلق روئے گی مگر تم نہ پریشاں ہونا!   (عزیزؔ)

ثاقبؔ شہاب کی طرح چمکے تو ضرور مگر اس میں بھی گرتے آنسوؤں کا ڈھنگ تھا ؎

سننے والے رو دیے سن کر مریضِ غم کا حال   دیکھنے والے ترس کھا کر دعا کرنے لگے

آرزوؔ کی خدمت میں رسائی پیدا کی، اپنی آرزو پیش کی، وہاں بھی آرزو نہ بر آئی ؎

سیلابِ نگاہِ حسرت زا عجب چاہے ڈبو دے یہ دنیا   سمجھو نہ اسے سوکھا چشمہ، بہتا ہوا اک دریا جانو،

تاثیرؔ سے عرض کیا "زندہ دلانِ پنجاب اپنی بذلہ سنجی کے لئے دور دور تک مشہور ہیں، آپ سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں" فرمایا "کیا کروں ؎

حضورِ یار بھی آنسو نکل ہی آتے ہیں   کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں   (تاثیرؔ)

یاسؔ کی خدمت میں درخواست پیش کی۔ آپ چنگیزی بھی ہیں اور یگانۂ عصر بھی۔ آپ ہی میرے درد کا درماں تجویز فرمائیے۔ کہنے لگے "حضرت، آپ نے بھی کیا فرمائش کی، یہاں رونے سے ابھی خود ہی جی نہیں بھرا ؎

ایسا رونا بھی کوئی رونا ہے   آستیں آنسوؤں سے تر نہ ہوئی   (یگانہؔ)

شاعرؔ قریب ہی بیٹھے تھے جھٹ بول اٹھے، گھبرائیے نہیں ؎

آنسو شعلوں میں ڈھل رہے ہیں   غمِ دل کی فضا بدل رہی ہے   (شاعرؔ لکھنوی)

سالکؔ سے گذارش کی آپ ہی اس معاملے میں رہنمائی فرمائیے۔ کہنے لگے ابھی تو لوگ مجھے اسی طرح جانتے ہیں ؎

وہ گلِ انشائے گفتار کا پیکر سالکؔ   آج کوچے سے ترے اشک فشاں گذرا ہے   (سالکؔ)

اثرؔ کو توجہ دلائی۔ شعر و سخن کی دنیا میں آپ کا بڑا اثر و نفوذ ہے۔ آپ میری عرضی منظور کرا دیجئے۔ فرمایا۔ میاں! میں کس منہ سے تمہاری سفارش کروں؟ خود اپنا یہ حال ہے کہ ؎

آنکھیں کب کی برس چکی ہیں   کوندا اب تک لپک رہا ہے   (اثرؔ)

جگرؔ کے سامنے ہمت کرکے گیا، بڑے دل گردے والے ہیں۔ یقینی کامراں پلٹوں گا انہوں نے بھی جھڑک دیا ؎

انہیں آنسو سمجھ کر یوں نہ مٹی میں ملا ظالم   پیامِ دردِ دل ہے اور آنکھوں کی زبانی ہے   (جگرؔ)

حضرت دلؔ کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ آپ صاحبِ دل ہیں آپ ہی کرم فرمائیے۔ ٹھنڈی سانس لے کر بولے ؎

ستم تھا لطف کے پردے میں نما دوا دینا   ہماری اشک باری پر کسی کا مسکرا دینا   (دلؔ شاہجہاں پوری)

سراجؔ سے کہا، غم و الم کے اس گھور اندھیرے میں آپ ہی ہنسی کا کوئی دیا روشن کریں۔ انہوں نے روشنی دکھائی تو مگر وہی آنسو بہا کے ؎

آخری اشک رکا ہے سرِ مژگاں آکر   ڈوب جائے یہ ستارہ تو سحر ہو جائے   (سراجؔ)

رضویؔ کو یاد دلایا کہ آپ تو ان کی نسل سے ہیں جن کی ضمانت میں جانے کے بعد غم و ہم پاس نہیں آ سکتے۔ اپنی شاعری کی خزاں سے عاجز آکر بہار آیا ہوں۔

خدارا آپ ہی قہقہوں کی بہار دکھا دیجئے، مگر انہوں نے ایک نہ سنی۔ بولے تو یہ بولے ؎

سیلاب آیا اشکوں کا اور کشتِ تمنا ڈوب چلی   ہوش میں آئے رونے والے دل کی دنیا ڈوب گئی   (رضوی)

لکھنؤ سے تھانہ بھون ہوتا ہوا لاہور گیا۔ حضرت شوکت سے عرض کی۔ آپ تو نثر میں قہقہوں کا گلستان کھلاتے رہتے ہیں نظم میں ہنسی کا ایک بوستان عنایت ہو۔ فرمانے لگے یہ ہنسی کی بات سہی ؎

سمجھ رہے تھے کہ اشکوں سے ہوگا دل ہلکا   نہ جانتے تھے کہ ہیں یہ بھی چشمِ تر کے فریب

عاجز آ کر میں نے اب ادھر کا رخ کیا۔ جدھر ترقی پسندی کا سرخ سویرا ہے یقین تھا یہاں کی آبادی تو ٹسوے نہ بہاتی ہوگی۔ فراق سے گفتگو ہوئی کہنے لگے کیوں اپنے قد جیسا لمبا منہ بنائے پھرتے ہو ؎

فسردہ کیوں ہے چارہ آنسوؤں میں کیا نہیں   حرارتیں نئی نئی، طراوتیں نئی نئی !   (فراق)

مجاز سے کہا، آپ حقیقت پر روشنی ڈالیں۔ فرمایا ؎

روئیں نہ ابھی اہلِ نظر حال پہ میرے   ہونا ہے ابھی مجھ کو خراب اور زیادہ !   (مجاز)

فیض کے پاس پاکستان پہنچا۔ آپ ہی سے اربابِ ادب کو یہ فیض ملے۔ بولے ؎

صبا سے کرتے ہیں غربت نصیب ذکرِ وطن   تو چشمِ صبح میں آنسو ابھرنے لگتے ہیں   (فیض)

حضرت سرور سے علی گڑھ جا کر فریاد کی فرمایا یہی صالح روش ہے ؎

کیا لہو رونے تو آیا ہے بہاروں کا سلام   صرف خوابوں سے حقائق کو سنوارا نہ گیا   (سرور)

غرض سات سو برس کی اس چھان بین کے بعد میں صرف آنسوؤں کا ہار تیار کر سکا۔ مجھے قہقہوں کا ایک گلدستہ بھی نصیب نہ ہوا۔ اس لئے آپ شعرا سے یہ عرض کرنا ہے کہ فردوسِ شعر میں قہقہہ شجرۂ ممنوعہ نہیں ہے اور اگر ہو بھی تو ابنِ آدم وراثتہً اس کی لگ اور لپک پر مجبور ہے گندم نما جو فروشوں پر طعن و تشنیع، طنز و تنقید اس کے خمیر میں ہے پھر جنت سے نکالے جانے پر 'بابا' اتنا بلک چکے ہیں کہ ہنسنا ہر سعید فرزند کا فرض بن گیا ہے۔

چارۂ پشیمانی خوش دلی و خوش کامی !   توبہ از ریاکاراں، خندہ ہا زمن تنہا !   (یگانہ)

اس لئے صرف ہنسنے والوں کی صورت نہ بنائیے بلکہ سچ مچ ہنسائیے اور ہنسئے اور قہقہوں کا عصا ہاتھ میں لے کر موسیٰ وارانہ رودِ اشک سے گزریئے تاکہ آپ کے کسی خستہ و سوختہ، آشفتہ و گداختہ، تفتہ و برشتہ، تپیدہ و گزیدہ، کوفتہ و بیختہ، تشنہ و گرسنہ ساتھی کو بھی جیتے جی قبر کے کنوئیں سے یوں ہنسی کی بھیک نہ مانگنا پڑے ؎

ہنس قبر پہ میری کھل کھلا کے   یہ پھول چڑھا کبھی تو آ کر !   (امیر)

بلکہ آپ میں سے کم غمیدہ، خوں چکیدہ، مارگزیدہ، باراں دیدہ، سوکھا، کھرکھرا، سینگ سلائی شاعر بھی کیکڑی تیور سے خم ٹھونک کر یوں ہیکڑی دکھائے ؎

گر دیکھ کے ہنس دیا تو   منہ پھیر کے مسکرائیں گے ہم !   (مومن)

یہ اطوار و اندازِ بیاں خوبی کے سہی، مگر ان میں عمرو عیار کی چالاکی بھی شریک ہے۔ اسی لئے ان میں زندہ اور باقی رہنے کے آثار اور تیور ہیں بقول ناسخ

زندگی زندہ دلی کا ہے نام   مُردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

تلامذۂ غالب پر ایک نظر

نثار احمد فاروقی

میرزا اسداللہ خاں غالب، اُردو کے وہ خوش نصیب شاعر ہیں جن کی زندگی اور فن کے بہت سے گوشوں پر سیر حاصل بحث کی جا چکی ہے۔ اور بعض عالموں نے اپنی عمرِ عزیز کا بڑا حصہ اُن کی تحقیق و تفتیش میں بسر کر دیا ہے۔ یوں تو "غالب شناسی" کی مہم کا آغاز حالیؔ نے کیا تھا، لیکن اُن کے بعد جن حضرات نے غالبیات کے سلسلے میں گراں قدر اضافے کیے ہیں۔ اُن میں قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی، مالک رام اور مہیش پرشاد امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اُن میں بھی جناب مالک رام کو ایک حیثیت سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اوروں نے غالب پر تحقیق کو "پھیلایا" ہے۔ اور انھوں نے "سمیٹا" ہے، چنانچہ "ذکرِ غالب" سوانحی خوبیوں کے لحاظ سے بے مثال بھی ہے، اور مثالی بھی۔

پچھلے سال جناب مالک رام کی ایک اور کتاب "تلامذۂ غالب" شائع ہوئی تھی۔ اس میں غالب کے (۱۴۶) شاگردوں کے حالات، زندگی اور اُن کے کلام کا انتخاب شامل ہے۔ اس کی ترتیب و تالیف اور تلاش و تحقیق میں کتنی محنت کی گئی ہے۔ اس کا اندازہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ مؤلف نے (۱۴۸) مختلف مطبوعہ اور قلمی کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ جن میں (۲۳) رسائل و جرائد کے مجلدات بھی شامل ہیں۔ اس کتاب میں غالب کے (۲۷) تلامذہ کی تصویریں بھی جمع کر دی گئی ہیں۔ جن میں بعض بہت نادر ہیں، اور پہلی بار منظرِ عام پر آئی ہیں۔ اس کے علاوہ (۳۹) نام ایسے ہیں جن کا تذکرہ ضمناً حواشی میں آ گیا ہے، اور مؤلف نے اُن کے بارے میں بھی مفید معلومات مختصر پیرائے میں مہیا کر دی ہیں۔

ایک انگریز نقاد نے لکھا تھا کہ اچھا لکھنے والا وہ ہے، جو یہ بھی جانتا ہو کہ "کیا بات نہیں لکھنی چاہیے"! مالک رام کی تحریروں میں یہ وصف بہت نمایاں ہے وہ اپنے موضوع کا پوری طرح احاطہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں اور "انتخابِ مواد" کا حیرت انگیز ملکہ رکھتے ہیں۔ اُن کی تحریروں میں احتیاط، توازن، وقار اور سنجیدگی کے ساتھ دلکشی اور جاذبیت موجود ہے اور تحقیقی مضامین کے لیے اُن کا اسٹائل نہایت موزوں ہے۔

"تلامذۂ غالب" چونکہ اپنے موضوع پر واحد اور اہم کتاب ہے اس کے علاوہ اس کی حیثیت ایک "تذکرے" کی ہے۔ اس لیے میں یہاں اس کے بعض تسامحات کا ذکر کروں گا تاکہ فاضل مؤلف آئندہ ایڈیشن کی تیاری کے وقت اُن پر غور فرما سکیں، اور میری رائے سے متفق ہوں تو اس کی تصحیح کی جا سکے۔

اس کتاب میں جو فرو گذاشتیں ہوئی ہیں اُن کی نوعیت یہ ہے کہ اکثر کتابت کی غلطیاں ہیں، لیکن جہاں یہ باور کرنے کے لیے

صریح قرینہ موجود ہے، میں نے نظر انداز کر دیا ہے۔ بعض ماخذ مؤلف کی دست رس سے باہر رہ گئے، اُن کی طرف میں نے اشارہ کر دیا ہے۔ کئی جگہ مجھے شبہ وارد ہوتا ہے اور بعض امور محض میری رائے سے علاقہ رکھتے ہیں۔

۱۔ امراؤ مرزا انورؔ دہلوی کے ترجمے میں لکھا ہے: "۱۸۵۷ء کے بعد پہلے رامپور اور وہاں سے جے پور گئے۔ وہیں ۱۸۸۵ء (۱۳۰۲ھ) میں ۳۸ برس کی عمر میں خدا کو پیارے ہوئے۔"[1]

اس حساب سے انورؔ کا سال پیدائش ۱۸۴۷ء قرار پاتا ہے۔ اس کے بعد یہ بیان پڑھیے:

> "نواب سعید الدین احمد خاں طالبؔ نے اپنے والد نیر درخشاں سے اُن کی شاگردی کے سلسلے میں ایک عجیب روایت نقل کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ جب... عارفؔ کو خطِ نسخ سیکھنے کا شوق ہوا تو وہ سید جلال الدین یاقوت رقمِ ثانی ...... کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُن دنوں عارفؔ کی شاعری کا نام شہرہ تھا، اُدھر میر جلال الدین کے اِن دونوں صاحبزادوں کو شاعری کی چٹیک تھی، اور وہ ایک اچھے استاد کی ٹوہ میں تھے۔ میر جلال الدین کو یہ اچھا موقع ہاتھ آیا۔ انھوں نے عارفؔ سے کہا کہ میں آپ کو یوں تو شاگرد کرتا نہیں ہاں تبادلہ کرتا ہوں۔ یعنی میں آپ کو نسخ کی تعلیم دوں گا۔ اور اس کے اصول بتاؤں گا، آپ میرے دونوں لڑکوں کو شاعری کے رموز بتائیں اور شاعر بنا دیں۔ عارفؔ مرحوم نے منظور کر لیا اور معاملہ اس پر طے ہو گیا۔ اگرچہ عارفؔ نے ایک سال کے بعد سلسلۂ تعلیم ختم کر دیا، اور استاد نے سند لکھ دی، لیکن ظہیرؔ اور انورؔ مدتوں عارفؔ سے اصلاح لیتے رہے...... جب بہادر شاہ ظفرؔ کو اُن کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے ان دونوں کو استاد ذوقؔ کے سپرد کر دیا۔..... ذوقؔ کے بعد انورؔ غالبؔ سے مشورہ کرنے لگے تھے....."[2]

ذوقؔ کی وفات ۱۶ نومبر ۱۸۵۴ء کو ہوئی[3] اور عارفؔ نے اپریل ۱۸۵۲ء میں انتقال کیا۔[4] اگر طالبؔ مرحوم کی مذکورہ بالا روایت کو صحیح سمجھا جائے تو اس کے ساتھ ہی یہ تسلیم کرنا بھی لازم آتا ہے کہ انورؔ نے ۴۔۵ سال کی عمر میں عارفؔ سے استفادہ کیا اور ۶۔۷ سال کی عمر میں ذوقؔ سے۔ اور یہ عادتاً محال ہے کہ انھوں نے عالمِ شیر خوارگی ہی میں شعر کہنا شروع کر دیا ہو۔ جبکہ "ظہیرؔ اور انورؔ مدتوں عارفؔ سے اصلاح لیتے رہے" سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عارفؔ کی وفات (۱۸۵۲ء) سے بہت پہلے تعلقِ تلمذ پیدا ہو چکا تھا۔

---

[1] تلامذہ/۴۲

نوٹ: یہ تبصرہ میں نے مخدومی و مکرمی حکیم سید حسن مثنیٰ رضوی امروہوی مدظلہ کے ارشاد کی تعمیل کرتے ہوئے لکھا ہے اور اس میں بڑی حد تک موصوف کے مشوروں کو بھی دخل ہے۔ حکیم صاحب عزلت پسند انسان ہیں۔ اس لیے گم نام بھی ہیں، ورنہ بے پناہ قوتِ حافظہ رکھنے کے ساتھ عربی، فارسی اور اردو کے علمی خزانوں پر پورا عبور اور ناقدانہ نگاہ رکھتے ہیں۔ میں بھی اُن کے خوانِ علم کا زلہ ربا ہوں۔ ن — ا — ف

[2] تلامذہ/۴۱ [3] ذکر غالب (طبع سوم)/۹۱ [4] ایضاً/۱۳۷

انور کا دیوان ۱۸۹۹ء میں مطبع رفاہِ عام لاہور سے شائع ہوا تھا۔ اس کے خاتمے پر ایک طویل تقریظ، انور کے بھائی ظہیر دہلوی کی بھی شامل ہے۔ انھوں نے بھی یہی لکھا ہے کہ "فنِ سخن کا اکتساب شیخ محمد ابراہیم ذوق و میرزا اسد اللہ خاں غالب سے کیا تھا مگر شاید کوئی ایک ایک دو دو غزل دکھانے کا اتفاق ہوا ہو" (دیوان انور/۴۷۱)

لیکن مجھے پھر بھی یہ قبول کرنے میں تامل ہے کیونکہ ذوق کی وفات کے وقت انور محض طفلکِ ناداں تھے۔

۲۔ منشی غلام بسم اللہ بسمل میرٹھی کے حال میں لکھا ہے: "نعت بھی کہتے تھے۔ چنانچہ نعتوں کا ایک مجموعہ "نالۂ بسمل" کے عنوان سے شائع کیا تھا۔"[1]

"نالۂ بسمل" کا ایک نسخہ میرے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے۔ یہ ۳۲ صفحوں کا مختصر سا رسالہ ہے۔ جسے "نعتوں کا مجموعہ" ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی کیفیت خاتمۂ کتاب کے مندرجہ ذیل ترقیمے سے ظاہر ہو گی:

> "شکرِ خداوندِ ذو الجلال کہ نسخۂ عدیم المثال دُور حال پُر ملال، حضرتِ بلال رضی اللہ عنہ، از تصنیفِ لطیف، عاشقِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، مولوی غلام بسم اللہ صاحب بسمل رئیس بریلی...... ارشد تلامذۂ نواب اسد اللہ خاں صاحب غالبؔ، مطبع مطلع العلوم و اخبار نیرِ اعظم مراد آباد میں...... ۲۰ اکتوبر ۱۸۹۶ء کو چھپ کر سرمۂ چشمِ مشتاقاں ہوا۔"[2]

حضرت بلالؓ کا یہ قصہ ترکیب بند مسدس کی شکل میں نظم ہوا ہے۔ پہلا بند یہ ہے:

طالبِ مولیٰ کا فسانہ ہے یہ — تارکِ دنیا کا فسانہ ہے یہ
راغبِ عقبیٰ کا فسانہ ہے یہ — عاشقِ شیدا کا فسانہ ہے یہ
دل سے سنو دوستو یہ داستاں
لکھتا ہے یوں راویِ رنگیں بیاں

خاتمے پر بھی لکھا ہے: "تمام شد نسخۂ وفات نامۂ بلال رضی اللہ عنہ"۔ اس کے بعد ایک نعتیہ قصیدہ ہے اور پھر قدسی کی مشہورِ عالم نعت "مرحبا سید مکی مدنی العربی" کی تضمین ہے۔ تضمین کے بعد "تاریخ تصنیف ریختۂ قلم...... حضرت مولوی صاحب عالم متخلص بہ صاحب...... کہ بسیار طول دادہ بودند چند اشعار ازاں چیدہ نوشتہ شد"۔[3]

بسمل ہی کے ترجمے میں لکھا ہے کہ "حضرت شاہ عبد الرحمٰن (گنج) سے بیعت تھے۔"[4] "گنج" اُن کا لقب نہیں، اس سے عموماً قاری کو دھوکا ہو جاتا ہے۔ ثانیاً یہ کہ مجھے شبہ ہے، وہ حضرت شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی سے بیعت ہوں گے۔ اور یہ نام غلط لکھا گیا ہے۔

۳۔ لالہ بالمکند بے صبر کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ "دیوان اور ایک مثنوی "لختِ جگر" مطبوعہ موجود ہے۔"

---

[1] تلامذہ/۴۹ [2] نالۂ بسمل/۳۲ [3] ایضاً/۳۱ [4] تلامذہ/۴۹

مثنوی میں ۲۵۰۰، شعر ہوں گے۔ ایک دوسری مثنوی "اخگرِ عشق" غیر مطبوعہ رہ گئی۔ یہ ۱۲۷۳ھ
میں لکھی گئی تھی۔ "لالۂ پُر داغ" تاریخ ہے۔"[۱]

صرف یہی نہیں، بے صبر کا بہت سا اردو، اور فارسی کلام غیر مطبوعہ ہے۔ ان کے ضخیم کلیات کا ایک قلمی نسخہ محبّی ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو دستیاب ہوا ہے جو تقریباً ۸۳۴ صفحات کو محیط ہے۔ اس میں غزلیں، مثنویاں، قصائد، قطعات، رباعیات، تاریخیں، مسدّس، مخمّس سبھی کچھ موجود ہیں۔ چند قصائد مرزا غالب کی مدح میں بھی ہیں۔ اور اُن کا بیشتر حصہ غیر مطبوعہ ہے۔ یہ کلیات صحت اور اہتمام سے مرتب ہو کر شائع ہو جائے تو بے صبر کی ساری عمر کی کمائی محفوظ ہو جائے گی۔

۴۔ ذیلی حاشیے میں شیخ مہدی علی ذکی مراد آبادی کے ترجمے میں لکھا ہے کہ "کلیات مطبوعہ موجود ہے۔" ذکی کا کلیات آج تک نہیں چھپا، البتہ ان کا اردو دیوان طبع ہوا تھا۔ اور اب بہت کمیاب ہے۔ دیوان ذکی کا ایک قلمی نسخہ دہلی یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔ اور اُس میں مطبوعہ نسخے سے بعض اختلافات کے علاوہ کچھ کلام زائد بھی ہے۔ یہ نسخہ وفاتِ ذکی کے چند سال بعد اُن کے ایک شاگرد نے لکھنؤ میں نقل کیا تھا۔

۵۔ قاضی عبدالجلیل جنوں کے بارے میں لکھا ہے: "کتب درسیہ صدر الصدور مفتی عنایت اللہ (مصنف تواریخ حبیب اللہ) سے پڑھیں۔"[۲] ان کا صحیح نام مفتی عنایت احمد ہے۔ یہ کاکوری کے رہنے والے تھے اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔"[۳]

۶۔ حالی کے حال میں لکھا ہے: "اردو کے علاوہ فارسی اور عربی میں بھی یکساں دستگاہ تھی اور ان زبانوں میں بھی اُن کا مختصر دیوان موجود ہے۔"[۴]

حالی کا اردو دیوان عام طور سے مل جاتا ہے۔ عربی اور فارسی میں اُن کا کوئی دیوان نہیں، فارسی کی چند غزلیں اور نظمیں (مثلاً مرسید کا مرثیہ) اور عربی میں چند اشعار ہیں۔ انھیں "مختصر دیوان" کی حیثیت میں تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اُن کا یہ کلام اگست ۱۹۱۴ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا تھا۔ (حالی کی تصانیف کے سلسلے میں ملاحظہ ہو رسالہ صحیفہ لاہور دسمبر ۱۹۵۸ء)

۷۔ شاہ رؤف احمد رافت رامپوری کا حال حاشیۂ ذیلی میں لکھا ہے، اور یہ کہ "اپنے مرشد کے ملفوظات "دار المعارف" کے عنوان سے جمع کیے۔"[۵]

اس مجموعہ کا صحیح نام "دُرُّ المعارف" ہے۔ اور یہ حضرت شاہ غلام علی نقشبندی کے ملفوظات ہیں۔

۸۔ ذیلی حاشیے ہی میں جارج پیش شور کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن اُن کی تصانیف میں منظوم سوانح عمری کا نام نہیں آیا۔ یہ بھی طبع ہو چکی ہے۔

۹۔ نواب سید سجاد مرزا، سجاد دہلوی کے ترجمے میں لکھا ہے: "پدری سلسلہ برہان الملک سعادت علی خاں میر محمد امین نیشاپوری نواب وزیر اودھ کے واسطے سے حضرت امام موسیٰ کاظم سے ملتا ہے۔"[۶]

میر محمد امین نیشاپوری کو محمد شاہ پادشاہ کے دربار سے "سعادت علی خاں برہان الملک" کا خطاب ملا تھا۔ "سعادت علی خاں" اُس کا نہیں، اودھ کے پانچویں وزیر کا نام ہے جو آصف الدولہ کے بعد مسندِ آرائے ریاست ہوا تھا۔

---

[۱] تلامذہ/۵۵ [۲] ایضاً/۶۷ [۳] تفصیل کے لیے: تذکرہ مشاہیر کاکوری از حافظ محمد علی حیدر، اور نُزہۃُ الخواطر و بہجۃ المسامع والنواظر۔ الجزءُ السابع/۳۴۱ شائع کردہ دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن۔ (۱۹۵۹ء)

[۴] تلامذہ/۸۸ [۵] تلامذہ/۱۰۴ [۶] تلامذہ/۱۴۴

یہ کہ پدری سلسلہ کا برہان الملک کے واسطے سے ملنا محال ہے۔ اُس کی اولاد میں ایک بیٹا اور چھ بیٹیاں تھیں، بیٹا نوعمری ہی میں چیچک یا کسی اور بیماری سے مرگیا تھا[1] اسی لیے برہان الملک کے بعد خلعتِ وزارت اُس کے بھانجے اور داماد مرزا مقیم کو عطا ہوا جس نے بعد میں "صفدر جنگ" کا خطاب دربار شاہی سے حاصل کیا۔ سعادت خاں کے ایک بھائی سیادت خاں تھے، یہ ممکن ہے کہ سجاد کا پدری سلسلہ ان کے واسطے سے حضرت موسیٰ کاظم تک پہنچتا ہو۔

۱۰۔ نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ پر "باغیوں کی مجرمانہ اعانت" کا الزام، اُن کی گرفتاری، اور پھر رہائی کے سلسلے میں نواب صدیق حسن خاں کی کوشش و سفارش کا واقعہ بیان کرتے ہوئے جناب مالک رام نے لکھا ہے:

> "ان کی رہائی کے لیے نواب والاجاہ، امیر الملک مولوی صدیق حسن خاں بہادر (بھوپال) نے بعض انگریزی حکام کے توسط سے خاص کوشش کی تھی۔ اُن کا مقدمہ مولوی مومن علی خاں سندیلوی صدر الصدور کی عدالت میں تھا۔ نواب والاجاہ نے اُن کے نام سفارشی خط لکھا۔ خدا کے فضل سے شیفتہ رہا ہو گئے۔ لیکن جائیداد ضبط ہو گئی۔ رہائی کے بعد انھوں نے شکریے کا خط نواب صدیق حسن خاں بہادر کو لکھا اور کہا کہ نجاتِ صُوری تو ہو گئی لیکن نجاتِ معنوی ابھی باقی ہے۔ یعنی جب تک ذریعۂ معاش پیدا نہ ہو زیست محال ہے۔ اس پر نواب صاحب نے دوسرا خط صدر الصدور موصوف کے نام لکھا تو نصف جائیداد بھی واگذاشت ہو گئی"[2]

مؤلفِ تلامذہ نے یہ واقعہ "شمع انجمن" کے حوالے سے لکھا ہے[3]۔ لیکن اس معاملے میں ایک بات وضاحت طلب رہ گئی۔ نواب صدیق حسن خاں نے خود اپنا حال متعدد جگہ لکھا ہے[4]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۹ جمادی الاول ۱۲۴۸ھ کو پیدا ہوئے تھے۔ پانچ سال کی عمر میں یتیم ہو گئے۔ ماں نے پرورش کی اور :

> "بچوں زمانِ شعور آمد در خانہ ہیچ شے از اسبابِ دنیا جز کتاب خانہ متروکۂ والد مرحوم ندید"[5]

طلب علم میں گھر سے نکلے کانپور، فرخ آباد ہوتے ہوئے، ۱۲۶۹ھ میں دہلی آئے اور شیفتہ کے گھر قیام کیا۔ ایک سال ۸ ماہ دہلی میں رہے اور مفتی صدر الدین خاں آزردہ کے درس میں شریک ہوئے۔ ۱۲۷۶ھ میں بھوپال گئے۔ وہاں ماموں مفتی محمد حسین کے گھر قیام کیا اور انھیں کے وسیلے سے ملازم ہوئے۔ نائب اوّل ریاست مدار المہام محمد جمال الدین خاں بہادر کی بیوہ دختر سے عقد کیا، (۵ شعبان ۱۲۷۷ھ)۔ ازاں بعد ۱۲۸۷ھ میں نواب شاہ جہاں بیگم والیہ بھوپال سے ۸ شوال کو عقد ہوا۔ یہاں سے اُن کا عروج اور رسوخ کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ ۱۲ ربیع الثانی ۱۲۸۶ھ کو دربار عام میں عہدۂ نیابت دوم ریاست کا خلعت، قیمتی بیس ۲۰ ہزار روپیہ، "زاویہ مروارید و اقمشۂ پوشیدنی و قلمدانِ نقرہ و آفتابی و پالکی و سپر و شمشیر و کمر بند و فیل وغیرہ مع خریطۂ عہدہ" خود بیگم بھوپال نے عطا فرمایا، پہلے "میر دبیر ریاست" تھے۔ اب خطاب "معتمد الدولہ سید محمد صدیق حسن خاں بہادر نائب دوم ملک محروسۂ ریاست بھوپال" ہوا۔ پھر پچاس ہزار سالانہ کی جاگیر اور ضرب توپ اور

---

[1] نجم الغنی: تاریخ اودھ جلد ۱/۸۳ [2] تلامذہ/۱۸۱ [3] شمع انجمن/۲۴۴ [4] مثلاً ملاحظہ ہوں: (۱) حِطّہ فی ذکر الصحاح الستّہ۔ (۲) ابجد العلوم جلد ۳/۹۳۹ (۳) اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہاء المحدثین/۲۶۳ تا ۲۷۱ (۴) الفرخ النامی وغیرہ [5] اتحاف النبلاء/۲۶۳

طاب کو نواب ذالاجاہ امیر الملک" عطا ہوا۔

شیفتہ کا جو خط "شمع انجمن" میں نقل ہوا ہے۔ وہ یکم شعبان ۱۲۷۶ھ کا مکتوبہ ہے۔ اُس سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ نواب صدیق حسن خاں نے اُن کی رہائی کے لیے کوشش کی تھی۔ لیکن یہ اُن کے ذاتی اثر و رسوخ سے نہ تھی بلکہ بعض حکام انگریزی کے واسطے و وسیلے سے تھی۔ ورنہ اس زمانے یں اُن کی حیثیت ایک غیر معمولی سر رشتہ دار سے زیادہ نہیں تھی۔ اُن کا عروج تو شیفتہ کی وفات کے بھی دو سال بعد ہوا ہے۔

۱۱۔ سید فرزند احمد صفیر بلگرامی کے ترجمے میں لکھا ہے کہ "مئی ۱۸۶۵ء میں اپنے ماموں جناب شاہ عالم شائق کے ساتھ دہلی پہنچ ر غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بہت دن تک اُن کے پاس رہ کر استفادہ کیا۔ غالب کی وفات کے بعد، چندے غلام حسنین قدر بلگرامی سے بھی مشورہ کرتے رہے۔"[1]

صفیر نے قدر سے مشورہ کیا ہو، اس پر بھی مشکل سے یقین کیا جا سکتا ہے۔ اس پر بھی وہی شبہ وارد ہوتا ہے جو عاشق کے، فرحتی ے اصلاح لینے پر مؤلف تلامذہ نے وارد کیا ہے[2] قدر ۱۲۴۹ھ (۱۸۳۳ء) میں پیدا ہوئے[3] اور صفیر ۱۲۴۹ھ (۱۸۳۴ء) ۔ یعنی دونوں تقریباً ہم عمر تھے اور ہم طرح بھی۔ صفیر نے امان علی سحر اور میرزا دبیر سے بھی مشورہ کیا تھا۔ قدر نے بھی فتح الدولہ برق اور وسے عروض وغیرہ کی تحصیل کی تھی۔ امداد علی بحر سے بھی شاید مشورۂ سخن کیا ہو۔ بعد میں دونوں نے غالب کا تلمذ اختیار کیا۔ غرض قدر اور فیر ہم عمر ہونے کے ساتھ ہم طرح اور ہم پلہ تھے۔ اور مجھے یاد آتا ہے کہ ایک بار دونوں نے ایک ہی زمین میں منقبت لکھ کر فیصلے کے لیے الب کے پاس بھیجی تھی جس پر انھوں نے گول مول سی رائے ظاہر کر دی تھی۔ (غالب کے اُس خط کا حوالہ سر دست مجھے نہیں ملا۔)

۱۲۔ سید قطب الدین دلاور علی طرزی ہاپوڑی کے ترجمے میں لکھتے ہیں کہ:

> "مولانا مملوک علی کے درس حدیث میں یہ اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی مرحومؒ
> ہم سبق تھے۔ مولانا تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ دلاور علی اور تو سب کام کر لیتے تھے لیکن
> روٹی پکانے سے ہمیشہ کتراتے تھے۔ اور یہ کام میرے سپرد تھا۔"[5]

مولانا مملوک علی کا انتقال ۱۲۶۷ھ میں ہوا[6]۔ آثار الصنادید کی تالیف کے وقت وہ چودہ پندرہ برس سے دہلی میں درس دیتے تھے[7]۔ کیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ولادت ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ (چہار شنبہ) کو ہوئی[8] "کرم عظیم" مادۂ تاریخ ولادت ہے۔ ابتدائی یات کی تعلیم کے بعد ۱۲۹۵ھ میں مدرسۂ دیوبند میں داخل ہوئے۔ اور ۱۳۰۱ھ میں فارغ التحصیل ہوئے[9]۔ غرض یہ محالات میں سے ہے ولانا اشرف علی تھانویؒ، طرزی کے ہم درس رہے ہوں۔ یہاں شاید مؤلف کا سہو قلم ہو۔ نام، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (بانی دار العلوم دیوبند) و سکتا ہے۔

۱۳۔ (الف) ترجمۂ احمد حسن عرشی قنوجی میں، اُن کے والد مولانا سید اولاد حسن کے نام کے بعد قوسین میں (۱۸۰۵ء–۱۸۳۸ء)

---

[1] تلامذہ/۹۴؛ [2] تلامذہ/۲۲۵ [3] تلامذہ/۲۴۸ [4] تلامذہ/۱۹۴ [5] تلامذہ/۲۰۳ [6] عبدالحی: نزہۃ الخواطر
و بہجۃ المسامع والنواظر، الجزء السابع/۴۸۷ (۱۹۵۹ء) [7] سرسید: آثار الصنادید (طبع اول)
[8] عزیز الحسن: اشرف السوانح/۱۶ (۱۳۵۴ھ) [9] ایضاً/۲۴-۲۵

لکھا ہے۔ بظاہر اس کا مطلب یہی ہے کہ مؤلف کے نزدیک اُن کا سال ولادت ۱۸۰۵ء اور سال وفات ۱۸۳۶ء ہے۔ مولانا اولاد حسن ۱۲۱
میں پیدا ہوئے تھے[1] اور ۱۲۵۳ھ میں اُن کا انتقال ہوا۔ عمر ۴۳ برس کی پائی۔ اس حساب سے پیدائش کا عیسوی سال سنہ ہونا چاہیے
نہ کہ ۱۸۰۵ء۔

(ب) احمد حسن عرشی قنوجی کی تحصیل علمی کے حال میں لکھا ہے کہ: "علوم کتاب و سنت کی سند شیخ صالح عبدالغنی، اور سید فاروقی مجدد
اور مولانا سید عبدالغنی مدنی سے لی۔"[2]

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے تین اساتذہ سے سند حدیث لی۔ حالانکہ یہ ایک ہی نام ہے۔ "شیخ صالح" کسی کا نام یا نام ک
حصہ نہیں، بلکہ تعظیمی الفاظ کے طور پر لکھا گیا ہے، اور "سید فاروقی مجددی" کسی مختلف فرد کا نام نہیں۔ ایک ہی شخص کی نسبت ہے۔ صدیق ح
کا بیان ہے:

> "کتب حدیث از شیخ صالح عبدالغنی بن ابوسعید الفاروقی المجددی نزیل مدینۂ منورہ فرا گرفت....
> و ایں اجازت در سنہ احدی و سبعین و مأتین و الف (۱۲۷۱ھ) حاصل نمود...."[3]

نواب صدیق حسن خاں نے اجازت نامے کے الفاظ بھی نقل کیے ہیں۔ یہ شاہ عبدالغنی صاحب دہلوی ہیں۔ جو حضرت شاہ ابو سع
(خلیفہ شاہ غلام علی نقشبندی) کے فرزند تھے۔ نسباً فاروقی اور مشرباً مجددی تھے۔ مقامات مظہری کا ضمیمہ انھیں کا لکھا ہوا ہے۔ سر سید احمد خا
آثار الصنادید میں دونوں بزرگوں کا احوال لکھا ہے[4] اور خود جناب مالک رام نے اسی کتاب میں اُن کا ترجمہ حاشیے پر درج کیا ہے[5]

(ج) عرشی کے سفر حج کی نیت سے جانے اور بڑودہ میں قیام کرنے کا بھی تذکرہ ہے، اور جناب مالک رام نے لکھا ہے کہ
"بڑودہ پہنچ کر ایک ہم نام دوست، حکیم سید احمد حسن فنا (شاگرد غالب) کے مکان پر اترے۔ (تذکرۂ علمائے ہند" میں لکھا ہے کہ مو
غلام حسین قنوجی کے مکان پر ٹھیرے تھے)"[6]

مؤلف نے جو عبارت قوسین میں لکھی ہے۔ وہ شاید انھیں ضعیف روایت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن خود نواب صدیق حسن خاں نے
بھی لکھا ہے کہ عرشی بڑودہ میں غلام حسنین کے مکان پر فروکش ہوئے تھے۔ ان کے گھر ہی عرشی کا انتقال ہوا۔ اس لیے رحمن علی، مؤلف تذکرہ
کی روایت قابل ترجیح ہے۔

ضمناً دو باتیں اور عرض کر دوں: "تلامذہ" میں "غلام حسین" نام لکھا گیا ہے۔ لیکن صحیح نام غلام حسنین ہے[7]۔ نیز یہ لکھا ہے کہ
"بڑودہ میں تکیہ ماتریہ میں مدفون ہیں"[8] ممکن ہے کہ یہ کتابت کی غلطی ہو "ماتریدیہ" ہونا چاہیے۔ یہ صوفیا کے ایک سلسلے کا نام ہے۔

۱۴۔ منشی محمد حسین محمود دہلوی کی ایک مثنوی "تحفۂ محمود" کا تذکرہ مؤلف نے کیا ہے اور اُسی کے خاتمے کی عبارت سے مخت
حال اخذ کر کے لکھا ہے[9] ان کی ایک غزل اکمل الاخبار، دہلی (اگست ۱۸۶۹ء) میں شائع ہوئی تھی وہ نقل کر دی ہے۔ محمود کی ایک
تصنیف مختصر رسالہ "قول فیصل" بھی ہے۔ یہ ۱۸۸۰ء کا مطبوعہ ہے۔ اُس کے سرورق کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس میں

---

[1] اتحاف النبلا/۲۳۵ [2] تلامذہ/۲۳۱ [3] اتحاف النبلا/۲۲۲-۲۲۳ [4] آثار الصنادید/۲۶ (طبع اول)
[5] تلامذہ/۱۷۹-۱۸۰ (حاشیہ) [6] تلامذہ/۲۳۱ [7] ابجد العلوم جلد ۳/۹۳۳ [8] تلامذہ/۲۳۱ [9] تلامذہ/۲۵۶

پرانی شاعری کا محاکمہ ہے۔ اس میں حالی اور غالب وغیرہ اساتذہ کی غزلوں کے علاوہ محمود کی اپنی غزلیں بھی شامل ہیں۔ یہ رسالہ بہت دن ہوئے مرحوم میں ایک صاحب کے پاس میں نے دیکھا تھا۔ اور اس وقت وہ آسانی سے دستیاب نہیں ہو سکتا۔

۱۵۔ احمد حسین مرزا پوری کا حال دو تخلصوں (تمنا اور بینا) کے ذیل میں لکھا ہے اور یہ صراحت بھی کر دی ہے کہ غالباً بینا اور تمنا میں تصحیف ہو گئی ہے[1] اگر یہ صحیح تھا تو دو جگہ تذکرہ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

۱۶۔ نواب یوسف علی خاں ناظم (رامپور) کو لکھا ہے کہ آپ "نسباً حسینی سید تھے۔" اگرچہ حاشیے میں اختلاف کی صراحت کر دی گئی ہے۔ لیکن سیادت کی روایت کو ظاہراً ترجیح دی ہے۔ میرے خیال میں یہ صحیح نہیں۔ قدیم تاریخیں اور تذکرہ نگار علی محمد خاں کو "افغان" یا "روہیلہ" ہی لکھتے ہیں۔ نجم الغنی رامپوری نے اُن کو سید ثابت کرنے کے لیے بڑی طومار بندی کی ہے۔ لیکن اُن کے دلائل حد درجہ بودے ہیں۔

۱۷۔ بعض شعرا کے تراجم تو تلامذہ میں شامل ہیں۔ لیکن یا تو اُن کے تلمذ کا ثبوت نہیں دیا گیا یا وہ میری نظر میں مشکوک ہیں۔ جب تک ان کے تعلق تلمذ کی سند دستیاب نہ ہو۔ مثلاً :

(۱) فرزند علی اخگر عظیم آبادی	(ص ۲۹)	(۲) عین الحق بے صبر کالھوی	(ص ۵۷)
(۳) غلام محمد تپش دہلوی	(ص ۵۹)	(۴) شاہزادہ بشیر الدین توفیق	(ص ۶۸)
(۵) جمشید علی خاں جم	(ص ۴۷)	(۶) حکیم معشوق علی خاں جوہر	(ص ۸۰)
(۷) خلیفہ حسام الدین حسام	(ص ۹۳)	(۸) محمد ابراہیم خلیل وفوق	(ص ۱۰۱)
(۹) دیبی پرشاد سرور	(ص ۱۵۰)	(۱۰) انور علی شاہ	(ص ۱۶۶)
(۱۱) سید محمد بشیر خاں شبیر	(ص ۱۷۶)	(۱۲) حکیم محمد علی صوفی	(ص ۱۹۸)
(۱۳) سردار محمد خاں غالب	(ص ۱۹۹)	(۱۴) مرزا سرفراز حسین طرار	(ص ۲۰۲)
(۱۵) پیارے لال ظہیر	(ص ۲۱۸)	(۱۶) شنکر دیال عاشق	(ص ۲۲۳)
(۱۷) عاشق حسین عاشق	(ص ۲۲۶)	(۱۸) سید محمد سلطان عاقل	(ص ۲۲۶)
(۱۹) سید بدر الدین احمد کاشف	(ص ۲۵۰)	(۲۰) مصلح الدین منصور	(ص ۲۶۵)
(۲۱) احمد حسین یکتا	(ص ۲۶۸)	(۲۲) وحید الدین وحید دہلوی	(ص ۲۶۴)
(۲۳) شکور احمد وکیل	(ص ۲۹۹)		

مندرجہ بالا شعرا میں بہت سے وہ ہیں جن کے تلمذ کی روایت ضعیف ہے، یا اس کی تصدیق کا قدیم تر ذریعہ نہیں۔ انھوں نے بالفرض اگر غالب سے اصلاح لی بھی ہو تو ایک دو غزلوں سے زیادہ دکھانے کا موقع نہ ملا ہو گا۔

۱۸۔ مقدمہ میں مؤلف تلامذہ نے اعتراف کیا ہے کہ: "ایسے بھی شاعر تھے کہ اُن کا صرف تخلص ہی معلوم ہو سکا، نام اور کلام تک رسائی نہ ہوئی مثلاً آزردہ، وغیرہ۔ میں نے دانستہ سلسلہ میں اُن کا ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ محض فہرست کو لمبا کرنا مقصود نہیں تھا۔ بعض اصحاب

---

[1] تلامذہ/۶۶ - اور - ۲۶۹

ایسے تھے کہ اُن کا نام اور تخلص دونوں معلوم ہو گئے۔ اگرچہ نہ مفصل حالات ملے نہ زیادہ کلام ہی ہاتھ لگا۔ مثلاً حسام، درد، ذکی، رابطہ، سالم وغیرہ
انھیں البتہ میں نے سلسلہ میں درج کر لیا ہے"[1]

اگر ان شعرا کو اتنی کمزور شہادتوں کے ہوتے بھی زمرۂ تلامذہ میں شامل کر لیا گیا تو الگزنڈر ہیڈرلی آزاد کا ترجمہ کیوں شامل تذکرہ
نہیں جس کے تلمذ کا نسبتاً قوی ثبوت موجود ہے۔

الگزنڈر ہیڈرلی آزاد، ایک فرانسیسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اور بقول رام بابو سکسینہ "ہند یورپی نسل کے شاع
تھے۔ غالباً ۱۸۲۹ء میں اُن کی ولادت ہوئی اور اٹھارہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ پہلے اپنا کلام زین العابدین خاں عارف کے پاس
اصلاح کے لیے بھیجتے تھے۔ بعد میں مرزا غالب سے مشورہ کیا۔ اُردوئے معلیٰ کے ایک خط میں غالب نے اُن کا تذکرہ بھی کیا ہے[2]

ان کا حال رام بابو سکسینہ نے تفصیل سے لکھا ہے[3] مولانا عبدالماجد دریا بادی، رسالہ معارف میں آزاد پر ایک مقالہ "غا
کا ایک فرنگی شاگرد" لکھ چکے ہیں[4]۔ نظرِ ثانی کے بعد یہ اُن کے مجموعہ مضامین میں بھی شامل ہے[5] آزاد کے بڑے بھائی تھامس ہیڈرلی بھ
شاعر تھے۔ انھوں نے ۱۸۶۳ء میں مطبع احمدی آگرہ سے آزاد کا دیوان طبع کرایا تھا۔ اس کا دیباچہ منشی شوکت علی ساکن شاہ پور ضل
فتح پور نے لکھا ہے:

"الگزنڈر ہیڈرلی ...... با محتشم الدولہ امیر الملک محمد اسد اللہ خاں بہادر سہراب جنگ
غالب متخلص و نواب زین العابدین خاں متخلص بہ عارف ...... بذریعہ مراسلات و مکاتبات
استمدادِ سخن داشتے"[6]

غالب سے، الگزنڈر ہیڈرلی کا متعارف ہونا تو اردوئے معلیٰ کے ایک خط سے ثابت ہے اور اس کا امکان ہے کہ زین العاب
خاں عارف کی وفات کے بعد انھوں نے غالب سے مشورۂ سخن کیا ہو۔ اگر یہ بات بے بنیاد ہوتی تو منشی شوکت علی دیباچۂ دیوان میں انھیں غا
کا شاگرد نہ لکھتے جو خود آزاد کے بھائی تھامس ہیڈرلی کی نگرانی میں چھپا تھا۔

۱۹۔ تلامذۂ غالب میں، قاضی عنایت حسین بدایونی کا ترجمہ "رشکی" تخلص کے ذیل میں لکھا گیا ہے[7] شعرائے بدایوں کے
ناقص تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے "رشکی" تخلص کرتے تھے۔ بعد میں فراق اختیار کیا۔ تذکرے کی عبارت یہ ہے:

"فراق۔ حاجی حافظ عنایت حسین، رئیس بداؤں۔ پہلے تخلص رشکی کرتے تھے، اب
فراق۔ انھوں نے نظم نویسی و نثر نگاری میں عمدہ لیاقت پیدا کی۔ علم کی تحصیل اچھی کی۔
یہ صاحب طراریٔ طبیعت و تیزیٔ ذہن و مضمون آفرینی میں بے مثال اور جملہ فنونِ شاعری

---

[1] تلامذہ/ ۷—۸ [2] غالب، اُردوئے معلیٰ/ ۱۳۹ (مبارک علی: لاہور ایڈیشن)
SAKSENA: European &
Indo European poets of urdu & persion. P71
[4] معارف: اعظم گڑھ جنوری ۱۹۴۲ء
[5] مقالات ماجد/ ۹ [6] ماسبق/ ۱۰ غالب کا خطاب اس میں سرتاپا غلط لکھا ہے۔ انھیں بہادر شاہ ظفر نے ۴ جولائی
۱۸۵۰ء کو "نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ" کا خطاب دیا تھا (دیکھیے ذکرِ غالب/ ۹۰) [7] تلامذہ/ ۱۲۰

> ہیں باکمال ہیں۔ پہلے مرزا غالب دہلوی کے شاگرد ہوئے تھے۔ اب حضرت مذاق مدظلہم العالی سے مشورتِ سخن رکھتے ہیں۔ چونکہ ہر قسم کی لیاقت عمدہ تھی۔ امتحان دے کر وکالت درجۂ اعلیٰ کی سند پائی۔ چند مدت تک عدالت دیوانی میں وکالت کرتے رہے۔ تھوڑے عرصے سے اُس کو ترک کیا۔ اب نواب ٹونک مقیم بنارس کے داروغہ کارخانہ جات ہیں۔"[1]

یہ ایک مختصر سا مطبوعہ رسالہ ہے جس میں صرف بدایوں کے شعرا کا مختصر حال اور انتخاب کلام ہے۔ ان میں تقریباً سب ہی شاہ دلدار علی مذاق (شاگرد ذوق) کے تلامذہ ہیں۔ چونکہ "اوّل و آخر ایں کہنہ کتاب افتاد است" اس لیے مصنف، عنوانِ کتاب، اور سالِ تالیف و طباعت کے بارے میں کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ داخلی قرائن سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۹۶ھ کے بعد کسی سال میں یہ لکھا گیا ہے۔"

مندرجہ بالا بیان، اور ترجمہ مندرجہ "تلامذۂ غالب" میں کچھ جزوی اختلافات ہیں۔ اُن کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے۔ ایک بات یہاں ضمناً اور عرض کرنا چاہتا ہوں۔ قاضی عنایت حسین ہی کے ترجمے میں لکھا ہے کہ: "جب موسیٰ ندی میں طغیانی آئی (۱۹۰۸ء) اور اُن کا گھربار نذرِ سیلاب ہوا تو اُسی میں کلام بھی ضائع ہو گیا۔"[2]

یہ مشہور طغیانی ۱۹۰۸ء میں نہیں غالباً ۱۹۰۴ء یا ۱۹۰۵ء میں آئی تھی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس طوفان میں جو اسباب تاراج ہوا، اُسی میں گلشنِ ہند، مرزا علی لطف کا ایک قلمی نسخہ جناب غلام محمد مددگار کیبنٹ کونسل دولتِ آصفیہ کو ملا تھا، جسے مولانا شبلی نعمانی نے ایڈٹ کر کے مقدمہ لکھا ہے اور وہ پہلی بار ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا تھا۔[3]

۲۰۔ تلامذہ میں متعدد اشعار اس طرح نقل ہوئے ہیں جو وزن میں نہیں ہیں۔ اُن میں کہیں سہوِ کاتب ہے اور کہیں خود مؤلف سے تسامح ہوا ہے۔ بہرحال اُن کی تصحیح ضروری ہے۔ ایسے اشعار کی ایک نامکمل فہرست پیش کرتا ہوں۔ صرف وہی مصرع لکھا گیا ہے جو ساقط الوزن ہے۔ اُس کے سامنے قوسین میں صفحہ کا حوالہ ہے:

انور ع: تم نہ ورنہ آفتِ صد کارواں ہو آج (۴۲) [صحیح: آفتِ رہ صد کارواں]
بیتاب ع: ساقی اگر نہیں، نہ ہو، مے سے کام ہے (۵۲) [صحیح: ساقی اگر نہیں ہے الخ]
بیدل ع: قطرہ میں بحر کا تماشا (۵۴) [صحیح: قطرے میں ہے الخ]
بے صبر ع: یار جب مجھ کو یاد آتا ہے + گریہ بے اختیار آتا ہے (۵۶) [یہ مطلع ہے، لہٰذا پہلا مصرع یوں ہونا چاہیے: یار جب مجھ کو یاد آتا ہے]
جوہر ع: روزے کہ دیدمت، شدم مبتلائے تو (۸۲) [صحیح: ...... شدہ ام الخ]
حزیں ع: سب ناز سہے میں نے بے جا اور بجا اُن کے (۹۳) [صحیح "بے جا و بجا"]
سیاح ع: مسندِ فقر او پہ زاہد نہ کرے کیوں تکیہ (۱۵۷) [صحیح: مسندِ فقر پہ الخ]

---

[1] تذکرہ شعرائے بدایوں (مطبوعہ و ناقص) / ۳۲-۳۳
[2] تلامذہ / ۱۲۰
[3] ملاحظہ ہو دیباچہ گلشنِ ہند

شیفتہ ع : کچھ انتظار مجھ کو نہیں، مے کا نہ ساز کا (۱۸۶) [صحیح : ..... مجھ کو نہ مے کا، نہ الخ]

شیفتہ ع : دل ہوا رنج سے خالی، تو جی بھر آیا (۱۸۶) [صحیح : ...... خالی بھی، الخ]

شیفتہ ع : آں جا کہ خندہ آید بر پادشاہ گدا را (۱۸۹) [صحیح : ...... بر پادشہ الخ]

صوفی ع : خوش ہوں جنوں سے ہیں، کہ کرتے ہیں التفات (۱۹۸) [صحیح : ..... کہ وہ کرتے ہیں التفات]

صوفی ع : بیک ملک دو حکمراں نگنجد (۱۹۸) [صحیح : یک ملک و دو حکمراں نگنجد]

صوفی ع : بار غم کیوں کر نہ ہووے سر احباب کو داب (۱۹۸) [صحیح : کیوں کہ]

طالب ع : نگر چل گیا وار تیر نگاہ کا (۲۰۰) [صحیح : تیرِ نگہ]

در قطعۂ تاریخ ع : رفتہ بخلد، طرزی شیریں بیاں (۲۰۴) [صحیح : "بخلدِ بریں]

تاریخ از صہبائی ع : آمد بلب خرد "چراغ دہلی" (۲۰۹) [صحیح : بہ لبِ خرد]

عارف ع : رہن ہو جائے نہ جبہ و دستار کہیں (۲۲۲) [صحیح : ہو نہ]

عزیز ع : بیا، کہ پیری جوان بجگر دانیم (۲۳۵) [غالباً : بیا کہ عشق بہ پیری الخ)

تاریخ از طالب ع : لاز نوشتش خود ز "اغفرلی" بر آر (۲۵۳) [صحیح : سالِ نوشتش]

مفتون ع : مثل چشم اغنیا تنگ است پیرہن مرا (۲۶۳) [صحیح : پیراہن]

مفتون ع : چہ خوشا! کہ قاتل من (۲۶۳) [خوشا کے بعد ایک لفظ کم ہے مثلاً "زندگی"

ناظم ع : میں نے کہا کہ دعوائے الفت مگر غلط (۲۷۷) [صحیح : دعویٔ الفت]

ناظم ع : تجھ سے کچھ شکوہ، اے فلک پیر نہیں (۲۷۸) [صحیح : مجھے اے فلکِ پیر]

ناظم ع : یہ روز سیہ ہے شب دیجور نہیں (۲۷۸) [صحیح : شبِ دیجور نہیں ہے]

نشاط ع : چارہ ساز بے پروا، مدد پہ لا دوا اپنا (۲۸۱) [صحیح : بلا اضافت]

نشاط ع : نشاط، دل سے پہنچے تا درِ کعبہ، وہ لے واں بھی (۲۸۱) [صحیح : نشاط ہم الخ]

نیر ع : دیدۂ صاحب نظراں از نظر افتاد (۲۹۱) [صحیح : در دیدۂ الخ]

نیر ع : چلے آؤ شب تاب ہیں، کیسی شب ماہ (۲۹۲) [مثلاً : شبِ مہ تاب]

وفا ع : آہوں نے میرے یہ دل خراشی کی ہے (۲۹۹) [صحیح : مری]

وفا ع : کیا ناز کرے اس پر کہ جب آخر کار (۲۹۹) [صحیح : اس پہ]

وکیل ع : ہٹے بول لطف سے کشوں کو پیر سے خانہ (۲۶۹) [ایک لفظ "لطف" کے بعد اور چاہیے]

۲۱۔ بعض شعرا کا صرف نام یا تخلص لکھا ہے۔ مگر اُن کے ماخذ کا اندراج نہیں کیا۔ مثلاً۔
منشی ہیرا سنگھ درد (ص ۱۰۵)۔ منشی دیبی پرشاد سرور (ص ۱۵۰) حکیم محمد علی محبتی نجیب آبادی (ص ۱۹۸)
سید بدر الدین احمد عرف فقیر صاحب دہلوی کاشف (ص ۲۵۰)

۲۲ - نمبر ۳ کے تحت سطورِ بالا میں، بالمکند بےصبر کی تصانیف کا تذکرہ آچکا ہے۔ بےصبر کے سلسلے میں چند باتیں بیان درج کرنا ضروری ہیں۔ مولفِ تلامذہ نے لکھا ہے کہ بےصبر اور تفتہ دونوں سکندر آباد کے رہنے والے تھے اور "غالباً اُن سے کچھ عزیزداری بھی تھی"[1]

(الف) بےصبر کے پسرِ خورد سری برہما سروپ نے اگست ۱۸۸۵ء (۱۳۰۳ھ) میں ایک مضمون "سوانح عمری بےصبر" کے عنوان سے شائع کرایا تھا۔ اس کی بنیاد پر قاضی معراج دھولپوری بھی بےصبر پر ایک مفصل مضمون لکھ چکے ہیں۔[2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تفتہ بےصبر کے ماموں ہوتے تھے۔

(ب) جناب مالک رام نے لکھا ہے کہ "ستر برس کی عمر تھی جب ۱۸۹۰ء میں انتقال کیا"[3] اس حساب سے ان کا سالِ پیدائش ۱۸۲۰ء تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ لیکن صحیح سالِ ولادت ۱۸۱۰ء (۱۲۲۵ھ) ہے اور انتقال ۱۳ فروری ۱۸۸۵ء (مطابق ۱۳۰۲ھ) کو میرٹھ میں ہوا۔ اس طرح ان کی عمر ۷۵ سال کی ہوئی۔[4]

(ج) مالک رام صاحب کا بیان ہے کہ "...... اخگرِ عشق ...... ۱۲۷۳ھ میں لکھی گئی تھی۔ "لالۂ پُرداغ" تاریخ ہے۔"[5] "لالۂ پُرداغ" سے ۱۲۷۳ھ ہی برآمد ہوتے ہیں۔ لیکن مثنوی کا سالِ تصنیف ۱۲۷۵ھ ہے۔ اس تاریخ میں دو عدد کا تعمیہ کیا گیا تھا۔ مادۂ تاریخ یوں ہے: ؎

جس کا سن "لالۂ پُرداغ" ملا   پردہ لالہ بہ سرِ باغ ملا
۱۲۷۳ + ۲ = ۱۳۷۵ھ

۱۲۷۳ھ میں سرِ باغ (یعنی ب) کے دو عدد شامل ہوں تب صحیح سالِ تصنیف ہاتھ آتا ہے۔[6]

"مثنوی لختِ جگر" کا تذکرہ تلامذہ میں ہے لیکن سالِ تالیف نہیں بتایا۔ یہ ۱۲۵۳ھ میں تصنیف ہوئی تھی۔

(د) بےصبر کی تصانیف کی مجموعی تعداد دو درجن کے لگ بھگ ہو تو عجب نہیں۔ مناسب ہوگا کہ آئندہ ایڈیشن میں فاضل مرتب اُن کی ایک فہرست بھی شامل کر دیں۔[7]

مجھے اس تبصرے کے مکمل ہونے کا دعوےٰ نہیں۔ البتہ میں نے "تلامذہ" کو بہت غور سے پڑھا ہے اور جہاں کہیں مجھے شک گذرا ہے اُس کا بےلاگ اظہار کر دیا ہے۔ مجھ سے پہلے جناب تمکین کاظمی، اپنے تبصرے میں بعض مسامحات کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔[8] میں نے ان کا اعادہ کرنا غیر ضروری سمجھا ہے۔ اگر مجھے یہ بات معلوم نہ ہوتی کہ جناب مالک رام ایسی تنقید یا تبصرے کا بڑی فراخدلی سے خیر مقدم کرتے ہیں تو مجھے اُن کی بلند پایہ تالیف پر قلم اٹھانے کی کبھی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔ یہی میری معذرت ہے۔

---

[1] تلامذہ/۵۵ [2] اردو ادب (علی گڈھ) جلد ۶ شمارہ ۳ [3] تلامذہ/۵۵ [4] اردو ادب جلد ۶ شمارہ ۳

[5] تلامذہ/۵۵ [6] ملاحظہ ہو اردو ادب، جلد ۶ ش ۳ - نیز ہماری زبان علی گڈھ یکم جولائی ۱۹۵۷ء و ۱۵ اگست ۱۹۵۷ء

[7] اس سلسلے میں ہری کشن راز کا مضمون "منشی بالمکند بےصبر" مطبوعہ ماہنامہ نیا دور۔ لکھنؤ جلد ۱۴ شمارہ ۱ (ستمبر ۱۹۵۹ء) بھی قابلِ قدر ہے۔

[8] تحریک: دہلی جلد ۶ شمارہ ۱۲ (اپریل)

زُبُر و بیّنات

کستری منہاس

حروف ابجد یعنی حروف تہجی عربی میں اٹھائیس ۲۸ ہیں۔ حرف کیا ہے؟ ہر آواز کی علامت۔ مثلاً ہمزہ یا الف متحرک وہ آواز ہے۔ جو حلق سے نکلتی ہے سانس کی علامت (ء) ہے۔ اور اس علامت کا نام الف لہٰذا (ء) موسوم اور الف اسم ہے۔ یہی حالت کل حرفوں کی ہے۔ اور ہر موسوم اپنے اسم کی ابتدا میں ضرور آئے گا۔ مثلاً لفظ الف کے پہلے الف ہی ہے۔ اور یہی صورت آپ اٹھائیسوں حروف میں پائیں گے۔ اب ان حروف کے اسما دو طرح کے ہیں۔ کچھ دو ۲ حرفی کچھ سہ ۳ حرفی۔ مثلاً با۔ تا۔ ثا۔ حا۔ خا۔ را۔ زا۔ طا۔ ظا۔ فا۔ ہا۔ یا۔ بارہ ۱۲ حروف دو حرفی ہیں۔ اور الف۔ جیم۔ دال۔ ذال۔ سین۔ شین۔ صاد۔ ضاد۔ عین۔ غین۔ قاف۔ کاف۔ لام۔ میم۔ نون۔ واو۔ سولہ حروف سہ حرفی۔

اسمائے حروف اپنے موسوم سے شروع ہوتے ہیں۔ یعنی الف کے پہلے ء ہوگا۔ با کے پہلے ب۔ اسی طرح کل حروف کے اسما ہیں۔ اسمائے حروف کے پہلے حرف کو زُبُر اور باقی ایک، دو حرف جو رہیں انھیں فن تاریخ میں بیّنات کہتے ہیں۔ مثلاً الف زبر بیّنات میں ء زبر ہے۔ اور ل ف بیّنات۔ دو حرفی اسما میں پہلا زبر اور دوسرا بیّنات سمجھا جائے گا۔ سہ حرفی اسما میں پہلا حرف زبر اور باقی دو حرف بیّنات سمجھے جائیں گے۔ اس بنا پر اگر تاریخ میں اسمائے حروف کے اعداد میں سے محض بیّنات شامل ہیں۔ تو با سے یا تک کل دو حرفی اسما کا صرف ایک عدد شمار ہوگا۔ اور الف کے یعنی لام کے (تیس ۳۰) ف کے (اسّی) اسی طرح کل اسمائے حروف سہ حرفی کے حروف آخر محسوب کیے جائیں گے۔ اور اگر زبر و بیّنات دونوں کا مجموعہ تاریخ میں شمار کیا گیا ہو تو اسم حروف کے کل عدد شمار میں آئیں گے۔ مثلاً الف کا پہلا حرف زبر ہے۔ اس کا ایک عدد لیا جائے گا۔ اور باقی دو حرف ل ف بیّنات ہیں۔ ان کے عدد ایک سو ۱۱۰ دس ہوئے۔ اور ان دونوں کا مجموعہ ایک سو گیارہ ہوگا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے۔ کہ اسمائے حروف میں ہر اسم کا پہلا حرف زبر اور باقی حرف بیّنات کہلاتے ہیں۔ زبر وہی حروف ہیں جنھیں حروف جمل یا حروف ابجد کہتے ہیں۔ بالعموم تاریخیں زبر ہی میں کہی جاتی ہیں۔ محض بیّنات یا زبر و بیّنات دونوں کو ملا کر تاریخیں بہت کم دیکھنے میں آئی ہیں۔ زبر کو جمل صغیر اور بیّنات کو جمل وسیط بھی کہتے ہیں۔

مثال کے طور پر لفظ علی (اسم گرامی اسد اللہ الغالب) کے اعداد بطریق زبر (ع۔ ل۔ ی) ایک سو دس ہیں جو الف کے بیّنات (ل ف ۱۱۰) کے برابر ہیں۔ اور اسی اسم مقدس کے بیّنات (ین۔ ام۔ ا) کا مجموعہ دو سو بارہ ہوتا ہے۔ جو درجہ (د ۴۔ ر ۲۰۰۔ ج ۳۔ ہ ۵) کے زبر کے برابر ہے۔

زبر و بینات میں تاریخ نکالنے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کسی لفظ کے زبر کو کسی دوسرے لفظ کے بینات کے برابر کر کے عدد لیتے ہیں۔ اس کی مثال فیضی فیاضی کی مشہور رباعی ہے ؎

نوروزے کہ زمہر عالم آرا پیدا است　　از جبۂ شاہنشہ والا پیدا است
اکبر کہ زآفتاب دارد نسبت　　این نکتہ زبینات اسما پیدا است

محققین اہل جمل نے اس رباعی پر خوب اعتراضات کیے ہیں۔ صاحب ملحق تسلیم مذکورہ رباعی پر نکتہ چینی کرتے ہوئے فرماتے ہیں "در مصرع چہارم رباعی لفظ "اسما" کہ فائدہ ہیچ نے بخشد خلل انداز است۔ چو اعداد اکبر در زبر گرفتہ و اعداد آفتاب در بینہ آوردہ — خطا سوئے فیضی نادرم الا یقین تحریف کاتب است" صاحب معدن الجواہر فرماتے ہیں۔ "از فیضی فیاضی در مصرع چہارم این رباعی سہو و تسامح راہ یافتہ۔ زیرا کہ دریں جا بینات اسما نیست۔ بلکہ زبر یک اسم و بینات یک اسم است۔"

میزان التاریخ از موہن لال جاٹشی کا ایک قلمی نسخہ میں نے سید مسعود حسن صاحب رضوی لکچرار لکھنؤ یونیورسٹی کے کتب خانے میں دیکھا تھا۔ یہ کتاب ۱۲۵۶ھ کی تالیف ہے۔ اس میں بھی مذکورہ رباعی پر اعتراض وارد کیے گئے ہیں۔

لفظ "اسما" کے متعلق جو اعتراض کیا گیا ہے۔ وہ صحیح نہیں۔ مصرع چہارم میں "اسما" ہی ہے۔ اور کوئی کتابت کی تحریف نہیں۔ معترض صاحبان اسما کو آفتاب کے متعلق سمجھ کر چاہتے ہیں۔ کہ اسما کی جگہ اسم ہونا چاہیے۔ مگر درحقیقت علامہ فیضیؔ نے جو مفہوم شعر میں دکھایا ہے۔ اُسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

بات یہ ہے کہ حروف تہجی کی شکلوں کو مسمیٰ اور ان کے ناموں کو اسم کہتے ہیں۔ چنانچہ ہر حرف ابجد کا نام اسی حرف سے شروع ہوتا ہے۔ مثلاً ا کا نام الف ہے۔ تو ا مسمیٰ اور الف اسم ہے۔ ہر نام کے پہلے مسمیٰ کی شکل ضرور آئے گی۔ تمام حروف ابجد اسی قاعدے کے تابع ہیں۔

آفتاب میں حروف ابجد جو ہیں ان کے اسما یہ ہیں۔ الف۔ فا۔ تا۔ الف۔ با۔ ان تمام اسموں کے قبل جو حروف ہیں وہ مسمیٰ ہیں۔ اور زبر کہلاتے ہیں۔ اور ما بعد ان کے جتنے حروف ان اسموں میں ہیں۔ وہ بینات کہلاتے ہیں۔ ان کے عدد شمار کر لو۔ وہ "اکبر" کے زبر یعنی (۳ ۲ ۲) کے مساوی ہوں گے۔ چونکہ آفتاب میں پانچ حرف ہیں۔ اور ہر حرف کے بینات جوڑے گئے ہیں۔ لہذا لفظ "اسما" صرف کیا گیا ہے۔ اگر اس جگہ اسم ہوتا۔ تو مصرع غلط ہو جاتا۔

مولانا صہبائیؒ نے بھی اپنی کلیات میں اس کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

اکبر کہ زآفتاب نسبت دارد
این نکتہ زبینات اسما پیدا است

بینات اسمائے حروف ہر چہ بعد از ترک حروف اول باقی ماند۔ چون از الف۔ لف و از با۔ ا۔ و از صاد۔ اد۔ و ہم چنیں مراد از بینات اسما۔ بینات اسمائے حروف آفتاب ست۔ یعنی کہ اکبر کہ نسبت بہ آفتاب دارد این نکتہ ظاہر شود از بینات اسمائے حروف آفتاب چہ بینات دو الف دو لف است۔ بینات فا تا با سہ الف اند۔ و اعداد مجموعۂ این دو صد و بست و سہ است۔"

علامہ فیضی کی مذکورہ رباعی اپنے اندر جن محاسن کو لیے ہوئے ہے۔ ان پر ناروا اعتراضات پردہ پوشی نہیں کر سکتے۔ افسوس سطحی نظر سے دیکھ کر اعتراض کر دیا گیا۔ ورنہ یہ رباعی ہرگز ایسے سلوک کی مستحق نہ تھی۔

گنجینۂ تاریخ جو جناب رعد حیدرآبادی کی ایک وقیع تالیف ہے۔ اس میں انھوں نے ایک تاریخ نقل کی ہے۔ جو کسی بزرگ نے جناب جلال لکھنوی کے دیوان کی اشاعت کے موقع پر کہی ہے۔ مصرع تاریخ یہ ہے۔ ع

نظم دلکش راحت افزا جانفزا و باوقار

لفظ	بیّنات	اعداد	تشریح
نظم	ون – ا – یم ۵۶ + ۱ + ۵۰	۱۰۷	
دل	ال – ام ۳۱ + ۴۱	۷۲	
کش	اف – ین ۸۱ + ۶۰	۱۴۱	
راحت	ا – لف – ا – ا ۱ + ۱۱۰ + ۱ + ۱	۱۱۳	
افزا	لف – ا – ا – لف ۱۱۰ + ۱ + ۱ + ۱۱۰	۲۲۲	
جاں فزا	یم – لف – ون – ا – ا – لف ۵۰ + ۱۱۰ + ۵۶ + ۱ + ۱ + ۱۱۰	۳۲۸	
و	اؤ ۷	۷	
با	ا – لف ۱ + ۱۱۰	۱۱۱	
وقار	اؤ – اف – لف – ا ۷ + ۸۱ + ۱۱۰ + ۱	۱۹۹	
	مجموعہ	۱۳۰۰	

مولانا عنایت حسین بلگرامی نے ایک بے نظیر تاریخ کہی ہے۔ بصفتِ اہمال کے ساتھ اس تاریخی مصرع کے اعداد زبر سے بھی اتنے ہی برآمد ہوتے ہیں۔ جتنے کہ بیّنات سے۔ یہ تاریخ مصنف کے لیے تمغائے کمال اور ان کی کامل فکر و کاوش پر دال ہے۔ ایسی تاریخیں

شادی نکلتی ہیں۔ ع

سرو سروار دہر اہل کمال و مالک و عادل

۶۹ ہجری ۱۲

لفظ	حروف زُبُر	اعداد	حروف بیّنات	اعداد
سرو	س - ر - و	۲۶۶	ین ا او ۶۰ + ۱ + ۷	۶۸
سروار	س-ر-و-ا-ر	۴۶۵	ین ا ال لف ا ۶۰ + ۱ + ۳۱ + ۱۱۰ + ۱	۲۰۳
دہر	د - ہ - ر	۲۰۹	ال ا ا ۳۱ + ۱ + ۱	۳۳
اہل	ا - ہ - ل	۳۶	لف ا ام ۱۱۰ + ۱ + ۴۱	۱۵۲
کمال	ک-م-ا-ل	۹۱	اف یم لف ام ۸۱ + ۵۰ + ۱۱۰ + ۴۱	۲۸۲
و	و	۶	او ۷	۷
مالک	م-ا-ل-ک	۹۱	یم لف ام اف ۵۰ + ۱۱۰ + ۴۱ + ۸۱	۲۸۲
عادل	ع-ا-د-ل	۱۰۵	ین لف ال ام ۶۰ + ۱۱۰ + ۳۱ + ۴۱	۲۴۲
مجموعہ		۱۲۶۹	مجموعہ	۱۲۶۹

کانِ تاریخ مؤلفہ جناب رام پرشاد صاحب شاہ جہاں آبادی جودتِ تخیل کی ایک اچھی تلاش ہے۔ اس میں مؤلف نے اپنی جدتِ فکر سے ایک اچھا مادۂ تاریخ نکالا ہے۔ جو تعریف سے بالاتر ہے۔ قطعہ تاریخ یہ ہے ؎

لکھ چکا جب فروغ میں یہ کتاب فکرِ تاریخ کی ہوئی پیدا
زبر اور بینات ہیں دل نے ہیں عجوبہ یہ واقعات کہا (۱۲۹۲)

پھر فرماتے ہیں ؎

زبر میں منقوط کے دیکھو عدد　　بینہ اور زبر میں لو مہملہ
عیسوی سن دونوں ملا کر کہو　　غنچۂ امید جہاں کھل گیا　　(۱۸۷۵)

حروف منقوط بحساب زبر (غ ن چ ی ج ن ی)
۱۰۰۰+۵۰+۳ + ۱۰ + ۳ + ۵۰ + ۱۰ = ۱۱۲۶ (مجموعہ)

حروف مہملہ بحساب زبر و بینات　　الف ہا دال میم الف ہا
۶ + ۱۱۱ + ۹۰ + ۳۵ + ۶ + ۱۱۱

الف گاف لام ہا کاف
۱۰۱ + ۶ + ۷۱ + ۱۰۱ + ۱۱۱

۷۴۹ مجموعہ

حروف منقوطہ بحساب زبر + حروف مہملہ بحساب زبر و بینات
۱۱۲۶　　۷۴۹ = (۱۸۷۵) عیسوی

جناب احسان شاہجہانپوری کی ایک تاریخ ہے فرماتے ہیں ؎

گفت احساں در زبر ہم بینہ　　نوجواں محبوب خاں اے آہ مرد
۱۹۰۳ء

حضرت ثاقب لکھنوی نے زبر و بینات میں تاریخیں کہی ہیں۔ چنانچہ کلیات سحر کی تاریخ اشاعت موتیوں سے تولنے کے قابل ہے ؎

بہ بینات و زبر بگفتم دو سال ہجری بمصرعِ نو
یگانۂ فن۔ بعصر عالی بعقل سعدی بقدس حسان
زبر (۱۳۲۰ھ) بینات (۱۳۲۰ھ)

دوسرے قطعۂ تاریخ میں بھی زبر و بینات سے دو سال نکالے ہیں۔ ایک بنگلہ اور دوسرا فارسی ؎

دو سالِ تاریخِ بینات و زبر بیک مصرع بگفتم
دبیرِ معنی نگار و موجد۔ فصیح و نقادِ فن زباندان
بینات ۱۳۰۹ (بنگلہ)　　زبر ۱۳۱۰ (فارسی)

اب ہم ایک اہم نکتہ کی طرف قارئین کرام کی توجہ مبذول کراتے ہیں۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ زبر و بینات کے قواعد کا تتبع عربی اور فارسی حروف کے تلفظ کے تحت اردو زبان کی تاریخوں میں نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ اردو زبان کی تاریخوں میں اردو ہی کے تلفظ کا اعتبار کیا جائے۔ اب ہم ان سترہ حروف کا نقشہ ذیل میں پیش کرتے ہیں جن کا تلفظ اردو میں عربی و فارسی حروف کے تلفظ کے خلاف ہے۔

حرف	۱ ۲ ب یا پ		۳ ۴ ت یا ٹ		۵ ث	۶ چ	۷ ح	۸ خ	۹ ۱۰ ر یا ڑ		۱۱ ۱۲ ز یا ژ		۱۳ ط	۱۴ ظ	۱۵ ف	۱۶ ہ	۱۷ ی
اسم حرف بہ لحاظِ تلفظ اردو	بے	پے	تے	ٹے	ثے	چے	حے	خے	رے	ڑے	زے	ژے	طوے	ظوے	فے	ہے	یے
بیّنہ	ے	ے	ے	ے	ے	ے	ے	ے	ے	ے	ے	ے	وے	وے	ے	ے	ے
عدد	۱۰	۱۰	۱۰	۱۰	۱۰	۱۰	۱۰	۱۰	۱۰	۱۰	۱۰	۱۰	۱۶	۱۶	۱۰	۱۰	۱۰

میں نے چند اساتذۂ مشاہیر سے مذکورہ مسئلہ کے متعلق دریافت بھی کیا تھا۔ ان کی آرا بعینہٖ ذیل میں مندرج ہیں:

(۱) مصرع تاریخ اُردو زبان میں ہونے کی صورت میں بھی اردو کے تلفظ پر اعتبار کر کے عدد نہیں لیے جا سکتے۔ عربی و فارسی ہی کے تلفظ کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ با تا ثا جیم وغیرہ کے عدد لیے جا سکتے ہیں۔ لیکن بے تے ثے طوئے ظوئے وغیرہ کے عدد پر بنائے تلفظِ اردو ۱۲ ۔ ۱۰ ۔ ۱۴ ۔ ۱۰ ۔ ۵ وغیرہ لینا درست نہیں۔

(امام الفن حضرت جلیلؔ جانشین امیر مینائی رحؒ)

(۲) قاعدۂ جمل یعنی اعداد حروفِ ابجد کی طرح زبر و بیّنات کا بھی تمام تر تعلق عربی سے ہے۔ فارسی یا اردو میں اس کی نقل کی جاتی ہے۔ اور حروف متشابہ میں انھیں قواعد کی پابندی ہوگی۔ مثلاً بقاعدہ ابجد ب کے دو عدد لیے جاتے ہیں۔ پ فارسی اور اُردو کا حرف ہے۔ عربی میں نہیں آتا۔ مگر اس کے بھی دو عدد شمار ہوں گے۔ اور لغت میں اس کا نام بائے فارسی رکھا گیا ہے۔ اسی طرح چ کا نام جیم فارسی اور عدد، جیم عربی کے مساوی ہے۔ ایسے حروف صورتاً یکساں ہوتے ہیں۔ صرف نقطوں یا کسی دوسری علامت سے ان میں فرق ہوتا ہے۔ لیکن از روئے عدد ان مختلف زبانوں کے حروف میں کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔ لہٰذا (پ ۔ چ ۔ ژ ۔ گ) کے وہی عدد ہیں جو (ب ۔ ج ۔ ز ۔ ک) کے۔ اسی قاعدے کے تحت میں آپ ہندی حروف کو بھی سمجھئے۔ یعنی (ٹ ۔ ڈال ۔ ڑ) کو ان کے از روئے ابجد وہی عدد شمار ہوں گے جو (ت ۔ دال ۔ ر) کے ہیں۔ یہی قاعدہ زبر و بینات میں بھی ملحوظ رکھا جائے گا۔ اور ٹ تائے ہندی ۔ ڈال دال ہندی ۔ ڑ رائے ہندی کہلائے گی۔ اور بقاعدہ زبر و بیّنات جو اعداد (با ۔ تا ۔ جیم ۔ دال ۔ را) کے گنے جاتے ہیں۔ بعینہٖ وہی عدد (بائے فارسی پے۔ تائے ہندی ٹے ۔ جیم فارسی چے ۔ دال ہندی ڈال ۔ رائے فارسی ژے ۔ رائے ہندی ڑے) کے گنے جائیں گے۔ اس میں تلفظ اسمائے حروف کے تغیر کو کوئی دخل نہیں۔ پے کو با۔ ٹے کو تا۔ چے کو جیم۔ ڈال کو دال۔ ڑے کو را۔ ژے کو زا قرار دے کر شمار کیجئے۔

(لسان القوام مولانا صفیؔ لکھنوی)

(۳) زبر و بیّنات وہ ہے کہ مسمّیٰ اور اسم دونوں کے عدد نکال کر تاریخ نکالی جائے۔ مثلاً (الف) میں ا ل ف کے عدد زبر اور جیم میں ج ی م کے عدد زبر و بیّنات ہیں۔ تاریخ دیوان داغ از ڈاکٹر مہدی حسن صاحب المؔ سے

چھپ گیا استاد کا دیوان جب — عیسوی تاریخ المؔ نے یوں کہی
بیّنات و زبر میں دیکھو عدد — گلشنِ بے خارہ ہے دیوان بھی (۱۸۹۲)

زبر و بینات میں تاریخ نکالنے کی اور ایک صورت ہے کہ کسی لفظ کے زبر کو کسی دوسرے لفظ کے بینات سے برابر کرتے ہیں۔ فیضی نے اکبر کے زبر کو آفتاب کے بینات سے برابر کیا ؎

اکبر کہ ز آفتاب دارد نسبت
ایں نکتہ ز بینات اسما پیدا است

اکبر کے عدد بحساب زبر اور آفتاب کے بحساب بینات لیے گئے ہیں۔ جو ہر ایک (۲۲۳) ہیں۔ ٹ۔ ڈ۔ ڑ کے عدد ت۔ د۔ ر کے عدد ہوں گے۔ اُردو کے تلفظ کو اس میں دخل نہیں۔

(ناخدائے سخن حضرت نوح ناروی جانشین داغ)

۴۔ زبر و بینات کے سلسلے میں جو نئی بات آپ نے لکھی ہے۔ اس پر آج تک کسی نے عمل نہیں کیا۔ لفظ اردو کا ہو یا فارسی کا بینات کے لیے حروف کا تلفظ وہی شمار ہوتا ہے۔ جیسے فارسی تلفظ کہنا چاہیئے یعنی ب کو ہمیشہ با محسوب کیا جاتا ہے۔ بے محسوب نہیں کیا جاتا۔ زبر و بینات میں متنازعہ حروف ٹ۔ ڈ۔ ڑ ہی ہیں۔ ڈال تو اس جھگڑے سے باہر سمجھئے۔ باقی ٹ اور ڑ رہ گئے۔ جب اُن کے عدد ت اور ر کے برابر لیے جاتے ہیں۔ تو ملفوظی صورت میں انھیں تائے ہندی رائے ہندی کیوں نہ خیال کیا جائے۔ اور یہاں فارسی کی ملفوظ صورت کیوں چھوڑ دی جائے۔ خلاصہ کلام یہ کہ میں ان حروف کو تا۔ را ہی سمجھنے کے حق میں ہوں۔ ی کو اردو میں یے بولتے ہیں۔ مگر زبر و بینات میں یا کے عدد شمار ہوتے ہیں۔ اگر اردو ہی کا رنگ چڑھانا مقصود ہے۔ تو ان کے عدد بھی کیوں نہ لیے جائیں۔ چے۔ حے۔ خے۔ بے۔ پے تے۔ ثے وغیرہ بھی اس زد میں آئیں گے۔ گویا دو حرفوں (ٹ۔ ڑ) کے لیے ان تمام حروف کی ملفوظی صورت بدل جائے گی۔ اور سابق میں کہی ہوئی تمام تاریخیں غلط ہو جائیں گی۔

(ابوالفصاحت حضرت جوشؔ ملسیانی)

۵۔ آپ کے مجتہدانہ سوال کے متعلق جو قبل ازیں کبھی کسی کے انتقال ذہنی کا مرکز نہیں بنا گزارش ہے۔ کہ اس تازہ تحقیق کا سہرا ہمیشہ آپ کے سر رہنے والا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بسیط اور زبر و بینات وغیرہ کا انضباط عرب میں تدوین فن جفر کے وقت تکمیل کی ضرورت کی غرض سے کیا گیا تھا۔ جس کو فن سیاق و حساب سے کوئی تعلق نہیں۔ تاریخ گویوں نے اس کو وہاں سے لے کر حساب تاریخ میں داخل کر لیا۔ جو فارسی میں منتقل ہو کر اُردو میں بھی آ گیا۔ عربی و فارسی کے اسمائے حروف ایک ہیں۔ ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ بعض اسما (پ۔ چ۔ ژ۔ گ) عربی سے نایاب ہیں۔ لیکن اعداد زبر و اسم کتابت وہی ہے۔ جو عربی و فارسی میں ان کے اخوات کی ہے۔ اس بنا پر نہ تو پہلے کبھی کسی نے قواعد مروجہ کی خلاف ورزی کی ہے۔ اور نہ ہی آیندہ کیے جانے کی گنجائش ہے۔ البتہ اردو ہندی کے بعض اسمائے حروف کی حالت اس سے جداگانہ ہے۔ خصوصاً اسمائے حروف مخصوصہ ہندی جن کو تا، دال و رائے ثقیلہ کہا جاتا ہے۔ اور اعداد اب تک وہی لیے جاتے ہیں۔ جو اُن کے اخوات عربی و فارسی کے لیے جاتے ہیں۔ گو قواعد اعداد کے لحاظ سے ان کے ساتھ وہی عمل جاری ہے۔ جو دوسرے حروف کے ساتھ ہے لیکن بنظر تحلیل تلفظ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ یہ عمل ایک زیادتی ہے۔ جب اُردو ہندی میں ان کا صحیح تلفظ بے۔ تے۔ ٹے۔ ثے۔ ڈے۔ ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ محض اردو ہندی تاریخ میں کورانہ تقلید کر کے اسمائے مکتوبی و ملفوظی کے اعداد نہ لیں بلکہ ایسا کرنا ایک قسم کی ہٹ دھرمی ہے۔ گو یہ اصول بہت صحیح ہے۔ لیکن سو اندھوں میں ایک سوجھلا بھی اندھا ہوا کرتا ہے۔ اس لیے اگر ایسا کیا جائے تو بوجہ جدت اس امر کا اعلان و اشتہار

کر دینا انسب ہے۔ پھر کسی اعتراض کی گنجائش بھی نہ رہے گی۔ اور نہ جواب دہی کی نوبت آئے گی۔

(حضرت نکہتؔ سہسوانی برادر زادہ حضرت تسلیمؔ سہسوانی)

۶[1]۔ حروف کا تلفظ خواہ وہ حرف زبانِ عربی کا ہو یا فارسی کا ہماری اردو زبان میں جس طرح ہوتا ہو۔ اُسی کے اعتبار سے بینات تجویز ہونا چاہیے۔ مانا کہ ث عربی زبان کا حرف ہے۔ اور عربی تلفظ میں اس کو (ثا) کہتے ہیں۔ اور فارسیوں نے بھی اس کو (ثا) ہی کہا ہے۔ لیکن جب اردو زبان میں اس کا تلفظ (ثے) ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں۔ کہ ہم اس کا جمل و بسیط یا بینات بلحاظ عربی و فارسی (۱) لیں اور بلحاظ تلفظ اردو (۱۰) نہ لیں۔ بعض متاخرین کا خیال یہ ہے۔ کہ حروف (ٹ۔ ڈ۔ ڑ) کے متعلق یہ عمل رہے۔ اس لیے کہ (ٹ۔ ڈ۔ ڑ) زبانِ اُردو کے خاص حروف ہیں اور باقی حروف میں قاعدۂ عربی و فارسی کی پابندی کی جائے۔ ہم کو اس آخر الذکر گروہ سے بھی اختلاف ہے۔ اس لیے کہ (ٹ۔ ڈ۔ ڑ) اگرچہ اردو کے خاص حروف ہیں۔ جو فارسی و عربی میں نہیں آتے۔ لیکن (ت۔ د۔ ر) یا اور اکثر حروف کے متعلق یہ نہیں کیا جا سکتا۔ کہ وہ زبانِ اُردو کے حروف نہیں۔ اصول ایک اختیار کرنا چاہیے۔

(شمس العلما نواب عزیز یار جنگ ولاؔ)

افتخار الملک حضرت دلؔ شاہجہانپوری اور حضرت جگرؔ بسوائی ارشد تلامذہ امیر مینائیؒ کی آرا گرامی بھی حضرت لسان القوم کی رائے کے تتبع میں وصول ہوئی ہیں۔ جناب سید حسن امام سابق مدیر "ندیم" پٹنہ کی رائے جناب ولاؔ کی رائے کی پیروی میں ہے۔

فنِ جمل ایک قدیم فن ہے۔ جو عربوں میں زمانۂ قدیم سے رائج چلا آ رہا ہے۔ اس فن سے جب اہلِ فارس روشناس ہوئے تو انھوں نے اس فن کے تمام قوانین بغیر کسی ترمیم و تنسیخ کے عربوں سے لے لیے۔ اور ان پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ حروفِ تہجی کی قیمت عددی بھی انھوں نے وہی رکھی جو عربوں نے مقرر کر رکھی تھی۔ اگرچہ ان کے ہاں عربی حروفِ تہجی سے چند ایک حروف یعنی (پ۔ چ۔ گ) زاید تھے۔ لیکن انھوں نے ان کی کوئی دوسری قیمتِ عددی مقرر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بلکہ پ کو ب۔ چ کو ج اور گ کو ک کا ہم عدد سمجھ لیا۔ اور تاریخیں کہنے لگے۔ زبر میں بھی انھوں نے عربی قوانین کی متابعت کی اور بینات میں بھی۔ جب یہ فن اردو زبان میں آیا۔ کیونکہ اُردو نے فارسی کا دودھ پی کر پرورش پائی تھی۔ اس لیے اُردو کے اکابرین فنِ جمل نے بھی وہی طریقہ اختیار کیا جو اس سے پہلے عربی کی تاسی میں فارسی والے کر چکے تھے۔ اس لیے انھوں نے (ٹ۔ ڈ۔ ڑ) جو خالص اردو زبان کے حروف ہیں۔ ان کو (ت۔ د۔ ر) کا ہم عدد خیال کر کے ان کی قیمتِ عددی وہی مقرر کی۔ جو عربی و فارسی میں اس سے پہلے مقرر ہو چکی تھی۔ زبر اور بینات دونوں میں اسی قانون کے ماتحت پیروی ہونے لگی۔ کیونکہ بینات میں حروف کے تلفظ پہ اعداد کا انحصار ہوتا ہے۔ عربی فارسی حروف کا تلفظ اردو کے چند ایک حروف سے جدا ہے۔ اسی لیے یہ اختلاف پیدا ہو گیا۔

صفیؔ۔ عندلیبؔ۔ دلؔ۔ جوشؔ۔ جگرؔ صاحبان کی رائے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح زبر کی تاریخوں میں عربی حروفِ ابجد کی پیروی کی جا رہی ہے۔ اسی طرح بینات میں بھی عربی فارسی تلفظ کے اعتبار سے عدد لینا ضروری ہے۔ مشہور نقادِ فنِ جمل حضرت نکہتؔ سہسوانی کی رائے گرامی کے آخری جملوں میں اُردو تلفظ کی سفارش کی بو آتی ہے۔ جناب ولاؔ و جناب حسن امام اردو تلفظ کی پیروی کو زبر و بینات کی تاریخوں میں ضروری خیال کرتے ہیں۔ لیکن یہ اُسی وقت ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ کہ ہمارے جمل کو عربی و فارسی قواعد سے مکمل طور پہ آزاد کر دیا جائے۔ تمام حروف کی

---

[1] یہ رائے غرائب الجمل سے نقل کی گئی ہے۔

قیمتِ عددی جو عربی میں مقرر ہے۔ اس کی پیروی نہ کی جائے۔ بلکہ ہر حرف اردو کی علیحدہ قیمت عددی مقرر کی جائے۔ یعنی ابجدیہ حروف کے اعداد بھی عربی و فارسی کے حروف کے اعداد سے مختلف ہوں۔ اور زبر کی تاریخوں میں بھی قواعد عربی کی پابندی نہ کی جائے۔ لیکن یہ ممکن نہیں۔ برسوں سے قواعد عربی ملک میں رائج ہیں۔ ان سے روگردانی کوہ کندن و کاہ برآوردن کے مترادف ہے۔

اردو زبان میں زبر کی تاریخیں تو قواعد عربی کے تحت ہی کہی جائیں۔ اور بینات میں اردو کے تلفظ کا اعتبار کر کے عدد لیے جائیں تو اس سے اس فن کو شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ مثلاً ہم کو اردو زبان کے ایک لفظ "گھڑی" کی قیمتِ عددی معلوم کرنا ہے۔ اس کے عدد بینات میں تین طرح سے لیے جا سکتے ہیں۔

	لفظ	حروف بینات	اعداد
اسمائے حروف کے عدد عربی تلفظ کے اعتبار سے	گھڑی	اف - ا - ا - ا ۸۱ + ۱ + ۱ + ۱	۸۴
اسمائے حروف کے عدد اردو تلفظ کے اعتبار سے	گھڑی	اف - ے - ے - ے ۸۱ + ۱۰ + ۱۰ + ۱۰	۱۱۱
اسمائے حروف کے عدد عربی و اردو کے تلفظ کے اعتبار سے	گھڑی	اف - ا - ے - ا ۸۱ + ۱ + ۱۰ + ۱	۹۳

وہ افراد جو اسمائے حروف میں عربی تلفظ کی پیروی کے حق میں ہیں۔ وہ "گھڑی" کے بینات کے اعداد (۸۴) لیتے ہیں۔ جو اردو تلفظ کی مطابقت کے حق میں ہیں وہ اس کے (۱۱۱) عدد محسوب کرتے ہیں۔ اور جو اردو کے مخصوص تین حروف (ٹ۔ ڈ۔ ڑ) کے اسمائے حروف میں عربی و فارسی تلفظ کی پیروی ضروری خیال نہیں کرتے اور باقی تمام حروف کے وہی عدد لیتے ہیں۔ جو عربی و فارسی میں لیے جاتے ہیں وہ اس کے (۹۳) عدد شمار کرتے ہیں۔ یہ اختلاف آخر کیوں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک ہمارے قواعد ایک قانون کے ماتحت نہیں ہوں گے۔ تب تک اختلاف کی یہ خلیج وسیع ہوتی جائے گی۔ اس لیے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ جب ہمارے ادب کے تمام شعبوں میں عربی و فارسی قواعد کی پابندی کی جا رہی ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ زبر و بینات کی تاریخوں میں اس کی پابندی نہ کی جائے۔ ہاں اگر اردو تلفظ ہی کا رنگ چڑھانا مقصود ہے تو جس طرح حضرت نکہت نے فرمایا ہے اس کا اعلان و اشتہار کر دیا جائے۔ تاکہ حرف گیری اور جواب دہی کی نوبت نہ آئے۔

زبر و بینات میں بہت کم تاریخیں دیکھنے میں آئی ہیں۔ چند ایک نمونے ملاحظہ ہوں۔

جناب بختؔ جونپوری نے ایک قطعۂ تاریخ سابق نظام دکن کے فرزند کی ولادت پر اردو میں کہا ہے۔ اور اسمائے حروف کے تلفظ میں عربی و فارسی تلفظ کے اصول کو مدنظر رکھا ہے۔ مصرع تاریخی یہ ہے ؎

کہا بختؔ نے سنہ زبر بینہ میں

ہے	عالی	نسب	اور	والا	حسب	بھی	
۱۷	۳۲۳	۲۲۹	۳۲۵	۳۰۶	۱۳۲	۲۰	(۱۳۵۲)

جناب جویا مراد آبادی نے ایک نواب کے فرزند کی تولید پر ایک اچھی تاریخ لکھی ہے ؎

دیا حق نے فرزند نواب کو   کرے کیوں نہ تعریف مریخ اس کی
کہا مجھ سے ہاتف نے صنعت میں جویاؔ   مراج سعادت ہے تاریخ اس کی
۱۲۸۲

جناب فرحت سبتی کی وفات پر جناب مولانا عارج مالیگانوی نے مجھے ایک قطعہ تاریخ اسی صنعت میں کہہ کر بھیجا تھا مصرع تاریخ یہ ہے ع

سبتی فرحت جہاں بخشے نا بجو
۴۲ ۶ ۱۹

میں نے اپنی چچازاد بہن کی تاریخ بھی اسی صنعت میں کہی تھی ؎

دہر فانی سے سکینہ چل بسی   دل نہ کیوں ہو اس کے غم میں مضمحل
اب زبر کے ساتھ گنیئے بینات   زیب جنت پاک باطن نیک دل   (۱۳۵۱)

جناب عتیقؔ نے استاذی حضرت جلیلؔ کے دیوان اول تاج سخن کی چند تاریخیں اسی صنعت میں کہی ہیں ؎

شکر خالق را کہ شد تاج سخن   بے مثال و بے نظیر و بے عدیل
سال ہجری در زبر بہم بینہ   ہاتفم گفتہ۔ زہے نظم جلیل
۱۳۲۸

اور سال ترتیب بھی زبر و بینہ ہی میں کہا ہے ؎

مصنف نے مرتب کر کے دیوان   زمانے پر بڑا احسان کیا ہے
زبر اور بینہ میں ہے یہ تاریخ   کہ۔ یہ دیوان جلیل القدر کا ہے
۲۷ ھ ۱۳

جناب رعدؔ مولف گنجینۂ تاریخ کی ایک تاریخ ہے ؎

زبر بہم بینا نقش سال فصلی
شدہ مطبوع و مقبول جہانے   (۱۳۰۵)

جناب مولوی غلام حیدر صاحب ارشدؔ کی ایک تاریخ ہے ع

ہے ہے تدبر وفات مود
۱۷ ۱۷ ۳۲۷ ۶۰۶ ۲۴۴   (۱۳۰۱)

تعمیہ محاسن فن تاریخ میں سے ہے۔ اگر مادۂ تاریخ میں کچھ اعداد کم ہوں یا زیادہ۔ اس کمی یا زیادتی کو خوش اسلوبی سے پورا کرنے کا نام تعمیہ ہے۔ اگر مادۂ تاریخ میں کچھ عدد کم ہوں تو مورخ معمے کے طور سے جتنے عدد کم ہوں۔ مادۂ تاریخ میں داخل کرتا ہے۔ جس سے سال مطلوبہ

برآمد ہو جاتا ہے۔ اس کو تعمیۂ داخلی کہتے ہیں۔ اگر مادۂ تاریخ میں کچھ اعداد زیادہ ہیں۔ تو مورخ اپنی فکر و کاوش سے ان اعداد کو کسی مناسب طریقے سے کم کرتا ہے۔ جس سے سال مطلوبہ نکل آتا ہے۔ اس کو تعمیۂ خارجی کہتے ہیں۔ تعمیہ میں مورخ کی استادی، طباعی، فکر و کاوش اور مکمل تلاش کا امتحان ہوتا ہے۔ مثلاً زبر میں حضرت جلیلؔ کی ایک تاریخ ہے ؎

باادب کر عرض یہ تاریخ کا مصرعِ جلیلؔ   کیا بنا ہے قصرِ شاہی کیا نیا دربار ہے

۳۴ ھ ۱۳

مصرعِ تاریخ "کیا بنا ہے قصرِ شاہی کیا نیا دربار ہے" (۱۳۲۷) اعداد کا حامل ہے۔ اب سات عدد سال مطلوبہ سے کم تھے پہلے مصرع میں "باادب" کہہ کر ادب کے لفظ جس کے سات عدد ہیں تعمیۂ داخلی فرمایا ہے۔

حضرت امیر مینائیؒ کی وفات پر حضرت جلیلؔ فرماتے ہیں ؎

جلیلؔ نے سرِ بزمِ عزا یہ پوچھا آج   وہ کون تھے جنھیں روتے ہیں سارے شیدائی
پڑھا جواب میں اٹھ کر یہ ایک نے مصرع   امیرِ کشورِ معنی امیرؔ مینائیؒ

۱۸ ھ ۱۳

ایک عدد کا نازک سا تخرجہ ہے جو تعمیۂ خارجی کی ایک اچھی مثال ہے۔

جس طرح زبر میں تعمیۂ داخلی و خارجی سے ضرورت پوری کی جاتی ہے۔ اسی طرح زبر و بینات میں بھی اس صنعت سے کام لیا جاتا ہے۔ جناب فصاحت لکھنوی مرحوم کی ایک تاریخ ہے۔ جو انھوں نے شاد پیرو میر کی وفات پر کہی ہے۔ اس تاریخ میں تین عدد کا تعمیۂ داخلی ہے ؎

مُرد افسوس شاعرِ نامی   رشکِ سعدی و انوری و ظہیر
اے فصاحت بہ بینات و زبر   خواست چوں سالِ او منِ دلگیر
از سرِ بامِ چرخ گفت سروش
ہائے آہ آہ شادِ پیر و میر

۱۳۱۴
۳
۱۳۱۷

جناب شادؔ پیرو میر کی وفات (۱۳۱۷) ہجری میں ہوئی۔ مادۂ تاریخ کے عدد بطریق زبر و بینات (۱۳۱۴) برآمد ہوتے تھے۔ تین عدد کم تھے۔ جناب فصاحت مرحوم نے از سرِ بام یعنی بام کا سر (ب) جس کے عدد بطریق زبر و بینات تین ہوتے ہیں، تعمیۂ داخلی فرما کر سال مطلوب (۱۳۱۷) حاصل کیا ہے۔

یہاں ایک اور نکتہ بھی غور طلب ہے کہ جب مادۂ تاریخ زبر میں ہو تو تعمیہ میں زبر کے قواعد کی پابندی کی جائے گی۔ اور جب مادۂ تاریخ زبر و بینات میں ہو تو زبر و بینات کے قواعد کی رو سے تعمیۂ داخلی و خارجی پر عمل درآمد کیا جائے گا۔ یہ نہیں کہ زبر کی تاریخوں میں زبر و بینات کے قواعد سے کمی و بیشی کو پورا کیا جائے۔ اور زبر و بینات کی تاریخوں میں زبر کے قواعد پر عمل کر کے تاریخیں کہی جائیں۔

تعمیۂ خارجی کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔

جوشؔ ملسیانی ؎

زبر بینہ میں یہ تاریخ طبع   کہی بے سرِ صبح - باغِ سخن

۲۰۰۱-۹۵ = ۱۹۰۶ء

باغِ سخن کے اعداد میں سے (ص) کے اعداد کا تخرجہ کیا گیا ہے۔ تخرجہ کا عمل زبر و بینات کے قواعد کے ماتحت ہے۔

میں نے اپنے عموزادہ یوسف مرحوم کی وفات پر یہ تاریخ کہی تھی ؎

منتظر ہیں آمد مرحوم کے — سب اہالی و موالی خلد میں
بے بہا صنعت ایں ہے کسری یہ سال — پائے یوسف قصرِ عالی خلد میں

۱۹ ء ۴۴

مادۂ تاریخ سے "بہا" کے اعداد کا تخرجہ بطریق زبر و بینہ کیا گیا ہے۔

جناب ممتاز بنگلوری تلمیذ امیر مینائی کی وفات پر جناب عبد السبحان صاحب اثیمؔ بنگلوری نے ایک قطعۂ تاریخ کہا ہے۔ فرماتے ہیں۔

زبر و بینہ ہیں کہہ دو اثیمؔ — آج ممتاز واصلِ حق ہے

۱۳ ھ ۶۲

مادۂ تاریخ بہت اچھا اور رواں ہے۔ لیکن اس کے عدد (۱۳۶۱) برآمد ہوتے ہیں۔ یہ قطعۂ تاریخ ماہنامہ فصاحت حیدر آباد (دکن) کے دسمبر ۱۹۴۳ء نمبر میں شائع ہوا تھا۔

اب ہم ایک معرکۃ الآرا تاریخ کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ تاریخ میرزا دبیرؔ لکھنوی نے خدائے سخن میر انیسؔ لکھنوی کی وفات پر کہی تھی۔ یہ تاریخ صنعتِ مجمع الاقسام میں ہے۔ جو مشکل ترین صنعتِ تاریخ ہے۔ میرزا دبیرؔ فرماتے ہیں ؎

سال تاریخش بہ زبر و بینہ شد زیبِ نظم
طورِ سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیسؔ

تاریخ گوئی میں صنعتِ مجمع الاقسام اُس صنعت کو کہتے ہیں کہ مصرعِ تاریخ میں بعض الفاظ کے عدد بطریق زبر شمار کیے جائیں بعض کے بینات جوڑے جائیں۔ بعض کے بینات جوڑے جائیں۔ اور بعض کے زبر و بینات محسوب کیے جائیں۔ چنانچہ فاضل مولف ارمغان میزان التاریخ کے حوالے سے رقم طراز ہیں۔ (ویجوز فی المعمیٰ والتاریخ ان یوخذ اعداد الحروف بحساب الجمل وان یوخذ بطریق الزبر والبینات وان یوخذ اعداد بعض الکلمات بحساب الجمل وبعضها بالزبر والبینات و رح یجب ان یشار الیہما بوجہ ما لا یلزم خلاف المقصود) الیہما (ارمغان صفحہ ۳۲۵)

یعنی جائز ہے۔ معمے اور تاریخ میں یہ کہ لیے جائیں اعداد حروف کے بحساب ابجد یا یہ کہ لیے جائیں اعداد بطریق زبر و بینات یا یہ کہ لیے جائیں اعداد بعض انھیں کلمات کے بحساب ابجد اور اعداد بعض بطریق زبر و بینات اور اس وقت میں واجب ہے کہ اشارہ کیا جائے ان دو لفظوں کی طرف کسی اشارے کے ساتھ تاکہ لازم نہ آئے خلاف مقصود اور التباس نہ ہو۔

مذکورہ صنعت کی بعینہٖ مثال میرزا دبیرؔ لکھنوی مرحوم کی زیرِ بحث تاریخ ہے۔ فاضل مولف نے اس تاریخ میں بعض الفاظ کے زبر بعض کے بینہ اور بعض کے زبر و بینہ محسوب کر کے مختلف طریقوں سے استخراج سنین کیا ہے۔ رسالہ حل التاریخ کا ایک قلمی نسخہ میرے کتبخانے میں ہے۔ اس سے مختلف سنین کی تشریح ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔

(۱)

الفاظ	عدد
طور کا زبر	۲۱۵
سنیا کا زبر	۱۲۱
بے کا زبر و بینہ	۱۴
کلیم کا زبر	۱۰۰
اللہ کا زبر	۶۶
د کا زبر و بینہ	۱۳
منبر کا زبر و بینہ	۴۰۰
بے کا زبر و بینہ	۱۴
انیس کا زبر و بینہ	۳۴۸
مجموعہ	۱۲۹۱ ہجری

(۲) بقاعدہ دیگر (۳)

الفاظ	اعداد	الفاظ	اعداد
طور سنیا کا زبر	۳۳۶	طور سنیا بے کا زبر و بینہ	۵۸۶
بے کا زبر و بینہ	۱۴	کلیم اللہ و کا زبر	۱۷۲
کلیم اللہ کا زبر	۱۶۶	منبر کا زبر و بینہ	۴۰۰
د منبر بے انیس کا زبر و بینہ	۷۷۵	بے انیس کا زبر	۱۳۳
مجموعہ	۱۲۹۱	مجموعہ	۱۲۹۱

(۴) بقاعدہ دیگر (۵)

الفاظ	اعداد	الفاظ	اعداد
طور سنیا کا زبر و بینہ	۵۷۲	طور سنیا کا زبر	۳۳۶
بے کلیم اللہ کا زبر	۱۸۴	بے کا بینہ	۲

منبرے کا زبر و بیّنہ	۴۱۴	کلیم اللہ کا زبر و بیّنہ	۵۳۲
انیس کا زبر	۱۲۱	و منبر کا زبر	۲۹۸
		بے کا بیّنہ	۲
		انیس کا زبر	۱۲۱
مجموعہ	۱۲۹۱	مجموعہ	۱۲۹۱

بقاعدہ دیگر

(۶)[1] (۷)

الفاظ	اعداد	الفاظ	اعداد
طور سینا کا زبر	۳۳۶	طور سینا کا زبر	۳۳۶
بے کا بیّنہ	۲	بے کا زبر و بیّنہ	۱۴
کلیم اللہ کا زبر	۱۶۶	کلیم اللہ کا زبر	۱۶۶
منبرے کا زبر	۳۰۴	و کا بیّنہ	۷
انیس کا بیّنہ	۲۲۷	منبر کا زبر و بیّنہ	۴۰۰
		بے کا بیّنہ	۲
		انیس کا زبر	۱۲۱
مجموعہ	۱۰۳۵ یزدجردی	مجموعہ	۱۰۴۶ ہندی

بقاعدہ دیگر

(۸) (۹)

الفاظ	اعداد	الفاظ	اعداد
طور سینا بے کلیم اللہ و کا زبر	۵۲۰	طور سینا بے کا زبر و بیّنہ	۵۸۶
منبر کا بیّنہ	۱۰۸	کلیم اللہ و کا زبر	۱۷۲

---

[1] نمبر ۶ میں و غیر محسوب ہے۔

سے بے انیس کا زبر و بیّنہ	۳۶۲	منبر کا زبر و بیّنہ بے انیس کا زبر	۴۰۰ ۱۳۳
مجموعہ	۹۹۰ مہدوی	مجموعہ	۱۲۹۱ ہجری

بقاعدہ دیگر

(۱۰)

الفاظ	اعداد
طور کا زبر	۲۱۵
سینا بے کلیم اللہ کا بیّنہ	۱۰۹۵
د کا زبر و بیّنہ	۱۳
منبر کا بیّنہ	۱۱۰
انیس کا زبر و بیّنہ	۳۴۸
مجموعہ	۱۲۸۱ فصلی

(۱۱)

الفاظ	اعداد
طور سینا کا زبر و بیّنہ	۵۷۲
بے کا بیّنہ	۲
کلیم اللہ کا زبر و بیّنہ	۵۳۲
د کا زبر	۶
منبر بے انیس کا زبر و بیّنہ	۷۶۲
مجموعہ	۱۸۷۴ عیسوی

بقاعدہ دیگر (۱۲)

الفاظ	اعداد
طور کا زبر	۲۱۵
سینا کا زبر و بیّنہ	۳۴۸
بے کا زبر	۱۲
کلیم کا زبر و بیّنہ	۲۷۴
اللہ کا زبر و بیّنہ	۲۵۹
د کا زبر	۱۶
منبر کا زبر و بیّنہ	۴۰۰
بے کا زبر	۱۳
انیس کا زبر و بیّنہ	۳۴۸
مجموعہ	۱۸۷۴ عیسوی

مصرع تاریخ کی جو تشریح بارہ طریقوں سے اوپر بیان ہو چکی ہے۔ ان میں سے چھ طریقوں سے سال ہجری (۱۲۹۱) دو طریقوں سے سال عیسوی (۱۸۷۴) اور ایک ایک طریقہ سے سال فصلی (۱۲۸۱) یزدجردی (۱۰۳۵) ہندی (۱۰۴۶) اور مہدوی (۹۹۰) علی الترتیب حاصل ہوتے ہیں۔ حل التاریخ میں اور بھی کئی طریقوں سے میرزا دبیر مرحوم نے سال مطلوبہ نکالا ہے۔ چنانچہ سمت (۱۹۳۱) یزدجردی (۱۲۸۱) فصلی (۱۲۸۲)، فارسی (۱۲۴۲)، سنکا کائی (۱۷۹۶) اور مہدوی (۱۰۶۶) کے نقشے بھی مع تشریح دیئے ہوئے ہیں جنھیں میں بوجہ طوالت نظرانداز کرتا ہوں۔ البتہ حیاتِ دبیر جلد دوم کے صفحہ ۱۴-۱۵ پر ایک نئے طریقے سے استخراج سنین کیا گیا ہے۔ یہ طریقہ حل التاریخ میں موجود نہیں اس لیے اسے ذیل میں مندرج کیا جاتا ہے۔

بقاعدہ دیگر

لفظ	اعداد
طور کا زبر	۲۱۵
سینا کا بینہ	۲۲۷
بے کلیم اللہ کا زبر	۱۱۲
اللہ کا بینہ	۱۹۳
و کا زبر و بینہ	۱۳
منبر بے کا زبر	۳۰۴
انیس کا بینہ	۲۲۷
مجموعہ	۱۲۹۱ عیسوی

اس حساب میں یہ بڑی خوبی ہے کہ زبر و بینہ کی ترتیب قائم رہتی ہے۔ کیونکہ مصرع تاریخ میں ایک لفظ کے عدد زبر کے طریقے سے اور دوسرے لفظ کے عدد بینہ کے قاعدے سے جوڑے گئے ہیں۔ البتہ واوِ عطف کو زبر اور بینہ دونوں میں شمار کیا گیا ہے۔ کیونکہ حرفِ عطف کا یہ خاصہ ہے کہ وہ ان الفاظ ماقبل اور مابعد دونوں کے درمیان ایک واسطہ ہوتا ہے کیونکہ دونوں کو ملاتا ہے۔ اس لیے اس پر ماقبل اور مابعد دونوں الفاظ کا حق ہے۔ اس بنا پر (واؤ) کو زبر و بینہ دونوں طرح سے محسوب کیا گیا ہے۔

حیاتِ دبیر جلد اوّل میں یہ تاریخ ایک اور طرح سے بھی ملتی ہے۔ جس کو مؤلف نے کتاب شمس الضحیٰ طبع حسینی اثنا عشری لکھنؤ سے نقل کیا ہے ؎

در سنین عیسوی تاریخ گفتم صاف صاف
آسماں بے ماہ کامل سدرہ بے روح الامین
۹۲۹

+

گرچہ طبع بود محزون و مکدر بے انیس
طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس
۹۴۵

(۱۸۷۴ء)

دونوں مصرعوں کے عدد زبر کے طریقے سے شمار کیے گئے ہیں اور آسماں کے الف ممدود کے دو عدد شمار کیے ہیں۔ کیونکہ متقدمین میں اسی کا رواج تھا۔ چنانچہ کلیم ہمدانی کی ایک تاریخ ہے ؎

داد ایزد بہ بادشاہ جہاں   خلفے ہمچو نو گل شاداب
چوں بدیں مژدہ آفتاب انداخت   افسر خویش بر ہوا چو حباب
طبع دریافت سال تاریخش   رقم زد۔ آفتاب عالم تاب
۱۰۲۸

"دریں مادہ بقاعدہ مرقومہ بالا زیادتی یک عدد بود۔ شاعر بانداختن افسر آفتاب اشارت کرد۔ یعنی مدے را کہ علامتِ ممدودہ است برافسر آفتاب استعارہ کردہ انداخت (ملخص تسلیم)

زیر بحث تاریخ اگرچہ معنوی خوبیوں سے لبریز ہے۔ اور جو مورخ ہیں۔ انھیں اس تاریخ کی قدر و قیمت کا اندازہ ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اس مادۂ تاریخ کے حاصل کرنے میں کس قدر محنت اور کاوش سے کام لیا گیا ہے۔ ایک نہیں کئی طریقوں سے ایک ہی مصرع سے مختلف سال مطلوبہ حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ جو لوگ اس کوچے سے آشنا ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ایک برمحل مادۂ تاریخ کے حصول کے لیے کس قدر دماغ سوزی کرنا پڑتی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ بے نظیر اور لاجواب تاریخ اعتراضات سے نہ بچ سکی۔ چنانچہ افادۂ تاریخ کے صفحہ (۱۰) پر حضرت جلالؔ اور ملخص تسلیم کے صفحہ (۵۶-۵۸) پر حضرت تسلیم سہسوانی نے اعتراضات کیے ہیں۔ اودھ اخبار (۹-۱۳ فروری ۱۸۷۵ء) میں کسی غیر معلوم شخص نے اعتراضات کیے ہیں۔ اور ان کے جواب سید محسن علی صاحب شمس وکیل نے ایک رسالہ موسوم بہ "جلوۂ نیرنگ" میں دیئے ہیں۔ ان حضرات نے اس تاریخ پر جو اعتراضات کیے ہیں۔ ان کا مفہوم یہ ہے۔

۱۔ زبر بہ ضمتین ہے۔ یہاں بائے موحدہ مصرع ابتدائی میں ساکن ہے۔

۲۔ ماتمی نظم میں "زیبِ نظم" کہنا مناسب نہیں۔

۳۔ سال ہندی و فارسی غلط ہیں۔

۴۔ مادۂ تاریخ میں بے حرف نفی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ طور سینا کے اعداد میں سے کلیم اللہ کے اعداد تفریق کیے جائیں۔ اسی طرح انیس کے عدد منبر میں سے منفی کیے جائیں۔ مگر مصنف نے ایسا کرنا ضروری نہیں سمجھا۔

۵۔ زبر و بیّنہ کی شرح نہیں بتائی گئی۔ کسی جگہ کسی لفظ کو زبر مانا ہے۔ اور کبھی بیّنہ اور کبھی زبر و بیّنہ (حسب تشریح مرزا دبیر) بعض دفعہ دو دو تین تین لفظوں کو زبر مانا گیا ہے۔ پھر ان کا کچھ حصہ بیّنہ اور کبھی زبر و بیّنہ۔ جب تک صاف اشارہ نہ کیا جائے کوئی شخص اس تاریخ کو کیونکر سمجھے ان وجوہ سے یہ تاریخ سراسر معمّا ہے۔

تشریح سنین جو مذکور ہو چکی ہے۔ مرزا دبیر نے خود اودھ اخبار میں چھپوا دی تھی۔ اور پھر حل التاریخ میں اسے محفوظ کر دیا تھا۔ ایک ہی مصرع کے مختلف کلمات سے بحساب زبر و بیّنہ مرحوم نے مختلف سنین نکالے ہیں۔ میں نے تشریحی عمل کو جانچا اور صحیح پایا۔ ان سنین (۱۳۰۵) یزدجردی بحذفِ واوِ عطف ہے۔ جس کا اشارہ فٹ نوٹ میں کر دیا گیا۔ میر انیس نے ۲۹ ذی قعدہ سنہ 1291ھ مطابق ۱۰ دسمبر سنہ ۱۸۷۴ء بروز سہ شنبہ انتقال فرمایا تھا۔ اس لیے دوسرے مختلف سال جو مرزا دبیر نے نکالے ہیں۔ وہ ان سنوں کے مساوی ہیں صد سالہ جنتری

مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ میں (۱۹۳۱) بکرماجیتی اور (۱۸۳۱) فارسی تو ملتے ہیں۔ لیکن دوسرے سنین جو مذکور ہو چکے ہیں درج نہیں۔ اس لیے ان کے متعلق میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ کیونکہ مؤلف کو جو سنہ مطلوب تھا۔ اس کی تشریح انھوں نے نقشے میں کر دی ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ کوئی سنہ غلط ہے درست نہیں۔

چونکہ مصنف نے مادۂ تاریخ کے پہلے مصرع میں اجمالاً یہ اشارہ کر دیا ہے کہ سال تاریخ کا استخراج بقاعدہ زبر و بینہ ہوتا ہے۔ اور پھر نثر میں ہر سال کا نقشہ بنا کر حل التاریخ میں اس کی تشریح بھی فرما دی۔ لہٰذا پانچواں اعتراض کوئی وزن نہیں رکھتا۔ اگر اس اعتراض سے معترضین کا یہ مطلب ہے کہ اس تشریحی نوٹ کی کل عبارت قطعۂ تاریخ کے اندر نظم ہونا چاہیے تھی۔ تو یہ اعتراض ویسا ہی مہمل ٹھہرے گا۔ جس طرح کوئی شخص معترضین سے یہ کہہ دے۔ کہ ان کو تمام اعتراضات عبارت منظوم میں کرنے چاہیے تھے۔

چوتھا اعتراض بھی کچھ عجیب سا ہے۔ اس لیے کہ مصنف نے نظم و نثر دونوں میں بالاجمال و بالتفصیل واضح کر دیا ہے کہ استخراج سنین بقاعدہ زبر و بینہ ہوگا۔ لیکن اس پر معترضین (بے کلیم اللہ) اور (بے انیس) کے کلمات میں حرفِ نفی (بے) کو علامتِ تخرجہ اعداد (کلیم اللہ) اور (انیس) سمجھ رہے ہیں۔ اور قطعۂ تاریخ میں نظماً اس کی صراحت یوں چاہتے ہیں کہ اس مصرع میں حرفِ نفی (بے) علامتِ تخرجہ نہیں۔ سبحان اللہ! اگر کسی مادۂ تاریخ میں کسی متوفی کے متعلق بے مثل۔ بے بہا۔ بے عدیل۔ بے نظیر اس قسم کے توصیفی الفاظ لائے جائیں۔ اور تخرجے کی نیت سے حرفِ نافیہ (بے) نہ لایا گیا ہو۔ تو کیا معترضین کی رائے میں وہاں بھی (بے) کے لفظ مابعد کا تخرجہ ہی لازم ہوگا۔ چنانچہ یہ اعتراض بھی بے جان سا ہے۔ اور کوئی صاحبِ علم اسے تسلیم نہیں کر سکتا۔ موجودہ دور کے دو چوٹی کے اساتذہ نے حروفِ نافیہ (بے) کا استعمال تاریخ میں کیا ہے۔

(۱) نذر دے تاریخ لکھ کر اے جلیلؔ — خسروِ والا گہر کا ہے یہ لعل بے بہا — (۱۳۳۰) ھ
(۲) سینۂ صبر پر کلکِ عیشی سے نوائے تلخ — ٹوٹا ستارہ قلب فنا ساز بے صدا — (۱۹۱۱) ع

لیکن ان دونوں استادوں نے حرفِ نافیہ (بے) کا استعمال تخرجہ کی نیت سے نہیں کیا۔ اس لیے اعتراض بے وقعت ہے۔

تیسرا اعتراض کہ سال ہندی و فارسی غلط ہے۔ بداہتاً خود ہی غلط ہے۔ وہ اس لیے کہ بقاعدۂ زبر و بینہ حسب ہدایت مندرجہ شرح وہی سنہ مصرع سے برآمد ہو رہے ہیں۔ جو مطلوبِ مصنف ہیں۔ معلوم نہیں کس بنا پر غلط قرار دیئے گئے ہیں۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ماتمی نظم میں "زیبِ نظم" کہنا مناسب اور برمحل نہیں۔ کیونکہ مصنف علام کو اپنے اس مصرع تاریخی کی جو در حقیقت لاجواب ہے۔ ستائش منظور تھی۔ اور ان کی نظر میں یہ مادۂ تاریخ محض اس قطعۂ تاریخ بلکہ صنفِ نظم کے لیے باعثِ زیب و زینت ہے۔ ممتنع الجواب بر بنائے سنتِ شاعرانہ مصنف کا یہ دعویٰ واقعیت پر مبنی ہے۔

پہلا اعتراض زبر کے اعراب پر ہے کہ مرزا صاحب نے زُبُر کو زُبَر باندھا ہے اور جناب تسنیمؔ نے زُبُر بہ ضمتین کے ساتھ دو مصرعے پیش فرمائے ہیں۔

(۱) تعزیت چوں در زُبُرھم بیتہ جا گرم کرد

"تعزیت جا گرم کرد" اردو خیال کو فارسی لفظوں میں ڈھال دیا گیا ہے۔ تعزیت جا گرم کرد (تعزیت نے جگہ گرم کی) اردو زبان میں بھی یہ فقرہ غیر فصیح ہے۔ اور فارسی میں "جا یافت" یا "جا گرفت" کے مقام پر "جا گرم کرد" محتاج سند ہے۔ یہ تو اردو زبان کا ویسا ہی ترجمہ ہے جیسا کہ

گڑگڑاہٹ کی فارسی (تندتندی) یا چپکلی کی فارسی (پوشیدہ غنچی) اس بنا پر یہ مصرع نادرست بلکہ غیر فصیح ہے۔

(۲) شد سخن دہ بتیغہ پیرائے آمد در زُبُر

یہ دوسرا مصرع بھی کچھ درست معلوم نہیں ہوتا۔ بات ہونے کی فارسی (سخن رفتن) ہے نہ کہ سخن شدن اس مصرع میں دوسرا ٹکڑا (پیرائے آمدو زبر) ہے۔ پیرا، پیرائے بمعنی پیرائندہ لغت میں آیا ہے۔ یعنی زینت دہندہ۔ مجازاً سر تراش (حجام) یا باغبان وغیرہ کو بھی کہتے ہیں۔ جو درختوں کی شاخیں چھانٹ کر ہموار کرتا ہے۔ یہ لفظ اس مقام پر کوئی معنی نہیں دیتا۔ اگر اس لفظ کو پیرایہ سمجھیں جس کے معنی زیور اور آرائش کے ہیں۔ تو اس کا استعمال فارسی زبان میں کردن۔ بستن۔ افشاندن۔ پوشیدن۔ سنجیدن کے ساتھ آیا ہے۔ آمدن کے ساتھ فصحا کے ہاں مستعمل نہیں۔ لہذا یہ بھی بے موقع ہے۔

عربی کا مقولہ ہے "یجوز للشاعر ما لا یجوز لغیرہ" یعنی ہر زبان کے شعرا کو شاعرانہ اختیارات دیئے گئے ہیں۔ چنانچہ عربی میں بھی عند الضرورت دس اختیارات دیئے گئے ہیں۔ ان ہی میں سے ایک اختیار کو شدید ضرورت کی حالت میں مصنف نے صرف کیا یعنی سہ حرفی لفظ کے حرفِ دوم کی حرکت کو سکون سے بدل دیا۔ اساتذۂ عجم نے بیشتر ایسا کیا ہے۔ مثلاً شَفَقَتْ کو شَفْقَتْ اور خَجَلَت کو خَجْلَت تو مصنف نے کونسی خلافِ قاعدہ بات کی ہے۔

تسکین۔ تحریک۔ تخفیف۔ تشدید۔ تجرید۔ ابدال۔ ادغام۔ اشباع۔ امالہ۔ اضافہ۔ ان سب کی مثالیں اساتذہ کے کلام میں بکثرت ملتی ہیں۔ مثلاً حیواں بالتحریک بمعنی زندہ بودن و زندگانی ہے۔ بمعنی جاندار مجاز۔ لیکن اہل فارس دونوں معنی میں اس لفظ کو بیشتر بہ سکون یا استعمال کرتے ہیں۔ جیسے مصرع میں

آبِ حیواں درون تاریکیست (سعدی)

ع چوں زہاد ریاضت پیشہ بنیم شحنۂ عدلش ہزبر و شیر را بہ پرہیز فرماید ز حیوانی
(طالب آملی)

ع کند چو شیخ ز حیوانی آنقدر پرہیز بجز تمم کہ حیوا در لباس پشمیں است
(مخلص کاشی)

ان مثالوں میں حرفِ متحرک کو شاعر نے ساکن استعمال کیا ہے۔

اسی طرح ذیل کی مثالوں میں حرف ساکن کو متحرک اور مشدد استعمال کیا ہے۔ لفظ شفقت لغت میں بفتح اول و سکونِ ثانی ہے۔ اور حرف قاف غیر مشدد۔ لیکن اساتذۂ عجم نے اس لفظ کو بفتحات نیز بہ تشدید قاف استعمال کیا ہے۔ مثلاً

ع از تغافل جگرم سوخت ندانم آخر کہ سزاوار عتاب و شفقت خواہم شد (میر نجات)
ع سربلندی آرزو داری شُفَقّت پیشہ کن کایں علم را ریزش باراں احساں پرچم است (واعظ قزوینی)

لہذا مرزا دبیر مرحوم جو ایک مستند اور مسلم الثبوت اور شاعری کے استاد تھے۔ اگر انھوں نے زُبُر کو زُبّر از تصرفاتِ شاعرانہ نظم کیا ہے۔ تو کونسی قباحت لازم آتی ہے۔ زُبُر و بتیغہ سے زُبُر و بلیغہ میں زیادہ تر سلاست ہے۔ اور اس طرح یہ مرکب زیادہ مترنم اور خوش آئند ہے۔

ملخص تسلیم میں تو زُبُر پر اعتراض کیا گیا ہے۔ لیکن ملخص تسلیم کا ترجمہ جب ساحر بھسوانی نے اردو میں ملہم تاریخ کے نام سے کیا تو اس اعتراض کا جواب فٹ نوٹ میں اس طرح دیا ہے کہ زبر بہ سکون بھی ہے اور منتہی الارب کا حوالہ دیا ہے۔

جب مذکورہ مادۂ تاریخ پر اعتراض کیے گئے۔ تو جناب حاتم علی مہر شاگرد غالب مرحوم نے اس کے جواب بڑی قابلیت سے لکھے۔ اس رسالہ کا نام بھی "طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس" ہے۔ صفحہ ۳ پر فرماتے ہیں۔

> "افتخار الشعرا، سخنور یکتا عطارد بے نظیر جناب سلامت علی دبیر نے جو تاریخ صاف بیان سلیس و طبع نفیس میر ببر علی انیس کے انتقال کے بقاعدہ زبر و بینہ کمال جدت کے ساتھ فرمائی۔ اس کے سمجھنے میں نابلدان کوچۂ تحقیق کو انتہا کی پریشانی ہوئی۔ کہ آخر سمجھانے کی نوبت آئی۔ تو سید بادشاہ علی متخلص بہ بقاؔ ابن میر وزیر علی صاحب، صباؔ اسکنہ اللہ فی الجنت الماوا خویش میرزائی مغفور نے اس کی کیفیت واقعی ناواقفوں کے ذہنوں پر بحالی کرنے کو طریقۂ سوال و جواب ایجاد کیا۔ اور افہام و تفہیم نکات شعر غوامض سے طبیعتِ متردین کو شاد کیا۔"

غرائب الجمل کے فاضل مؤلف نے معترضین کے متعلق ایک چبھتا ہوا فقرہ لکھا ہے "جن حضرات نے اپنی تالیف میں اس کو بگاڑ کر دکھایا ہے۔ انھوں نے اپنی تالیف کی عزت گھٹائی۔ خدا ان کو بخشے" (غرائب الجمل صفحہ ۲۲۸)

حاصل کلام یہ کہ جو اعتراضات مادۂ تاریخ پر کیے گئے ہیں۔ وہ قطعاً قابلِ اعتنا نہیں۔ بالکل بے جا ہیں۔ مرحوم کا قطعۂ تاریخ بالخصوص مصرع مادہ بلا شبہ الہامی ہے اور مصنف کی خوش نیتی اور متوفی کے برکات روحانی کا نتیجہ ہے۔

فن جمل میں بقاعدہ زبر و بینہ ایسا بے مثل مادۂ تاریخ دیکھا نہیں گیا۔ چونکہ مادح و ممدوح دونوں پاک نفس ذاکر آل عبا تھے۔ لہٰذا ان کی دینی خدمات کا یہ بیش بہا عطیہ ہے۔ اعتراضات کی وجہ اس کے سوا اور کچھ سمجھ میں نہیں آتی کہ معترضین کے دامن میں ایسا کوئی گوہر گرانمایہ نہیں۔ ان کی کتابیں اس قسم کی بے نظیر اور لاجواب تاریخوں سے خالی ہیں۔ بلکہ میں یہاں تک کہہ دوں کہ انھوں نے تمام عمر میں کوئی تاریخ اس پایہ کی کہی ہی نہیں۔ آخر میں ناقدر شناسوں کی حالت پر افسوس کے سوا اور کیا لکھوں۔

(بقیہ "اسے" صفحہ ۱۴۴ سے آگے)

"اری پگلی! شوکت کو نہیں پہچان سکیں۔ تمہارا تو بچپن کا ساتھی ہے۔ کل ہی رات کراچی سے یہاں آیا ہے۔" بھائی جان بدستور گلا پھاڑ رہے تھے۔

"ارے"! کہہ کر میں خاموش ہو گئی۔ دس سال کے وقفے کا پردہ چشم زدن میں سامنے سے سرک گیا۔ میں اور شوکت مظفر پور کے ایک مکان کے دالان میں آنکھ مچولی کھیلتے نظر آئے۔ لیکن غضب کی شباہت تھی۔ غور سے دیکھا تو بجلی کی روشنی میں اس کا چہرہ دمکتا نظر آیا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ آواز اور آنکھوں میں فرق کیوں محسوس ہوتا تھا۔ مجھے اس طرح پریشان دیکھ کر شوکت جھینپ گیا۔ لیکن اب مجھ پر شرم و ندامت کا دورہ پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ زیادہ غصے کا شکار ہو جانا بھی عجیب دل سوز نتائج پیدا کرتا ہے۔ میں غصے میں اندھی ہو کر شوکت اور اس لفنگے میں تمیز نہ کر سکی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ جسے میں نے تھپڑ مارا ہے اور جس کی انگلیاں کچلی ہیں وہ شوکت نکلے گا۔ اس کی زخمی انگلیوں کا خیال آتے ہی ندامت کے آنسو میری آنکھوں میں مچل پڑے۔ روکنے کی کوشش کی۔ لیکن دو قطرے ٹپک ہی گئے۔ مجھے اپنی کمزوری پر افسوس ہوا۔ میں نے پھر شوکت کو غور سے دیکھا۔ جانا پہچانا سرخ تل اس کے بائیں گال پر موجود تھا۔

"کیوں پہچانا؟" بھائی جان مجھے گم سم دیکھ کر زچ کرنے کی خاطر بولے۔

"اب بھی نہ پہچانوں گی؟" میں نے فرش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا شوکی تم مجھے معاف کر دو گے؟" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں شوکت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" شوکت تھوک نگل کر بولا۔

"کتنی بار معافی منگواؤ گے؟" میں نے شوکت کی بوکھلاہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ اس کی معصومیت میں ذرا بھی فرق نہ آیا۔ وہ بالکل ایسا ہی تھا جیسا آج سے دس سال پہلے تھا۔

مجھے اب تک خطرہ ہے کہ میں ہٹا اور تم نے شوکت کا سر توڑا" بھائی جان نے عجیب انداز سے دیکھتے ہوئے کہا۔

شوکت ضبط نہ کر سکا کھل کھلا کر ہنس پڑا۔

شوکت کی انگلیوں کی ڈریسنگ بھی مجھے ہی کرنی پڑی۔ بھائی جان حیران تھے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ میں شوکت سے معافی کیوں مانگ رہی ہوں۔ اور اوٹ پٹانگ کیوں بک رہی ہوں۔ اگر انہیں پتہ چل جاتا کہ شوکت یہاں مجھ سے پہلے ہی پٹ چکے ہیں تو وہ میرے پاگل ہونے کی پیش گوئی کر دیتے۔

(یہ صفحہ غلطی سے بچھڑ گیا ہے۔ جس کا ہمیں بڑا افسوس ہے)

ادارہ

سمپوزیم

کیا موجودہ ادب رُو بہ تنزّل ہے

؟

افسانہ

قرۃ العین حیدر

عام طور پر جدید اردو افسانے کی ابتدا ۳۶ء سے کی جاتی ہے لیکن ۳۶ء میں تو پریم چند کا انتقال ہوا۔ پریم چند کا افسانہ موضوع، سماجی دیو مالا اور کردار نگاری کے لحاظ سے بے انتہا جدید تھا۔ ممکن ہے طرزِ بیان کے اعتبار سے نیا نہ رہا ہو اور یہ خالص ہندوستانی افسانہ تھا۔ اس وقت تک اردو میں روسی، انگریزی اور فرانسیسی کہانیوں کے ترجمے کیے گئے تھے اور ملک کے متوسط طبقے کی زندگی کی جھلک فنکارانہ طور پر محض ہنگامی افسانہ نگاروں نے پیش کی تھی۔ مجموعی طور پر ہمارا افسانہ ——— سوا چند ایک ناموں کے ——— خاصا بے جان تھا۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ "لندن کی ایک رات" اور "انگارے" نے اچانک ایک نیا دروازہ کھول دیا۔ ۳۶ء سے لے کر ۴۷ء تک اور تقسیم کے بعد سے لے کر آج تک کے افسانوی ادب کے بارے میں اس قدر لکھا جا چکا ہے کہ مجھے وہی سب باتیں دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ "جمود" کے مسئلے پر بھی اَن گنت مضامین لکھے گئے ہیں۔ بار بار یہ سوال اٹھایا جا چکا ہے کہ اس ملک میں اچھا ادب کیوں نہیں تخلیق کیا جا رہا؟ یہ صحیح ہے کہ پچھلے بارہ سال میں چند ایک اچھے افسانے بھی لکھے گئے ہیں۔ ۵۵ء تک تو خیر منٹو ہی زندہ تھے۔ رہے ۴۷ء سے پہلے کے افسانہ نگار تو غلام عباس جب بھی لکھتے ہیں بہت اچھا لکھتے ہیں۔ ہاجرہ اور خدیجہ کا ہر افسانہ ترشا ترشایا اور مکمل ہوتا ہے۔ نئے لکھنے والوں میں جیلانی بانو کے علاوہ (جن کا تذکرہ میں آگے کروں گی) صرف تھوڑے سے نام ہی کوئی اہمیت حاصل کر سکے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ گنتی کے یہ چند ادیب کب تک گاڑی چلائیں گے؟

ساری دنیا میں ہر زبان میں ہزاروں کہانیاں لکھی جا رہی ہیں۔ ان میں سے سب ہی اچھی نہیں ہو سکتیں مگر جاپانی قوم، فرانسیسی قوم، امریکن قوم اطمینان کے ساتھ کہہ سکتی ہے ——— "یہ ہمارا آج کا ادب ہے" ——— ہم اپنے آج کے ادب کے متعلق کیا کہہ سکتے ہیں؟ ہم ایسے موقعوں پر اپنا سارا پرانا کچا چٹھا سنانے بیٹھ جاتے ہیں۔ یلدرم، سلطان حیدر جوش، ل۔ احمد اور نیاز صاحب نے یہ لکھا۔ ۳۶ء میں یوں ترقی پسند آئے۔ یوں ان کا عروج ہوا، یوں زوال اور آخر میں ٹیپ کا بند ——— اب یوں جمود طاری ہو گیا ——— اچھے افسانے کیوں نہیں؟ کیا کریں صاحب! جمود طاری ہے ——— اللہ کی قسم! اس لفظ کی گردان سنتے سنتے دم بولا گیا۔ اے لیجیے اب "نقوش" نے جمود نمبر شائع کر دیا۔ اب سال کے سال یومِ جمود بھی منایا کیجیے۔

جدید مغربی ادیب نے کمیونزم کی ناکامی کے بعد نئے تصوف کو اپنا لیا مگر وہاں ریلزم ختم ہوئی تو نیو ریلزم بھی شروع ہو چکی ہے۔ ہمارے یہاں ریلزم ختم ہوئی، ترقی پسندی ختم ہوئی، کسی نئے رجحان، جاندار تحریک نے جنم نہ لیا۔ انٹ سنٹ جو جس کے جی میں آ رہا ہے لکھ رہا ہے، یا پھر لکھتا ہی نہیں۔ عسکری صاحب کے ایسے لوگ بھی ہیں جو نروان کی اس بلندی پر پہنچ گئے ہیں کہ اب کچھ لکھ کر ہی نہیں دیتے۔

مزے کی بات یہ ہے کہ ان حضرات (اختر رائے پوری، احمد علی وغیرہم) کی خاموشی پر اب تک اتنے صفحے سیاہ کیے گئے ہیں جن کا حجم ان مصنفین کی ادبی تخلیقات سے زیادہ ہی ہوگا۔ گویا لکھنے والے بھی موجود ہیں، رسالے بھی دنادن چھپ رہے ہیں مگر سب کے سب مل کر جمود ہی کے متعلق لکھنے پر جُٹ گئے ہیں۔ معلوم یہ ہوا کہ موضوع کا اس قدر فقدان ہے کہ اب صرف اسی فقدان پر لکھا جا رہا ہے، اسے معرفت کی آخری اسٹیج کہتے ہیں۔

اس مرتبہ بھی نقاد لوگ دریائے جمود میں غوطہ زن ہو کر ایسے ایسے آبدار موتی برآمد کریں گے کہ مجھ جیسے جاہل جپٹ لوگوں کے سامنے چودہ طبق روشن ہو جائیں۔

ہر ملک میں ادب کا ایک عظیم عہد ہوتا ہے جو ناسازگار حالات کے باوجود تخلیق کیا گیا اور بعض مرتبہ انہی ناسازگار حالات کی وجہ سے پیدا ہوا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ جنگ چھڑی، یا کوئی قومی کرائسس آیا تو قوم کی قوم ایک طرف کو ڈھل گئی۔ یونیورسٹیاں بند کر دی گئیں — چھاپے خانوں اور لائبریریوں میں تالے پڑ گئے، کتابیں ردّی میں بیچ دی گئیں، دماغوں کو کھنگال کر خالی کر دیا گیا، ادیبوں نے قلم رکھ دیئے کہ بھائی گھمسان کا رن پڑا ہے لکھیں کیا خاک؟ کل کلاں کو بمباری سے مر جائیں گے — شاعری اور افسانہ نویسی چھپر پہ رکھیے، ہمیں تو اپنی جان عزیز ہے۔

اس کے برعکس ہوا یہ کہ شہروں میں آگ لگتی رہی، عظیم الشان میوزیم، آرٹ گیلریاں اور کتب خانے جل کر خاک ہو گئے، ملک کے ملک تہ و بالا ہو گئے مگر لکھنے والا اسی طرح لکھتا گیا۔ وہ محاذ پر لڑا، جلاوطن ہوا، جیلوں میں بند کیا گیا، گولی سے اُڑا دیا گیا، مگر وہ سچا فنکار تھا تو اس نے پھانسی کے سائے میں بیٹھ کر بھی لکھا — ورنہ یورپ کے پچھلے دو ہزار سال جس قدر تباہی کے گزرے ہیں وہاں تو ایک کتاب بھی نظر نہ آتی لیکن ذہنی اور سیاسی انقلابات، روحانی بے اطمینانی، اقتصادی کساد بازاری کے ہر دور میں ادیب کو جو کام اس کے معاشرے نے سونپا تھا وہ اس نے پورا کیا۔ تاریخ کے ہر جھنجال نے ادب میں ایک جگمگاتے دور کا اضافہ کیا۔ کہیں پرانے بت توڑے گئے، کہیں نئے صنم کدوں میں گم شدہ بت لا کر سجا دیے گئے۔ رزم و بزم ہر جگہ ادیب اپنے لوگوں کے ساتھ ساتھ رہا، چاہے وہ خانقاہوں میں بیٹھا تھا، چاہے وہ درباروں میں قصیدے لکھ رہا تھا، خواہ وہ جیلوٹین پر جا رہا تھا، ہر حالت میں بہرصورت اس نے اپنا تاریخی رول ادا کیا۔

دور کیوں جائیے آپ کے پڑوس میں ایک ملک چین نامی کئی ہزار سال سے آباد ہے۔ وہاں کے باشندوں نے اپنی ساری تاریخ میں جس قدر دُکھ جھیلے ہیں ان کا اندازہ ہم آسانی سے نہیں کر سکتے۔ اب سے چند برس اُدھر کی بات ہے کہ ان کے فوجی دستے محاذ پر جانے کے لیے آگے آگے چلتے تھے اور ان کی یونیورسٹیاں خچروں پر کتابیں لادے پیچھے پیچھے سفر کرتی تھیں۔ جہاں لڑنے بھڑنے سے فرصت ملی، کسی خندق یا کھوہ میں بیٹھ کر لکھنا پڑھنا جاری ہو گیا۔

مغرب میں قرونِ اولیٰ کی رزمیہ داستانیں، عشقیہ شاعری، مسیحی تصوف، پرتکلف شائستگی، نشاۃ ثانیہ کا سارا ادب، ریفارمیشن کے زمانے کا جرمن لٹریچر، فرانس کا عہدِ زریں، عقلیت پرستی، انقلابِ فرانس، وکٹورین دور، روسی روایت، صنعتی انقلاب کے بعد کا ناول، تجدیدِ روایات،

ناروے کا حقیقت پسند ڈرامہ، آئرلینڈ کی شاعری، فرانس کی جدید تحریکیں، پہلی جنگِ عظیم، ڈپریشن، اسپین، سوشلسٹ ریلزم، امریکہ کی وسیع کینوس کا عظیم ناول، ۱۹۴۵ء کے بعد کا سارا جدید تر ادب —— یہ سب کس طرح تخلیق کیا گیا؟ کیا ان سب کے لیے حالات سازگار تھے؟ خیر، ہمارے یہاں سلطنتِ مغلیہ کے زوال نے اُردو شاعری کو پروان چڑھایا۔ برصغیر کی ساری جدید زبانوں کی نثر کی نشوونما اس زمانے میں ہوئی جب ملکی حالات قطعی آئیڈیل نہیں تھے۔ ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک ہم نے بھی وہ وہ تھپیڑے کھائے کہ عقل درست ہو گئی اور اسی نوے سال میں ہمارا ادب اس مقام پر پہنچا جہاں ہم نے اسے ۱۹۴۷ء میں چھوڑ دیا اور آنکھیں موند کر ایک طرف کو ہو بیٹھے۔ کبھی کبھار پبلک کو اطلاع دے دی —— خواتین و حضرات! جمود طاری ہو گیا ہے ——

اب ذرا باہر کی دنیا میں ادب کی ترقی پر غور کیجیے اور اس اطلاع کی نزاکتوں پر جائیے تو سر دھننے کو جی چاہے گا۔ وجوہات تو بہت سی ہیں مگر چند ایک کا ذکر اس مضمون میں کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ بارہ سال گزر گئے پر ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا کہ ہوا کیا ہے۔ یہ میں کوئی آفاقی سطح پر بات نہیں کر رہی ہوں، محض اپنے گردوپیش کا اندازہ لگا کر میں نے محسوس کیا ہے کہ جس طرح ہم اپنے متعلق سنجیدہ نہیں اسی طرح اپنے ادب کے سلسلے میں بھی لاپروا ہیں۔ بنیادی حقائق اور مسائل سے بے نیازی اسی ذہنی کاہلی اور بے تعلقی کا نتیجہ ہے جو شدید مایوسی کے بعد پیدا ہوتی ہے لیکن اس مایوسی کے بعد کچھ کرنے کی لگن کیوں نہ ہوئی؟ اس کا جواب آپ خود دیجیے، اس کے ذمہ دار ملک و قوم نہیں آپ خود ہیں۔ آپ میں نہ ہمت ہے نہ تخیّل، لگن کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا —— ابھی دنیا کے بہت سے معاملات طے ہو رہے ہیں۔ اونٹ ذرا ایک کروٹ بیٹھ جانے دو اس کے بعد ہم لکھیں گے —— اس کے بعد آپ کیا لکھیے گا؟ یک طرفہ کارروائی ہو جانے کے بعد کیا آپ اپنا سر لکھیے گا؟

دعوے تو آپ کو بہت ہیں۔ ہم انٹلکچوئیل ہیں (بہت ہیبت ناک لفظ ہے)، ہم معاشرے کا ضمیر ہیں، ہم میر و غالب و حالی و اقبال کے وارث ہیں، تہذیب کے محافظ ہیں (وغیرہ وغیرہ) اپنے آپ کو "ادیب" کہلا کر پھولے نہیں سماتے مگر جو حالت ہے وہ یہ ہے:۔

غلامی کے عہد میں دارالمصنفین اعظم گڑھ، جامعہ ملّیہ دہلی، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن، انجمن ترقی اُردو نے ہزاروں کتابیں لکھ ڈالیں۔ تحقیق، تنقید، ترجمہ —— کیسے کیسے شاعر پیدا ہوئے۔ صاحبِ طرز نثر نگار، چوٹی کے اسکالر۔ ترقی پسند مصنفین کو تو چھوڑیے، ان کو تو برا کہنا اب فیشن میں داخل ہے کہ یہ لوگ گمراہ اور دہریے تھے مگر اللہ والے مسلمانوں نے بھی کیا کچھ نہیں لکھ ڈالا۔ بچوں کے لیے جامعہ ملّیہ نے کیسا لٹریچر چھاپا۔ خود زنانہ ادب کا ایک پورا کتب خانہ عصمت اور تہذیبِ نسواں نے تیار کر دیا۔ عصمت اور تہذیبِ نسواں کے نام پر مسکرانے کی ضرورت نہیں۔ ان کو آج ہم رجعت پسند سمجھ لیں مگر اس عہد میں انھوں نے مسلمان عورتوں میں لکھنے پڑھنے کا ذوق عام کرنے کی بڑی زبردست خدمت انجام دی۔ اس وقت عورتوں کے لیے کتنے اعلےٰ درجے کے رسالے نکلتے ہیں؟ بچوں کے لیے کتنی کتابیں لکھی گئی ہیں؟ کلاسیکس پر کتنا کام ہوا ہے؟ تخلیقی ادب میں ہم نے کون سے جواہر پارے پیش کیے ہیں؟ اب اگر اُردو میں نئی نئی کتابیں چھپوانا ہے تو مکتبہ فرینکلن نیویارک ——

تقسیم کے بعد کچھ کم بلند پایہ ادیب تو ادھر نہیں آئے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ لوگ پریشان حال ہیں، انھیں ذہنی یکسوئی میسر نہیں، تو غیر منقسم ہندوستان میں یہ لوگ کہاں کی گورنری کر رہے تھے؟ بلکہ اب تو زیادہ تر لکھنے والے اقتصادی لحاظ سے ۱۹۴۷ء سے پہلے کے مقابلے میں کئی گنا بہتر حالت میں ہیں۔

صورتِ حال فی الحال یہ ہے :-

ایک روز خاندان کی ایک کم سن لڑکی نے جس کی ساری ذہنی نشو و نما پہلے امریکن کومکس کی اور اب انگریزی کتابوں کی مرہونِ منت ہے اور اُردو میں پاکستانی بچوں کے لٹریچر کی حد تک۔ اس کا مطالعہ "بھوپت ڈاکو کی باتصویر سوانح حیات" اور روزنامہ جنگ اور انجام کے بچوں کے صفحات تک محدود ہے، مجھ سے پوچھا —— "کوئی اُردو کی کتاب ایسی بتائیے جسے پڑھ کر میں اُردو سیکھوں۔"

میں نے ہڑبڑا کر بہت سے نام گنائے۔

"یہ سب تو کورس میں ہیں۔"

"اچھا تو —— کرشن چندر پڑھو۔"

"وہ تو ہندو ہے —— کوئی اچھا سا پاکستانی رائٹر بتائیے خالہ آپا —— !"

"اچھا تو بٹیا! تم وہ پڑھو —— کیا نام اس کا ——"

میں آج تک اس کا نام سوچ رہی ہوں!

قاضی عبد الغفار، پریم چند، کرشن چندر، عصمت چغتائی، یہ سب کسی اور دنیا کے باسی ہیں، کسی اور معاشرے کی بات کرتے ہیں۔ یہ پندرہ سالہ ذہین لڑکی آج کا "پاکستانی رائٹر" پڑھنا چاہتی ہے اور پھر بور ہو کر امریکن یا انگریزی کتابوں کی طرف واپس لوٹ جاتی ہے۔ ذہنی طور پر یہ نئی نسل یک لخت اتنی بڑی ہو گئی ہے کہ اسے آسانی سے بہلایا نہیں جا سکتا۔

دفتر میں اکثر ہمارے پاس باہر کے ممالک سے فرمائش آتی ہے "۴۷ء کے بعد کے پاکستانی اور ہاں کی بہترین کہانیوں کا انتخاب بھیجئے، ہم جدید ایشیائی ادب کی انتھالوجی شائع کر رہے ہیں —— لیجئے، ہیر پھیر کے وہی "ہماری گلی" وہی "آنندی" وہی "ہتک"۔ تہی دامنی کی بھی حد ہونی چاہیے (اور یہ ساری کہانیاں بھی تقسیم سے قبل لکھی گئی تھیں)

کئی اچھے خاصے ادیبوں کو سستی جرنلزم نے مارا۔ (فلم میں یہاں اتنے نہیں گئے، اگر گئے بھی تو ان کے چلے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ پہلے بھی کوئی تیر نہیں مار رہے تھے) چند ایک ادیب لوگ کہتے ہیں کہ میاں اُردو میں کیا رکھا ہے، میں تو اب انگریزی میں ناول لکھنے کی فکر میں ہوں۔

؏ تو کارِ زمیں را نکو ساختی ——

یوں برس کے برس ادبی جائزوں میں فیکٹریوں کی سالانہ رپورٹ کی طرح ناموں کی بارات لے لیجئے (معلوم نہیں اس مضمون کو پڑھ کر مجھ پر کتنا تبرّا بھیجا جائے گا)

تکنیک سے بے توجہی کا یہ عالم ہے کہ "بڑے" "پندرہ سال قبل جو راستے سجھا گئے تھے ان پر نہایت پابندی، سعادت مندی اور فرماں برداری سے چلا جا رہا ہے۔ اسے بھی چھوڑیئے، کوئی ایک رسالہ اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ اس میں دس افسانوں میں سے پانچ اس طرح شروع ہوں گے —— اور علیہ کرسی پر سے اٹھی —— اور بارش ہونے لگی —— اور چراغ جلتا رہا —— اور آسمان پر خوش الحان چڑیاں اُڑ رہی تھیں —— اور ——

ہماری اس کم مائگی کی کچھ وجہ تو ضرور ہو گی۔ اب بغاوت کیوں نہیں کی جا رہی ہے؟ بغاوت وہ نوٹ ہے جس سے مختصر کہانی

کی ابتدا ہوئی۔ روایت سے باغی ہونا اور روایت کو ساتھ ساتھ رکھنا، ان دونوں دھاروں سے ادب بنتا ہے۔ ہمارے یہاں نثر کی روایت نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ روایت ہم نے مغرب سے مستعار لی۔ بغاوت بھی مغرب ہی کے زیر اثر کی۔ اس کے بعد ہم خرافات میں کھو گئے۔

امریکہ کی جنگِ آزادی میں برطانیہ ہار گیا تھا۔ ہندوستان کی جنگِ آزادی میں برطانیہ جیتا۔ ہمارے ادبی ارتقاء کی خوبیوں اور کمزوریوں کی کڑیاں اسی حقیقت سے جا کر ملتی ہیں۔ امریکہ نے اپنی فتح کے بعد برطانیہ سے کٹ کر اپنا فلسفۂ عملیت تیار کیا۔ اپنے محاورے، اپنی دیو مالا، اپنا نظریۂ زندگی۔ اپنی شکست کے بعد ہم محض برطانوی خیالات کی جگالی کرتے رہے اور آج تک کر رہے ہیں۔ ہمارے اپنے ادب کی دیسی نشو و نما رک گئی اور ہم کو دوم نمبر ملک کی حیثیت سے برطانیہ کے پیچھے پیچھے گھسٹتے رہے۔ حکمرانوں کے اشارے پر اُردو ہندی کا جھگڑا کھڑا ہوا جس کی وجہ سے زبان و ادب کی ترقی میں اور زیادہ روڑے اٹکے۔ ہم نے انگلستان کے ادب سے بہت کچھ حاصل کیا مگر حکمرانوں کی نسلی برتری کے تعصب کی وجہ سے انگریزی ادب میں کوئی مقام حاصل نہ کر سکے۔ آسٹریلیا، کینیڈا، جنوبی افریقہ اور آئرلینڈ کے ادیب کو تو انگریزی روایت میں شامل سمجھا گیا مگر ٹیگور اور سروجنی نائیڈو کو دوسرے درجے کے ادیبوں کے خانے میں جگہ ملی۔ آج کل بھی جان ماسٹرز کی بکواس کو سراہنے والے لاکھوں ہیں لیکن برصغیر کا کوئی ادیب جو انگریزی میں لکھتا ہے اس کے ناولوں کو ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ کے تبصروں میں چار پانچ سطروں میں ٹال دیا جاتا ہے۔ احمد علی کا ذکر بھی جو ایک آدھ جگہ "اینگلو انڈین لٹریچر" کے زمرے میں آگیا ہے وہ اس لیے کہ ان کو ای۔ ایم فارسٹر کی سرپرستی حاصل ہو گئی تھی۔ حال میں نوجوان ہندوستانی شاعر ڈوم موریز (فرینک موریز کا لڑکا) کو البتہ بے انتہا پسند کیا گیا ہے مگر اس کے لیے بھی یہ کہا جا رہا ہے کہ روحانی اور ذہنی طور پر وہ انگریز شاعر ہے، ہندوستانی نہیں۔ فرانسیسی نسلی تعصب سے قطعاً واقف نہیں (الجیریا کی جنگ کے پس منظر میں اس حقیقت کو دیکھئے تو بے حد عجیب معلوم ہوتا ہے) مصر کے محمود تیمور اور دوسرے مصنفین جو فرانسیسی زبان میں لکھتے ہیں، ان کے ناول پیرس میں چھپتے ہیں اور انھیں فرنچ روایت میں شامل سمجھا جاتا ہے۔ خیر یہ تو بقول شخصے جملہ معترضہ تھا۔

تو ذہنی افق تو وسیع ہو گیا، تخلیقی صلاحیتیں بھی بے پایاں تھیں مگر نہ جانے کس طرح ہم اُردو میں وہ عظمت پیدا نہ کر سکے جو اس خوبصورت زبان کا پیدائشی حق تھی۔ چونکہ سرکاری زبان انگریزی تھی اس لیے اُردو جدید تقاضوں کی ترجمانی کرنے سے قاصر رہی اور اس میں وہ خود اعتمادی نہ آ سکی جو چالیس کروڑ انسانوں کی لنگوا فرینکا کی حیثیت سے اس میں ہونا چاہیے تھی۔ ہمیں اپنی انگریزی دانی پر بڑا فخر تھا مگر ہمارے آقا اسے "بابو انگلش" کہہ کر اس پر مسکراتے تھے (جس طرح ان سے پہلے کائستھوں کی فارسی کا مسلمان مذاق اڑایا کرتے تھے) لہٰذا قومی ادب وہیں کا وہیں رہا۔

کسی اور ملک میں یہ حالت ہے؟ جاپانی، مصری، ایرانی، ترک سب ہی فخر سے اپنی اپنی زبانیں بولتے ہیں۔ ہم ہیں کہ انگریزی کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ گئے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مغرب کے سیاسی اقتدار کے دور میں اور یورپ سے جغرافیائی قرب کی وجہ سے مشرقِ وسطیٰ نے فرانسیسی کو اپنی کلچرل زبان کے طور پر اختیار کر لیا تھا مگر اب زمانہ بدل چکا ہے۔ قوم پرستی کے جوشیلے عہد میں اب مشرقِ وسطیٰ کے ممالک اپنی اپنی زبانوں کی طرف واپس لوٹ رہے ہیں۔

ہمارے یہاں نہ ڈرامہ پنپ سکا نہ تھیٹر بنا (جس ملک میں آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے یونان جیسا ترقی یافتہ تھیٹر موجود تھا) نہ ناول کی روایت قائم ہوئی۔ مختصر یہ کہ شگفتگی اور وسعت اُردو میں نہ آئی۔ آرٹ اور ادب کی جدید تنقید کے لیے بے شمار اصطلاحات ہیں جن کا اُردو نعم البدل ہمارے پاس آج تک موجود نہیں اور یہ وہ زبان ہے جو دیوناگری اور عربی رسم الخط کے فرق سے قطع نظر چینی اور انگریزی بولنے والوں کے بعد

دنیا کی آبادی کا تیسرا بڑا حصہ استعمال کرتا تھا۔ دنیا کی تیسری بڑی زبان ——— !! صرف ایک صنفِ ادب ایسی تھی (یہاں میں نثر کا ذکر کر رہی ہوں۔ شاعری اس پوری بحث سے خارج ہے) جس کے بل بوتے پر ہم نے اپنا سر اونچا کیا اور ہندی، مرہٹی، گجراتی، بنگالی، تامل اور تیلیگو، افسانہ نگاروں سے کہا: "وہ تو ٹھیک ہے ——— مگر آپ نے اُردو افسانے پڑھے ہیں؟"

اس اُردو افسانے پر آج اوس پڑ چکی ہے اور اس کی مرثیہ خوانی کی غرض سے مدیر "نقوش" کی دعوت پر ہم آج اس محفل میں جمع ہوئے ہیں۔

اس مسئلے پر زیادہ تفصیل میں جائے بغیر کام نہیں چلے گا کہ اس وقت ہمارا اور ہمارے افسانے کا ایک دوسرے سے کیا رشتہ ہے اور اس افسانے کے سوسائٹی اور باقی ساری دنیا سے کس قسم کے تعلقات ہیں!

میں نے ابھی "بڑوں" کا ذکر کیا تھا۔ یہ "بڑے" بیدی، کرشن، عصمت، غلام عباس، منٹو، حیات اللہ انصاری آسمان سے نہیں اُترے تھے نہ ان کے سروں کے گرد نور کے ہالے ہیں۔ مگر یہ سنجیدہ اور پُرخلوص فنکار تھے۔ آج کل محض رفع الوقتی کی خاطر لکھا جا رہا ہے یا زندگی سے وہ رابطہ قائم نہیں کیا جا سکا جو لیکھک کو کائنات کا ترجمان بناتا ہے۔

اس دور میں ساری دنیا کو ایک MYTH کی تلاش ہے۔ ہر زمانہ، ہر ادب، ہر رویّہ اپنے لیے ایک MYTH ڈھونڈھ لیتا ہے۔ پاکستان کو یہ اب تک نہیں مل سکا۔ ۴۷ء سے پہلے والوں کے پاس یہ MYTH موجود تھا۔ ۴۵ء کے بعد کے مغربی ادیب بھی اسی کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ رلکے اور کافکا اور لورکا اور ہوپکنز کو اپنے سمبل مل گئے تھے۔ ڈپریشن کے زمانے سے لیکر ہسپانوی خانہ جنگی تک ادیبوں نے اپنے سمبل تلاش کر لیے تھے اور ان کی خاطر اپنی جانیں تک دیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد فرانس میں سارتر اور کیمو نے ایک دوسری قسم کے اساطیر تراشنے شروع کیے۔ سارتر اب انسانیت کو ایک بالکل دوسرے رُخ سے پرکھ رہا تھا۔ ایلیٹ نے اپنے FOUR QUARTRETS میں سمبلز کی ایک پوری دنیا آباد کر کے رکھ دی۔ ڈی لن ٹامس اور ایڈتھ سیٹ ویل دونوں الگ الگ علامتوں کے خالق ہیں۔ آرٹ میں جدید انسان کی طرف سے یہی فرض ڈالی، پال کلی، گراہم سدرلینڈ اور ہنری مور نے ادا کیا۔

ہمارے یہاں ۳۶ء کے بعد سمبل مل گئے تھے اور ان میں بڑی توانائی اور گمبھیرتا تھی۔ اِس وقت یعنی ۱۹۵۹ء میں کچھ حضرات اسلام میں یہ MYTH تلاش کر رہے ہیں۔ غالباً ان کا کہنا یہی ہوگا کہ مغرب کے جدید تر ادیبوں نے مادہ پرستی، حقیقت پسندی اور مشینی تہذیب کے خلاف بغاوت کر کے روح اور صلیب کو اپنا آدرش بنایا ہے کیوں نہ ہم اپنی روح میں اپنا حل ڈھونڈھیں۔ یہ آواز دس سال قبل ۴۹ء میں بھی بلند کی گئی تھی۔ پچھلے دس سال میں ہم کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے اور اب از سرِ نو بات وہیں سے شروع کی جا رہی ہے۔ پچھلے برسوں میں جو مایوسی طاری ہوئی اس کی وجہ سے میرؔ کے الم سے اپنے الم کو مماثل کیا گیا۔ انتظار حسین کے کردار اس دور کے ترجمان ہیں ——— میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو ——— ہمارا بیشتر ادب نوسٹیلجیا کا ادب ہے اور اس کی یہ خصوصیت ۴۷ء کے بعد بالکل لازمی اور جائز اور حق بجانب ہے۔ انتظار حسین اور شوکت صدیقی دونوں کے کردار علیحدہ علیحدہ مختلف قسم کے سمبلز ہیں اور بے حد حقیقی ہیں لیکن ان دونوں افسانہ نگاروں نے اور ان کے علاوہ دوسروں نے بھی پچھلے دس سال میں جو کچھ لکھا ہے اس کے باوجود ہم نہیں کہہ سکتے کہ مجموعی طور پر پاکستان میں افسانے کا رجحان کس طرف ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کی تخصیص اس لیے کہ جیلانی بانو جس طرح کی کہانیاں پیش کر رہی ہیں ——— مثال کے طور پر "روشنی کے مینار"، "آگ کے پھول"، "جگنو اور ستارے" ——— یہ کہانیاں پاکستان میں نہیں لکھی جا سکتی تھیں۔ اُدھر ادیش

کی نئی عوامی زندگی، سیاسی شعور، حیدرآباد کی دم توڑتی ہوئی تہذیب ——— ان حقیقتوں کی پُرخلوص اور خوبصورت عکاسی صرف جیلانی بانو کا کمال ہے۔ "روشنی کے مینار" میں یہ پڑھیے ———

"اخبار بیچنے والا لڑکا زور زور سے چیخنے لگا۔ اس کے پاس کوئی گھٹیا سا اخبار تھا مگر ایک آنے میں اچھا اخبار بھی تو نہیں مل سکتا ———

"اخبار بیچنے والا لڑکا اب بھیک سی مانگ رہا تھا جیسے یہ اخبار آج نہ بکے تو ایک قیامت خیز طوفان آ جائے گا، ٹرین اُلٹ جائے گی، ایک اور خوفناک جنگ شروع ہو جائے گی جس کی بنیاد یہ اخبار بیچنے والا لڑکا رکھے گا ———

یہ اخبار خرید لو ورنہ میں تمھیں اپنا دوسرا روپ دکھاؤں گا۔ اخبار تمھیں قطعی خرید لینے چاہئیں ورنہ کل کی ہیبت ناک خبروں کے لیے تیار ہو جاؤ ———"

رہیں عصمت چغتائی تو وہ جہاں بھی ہوتیں اسی طرح چیر پھاڑ کرتی رہتیں۔ (عصمت کے ذکر پر خیال آیا کہ اگر یہ بی بی لکھنے کے بجائے محض اسکول پڑھا رہی ہوتیں یا محض خانہ داری کر رہی ہوتیں تو آج اُردو افسانے کی کیا کیفیت ہوتی)

میں ادب میں مردوں اور عورتوں کی تفریق کی قائل نہیں مگر یہ واقعہ ہے کہ میرا بائی، جین آسٹین اور ورجینیا وولف کی مانند کوئی مرد کبھی نہ لکھ سکتا تھا۔ اُردو کے نئے افسانے میں ایک نئی جہت کا اضافہ رشید جہاں اور عصمت چغتائی کی شرکت سے ہوا۔ یہ شرکت بھی اس بغاوت کا ایک لازمی پہلو تھی جس کا ذکر میں پہلے کر چکی ہوں۔ اس دور میں رشید جہاں اور عصمت کا پیدا ہونا اتنا ہی لازمی تھا جتنا کرشن چندر اور منٹو کا۔ وہ زمانہ اب گزر چکا تھا جب عورتیں محض موضوعِ سخن ہوتی تھیں، دوسروں کو موضوعِ سخن بنانے کی ہمت نہ کر سکتی تھیں۔ جن دنوں عصمت کی کہانیاں پہلے پہل چھپیں، فضا پر شدید رومانیت چھائی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ چند حضرات نے "طاہرہ دیوی شیرازی" کو ایجاد کیا اور ان فرضی بیگم صاحبہ کی طرف سے افسانے لکھے گئے یا پھر حجاب امتیاز علی کی مادام زبیدہ اور خاتون روحی اور کاؤنٹ لوث کی عملداری تھی۔ اس میدان میں عصمت ڈنڈا سنبھالے اُتریں۔ انھوں نے جو کچھ لکھا اس میں تلخی تھی۔ طنز، غصہ ——— (یہ بات معنی خیز ہے کہ اس زمانے میں ان ترقی پسند افسانہ نگار خواتین کے افسانوں کے عنوان "چوٹیں" اور "چرکے" ہوتے تھے) نئی مسلمان عورت کی یہ تلخی حق بجانب تھی۔ کیونکہ وہ اس سوسائٹی میں پیدا ہوئی جو اس مغربی دنیا سے سو سال پیچھے تھی جہاں کی زبان اور ادب اسے پڑھایا گیا۔ گو میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اکیڈیمک تعلیم نے عصمت کا کچھ نہ بگاڑا۔ علیگڑھ گرلز کالج میں پڑھ کر کیٹس پر مضمون لکھنے کے بجائے انھوں نے "پردے کے پیچھے" لکھ ڈالا۔

پردے کے پیچھے ——— یہ ان نئی افسانہ نگار خواتین کا خاص میدان تھا۔

عورتوں کے لیے کہا جاتا ہے کہ ان کی دنیا مختصر ہے لہٰذا وہ اس کے بارے میں زیادہ بصیرت سے لکھ سکتی ہیں۔ ورجینیا وولف نے ایک جگہ کہا ہے:۔

"مردوں کی بنائی ہوئی دنیا میں فٹ بال میچ کو زیادہ اہمیت حاصل ہے اور فیشن یا ملبوسات کی خریداری کو سطحی سمجھا جاتا ہے"

اگر یہ کتاب میدانِ جنگ کے بارے میں ہے تو بے حد معنی خیز ہے۔ اگر ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی عورت کے احساسات کے بارے میں ہے تو فضول ہے۔ میدانِ جنگ کا منظر ملبوسات کی دوکان کے منظر سے زیادہ اہم ہے ———!

لیکن جب ان خواتین نے آگرہ، علیگڑھ اور لکھنؤ کے گھر آنگن کی دنیا کے متعلق لکھا تو لوگ چونک اٹھے۔ یہ نہیں کہ آگرہ، علیگڑھ اور

لکھنؤ کے گھر آنگن کے بارے میں پہلے نہیں لکھا گیا تھا۔ مصلحینِ قوم نے عورتوں کی روحانی اور اخلاقی اصلاح و تربیت کے لیکچرز کے طور پر نصف صدی قبل ناولوں کا ایک دریا بہا دیا تھا۔ خود ان کی ہونہار شاگردوں نے حویلیوں کے اندر کی دنیا، شادی بیاہ کے قصّے اور مسلمان پردہ نشین عورت کی دکھی زندگی کے موضوعات پر ان گنت جلدیں رقم کر ڈالیں۔ رقّت خیز جذباتیت، آئیڈیلزم اور سماجی اصلاح پر ان کی بنیاد تھی۔ آپ اس صدی کے شروع میں لکھنے والی پردہ نشین خواتین سے اس سے زیادہ کی توقع بھی نہ کر سکتے تھے جبکہ ان کے پڑھے لکھے مرد ان سے بہت زیادہ بہتر ناول نہیں لکھ رہے تھے، ان کی یہ کاوشیں واقعی قابلِ قدر ہیں۔

پہلے زیادہ تر اردو ناولوں کی ہیروئن پارسی حسینہ، بنگالی حسینہ، یورپین حسینہ یا پھر حور تمثال عفت کی دیوی مسلمان یا ہندو ماہ پارہ ہوتی تھی۔ (فیاض علی مرحوم کے ایک ناول کی امریکن ہیروئن اردو کا ایک لفظ نہیں جانتی۔ ٹرین میں علیگڑھ کے کھلنڈرے نوجوان ہیرو سے ملاقات کے بعد فی الفور ہارمونیم پر فارسی غزل گانے لگتی ہے)

لیکن ۱۹۳۶ء تک پہنچتے پہنچتے دنیا بدل چکی تھی۔ گھر آنگن وہی تھے مگر باہر کی دنیا میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ ڈیوڑھیوں پر لٹکے ہوئے ٹاٹ کے ٹکڑے اور محل سراؤں اور کوٹھیوں کے ڈرائنگ روم کے مخملیں پردے سب کے سب اس آندھی میں پھٹپھٹانے لگے تھے اور ان کے اٹھنے سے اندر کی ایک بالکل نئی اور غیر متوقع جھلک دکھلائی دے گئی تھی۔ اب جذباتیت کا گزر کہیں نہ ہو سکتا تھا۔ عصمت اور ہاجرہ مسرور وغیرہ جذباتیت اور HUMBUG کی جانی دشمن تھیں۔

وہ وقت اب نکل گیا جب عورتیں غیر شعوری طور پر پُر احتجاج آٹو بیاگرفی لکھتی تھیں۔ اب وہ غیر شخصی اور پُرسکون انداز سے زندگی پر تنقید کر سکتی ہیں۔ اس ذہنی پختگی کا اندازہ آپ کو ہاجرہ اور خدیجہ کے تازہ افسانوں سے ہو سکے گا۔

بہرحال اس پچھلے دور نے بہت سی خواتین افسانہ نگار پیش کیں۔ شکیلہ اختر، ممتاز شیریں، تسنیم سلیم چھتاری، سرلا دیوی، کوشلیا اشک، شکیلہ معظم علی، ناہید عالم —— یہ سب ایک دوسرے سے مختلف تھیں اور خاصا اچھا لکھ لیتی تھیں۔ سرلا دیوی کا افسانہ "کلنک" مجھے آج تک یاد ہے۔

پچھلے بارہ سال میں جیلانی بانو کے علاوہ صرف تین نئے اور قابلِ ذکر نام سامنے آئے ہیں، نثار عزیز بٹ، واجدہ تبسم، جمیلہ ہاشمی — ان کے علاوہ آج کل کی پڑھی لکھی لڑکیاں کس طرح کے افسانے لکھ رہی ہیں، آپ "ساقی" اور "زیب النساء" کے پرچے اٹھا کر خود ہی ملاحظہ کر لیجیے۔

ہمارے یہاں ڈرامے کا سرے سے وجود ہی نہیں (جو ایک ایکٹ کے ڈرامے لکھے گئے ہیں وہ ڈھنگ کی ڈرائنگ روم کومیڈی بھی نہیں کہلا سکتے اور زندگی کے کسی بڑے مسئلے کی نمائندگی نہیں کرتے) ناول کا حال الگ پتلا ہے۔ اردو اللہ کے فضل سے برِ صغیر کی وہ واحد ترقی یافتہ زبان ہے جس کے ناول رسوا کی الکوتی نورِ چشمی امراؤ جان ادا اور پریم چند کے ناولوں سے شروع ہو کر عصمت، کرشن چندر اور عزیز احمد پر آ کر ختم ہو جاتے ہیں۔ آخر ہم کس برتے پر اپنے ادب کی بڑائی کا دعوے کر رہے ہیں؟ یہ احساسِ کمتری نہیں محض حقیقت کا اظہار ہے۔

اردو میں جمالیاتی اور سوشل بغاوت یلدرم نے شروع کی۔ پریم چند کے قلم سے باقاعدہ منظم احتجاج کا آغاز ہوا۔ باہر کی دنیا میں سوشل بغاوت نے ڈکنز سے لے کر آج تک کے مصنفین تک طرح طرح کے کنوئیں جھنکوائے تھے۔ صنعتی علاقوں کے مسلم، آئرلینڈ کا یہودی، امریکہ کا نیگرو۔ پریم چند نے اپنے معاشرے کی سب سے اہم حقیقت یو پی کے کسان کو چنا۔ ان کے بعد ترقی پسندوں نے کسان، مزدور، طوائف

اور متوسط طبقے کی عورت کو اپنایا۔ اس وقت ہمارے بیشتر ادیب کون سے تاریک گوشوں پر سے پردے اٹھا رہے ہیں؟ جو کچھ طوائف پر لکھا جائے گا وہ منٹو کو دُہرانے کے مترادف ہوگا۔ مڈل کلاس لڑکی پر عصمت اور ہاجرہ اور خدیجہ لکھ چکی ہیں۔ نئی دنیاؤں کے دروازے کس طرح بند ہو گئے؟ تقسیم کے بعد ایک لٹا پٹا بے جان سا کردار سامنے آیا۔ پناہ گزین، شرنارتھی! مگر یہاں بھی کرشن چندر اور منٹو کے پیش کردہ غنڈے کے سامنے کسی اور کا چراغ نہ جل سکا۔ اس وقت احتجاج تو درکنار رپورٹنگ بھی قرینے سے نہیں کی جا رہی۔

ہر دور اپنے گیبن کا منتظر رہتا ہے کیونکہ جو کچھ گزر رہا ہے اس کو ریکارڈ کرنا لازمی ہے۔ کردار اپنے ماحول کی تشریح کرتے ہیں۔ ماحول کرداروں کا آئینہ دار ہے۔ لکھنے والے کے لیے اس کی ساری گرد و پیش کی دنیا، مکان، سڑکیں، بازار، پہاڑ، دریا، میدان، کھیت، چنگھاڑتی ہوئی ریل گاڑیاں، ہجوم، جنگل، درخت غرضیکہ ہر شے ڈرامے میں حصہ لیتی ہے۔ ایک بھرپور اندرونی اور خارجی زندگی کی تخلیقی عکاسی کا دوسرا نام ادب ہے ایک سماجی دیو مالا کی تشکیل، سماجی شعور اور شخصی احساسات کے تانے بانے پر کی جاتی ہے۔ انکشاف وہ نوٹ ہے جس پر لیکھک دنیا سے کہتا ہے ——— دیکھو ——— میں محقق ہوں ——— میں انسان کی تصویریں بنا رہا ہوں ——— انسان جو اپنا دشمن، اپنا بھائی ہے ——— کلاسیکل تہذیب، وحشی ماضی، رومان، حقیقت پسندی، یہ ساری چیزیں آج کے متمدن انسان کے لاشعور میں بسی ہوئی ہیں۔ یہ وقت جبکہ دنیا پھر وحشی سماج کی طرف لوٹ رہی ہے ——— سارے فنکار نیوکلر تباہی کے سائے میں زندہ ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جہاں ماحول، احساسات، ادراک، ردِ عمل، بیک گراؤنڈ، ڈیکور، حرکات و سکنات محض تھیٹریکل بن کر رہ گئی ہیں۔ کیونکہ ہم نے ایک غیر حقیقی MYTH تخلیق کر کے اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دیا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب زندگیاں یکساں ہیں، موت ایک جیسی ہے۔ اس وقت جدید انسان اپنی کھوئی ہوئی شخصیت کی کھوج میں مارا مارا پھر رہا ہے۔

بقولِ البرٹ کیمو:۔

TO CREATE TODAY IS TO CREATE DANGEROUSLY.

تھورنٹن وائلڈر نے کہا ہے کہ ”ادب کا عظیم عہد وہ ہوتا ہے جس میں آڈینس بھی ادب میں حصہ لے جس طرح ایتھنز کے آڈینس نے یونانی ٹریجیڈی اور کامیڈی میں حصہ لیا، ہسپانوی اور عہدِ ایلزبتھ والے بھی اپنے اپنے ادب کے پھولنے پھلنے میں برابر کے شریک تھے ———“

——— یہ زمانہ ہمارے یہاں انیسویں صدی کی شاعری اور سر سید اور ان کے چیلوں کے دور میں تھا اور اس کے بعد ترقی پسند تحریک کے زمانے میں تھا۔ آج یہ کہنا کہ اب حالات بہت مختلف ہیں اور وہی بات دُہرانی کہ عہد ناسازگار ہے تو بھائی صاحب لکھنے والوں نے آزاد، نہرو، حسرت موہانی اور فیض نے جیل ہی میں رہ کر لکھا ہے۔ البرٹ کیمو ہی کی ایک اور بات مجھے یاد آئی۔ انھوں نے ایک جگہ ایک جرمن لفٹیننٹ کا ذکر کیا ہے جو برسوں سائبیریا میں قید رہا جہاں سردی اور بھوک کی تکالیف ناقابلِ برداشت تھیں۔ اس نے چند تختے تراش کر اپنے لیے ایک بے آواز پیانو بنایا جس کے پردے لکڑی کے تھے اور ان میں سے سُر پیدا نہیں ہو سکتے تھے۔ انتہائی مصیبت اور کرب کے عالم میں چیتھڑوں میں ملبوس ہجوم میں گھرے ہوئے اس جرمن قیدی نے اس بے آواز پیانو پر ایک عجیب و غریب انوکھی موسیقی کمپوز کی جسے فقط وہی سُن سکتا تھا۔

سوال یہ ہے کہ احتجاج کا ادب لکھنے سے آپ لامحالہ کمیونسٹ نہیں ہو جاتے۔ چارلس ڈکنز اور حالی کمیونسٹ نہیں تھے۔ آپ کا یہ کہنا کہ آپ خود کو کسی ایک بات کے لیے COMMIT نہیں کرنا چاہتے لیکن آپ پیدا ہوتے ہیں اور آپ زندہ ہیں، یہ بذاتِ خود سب سے بڑا COMITMENT ہے۔ اگر آپ یوگی بن جائیں تب بھی آپ یوگی کی حیثیت میں خود کو COMMIT ہی کریں گے۔ بے تعلقی خود ایک رویہ ہے۔ رویّے کی بات کہاں تک کھنچے گا۔

موجودہ دور کی جذباتی انارکی کا جواب کمیونسٹ معاشرے نے اپنی یکسانیت سے دیا جو ادب کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی۔ مغرب کے فن کار نے اپنی اس انارکی میں کہیں سے توازن حاصل کرنے کی سعی کی اور کمیونزم کو تج کر اور نئے مذاہب اختیار کر کے سب اپنی اپنی جگہ COMMITED ہیں۔ مکمل آزادی کس چڑیا کا نام ہے۔ آپ بالکل عقل و ذہن سے عاری، سوچنے سمجھنے اور محسوس کرنے کی صلاحیتوں سے معذور ہوں تب آپ البتہ خود کو آزاد کہہ سکتے ہیں۔ بودلیئر آزاد نہیں ہے، خود سارتر اور گبریل مارسل اپنی اپنی جگہ بندھے ہوئے ہیں۔

ادیب کو ہمیشہ یہ طے کرنا پڑے گا کہ اگر اسے TOTALITARIAN سوسائٹی میں رہنا ہے تو اسے کیا کرنا چاہیے۔ جمہوریت کا باسی ہے یا کمیونسٹ سماج کا ممبر ہے تو اسے کیا کرنا ہوگا۔ اسے برابر چوکنا رہنا پڑے گا کہ "آزادی" کو کس طرح کے معنی پہنائے جا رہے ہیں۔ انارکسسٹ، مارکسسٹ، معدومیت پرست، خود وجودیت کے شیدائی سب نے آزادی کی الگ الگ تفسیریں لکھی ہیں۔ ادیب کا کام ہے کہ وہ اپنی تشریحات خود کرے۔

لکھنا ایک مابعد الطبیعیاتی فعل ہے۔ "اس طرح لکھنا جیسے صفحے پر بارش ہو رہی ہے۔" ادراک، اکتساب، تجزیہ، تشریح، ترجمانی، اطلاع، خبر رسانی یہ سب ایک عمل میں شامل ہے جس کے ذریعے آپ کوئی واقعہ، کوئی خیال، کوئی حقیقت کہانی کے روپ میں قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ کوئی ایک معمولی سا واقعہ۔ پھولوں کی شاخ، گلی میں اکیلا کھڑا ہوا بچہ، رات کے وقت سنسان سڑک پر سے گزرتی ہوئی روشن بس، خزاں کی ہوائیں، دور کی موسیقی، دوپہر کے سناٹے میں کمرے کا سنہرا رنگ —— اور آپ ایک نئے سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں۔

تین چار سال ہوئے آپا نے مشین پر سلائی کرتے ہوئے یوں ہی باتوں باتوں میں کہا۔ "اپنے قصبے میں جاڑے آتے ہی ہم ہار سنگھار سے دوپٹے رنگتے تھے اور جب بسنت آتی تھی ——"

ان کی بچی نے جو چار سال کی عمر سے کراچی میں رہ رہی ہے ایلوس پریسلے کی سوانح حیات پر سے سر اٹھا کر پوچھا۔ "اماں بسنت کیا ہوتی ہے؟"

اس ایک جملے کو سننے کے بعد میں نے آٹھ سو صفحات کا ناول لکھ مارا۔

"اماں! بسنت کیا ہوتی ہے؟"

ساری دنیا، ساری کائنات، کا تجزیہ تو کوئی بھی نہیں کر سکتا مگر تلاش کسی ایک نکتے سے تو شروع کی جا سکتی ہے۔

شاید ہم سب دہشت زدہ ہیں۔ زندگی ایک ایسی زبان میں لکھی ہوئی کتاب ہے جسے ہم سمجھ نہیں پاتے۔ اب تک ہم ایک ڈکشنری کی کھوج میں جٹے تھے۔ اب ہم نے وہ کھوج بھی ختم کر دی ہے اور دوسروں کے بنائے ہوئے فٹ نوٹس اور حوالوں اور تشریحوں سے کام چلا رہے ہیں۔ دریافت، انکشاف اور اعتراف آخر کیوں نہیں؟ پورا رومن کیتھولک عقیدہ اعتراف پر قائم ہے محض اس حقیقت کا احساس کہ آپ کمیونی کیٹ کرنا چاہتے ہیں اس بات کا اعتراف ہے کہ آپ اپنے خیالات سے لبریشن حاصل کرنے کے خواہاں ہیں ورنہ آپ لکھنے کی زحمت ہی کیوں گوارا کرتے؟ لیکن مکمل اعتراف کی ہمت نہ پا کر ہم چند تیسرے درجے کی علامتیں تلاش کر لیتے ہیں جن کی بنیادوں پر تیسرے درجے کی کلچر کی تخلیق کی جاتی ہے۔ چند حضرات ایسے ہیں کہ جن کو ہر معمولی سے معمولی، معصوم سے معصوم اشارے میں سُرخی کا شبہ ہوتا ہے۔ کچھ صاحبان مذہب میں مکمل نجات تلاش کر چکے ہیں۔

بہت سی مایوسیاں جو ہمارا نصیب ہو چکیں، ابھی بہت سی سامنے موجود ہیں لیکن الم کے سارے مراحل طے کرنے کے بعد نیا عہد نامہ بھی لکھا جانا ہے۔

یہ جواب کہ ہم مینی فیسٹو کے قائل نہیں بالکل درست ہے لیکن آپ جو کچھ بھی لکھ رہے ہیں خواہ وہ انشائے لطیف ہی ہے، رومینٹک افسانے،

تصوّف۔ وہ خود آپ کے تخیل، خیالات، شخصیت، جذبات، پس منظر اور ماحول کی تفسیر ہے۔ یوگا، معرفت، کیتھولک، فلسفہ، زین، بدھ ازم، مسیحی خود وجودیت، اناکزم یہ سارے رویّے جن کا ادب میں اظہار رہا ان کی تاریخی وجوہات تھیں۔ ایسا نہیں ہوا کہ ایلیٹ یا ہوپکنز یا رلکے یا گراہم گرین، یا گبرئیل مارسل پہاڑ کی چوٹی پر جا کر بیٹھے اور ان پر وحی اُتری یا غروبِ آفتاب کے وقت ان کو الہام ہوا یا آدھی رات کو فرشتے نے آن کر نور کا قلم ان کے ہاتھ میں تھمایا اور کہا "لکھ ——!"

انھوں نے یہ سب اس لیے لکھا کہ اس اسٹیج تک پہنچنے کے لیے وہ بہت سے ذہنی اور روحانی اور جذباتی مراحل سے گزرے اور ہر مرحلے کے پس منظر میں ان کا پورا معاشرہ تھا، ان کی تہذیب کی تباہی تھی، ان کی اندرونی کیفیات تھیں جو اس لیے پیدا ہوئیں کہ وہ ایک مخصوص ملک، نسل، تہذیب، طبقے اور وقت کے دور میں پیدا ہوئے۔

ایک مصنف تنہا نہیں ہوتا اس کے پیچھے دوسرے مصنفوں کی قطار ہے۔ وہ اپنی انفرادیت کے ذریعے ایک اور کڑی کا اضافہ کر دیتا ہے۔ ادیب ہمیشہ NON-CONFORMIST ہوتا ہے مگر اس کی یہ ضرورت کہ اسے کمیونی کیٹ کرنا ہے، معاشرے سے اس کا رابطہ قائم کر دیتی ہے۔

ہمارا یہ رابطہ کس نوعیت کا ہے؟ روزانہ اخبار پڑھتے، اپنے حالات میں انتہائی دلچسپی لینے کے باوجود ہمیں اس قطعی تباہی کی فکر نہیں جو ہمارے سروں پر منڈلا رہی ہے۔ گویا "کوئی CAUSES باقی نہیں بچے جن کے لیے لڑا جائے"۔ ہمیں اپنی آفاقی اہمیت کا احساس نہیں۔

جنگ کے بعد کمیونزم کے خلاف مایوسی کی بڑی عظیم لہر ساری دنیا میں پیدا ہوئی اور توبہ تلا کرنے والے "سابقہ کمیونسٹ" ادیب کا باقاعدہ ایک مدرسۂ فکر قائم ہو گیا۔ جدید تر انتشار اور مایوسی کا مبلغ پیرس کی اٹھارہ سالہ فرانسوا ساگاں تھی جس کے انتہائی معمولی ناول لاکھوں کی تعداد میں بک گئے کیونکہ وہ بعد از جنگ نسل کی شکست خوردگی، کلبیت اور بے نیازی کی ترجمان تھی، حتیٰ کہ مرحوم جیمز ڈین اور مارلن برانڈو بھی اس BEATNIK نسل کے دیوتا بن گئے لیکن وہ دور بھی اب ختم ہو رہا ہے۔ انگلستان میں کولن ولسن کا بھوت تو بہت ہی جلد سروں سے اُتر گیا۔ سارے مصنف، سائنسدان، آرٹسٹ، موسیقار ہر مدرسۂ فکر سے تعلق رکھنے والے، لبرل، کمیونزم کے کٹر دشمن، کیتھولک پادری سب متفقہ طور پر ہائیڈروجن بم کے خلاف شدید ترین احتجاج میں مصروف ہیں۔ مغرب میں ہائیڈروجن بم کا خطرہ ایک عظیم الشان علامت بن چکا ہے۔

مگر ہم تو علامتوں سے خوف زدہ ہیں۔

"پشاور ایکسپریس" کو تو رقت خیز جذباتیت پر محمول کیا گیا تھا لیکن کیا ہم "ٹوبہ ٹیک سنگھ" سے آنکھیں چرانے کی ہمت رکھتے ہیں ——؟"

تیسرے درجے کا ادیب اور تیسرے درجے کا پریس (جو بدقسمتی سے "عوامی پریس" ہے) ان سب چیزوں کا مبلغ ہوتا ہے جن کے خلاف احتجاج کیا جاتا ہے یا آپ تبلیغ میں شامل ہو جاتے ہیں کہ میاں کیا فرق پڑتا ہے، دنیا چند روزہ ہے —— یا اور اگر اس سے علیحدہ رہ کر خاموش رہتے ہیں تو اپنی خاموشی سے مزید تقویت پہنچاتے ہیں کیونکہ میدان آپ نے بالکل ہموار کر دیا ہے۔

باقی رہا یہ کہ منظم ادارے آپ کے ضمیر کی دیکھ بھال کر لیں گے تو ہم کو معلوم ہے کہ ہار جھک مار کے فرد کو اپنی فکر خود کرنی پڑتی ہے۔ کیونکہ بقول نطشے "اخلاقیات جب کوڈ یا کونسٹی ٹیوشن کی شکل اختیار کر لیں تو ریاکاری لامحالہ چور دروازے سے گھس آتی ہے"۔

خود ہی ملاحظہ کیجیے —— عیسیٰ کی عجز و آشتی مسیحی کلیسا میں تبدیل ہو گئی، اپنشدوں کی شانتی نے برہمنوں کے تنگ نظر قوانین کا روپ

دھار لیا، اسلام بہتّر فرقوں میں بٹ گیا، عالمگیر برادری کے تصوّر کا ایک طرف اقوامِ متحدہ کے مسخرے پن اور دوسری طرف بیسیوں پارٹی کانگریس میں انجام ہوا۔

ہنگری پر ظلم ہوتا ہے تو ساری مغربی دنیا میں آگ لگ جاتی ہے۔ الجیریا میں اس سے کہیں بڑی قیامت ڈھائی جا رہی ہے، مغربی دنیا کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ یہ ریاکاری اور دوہرا معیار قدم قدم پر ہمارے سامنے ہے۔

ان ساری الجھنوں کا جواب ہمیں کمیونزم میں مل جاتا ہے۔ یہ امام حسین علیہ السلام اور جناب امیرؑ کی ہیومنزم بھی ہے اور ایران اور ہند کے صوفیوں کی بھی اور ان انسانیت پرستوں کی بھی جو کمیونسٹ جتھے بندی سے باہر رہ کر سوشلسٹ تخلیق کرنا چاہتے ہیں۔ انسان پہ یقین کرنا اصل چیز ہے چاہے وہ انسان کسی ملک، کسی قوم، کسی نسل، کسی مذہب کے لباس میں آپ کے سامنے موجود ہو۔ وہ آپ سے اپنی ترجمانی کروانے کا محتاج ہے کیونکہ خدا نے آپ کو تخلیقی صلاحیت دی ہے۔

یوں OUTSIDERS کا ڈھنڈورہ پیٹنا دوسری بات ہے کہ کہاں کی ہیومنزم صاحب ہم تو MISFIT ہیں —— ادیب ہمیشہ MISFIT ہوتا ہے ورنہ وہ ادیب نہ ہوتا، کپاس کی تجارت کر رہا ہوتا۔ یہ حقیقت کہ آپ نے لکھنا اپنا مقدّر بنایا ہے، آپ کے ہجوم سے ایک حد تک مختلف ہونے کا ثبوت ہے، معاشرے کا اجتماعی ضمیر آپ کے ضمیر سے الگ ہے۔ اگر دونوں کو ایک سانچے میں ڈھال دیا جائے تو آپ اسٹالن (اب لینن) پرائز ناول تو ضرور لکھ لیں گے مگر MURDER IN THE CATHEDRAL لکھنے سے قاصر رہیں گے۔

اسٹریوٹائپ کچھ اور سوچ رہا ہے، آپ کچھ اور سوچ رہے ہیں اور چونکہ آپ مختلف طور پر سوچنے کی اہلیت رکھتے ہیں آپ کے لیے وہ خوفناک لفظ "فن کار" استعمال کیا جاتا ہے۔ آپ اس خطاب کو بڑی ہنسی خوشی قبول کر لیتے ہیں لیکن اگر آپ واقعی فن کار ہیں تو آپ کی ذمہ داری آپ کے دوسرے بھائی بندوں سے کہیں زیادہ ہے۔ موسیقار، سنگتراش، مصوّر اتنے آدمیوں تک نہیں پہنچتے۔ آپ کی کتابیں ہر ریلوے بک سٹال پر موجود ہیں۔ آپ کے افسانے کالج کی ہر لڑکی پڑھتی ہے (جی ہاں! کالج کی لڑکیاں بہت اہم ہیں) اور ایک سماجی اور اقتصادی طور پر پسماندہ ملک کے مصنف کی حیثیت سے تو آپ کی ذمہ داری اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ چونکہ آپ ایک کم علم، توہم پرست، فاقہ زدہ، سیاست کی ماری ہوئی قوم کے لیے لکھیں گے، آپ جتنے مفید ثابت ہو سکتے ہیں اتنے ہی خطرناک بھی۔ یہ کہنا کہ ہم ایک چھوٹے سے حلقے کے لیے لکھتے ہیں، فی الحال صحیح ہے مگر تعلیم دیر یا سویر عام ہوگی۔ آج ریڈیو اور سنیما کے ذریعے غالبؔ اور فیضؔ سے لے کر شکیلؔ بدایونی اور قتیلؔ شفائی تک سبھی کے اشعار برّصغیر کے کونے کونے میں صبح سے شام تک گونج رہے ہیں۔ ادب تو وقت کی رفتار اور صنعتی ترقی کے ساتھ خود بخود مقبول ہوتا جائے گا۔ اس وقت ہم کیا کہیں گے —— ہمارے افسانہ نگار کون تھے ——؟"

بہت سے مسائل ہیں جن پر ابھی سے غور کرنا چاہیے۔ اس ملک میں اُردو کی شکل کیا ہوگی؟ مستقبل کا پاکستانی ادیب کن خطوط پر سوچے گا؟ وہ تہذیب جس کا وہ ترجمان سمجھا جائے گا کن عناصر پر مشتمل ہوگی؟

کیونکہ سمبلز اور روایتیں بدل جائیں گی۔ "سنگھاسن بتیسی" اور "اندر سبھا" کے سارے ٹرم آف ریفرنس آئندہ نسل کے لیے بے معنی ہو جائیں گے۔ محض محاوروں ہی کو لیجیے۔ ایسے محاورے اور کہاوتیں جو اُردو کی گھٹّی میں پڑی ہیں —— "مٹّی کا مادھو" —— "مہادیو کی بارات" —— "لنکا میں جو ہے باون گز کا" —— "رام کہانی" —— "بن باس" —— "نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچیں گی" —— "آنکھوں کے اندھے نام نین سکھ" ——

"گنگا جمنی" ــــ "گھر گھوڑا نخاس مول" وغیرہ وغیرہ۔ علاوہ ازیں دلّی اور لکھنؤ کے روزمرّہ اور اَن گنت مقامی حوالے جن کی وجہ سے اُردوئے مُعلّیٰ کا اب کیا جواز ہوگا اور بچوں کو کس طرح سمجھایا جائے گا؟ اب ایک عورت اپنی پڑوسن کو طعنہ دیتے وقت یہ نہ کہے گی "جاؤ ــــ جاؤ ــــ گڑھیا میں منہ دھو کر آؤ ــــ ایسی ہی تو بڑی ستی ساوتری ہو" ــــ اور "اہلِ زبان" گھرانوں کی پندرہ سالہ لڑکیوں کو بسنت کی کچھ خبر نہ ہوگی ــــ

پاکستان میں اس اُردو کے لیے کیا رویّہ اختیار کیا جائے ــــ؟ کیونکہ ٹکسالی سنسکرت، مگدھی، پالی، پراکرت، شورسینی، اپ بھرنش، مشرقی ہندی، برج بھاشا، دکنی اور کھڑی بولی کے بتدریج یا متوازی ارتقا میں عربی اور فارسی اور ترکی کی آمیزش سے اُردو بنی اور یہ وہی اُردو ہے جو اس وقت پاکستان میں مستعمل ہے اور جو اس ملک کی قومی زبان کہلاتی ہے۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ لسانیات کے نقطۂ نظر سے یہ ایک آریائی زبان ہے، سامی زبان نہیں۔ آریائی زبان کی دو شاخیں تھیں ــــ ایرانی اور ہند آریائی ــــ لہٰذا فارسی جو اُردو کے اجزائے ترکیبی میں شامل ہے خود ایک آریائی زبان ہے۔ عہدِ قدیم میں ان دونوں شاخوں یعنی سنسکرت اور اوستا کی صورت تقریباً یکساں تھی اور یہ مشابہت جدید فارسی میں ہمیں آج تک نظر آتی ہے۔

ہند آریائی زبان ڈیڑھ ہزار سال سے مسلسل بولی جا رہی ہے۔ ہماری آج کی اُردو میں بیشتر الفاظ اور نحوی تراکیب ایسی مستعمل ہیں جو کم و بیش اسی صورت میں آج سے پندرہ سو سال قبل مگدھ میں بولی جا رہی تھیں اور اس سے بھی ایک ہزار سال قبل ان الفاظ کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔

علاوہ ازیں لوک گیتوں کی زبان اور راگ راگنیوں کے بول بھی پوربی اور اودھی اور کھڑی بولیوں پر مشتمل ہیں اور ان کی ساری تلمیحات "غیر ملکی" اور "غیر اسلامی" ہیں۔

چنانچہ زبان کا مسئلہ بھی بہت پریشان کن ہے۔

وہ نئی نسل جو کرشن چندر کا نام بھی سننے کے لیے تیار نہیں، اس لیے کہ وہ ہندو ہے ــــ اسے اُردو کے لسانی اور تمدنی ورثے کے متعلق کیا بتایا جائے گا؟ مستقبل کا پاکستانی ادیب کس ورثے کو اپنا گردانے گا ــــ؟ مشرقِ وسطیٰ ــــ؟ مغربی یورپ ــــ؟ امریکہ ــــ؟

آزادی کے بعد نئی امریکی قوم اپنے انگریزی پس منظر سے شعوری طور پر جدا ہو گئی۔ واشنگٹن ارونگ سے لے کر شیروڈ اینڈرسن تک سارے ادبا کا جو اس نئے ملک میں پیدا ہوئے تھے، زندگی کو دیکھنے کا انداز بھی نیا تھا۔ ان کی ادبی روایات رفتہ رفتہ خالص دیسی یعنی امریکن بن گئیں گو زبان انگریزی رہی (انھوں نے ناول میں روزمرّہ کی گفتگو اور لکھی ہوئی پُر تکلف تحریر کا فرق یکسر مٹا دیا اور انگریزی کو اس کی بہت سی بندشوں سے آزاد کر دیا) پاکستان کی اُردو ابھی سنہ ۴۷ء سے بہت قریب ہے۔ برِّ صغیر کے پانچ ہزار سال میں بکسر کی لڑائی کے بعد ۱۹۴۷ء اہم ترین تاریخ ہے۔ ابھی ہم اس حدِّ فاصل سے وقت میں بہت نزدیک ہیں۔ کل کی بات ہے کہ سارے پاکستانی ہندوستانی تھے۔ نئی تہذیب اور نئے لٹریچر کے فطری ارتقا میں وقت لگے گا، اسے کسی فیکٹری میں تیار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح زبان میں سماجی اور سیاسی تبدیلیوں کے ساتھ نئے الفاظ شامل ہوتے ہیں اور پرانے الفاظ متروک ہوتے چلے جاتے ہیں۔ راتوں رات کسی قسم کی قلبِ ماہیت ناممکن ہے۔

جغرافیائی دُوری سے ذہنی اور جذباتی فاصلے آپ سے آپ پیدا ہو جاتے ہیں اور ان فاصلوں کے لیے سیاسی حد بندی یا مذہبی منافرت کی بھی ضرورت نہیں ــــ گو امریکی ادیب امریکی ہونے کے باوجود بار بار پرانی دنیا کو لوٹے۔ یورپ خصوصاً فرانس ان کا ذہنی اور روحانی مکہ تھا۔ وہ جغرافیائی اور سیاسی طور پر یورپ سے علیحدہ ہو چکے تھے مگر یورپ اپنے زادِ راہ میں لائے تھے ــــ

اس لیے یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ صحیح وطن پرستی کیا ہے؟ صرف اپنی دیواروں میں جیسے جانا یا ساری دنیا کی تہذیب کو اپنا ورثہ

سمجھنے سے اپنی قومیت میں کسی قسم کا رخنہ پڑ جاتا ہے یا نہیں ——— ؟ جب روس کے دروازے مغرب کے لیے کھلے تو وہاں بھی یہی مسئلہ درپیش تھا۔ روسی یعنی سلاو کلچر یا مغربی کلچر کس کو اپنا آدرش بنایا جائے۔ ایشیا میں قوم پرستی کی لہر پھیلی تو یہ کشمکش ہر جگہ سامنے آئی۔ ترکوں نے عربی الفاظ کو ترک کیا اور ”خالص“ ترکی کی طرف لوٹے۔ یہی سلسلہ ایران میں بھی رہا۔ مصر اور ترکی اور ایران اور انڈونیزیا سب اپنی اپنی قبل از اسلام قدیم تہذیبوں کو اپنی قومی تہذیب گردان رہے ہیں اور اسلامی عہد سے زیادہ ان تہذیبوں کا پرچار کر رہے ہیں۔ اگر برطانیہ دخل انداز نہ ہوا ہوتا یا اگر ساری کی ساری چالیس کروڑ آبادی مسلمان ہو چکی ہوتی تو شاید یہاں بھی مسلمان سنسکرت تہذیب کو اپنی تہذیب سمجھتے لیکن چونکہ مسلمان یہاں اقلیت میں رہا اور ایک متحدہ قومیت وجود میں نہ آسکی اس لیے بیسویں صدی کے مسلمان ادیب نے کالی داس اور بھرتری ہری کو اپنا ورثہ نہ سمجھا (لہذا مثال کے طور پر جب آج قومی تھیٹر کی بات کی جاتی ہے ——— تو سنسکرت ڈرامے کی طرف بھولے سے بھی کسی کا دھیان نہیں جاتا) تقسیم سے پہلے بھی حالات اس قسم کے تھے کہ اردو ادیب ہم عصر ہندی ادب سے قطعاً ناواقف تھا اور سات سمندر پار کے ملکوں کا اجنبی لٹریچر بڑے ذوق و شوق سے پڑھتا تھا۔ ادبی ہندی اور ادبی اردو کی صرفی و نحوی تشکیل بالکل ایک جیسی ہے لیکن اردو ہندی کے سیاسی جھگڑے کی بنا پر مؤخر الذکر میں غیر مستعمل سنسکرت ٹھونس کر اسے جناتی بنا دیا گیا۔ اردو میں عربی فارسی کا مزید اضافہ کیا گیا اور دونوں زبانوں کی ادبیات ایک دوسرے سے بہت دور جا پڑیں۔ وہ زمانے لد گئے جب مسلمان ہندی میں شاعری کرتے تھے، اور اردو میں دیسی دیومالاؤں اور اساطیر کی داستانیں قلم بند کی جاتی تھیں اور یہ سب گویا ایک بڑی ہندوستانی ادبی روایت میں شامل تھا ——— ۱۹۴۷ء سے پہلے کے عہد کے سیاسی اور جذباتی بحران سے زبان کو جو نقصان پہنچا اس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں اور اس صورت میں یہ کس طرح ممکن تھا کہ بھارتیندو یا نرالا کو اپنا ورثہ سمجھا جاتا؟

بنگالی والوں کے لیے یہ مسئلہ زیادہ ٹیڑھی کھیر بن جاتا ہے کیونکہ ادب کا ”کلکتہ اسکول“ بنگالی لیکھکوں کا آدرش رہا ہے اور وہ سنسکرت زبان اور تہذیب سے بہت ہی قریب ہیں (گو مسلمانوں کی آمد کے بعد بنگالی میں بھی فارسی اور عربی کی ہلکی سی آمیزش ہو گئی) اسی مسئلے پر بحث کرتے ہوئے ”مشرقی بنگال کی کویتائیں“ کی قابل مؤلفہ نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے کہ:

> ”مشرقی پاکستانی ادب کی غیر مسلم روایات پر اعتراض کیا جاتا ہے لیکن اگر اردو شاعری میں ایران کی ساری قبل از اسلام IMAGERY کو متواتر استعمال کیا جاتا رہا ہے تو بنگال کی دیسی روایات پر اعتراض کیوں؟“

قصہ مختصر یہ کہ آج کے پاکستانی ادیب کے سامنے خود لٹریچر کی بنیادی تشکیل کے متعلق بڑے زبردست مسائل ہیں جن کا سائنٹیفک اور غیر جذباتی حل تلاش کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

اور یہ فکر کہ یہ تو یہاں جمود ہے اور یا نوسٹیلجیا ——— تو مؤخر الذکر کی حد تک عرض ہے کہ اس کی پروا نہ کیجیے۔ وقت گزرنے دیجیے اگلے دس سال تک انتظار حسین کے کردار بوڑھے ہو کر مر کھپ چکے ہوں گے۔ گرٹرڈ اسٹین تیس سال تک پیرس میں رہیں۔ کچھ عرصے کے لیے وطن واپس آئیں مگر دوبارہ پیرس واپس جاتے وقت انھوں نے کہا:

> ”بہرحال ——— یہ میرا ذاتی معاملہ ہے ——— یہ امریکہ!!“

ہم جہاں رہتے ہیں، جہاں ہماری جڑیں ہیں ——— ہم دنیا کے کسی حصے میں بھی چلے جائیں، وہ خطہ جس نے ہمیں جنم دیا ہمیشہ ہمارا ذاتی معاملہ رہے گا۔

ایک چیز اور ہے ——— سر ہربرٹ ریڈ نے ایک جگہ خبردار کیا ہے کہ ہمیں کلچر کی بلیک مارکیٹ سے بچنا چاہیے۔ اپنے روحانی "مال" کو کلیسا، اسٹیٹ اور پریس کی دوکانوں کے ذریعے بلکہ 'کاؤنٹر کے نیچے' فروخت کرنے کی صورتِ حال کا سدِ باب ضروری ہے لیکن ممکن ہے اس کے جواب میں آپ کہیں کہ ہربرٹ ریڈ تو انارکسسٹ ہیں، ان کی بھلی چلائی ——— !

اپروچ کا تعین ——— ہمارے یہاں اجتماعی تجزیے کا وجود ہی نہیں۔ آج کل ہم لوگ امریکہ سے بے حد متاثر اور مرعوب ہیں یا ان کی ہر بات کو آنکھ بند کر کے قرآن حدیث سمجھتے ہیں یا پھر ان کو گالیاں دیتے ہیں۔ ان کے اچھے پہلوؤں پر غور نہیں کرتے ——— امریکن قوم پیٹ بھر کر اپنا مذاق اڑانے میں اپنی توہین نہیں سمجھتی۔ وہ اپنی سوسائٹی کے انتہائی کریہہ اور مجرمانہ پہلوؤں پر ان گنت کتابیں لکھتے ہیں، فلم بناتے ہیں، اعداد و شمار جمع کرتے ہیں۔ سوشیولوجیکل رپورٹنگ کا انھیں مرض ہے اور اس خصوصیت نے امریکن ناول کو وہ توانائی اور تر و تازگی اور بے ساختہ پن بخشا ہے جس کی مثال کسی اور ملک کے ناول میں مشکل سے ملے گی۔ ۱۹۲۹ء سے پہلے کے پرولتاری ادیب جیمز ٹی فیرل، ڈوس پیسوس، اسٹین بک وغیرہ اور اب ٹینسی ولیم، نیلسن الگر، نارمن میلر عوامی زندگی کی بھرپور اور بالتفصیل داستانیں بیان کرنے میں مصروف ہیں۔

ہم انگلستان سے بھی بہت مرعوب ہیں۔ وہاں دیکھئے آج کل کیا ہو رہا ہے۔ پچھلے دنوں "برافروختہ نوجوانوں" نے کیسا کیسا اودھم نہ مچایا لکی جم اور جمی پورٹر اس دور کے سمبل بن چکے ہیں۔ ان دونوں کرداروں کے خالق کنگسلے ایمس اور جان آوزبرن اور دوسرے "برافروختہ نوجوانوں" نے انگلستان کی ملکہ پرستی کے پرخچے اڑا دیے۔ حکومت اور برسرِ اقتدار طبقے اور مڈل کلاس کی کھوکھلی اقدار، سوسائٹی کے ذہنی دیوالیہ پن، ریاکاری، کلیسا، ملکہ ایلزبتھ، اوکسفرڈ اور کیمبرج والوں کی نخوت غرضیکہ ہر چیز کا بھرتہ بنا کر رکھ دیا لیکن جان آوزبرن ایک شراب خانے کی افلاس زدہ ملازمہ کا لڑکا اس وقت کروڑپتی ہے۔ اسی قوم نے جسے اس نے جی بھر کر گالیاں دیں، اسے مالا مال کر دیا۔ ان نوجوانوں کی کتابوں، ڈراموں اور ناولوں پر پابندی عائد نہیں کی گئی، الٹی ان کی تصنیفات ہاتھوں ہاتھ لاکھوں کی تعداد میں بک گئیں۔ ان کے ڈرامے لندن میں اپنی حیرت انگیز کامیابی کے بعد نیویارک کے براڈوے تک لے جائے گئے۔ ان کے ناولوں اور ڈراموں کے فلم بن رہے ہیں۔ برطانیہ کو کسی بورس پیسٹرنک کی ضرورت پیش نہ آئی، کیونکہ اس گئی گزری حالت میں بھی انگلستان آزادیٔ افکار کا علمبردار ہے۔ یہ لبرل روایات کا نتیجہ ہے۔

لہٰذا آج کل وہاں خوب جھگڑا ہو رہا ہے اور اس نئے گروہ نے بالکل آفت جوت رکھی ہے۔ آرٹسٹ اور سوسائٹی میں ہمیشہ ایک دوسرے سے ٹھنتا ہوتا آیا ہے اور یہ نوجوان تو سب کے سب بڑے سخت انفرادیت پسند ہیں۔ "برافروختہ نوجوان" کسی ایک منظم تحریک کا نام نہیں بلکہ یہ لوگ ایک دوسرے کے خلاف بھی ہیں اور آپس میں بھی خوب لڑ رہے ہیں۔

کسی نقاد نے جان آوزبرن کو "اعصاب زدہ" لکھ دیا تھا ——— جان آوزبرن اس کی جان کو آ گیا ——— اس نے دھاڑ کر کہا:۔

"اچھا تو تم ہمیں نیوروسس اور ہسٹریا کا شکار سمجھتے ہو! اچھا ہم تو سؤر ہیں، گندگی میں لوٹ رہے ہیں، پھر تم سے مطلب ——— ؟ سماجی کوڑا کرکٹ کی صفائی کے داروغہ جی! ہم نے تو تمھیں تمھاری اصلی صورت دکھلائی ہے ———

" ——— یہ لوگ دیواروں پر سے اندر جھانک رہے ہیں اور میں سؤر خانے میں لوٹ لگا رہا ہوں۔ لوگ کتنی خفیہ سطح پر زندہ ہیں ——— ہم لوگ سب سؤر ہیں ———

"اگر یہ باہر والے کچھ دیر کے لیے اندر آ جائیں اور اپنی تھوتھنیاں کلیسائی مذہب کے کوڑے میں گھسیں تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا۔

ویلفیئر اسٹیٹ ــــ ملکہ معظمہ ــــ اس سارے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں اپنی ناکیں رگڑو تو حقیقت کھلنے لگی بٹیا ــــ ہم سور لوگ تو غلاظت کے انبار میں لوٹ لگا لگا کر تم کو یہاں کا سارا کچا چٹھا سنا رہے ہیں۔ ہم اسی گندگی میں پیدا ہوئے ہیں اسی میں مریں گے۔ سوشل سائنس بیچ پونٹ سیاستدانوں، ماہرینِ نفسیات، فلسفیوں، اساتذہ کرام اور ماہرینِ اقتصادیات کو اپنا ممبر بنائے گا ــــ یہ سب جو سینیٹری انسپکٹر ہیں ــــ ادیب کی جگہ تو سور خانہ ہے۔"

"اب تک مذہب، شہنشاہیت، معاشرے کی منظور شدہ اقدار، اعلیٰ طبقہ، پبلک اسکولز کے متعلق ڈرامے اسٹیج کیے جاتے تھے۔ "آرٹی"، "انٹلکچوئیل" ڈرامے محض کلب تھیٹروں اور ریٹل تھیٹروں کے لیے مخصوص تھے۔ اس گروہ نے غربت، جہالت، تشدد اور ظلم کے متعلق بھی تمثیل نگاری شروع کر دی۔" کینتھ ٹائی نن، ان ہی میں سے ایک کا کہنا ہے کہ روس میں "صرف روٹی ہی سب کچھ نہیں" نے تہلکہ مچا دیا تھا۔ یہاں ہمیں ایک ایسی کتاب کی ضرورت ہے جس کا عنوان ہو "صرف کیک ہی سب کچھ نہیں"۔

"اس وقت جبکہ اہلِ قبرص کو پھانسی پر لٹکایا جا رہا ہے اور اہلِ ہنگری مشین گن سے بھونے جا رہے ہیں آرٹ محض دُور کا تماشائی نہیں رہ سکتا۔"

یہ نیا بایاں بازو خود کینتھ ٹائی نن کے الفاظ میں ۳۵ء سے پہلے والے ترقی پسندوں سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ جس طبقے میں یہ نوجوان پیدا ہوئے ہیں اس سے بغاوت نہیں کرتے۔ یہ نچلے متوسط طبقے کے افراد ہیں جن کو سرکاری یونیورسٹیوں میں مفت تعلیم ملی (اس وقت برطانیہ میں ساٹھ فی صدی انڈر گریجویٹ سرکاری خرچ پر پڑھ رہے ہیں) یہ کنٹری ہاؤس میں رہنے والے اونچے طبقے سے نہ متنفر ہیں اور نہ ان سے رشک میں جلتے مرتے ہیں۔ یہ اس اونچے طبقے سے محض بہت بُری طرح بور ہو چکے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "چھوٹی چھوٹی قومیں اپنی خصوصیات کی پرستش کرتی ہیں چنانچہ ہسپانیہ اپنی بل فائٹ کے، سان مارینو والے اپنے ڈاک کے ٹکٹوں کے اور اہلِ انگلستان اپنی ملکہ معظمہ کے پجاری ہیں لیکن حالات اس وقت واقعی قابو سے باہر ہو جاتے ہیں جب مقبول پریس ملکہ، ڈیوک اور ان کے بچوں کو دنیا کی چار اہم ترین ہستیاں بتاتا ہے۔ آج کا بایاں بازو اس مضحکہ خیز صورتِ حال سے بغاوت کر رہا ہے۔"

چنانچہ اگر اس گروہ میں کولن ولسن ہے تو ڈورس لیسنگ بھی موجود ہے جو کہتی ہے "کولن ولسن کے علاوہ اس دنیا میں روس اور چین اور ہندوستان کے لاکھوں نوجوان ہیومینسٹ بھی ہیں۔ مسٹر ولسن ظاہر ہے اس جوش و خروش کے جذبے میں شرکت کرنے سے معذور ہیں جو ہندوستان میں عظیم الشان DAMS کی تعمیر کی خبر سن کر ایک ایسے نوجوان افریقی قوم پرست کے دل میں پیدا ہوتا ہے جس کو لکھنا پڑھنا سیکھے ابھی پانچ سال کی مدت بھی نہیں گزری۔"

کمیونسٹوں کے مقابلے میں برطانیہ کے نئے اشتراکیوں کی وہی پوزیشن ہے جو ریفرمیشن کے وقت کیتھولک فرقے کے مقابلے میں پروٹسٹنٹ "بدعتیوں" کی تھی۔

"برافروختہ نوجوانوں" کو بدتمیز اور نالائق کہا گیا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک سفید پوش شریف گھرانے کا لڑکا آوارہ، گستاخ اور بیہودہ نکل جائے ــــ "سُرخ اینٹوں" والی پروونشل یونیورسٹیوں میں سرکاری وظیفے پر پڑھی ہوئی اس لونڈھار پارٹی نے، جسے سمرسٹ مام نے SCUM کے لقب سے نوازا، انگریزی ادب میں ایک نئی جان ڈال دی ہے اور ایک زبردست باب کا اضافہ کر دیا ہے۔

"برافروختہ نوجوانوں" نے یہ لقب خود اختیار نہیں کیا بلکہ مقبول پریس نے ان کو یہ خطاب دیا ہے۔ اس گروہ کا پیدا ہونا ناگزیر تھا۔

۴۵ء کے بعد وہی جنگ سے پہلے کے حالات واپس ہو گئے تھے۔ وہی طبقاتی تفریق، وہی متوسط طبقے کی قناعت اور جمود۔ دائیں بازو والے صاف صاف کہہ رہے تھے کہ سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ برطانیہ نے جنگ میں روس کے خلاف جرمنی کا ساتھ نہ دیا بلکہ اُلٹا ہٹلر سے لڑ بیٹھا۔ لیکن اس وقت یہ معلوم ہوتا ہے کہ جدید انسان، مرد اور عورت، بہت بہادر رہے جو اتنا کچھ سہہ لینے کے بعد بھی نیوکلر تباہی کے سائے میں سانس لینے کے باوجود ہنس رہا ہے اور مستقبل کی طرف سے مایوس نہیں ہونا چاہتا۔

دنیا روز بروز مشکل تر ہوتی جا رہی ہے۔ ہم الفاظ اور اصطلاحات اور نظریات اور خیالات اور واقعات کے سیلاب میں گھرے ہوئے ہیں۔ ان کا انتخاب ہمارا کام ہے۔ اگر ہم نے ادب کی تجارت نہیں شروع کر دی —— اور یہ عالمگیر تجارت کا دور ہے —— تو ہم اچھے فنکار ثابت ہو سکیں گے۔

مرتے وقت گوئٹے کے آخری الفاظ تھے —— "اور روشنی ——!"

کرشن چندر

تقسیم کے بعد اُردو زبان ادھر جس دورِ ابتلا سے گزری ہے اور گزر رہی ہے اس کا اثر اُردو افسانے پر کیسے نہ ہوتا؛ دل بجھ سے گئے، متعدد کاوشوں کے بہت سے چراغ ایک ہی پھونک سے گل کر دیے گئے۔ پھر کیا کریں؟ مر جائیں؟ ظاہر ہے اُردو افسانہ مر تو نہیں سکتا، مگر حالات کو سنبھلنے میں دیر لگے گی۔ اُردو افسانہ کوئی عارضہ تو نہیں ہے کہ انجکشنوں سے ٹھیک کر لیا جائے۔ ادب کی ہر صنف پر جمودی دور آتے رہتے ہیں۔ ہمیں مایوس نہ ہونا چاہیے۔ اُردو افسانہ ابھی بوڑھا نہیں ہوا ہے۔ میرے خیال میں تو وہ ابھی جوان بھی نہیں ہوا ہے۔

طویل خاموشی کبھی کبھی ادبی موت کے مترادف ہوتی ہے لیکن ہر صورت میں اور ہر حالت میں اور ہر شخصیت کے ساتھ اس کا انطباق نہیں کیا جا سکتا۔ طویل خاموشی کے بعد پھر حُسنِ تخلیق کی نمو ہوتی ہے۔ بُری کہانیوں کے بعد پھر اچھی کہانیوں کا دَور آتا ہے۔ کبھی ایک ہی فن کار ایک محدود عرصے میں اچھی اور بُری دونوں قسم کی کہانیاں تخلیق کرتا ہے۔ تخلیق کا عمل اکہری لائن کا عمل نہیں ہے۔ یہ ایک بہت ہی پیچیدہ ذہنی عمل ہے۔

سستے قسم کے ناولوں کی اشاعت نے بھی اُردو افسانے کو نقصان پہنچایا ہے۔ نہ صرف اُردو افسانہ بلکہ اُردو نثر کے ہر شعبے میں اس کے زہریلے اثرات آپ کو دکھائی دیں گے۔ پبلشر بازار کی مانگ پورا کرنا چاہتا ہے، ادیب اس سے تعاون کرتے ہیں، نتیجہ —— ؟

کیا صرف افسانہ نگاروں کو مطعون کر دینے سے کام چل جائے گا؟ کیا تنقید نگاروں اور رسالے کے ایڈیٹروں پر کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی؟ —— مجھے یاد ہے جب میں نے، بیدی نے، اشک نے، عصمت نے لکھنا شروع کیا تھا، کس کس طرح ہماری حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ حامد علی خاں نے میرے دوسرے افسانے کی اشاعت ہی پر "ہمایوں" میں لکھا تھا کہ یہ نوجوان ایک روز اُردو کا بہت بڑا ادیب ثابت ہو گا۔ "ادبی دنیا" میں چھپنے والے افسانوں پر صلاح الدین احمد کے بصیرت افروز تعارفی نوٹ آپ کے ذہن میں ہوں گے۔ آج وہ فراخ دل ایڈیٹر کہاں ہیں؟ جو نئے لکھنے والوں کی اُمنگوں کو سہارا دیں؟ ایک لمحے کے لیے آپ یہ مان لیں کہ پُرانے لکھنے والے بوڑھے ہو چکے، تو کیا یہ امر اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ نئے لکھنے والوں کی زیادہ سے زیادہ ہمت افزائی کی جائے؟

اس امر پر بھی غور کیجیے کہ گزشتہ آٹھ دس سالوں میں اُردو افسانے پر کتنے جائزے لکھے گئے ہیں، افسانوں کے مجموعوں پر کتنی تنقیدیں چھپی ہیں؟ اس میں نئے اور پرانے سبھی کی تخلیقات شامل کر لیجیے اور پھر ہندوستان اور پاکستان سے کوئی بھی اُردو کے دس رسائل

اٹھا کے دیکھ لیجئے۔ مقالوں کی فہرست پر نظر دوڑائیے، لامحالہ یہی خیال ذہن میں آئے گا کہ اُردو میں افسانہ نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ پرانے سے پرانے شاعروں کے گڑے مُردے اکھاڑے جا رہے ہیں۔ جناب جوڑ بلگرامی سے جناب توڑ سہرامی تک کے شاعروں، ایسے شاعروں پر بھی جنھوں نے اپنی زندگی میں مشکل سے دس شعر کہے ہوں گے، مقالے پر مقالے رقم کیے جا رہے ہیں۔ میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ اُردو شاعری کو نظر انداز کر دیا جائے مقصد یہ ہے کہ اُردو افسانے کو بھی تنقید میں اس کا مناسب مقام دلایا جائے۔ آج دنیا کی چالیس زبانوں میں اُردو افسانوں کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ ہندوستان کی ہر بڑی زبان میں اُردو افسانے ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں اور عزت اور احترام کی نظروں سے دیکھے اور پرکھے جاتے ہیں۔ بس گھر کے جوگی کی اپنے ہی گھر میں کوئی عزت نہیں! —— یہ ایک فطری امر ہے کہ ہر ادیب اپنی کاوش کے صلہ اور اس کی ستائش کی تمنا کرتا ہے۔ وہ لوگ جنھوں نے اُردو افسانے کو اپنے خون سے سینچا ہے یا جو نیا خون لے کر آئے ہیں سب اس کے متمنی ہیں۔ بے شک بڑوں کی بے جا تعریف سے احتراز کیجئے لیکن کم سے کم نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہ دیجئے۔ اس کا یقیناً اثر ہوگا۔ لوگوں کے حوصلے بڑھیں اور وہ زیادہ محنت سے کام کریں گے۔

”نقوش“ کے ذریعے آپ جس سنجیدگی سے اور دلی لگن سے اُردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ”نقوش“ کا طنز و مزاح نمبر اس کی تازہ مثال ہے۔ ”نقوش“ کے خاص نمبر اُردو ادب اور اس کی پرکھ میں سنگِ میل کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ نمبر بھی اپنی امتیازی شان رکھتا ہے اور آپ نے اس کے احاطے میں بہت کچھ سمیٹ لیا ہے لیکن جو کچھ نہیں سمیٹا ہے اس کی طرف میں ضرور ایک اشارہ کرنا چاہوں گا۔ طنز و مزاح کے موجودہ دور کو آپ نے اُردو ادب کا سنہری دور کہا ہے لیکن اس دور کی کاوشوں اور ان کی شخصیتوں پر آپ نے کتنے مقالے لکھوائے ہیں؟ فکری اور سنجیدہ طنز و مزاح کے انشا پردازوں میں فلک پیما کا نام سرِفہرست ہے۔ حیرت ہے آپ انھیں کیسے بھول گئے؟ چچا چھکن تو ایک مستعار کردار ہے لیکن چچا باقی تو کراچی کی پیداوار ہیں، آپ نے انھیں کیسے نظر انداز کر دیا؟ اس سنہری دور میں فکر تونسوی، محمد خالد اختر اور راجہ مہدی علی خان بھی بستے ہیں۔ یہ اور ان کے ساتھ آٹھ دس اور ایسے نام ہیں جن کے کام کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بہر حال ان معمولی اور غیر معمولی فروگذاشتوں کے باوجود آپ کا طنز و مزاح نمبر اپنے دامن میں ایک دنیا کو سمیٹے ہوئے ہے۔ میری دلی مبارک باد قبول فرمائیے!

عصمت چغتائی

طفیل صاحب! یعنی آپ بھی حد کرتے ہیں۔ میں کہانیاں لکھتی ہوں مگر یہ مجھے کیا معلوم کہ افسانہ ترقی کر رہا ہے یا تنزل پذیر ہے۔ مجھے فن تھوڑا بہت آتا بھی ہو تو فن کو پرکھنا میرا کام نہیں۔ یہ تنقید نگاروں کا کام ہے۔ ویسے عام طور پر زیادہ تر لوگوں کو شکایت ہے کہ کسی بھی چیز میں وہ پہلی سی بات نہیں۔ فرض کیجئے واقعی وہ پہلی سی بات نہیں تو اس میں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟ لوگ کہتے ہیں تو یقیناً کوئی بات تو ہوگی۔ لکھنے والوں پر اس کا اثر کیسے پڑ سکتا ہے؟ اگر کوئی قائل کر دے کہ افسانہ ترقی پذیر ہے یا تنزل پذیر، تو لکھنے والا اچھے افسانے لکھنے لگے گا؟ کیا وہ قصداً لوگوں کو جلانے کے لیے بُرے افسانے لکھ رہا ہے یا لکھنا چاہتا ہے؟ لکھنے والا کسی کو مرعوب کرنے کے لیے نہیں لکھ سکتا۔ وہ تو بس لکھتا ہے کیونکہ لکھنے کو دل چاہتا ہے۔

اچھی چیز لکھنا نہ لکھنا اپنے بس کی بات نہیں۔ ایک شخص کی تعلیم، تربیت، مشاہدہ اور ماحول بے شک اثر انداز ہوتا ہے مگر یہ کوئی ضروری نہیں کہ ایک اچھا افسانہ نگار ہمیشہ ہی اچھا لکھے۔ باوجود تجربہ اور فن پر قابو رکھنے کے ایک اچھا افسانہ نگار نہایت تیسرے درجہ

کا افسانہ لکھ دیتا ہے اور نیا لکھنے والا اوّل درجہ کی چیز لکھ دیتا ہے۔

میں سخت ناقدانہ نظر سے افسانے نہیں پڑھتی، لطف اٹھانے کے لیے پڑھتی ہوں اور سارے افسانوں پر نظر ڈال کر اس وقت یہ فیصلہ کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ ویسے میں ایک بات کہوں آپ سے، مجھے تنقیدوں سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ کسی نے برائی کی تو میرا دل نہ ٹوٹا، کسی نے تعریف کی تو میرا دماغ نہ خراب ہوا۔ ویسے تنقید نگار کسی افسانہ نگار یا اس کے افسانے کو لے کر تنقید نہیں کرتے۔ اس کی اچھائی اور کمزوری پر ایسی رائے نہیں دیتے جو لکھنے والے کو کسی قسم کی مدد دے سکے۔ چلتے چلتے وہی پرانے جملے دہرا دیتے ہیں۔ فلاں فحاش ہے، فلاں کے ہاں گہرائی ہے، فلاں کے ہاں رجعت پسندی پائی جاتی ہے اور فلاں نعرے بازوں کی فہرست میں آتا ہے۔ کیوں؟ اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا کہ یہ راستہ منزل کی طرف جاتا ہے اور اس راستے میں یہ یہ خطرے ہیں۔ یقین جانئے مجھے ایسی تنقیدوں سے کوئی مدد نہیں ملتی۔ ممکن ہے یہ تنقیدیں میرے لیے نہ لکھی جاتی ہوں، پڑھنے والوں کے لیے لکھی جاتی ہوں گی کہ وہ کس کی تحریر پڑھیں اور کس کی نہ پڑھیں یا چھاپنے والوں کو فیصلہ کرنے میں آسانیاں پیدا کرنے کے لیے لکھی جاتی ہوں گی۔

مجھے اپنی افسانہ نگاری سے زیادہ اور اہم باتوں کی فکر رہتی ہے۔ مثلاً میری چھوٹی بچی کا خط پنچ گنی سے بجائے ہفتہ کے پیر کو کیوں آیا؟ بڑی بچی کے پرچے کیسے ہو رہے ہیں؟ اس مہینے تین ماہ کا کرایہ دینا ہے یا چار ماہ کا؟ ان سب باتوں کا اطمینان بخش جواب مل جانے کے بعد خیال آتا ہے کہ کہانیاں لکھوں۔ وہ بھی اگر بمبئی کی مشغول زندگی اجازت دے۔ اس سال میں نے کوئی فلم کی کہانی نہیں لکھی اس لیے ادھر کچھ لکھنے کی فرصت مل گئی۔ اب تو ٹرک کا وقت آگیا۔ کام کی تلاش ہے اور جو لکھے ہیں جائیں یہ افسانے، کچھ روٹی کی بھی فکر کرنا چاہیے اور میری بلا سے اگر افسانہ نگاری تنزل کی طرف جا رہی ہے۔ چلی جائے کم بخت۔ اس سے زندگی کی ضرورتیں تو نہیں پوری کی جا سکتیں۔

ویسے بھی میرے تو یہ سن سن کر کان پک گئے کہ ادب میں جمود ہے۔ یہ جملہ تو فیشن میں داخل ہو گیا ہے اور ہر شخص اسے دہرانے کو ہی سب سے بڑی تنقید سمجھتا ہے۔ کیا مصیبت ہے۔ ادھر کچھ نئے لکھنے والوں کو شکایت ہے کہ انھیں ادب کے ٹھیکیدار ابھرنے نہیں دیتے۔ ادھر تنقید نگار کہتے ہیں ادب میں جمود ہے۔ یہ دونوں باتیں ایک وقت میں کیسے ہو سکتی ہیں۔ اگر ادب میں جمود ہے تو نئے لکھنے والوں پر ہم پرانے لکھنے والے کیونکر حاوی ہو گئے ہیں۔

جب کہیں ادب میں جمود کا ذکر سنتی ہوں تو مجھے یقین ہونے لگتا ہے کہ واقعی آج کل جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ بکواس ہے۔ بکواس نہ ہوتا تو لوگوں کے سر میں کیڑا نکلا ہے جو جمود کا رونا رو رہے ہیں۔ دراصل وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ جو کچھ ہم لکھتے ہیں وہ قابلِ توجہ نہیں۔ اونھ! تو میں کیا کروں؟ میرا جی چاہے گا تو لکھوں گی اور کسی جمود کے ہوّے سے نہیں ڈروں گی۔

افسانوں سے زیادہ آج کل تنقیدیں لکھی جا رہی ہیں۔ کاش! یہ لوگ بجائے ادب میں جمود کا رونا رونے کے خود کوئی جمود شکن افسانہ لکھ ماریں کہ چھٹی ہو۔ یہ لمبے لمبے مقالے لکھ کر بور کرتے جاتے ہیں اور رسالے والے چھاپے جاتے ہیں۔ یہ مقالوں والے رسالے ہمیشہ تنگدستی کا شکار رہتے ہیں۔ 'شمع' میں، 'بیسویں صدی' میں ہر ماہ تین چار کہانیاں چھپتی ہیں۔ ہزاروں آدمی شوق سے پڑھتے ہیں۔ جمود پر قطعی بحث نہیں ہوتی۔ پہلے 'ساقی'، 'نیا ادب' اور 'ادب لطیف' بھی ایسے ہی کہانیوں سے آراستہ چھپتے تھے، بغیر تنقیدوں کے۔ لوگ پڑھتے تھے، لطف لیتے تھے۔ اب تو افسانہ پڑھنے کی کسی کو فرصت نہیں ہوتی۔ گاڑھے گاڑھے تنقیدی مضامین لوگ پڑھتے ہیں اور جمود اور غیر جمود کے چکر میں پڑ جاتے ہیں۔

یقیناً آپ اپنی عادت کے مطابق ایک بھیانک حد تک موٹا سا جمود نمبر نکال دیں گے جس کے خیال سے ہی میرے ابھی سے رونگٹے کھڑے ہو رہے ہیں۔ براہِ کرم مجھے وہ پرچہ بھیجنا یاد کر کے بھول جائیے گا۔ مجھے تنقیدوں، کتابوں کے دیباچوں، مقدموں اور مقالوں سے قلبی بغض ہو گیا ہے۔ سخت بورنگ لگتے ہیں۔ ایک مضمون پڑھنے کے لیے مجھے قطعی کسی کی رائے کی ضرورت نہیں۔ میں خود اپنی رائے قائم کرنا پسند کرتی ہوں۔

یہ جمود نمبر، یا نہ جانے اس مردود کا کیا نام رکھیں گے، نہ نکالیں تو بہتر ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اس کے بعد مہینوں بحثیں چلیں گی، خوب چخ چخ ہوگی، بہت سے لوگ بگڑیں گے، شکایتیں بڑھیں گی اور لوگ کہانیاں لکھنے کے بجائے اس جمود کے چکر میں پڑ جائیں گے اور جمود در جمود پیدا ہو جائے گا۔ وہ نئے اور پرانے لکھنے والے جو شوق سے لکھ رہے ہیں ٹھٹک کر سوچنے لگیں گے۔

خیر آپ کی مرضی! آپ مانیں گے تھوڑی، مگر اتنا سن لیجئے کہ میں جمود نمبر کھول کر بھی نہیں دیکھوں گی۔

خواجہ احمد عباس

کسی ادبی صنف کا جائزہ ماہانہ یا ششماہی یا سالانہ امتحان کی طرح نہیں لیا جا سکتا، کچھ مدت لگتی ہے۔ ادبی رجحانات کو پروان چڑھتے کم سے کم دس بارہ برس درکار ہوتے ہیں۔ "موجودہ" اُردو افسانہ سے میں مراد لیتا ہوں تقسیم ہند و قیام پاکستان کے بعد کے افسانے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ہندوستان یا پاکستان میں افسانہ رُو بہ زوال ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی خاص ادیب نے اچھا نہ لکھا ہو یا کم لکھا ہو یا مدت تک کچھ نہ لکھا ہو لیکن اس کا مطلب یہ نہیں لیا جا سکتا کہ ہمارے افسانوی ادب میں جمود ہے۔

پرانے لکھنے والوں کو ہی لے لیجئے۔ مانا کہ پچھلے دس برس میں کرشن چندر نے "بالکنی" اور "ان داتا" جیسے اعلیٰ اور لازوال افسانے کم لکھے ہیں۔ نہ "شکست" اور "طوفان کی کلیاں" جیسے ناول ہی تخلیق کیے ہیں۔ لیکن اس عرصے میں کرشن نے بہت لکھا ہے اور اگر شاہکاروں کو نہیں تو درجنوں اچھے افسانوں کو تخلیق کیا ہے اور نہایت اہم اور معنی خیز ادبی تجربے کیے ہیں۔ "گدھے کی سرگذشت" طنزیہ افسانہ نگاری میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔

عصمت چغتائی نے بھی خاصی طویل مدت کی خاموشی کے بعد "ننھی کی نانی" اور "بچھو پھوپی" جیسے افسانے لکھے ہیں جو ان کے افسانوی فن کی معراج کہے جا سکتے ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی نے بھی "لاجونتی" اور "اپنے دُکھ مجھے دے دو" لکھ کر ثابت کر دیا ہے کہ ان کا فن اب نہ صرف نئی بلندیوں کو چھو رہا ہے بلکہ نفسیاتی گہرائیوں میں بھی اُتر رہا ہے۔ اسی طرح احمد ندیم قاسمی کی کہانیوں میں پاکستان کے عوام کی زندگی نہ صرف جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے بلکہ دھڑکتی ہوئی سنائی دیتی ہے۔

طنز و مزاح کے میدان میں رشید صدیقی اور پطرس کے بعد صرف کنہیا لال کپور تھے، اب ان کے علاوہ فکر تونسوی نے بھی اپنی جگہ بنا لی ہے۔

لیکن ادب کا میدان کوئی پرانے اور نامور ادیبوں ہی کی جاگیر نہیں ہے۔ ادب کے کارواں میں پرانے بچھڑتے جاتے ہیں اور اس میں نئے ملتے جاتے ہیں۔ ایسے بھی ہوتے ہیں جو طویل مدت تک ہمرکارواں رہتے ہیں، ایسے بھی ہوتے ہیں جو دو چار منزلوں تک ساتھ دے کر پیچھے رہ جاتے ہیں لیکن کارواں چلتا رہتا ہے —— ایک ان دیکھی منزل کی طرف جو ہمیشہ آگے ہی بڑھتی رہتی ہے۔

ہمارے افسانوی ادب کی عظمت اگر پریم چند اور کرشن اور بیدی اور عصمت اور قاسمی سے ہے تو اس کی رونق نئے افسانہ نگاروں کے دم سے

ہے۔ دیکھتے دیکھتے ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کا فن کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ حیدر آباد کی جیلانی بانو اور واجدہ تبسم نے کتنے ہی حسین اور یادگار افسانے تخلیق کر ڈالے۔ رضیہ سجاد ظہیر اچھی مترجم ہونے کے علاوہ اچھی افسانہ نگار بھی ثابت ہوئیں۔ جس طرح بیس پچیس برس پہلے پوسٹ آفس کے ایک کلرک راجندر سنگھ بیدی نے اپنے افسانوں کے پہلے مجموعے "دانہ و دام" سے اُردو ادب میں سنسنی پھیلا دی تھی اسی طرح اب ریلوے کے محکمے کے ایک کلرک رام لال نے "ایک شہری پاکستان کا" جیسے افسانوں سے چند برس ہی میں اپنا لوہا منوا لیا ہے۔

یہ ہمارے موجودہ افسانوی ادب کا نہایت سرسری اور مختصر اور غیر مکمل جائزہ ہے لیکن اس سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُردو افسانہ ہرگز روبہ زوال نہیں بلکہ یقیناً ترقی پذیر ہے۔

کشمیری لال ذاکر

یہ طفیل صاحب بھی خوب مزے کے آدمی ہیں۔ ایک نہ ایک شوشہ کھڑا کرتے ہی رہتے ہیں۔ اب یہ نئی بات سوجھی ہے حضرت کو ——— اُردو ادب روبہ تنزل ہے یا نہیں، اور چاہتے ہیں کہ فیصلہ دو ٹوک ہو، یا ادھر یا اُدھر ——— لیکن سوال یہ ہے کہ ہم کون ہوتے ہیں فیصلہ دینے والے۔ ہمارا کام تو ہے تخلیق کرنا ——— ہم نے ایک کہانی لکھ ڈالی، ایک نظم کہہ دی یا ایک تنقیدی مضمون لکھ دیا۔ اس میں غیر فانی ہونے کے عناصر کہاں تک موجود ہیں یہ ہم کیسے کہہ سکتے ہیں؟ اور کہہ بھی دیں تو اس کا جواز ہمارے پاس کیا ہے؟ اور پھر تصویر کا دوسرا رُخ ہم پیش ہی کیوں کرنے لگے؟ ہم یہ کاہے کو کہیں گے کہ جو کچھ ہم نے تخلیق کیا ہے اس پر زوال کی پرچھائیں پڑ رہی ہے؟ کمہار اپنے برتن کو کب کچا کہے گا؟ وہ تو اسے بجا بجا کر دکھلائے گا؟ بعینہٖ یہی حالت ادیبوں اور شاعروں کی ہے البتہ نقادوں کی بات اور ہے۔ انھیں یہ حق ضرور پہنچتا ہے کہ وہ کسی تخلیق کو تنقید کے اصولوں کی کسوٹی پر پرکھیں اور اسے کسی نہ کسی CATEGORY میں رکھیں اور نقادوں سے بھی زیادہ معتبر ہیں وہ لوگ جن کے ہاتھوں میں ہماری کتابیں جاتی ہیں اور جو انھیں پڑھ کر محظوظ ہوتے ہیں۔ ان سے پوچھئے کہ کون سی تخلیق بہت اچھی ہے اور کون سی انحطاط پذیر۔ مگر مشکل یہ ہے کہ وہ لوگ پڑھ سکتے ہیں، سوچ بھی سکتے ہیں، صرف اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر سکتے اور اگر کرتے بھی ہیں تو ان کے بیان میں وہ شدت اور روانی اور پختگی نہیں ہوتی کہ لوگ اس سے متاثر ہو سکیں چنانچہ اپنی چیزوں کے بارے میں رائے بھی ہمیں خود ہی دینا ہو گی۔ شاید یہی ایک جواز ہو سکتا ہے ہمیں خود اپنے بارے میں کچھ کہنے کا۔

میرا ذاتی نظریہ یہ ہے کہ اُردو ادب روبہ تنزل نہیں ہے۔ اسی طرح اُردو کہانی بلندی سے پستی کی طرف نہیں جا رہی۔ واقعہ یہ ہے کہ اُردو کہانی ابھی بہت بلندی پر پہنچی بھی نہیں۔ کچھ ہی اونچائی پر پہنچی تھی کہ اس کے فوراً بعد ایک سپاٹ سی سطح مرتفع پر آ کر سست رفتار سے چلنے لگی۔ بہت اونچی جگہ پر پہنچ کر نیچے گرنے میں جو ایک صدمے کی سی کیفیت ہوتی ہے وہ یہاں نہیں ہے۔ یہ تو ایک مقابلتاً اونچی جگہ سے آہستہ سے سرک کر قدرے کم اونچی جگہ پر دھیرے دھیرے چل پڑنے کی کیفیت ہے اور وہ دھیرے دھیرے چلنا بھی رُکنے ہی کے مترادف ہے۔ اب وہ ایک دم بڑھ کر منزل کو پا لینے کی دھن نہیں۔ رہبروں میں رہنمائی کا وہ ولولہ نہیں۔ راہ گیروں میں بھی عزم کی وہ پہلی سی گرمی نہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے پورے کا پورا قافلہ ایک سپاٹ سے راستے پر چلنے کے بعد تھک گیا ہے اور راستوں پر گرد کے گھنے بادل چھا رہے ہیں جہاں سے سامنے پھیلی ہوئی وسعتیں کجلا گئی ہیں اور نظریں ہر چیز کو اس کی پوری جزئیات کے ساتھ نہیں دیکھ سکتیں مجھے تو اُردو کہانی میں زوال پذیر ہونے کا نہیں بلکہ تھک کر ایک جگہ رُک جانے کی کیفیت کا احساس ہو رہا ہے۔

پچھلے کچھ برسوں کی افسانوی تخلیقات پر نظر ڈالیئے تو محسوس ہوگا کہ چوٹی کے افسانے انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ترقی پسند ادیبوں کا ایک گروہ جس نے کرشن چندر، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو جیسے افسانہ نگاروں کی تخلیقات پیش کی ہیں اب ایک دم خاموش ہوگیا ہے جیسے اس کے پاس کہنے کو کچھ رہا ہی نہیں۔ تقسیم ملک کے بعد فسادات نے کچوکے بھرے تو کچھ اذہان جاگے، کچھ اچھی تخلیقات بھی سامنے آئیں اور اس کے بعد سب لبادہ اوڑھ کر سو گئے۔ دراصل ادیب کی زندگی، اس کے ماحول اور اس کے سماج میں کسی نہ کسی ہنگامہ کا ظہور پذیر ہونا بڑا لازمی ہے۔ جب یہ ہنگامے ختم ہو جاتے ہیں تو ادیبوں کے دل و دماغ اونگھنے لگتے ہیں۔ آزادی سے پہلے سب سے بڑا مسئلہ تھا ملک کو غلامی سے نجات دلانے کا۔ یعنی ایک آدرش سامنے تھا، کچھ سماجی حالات سامنے تھے، کچھ سیاسی نظریات سامنے تھے، اس وجہ سے دماغ سوچنے پر مجبور ہوتے اور ہاتھ لکھنے پر۔ آزادی ملی تو ایک مسئلہ ختم ہوگیا، گویا ادب کی تخلیق کے لیے ایک تحریک ختم ہوگئی۔ اس سے پہلے عورت کی جگہ سماج میں متعین کرانے کا مسئلہ تھا، اس موضوع پر خاصا کچھ لکھا گیا۔ اب عورت گھر کی چار دیواری سے باہر نکل کر دفتروں میں آگئی ہے، اس نے افسروں کی کرسیاں سنبھال لی ہیں، وہ وزارتوں تک پہنچ گئی ہے۔ ایک مسئلہ اور ختم ہوگیا، ایک سوتا اور سوکھ گیا۔ غلط قسم کے رسم و رواج کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے سے کچھ شاہکار تخلیق ہوئے۔ رسم و رواج کے بندھن ذرا ڈھیلے پڑے تو لکھنے والوں نے اس موضوع پر پوری توجہ سے سوچنا چھوڑ دیا۔ آجا کے رہ گیا بس ایک معاشی نظام جس پر ادیب سوچتے ہیں اور اپنے تخیل کے مطابق اس کی تزئین کا اہتمام کرتے ہیں لیکن اس کے دو پہلو ہیں۔ افسانہ یا تو نعرہ بازی بن کر رہ جاتا ہے اور یا اتنی دھیمی آواز سے بولتا ہے کہ اس کی آواز خود افسانہ نگار کے علاوہ کوئی نہیں سن سکتا۔ افسانہ یا تو ایک اِزم کا پراپیگنڈہ بن جاتا ہے اور یا پھر SUBJECTIVE انداز اپنا کر نفسیاتی گتھیاں سلجھانے میں لگ جاتا ہے۔ دونوں صورتوں میں افسانوی ادب کی دولت میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوتا۔

افسانہ نگاروں پر تو جیسے ایک جمود کی سی کیفیت طاری ہے، ایک نیند کی سی کیفیت کا غلبہ ہے۔ یوں تو وہ جی رہے ہیں، سوچ بھی رہے ہیں، حالات کا جائزہ بھی لے رہے ہیں لیکن دماغوں میں اتنی اتھل پتھل نہیں ہوتی کہ کچھ کر کے دکھائیں۔ یا تو انھیں کوئی زبردست صدمہ پہنچے وہ جب جاگیں گے اور یا انھیں کوئی ناقابلِ برداشت قسم کی مسرت نصیب ہو۔ ایک طوفان کی ضرورت ہے ان کے لیے، چاہے وہ موسم سرما کی منجمد کر دینے والی ہواؤں کے دوش پر اڑتی ہوئی یلغار ہو اور یا ساون کے مہینے میں سیاہ گھٹاؤں کے ٹوٹ کر برس جانے کی کیفیت ہو مگر کچھ ہو، جب جا کر ان کی تھکی ہوئی انگلیاں اپنے قلم مضبوطی سے سنبھالیں گی اور شاہکاروں کی تخلیق ہوگی۔

ادھر ہندوستان میں اُردو کے ادیبوں کو ایک اور مسئلہ بھی درپیش ہے جو اس جمود کی سی کیفیت کا ذمہ دار ہے، وہ ہے اُردو کا مستقبل۔ اُردو پڑھنے والوں اور اس کے مطابق کتابیں خریدنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ناشر کتابیں چھاپنا نہیں چاہتے۔ اچھے رسائل سرے سے ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ ادیب کو ہی یقین نہیں کہ اس کی تخلیقات معیاری پرچوں میں چھپ سکتی ہیں یا اس کی کتابیں اچھے اداروں سے شائع ہو سکتی ہیں۔ یا تو وہ عامیانہ قسم کے جنسی اور فلمی رسالوں کے لیے لکھے اور نہیں تو لکھنا چھوڑ دے۔ کچھ لکھنے والوں نے تو واقعی لکھنا چھوڑ دیا ہے۔ جب لکھنا پڑھنا ہی چھوٹ گیا تو تنزل اور ارتقاء کا مسئلہ ہی ختم ———— رو بہ تنزل ہونے کا سوال تو جب اُٹھے جب کچھ لکھا جائے اور دوسری زبانوں کے ادب سے اس کا مقابلہ کیا جائے اور اس کا حقیقی مقام متعین کیا جائے۔ جب ہم کچھ لکھ ہی نہیں رہے تو اس کے اچھا یا برا ہونے کا سوال ہی کہاں رہا۔

لیکن میرا یہ بھی یقین ہے کہ جمود کا یہ دور بہت دنوں تک نہیں ٹکے گا، اس سے تو انسانی ارتقاء کا سارا PROCESS ہی رک جائے گا

ہونا ممکن ہے۔ ارتقا کا PROCESS کبھی نہیں رکتا، وہ تو ایک سدا بہار جھرنے کی طرح بہتا رہتا ہے۔ افسانوی ادب کا جھرنا کسی عارضی روک کے کارن کچھ دیر کے لیے خاموش ضرور ہو گیا ہے ہمیشہ کے لیے نہیں رکا۔ یا تو یہ زمین میں جذب ہو کر اپنی ہستی کھو دے گا اور یا پھر اپنی پوری رفتار سے دوبارہ آگے بڑھے گا۔ یہی دو صورتیں ہیں۔ یہ خوابیدگی، بے دلی، شکستگی اور تھکن بہت دیر تک قائم نہیں رہے گی۔ معاملہ ایک طرف ہو کر ہی رہے گا۔ دوسرے الفاظ میں یا تو اُردو افسانہ واقعی انحطاط کے گڑھے کی طرف قدم بڑھائے گا اور یا پھر آکاش کی وسعتوں میں اڑان بھر کر دوسری زبانوں کے ادب کے مقابلہ میں آ کھڑا ہو گا۔

ابو سعید قریشی

اب رہا نقوش کے "جمود نمبر" کا سوال ــــ یہی نام ہے نا ــــ؟ جانے یہ "جمود" کا لفظ کس کافر نے نکالا ہے۔ ضرور کوئی نقاد ہوگا ــــ یا کوئی ایڈیٹر، کسی کم بکنے والے رسالے کا ــــ قنوطی کوئی، بگڑا ادیب، ناکام شاعر ــــ نا صاحب! میں جمود کا قائل نہیں۔ متحرک دنیا میں جمود ناممکن ہے۔ رہا ادب، جانے کون کہتا ہے اور کیوں کہتا ہے کہ ادب پر جمود طاری ہے۔ ایک افسانے ہی کو لیجیے ــــ منٹو ہی نہیں ہے نا ــــ لیکن اس کے سبھی ساتھی اب تک لکھ رہے ہیں۔ اُدھر عصمت اور کرشن ہیں، اِدھر میں کہیں پہلے سے بھی جوان ہوں۔ پھر نئے لکھنے والے موجود ہیں (کتنی تو "والیاں" ہوں گی) اِدھر چھپنے والے پرچے دیکھیے اور اس ہجوم میں چند ایک تو ضرور ایسے نظر آئے جن سے امیدیں وابستہ ہو سکتی ہیں۔ مشکل اصل اور ہے۔ شاید ہمارے پیمانے غلط ہو گئے ہیں۔ زمانہ بدل گیا ہے ہم نہیں بدلے۔ فاصلے اور منظر اور ہیں مگر چشمے وہی۔ عینک کا نمبر نہیں بدلا۔ مگر بھئی یہ تنقید و تنقیص، یہ لفاظی، جمود ہے کہ نہیں ملکی بحث، یہ آپ کے ناقدوں یا نقادوں کا کام ہے۔ مجھ سے تو جب جی چاہے افسانہ لکھوا لیجیے۔ ابھی تخلیقی کام کا اہل ہوں۔ یہ چنگاری جب بجھ جائے گی تو آپ سے آپ جواب مضمون لکھوں گا اور ادب کی ٹھیکیداری کروں گا۔

واجدہ تبسم

اُردو کی ہر صنف رُو بہ زوال ہے ــــ!

"یہ کہنے والے ہیں کون ــــ؟ ذرا سامنے تو آئیں ــــ"

میں سوچ رہی تھی بات بالکل اسی انداز سے شروع کروں گی ــــ مگر مجھے محسوس ہوا کہ یہ تو بالکل بادشاہوں کا سا انداز ہے، جو کسی بھی قصور پر ملزم کو پکارتے تھے ــــ

"ذرا سامنے تو لایا جائے ــــ!"

لیکن میں چونکہ بادشاہ نہیں ہوں اس لیے میں نے سوچا کہ اس قدر بھاری بھرکم اندازِ گفتگو ذرا بھی مناسب نہیں ــــ ایک بات اور ہے۔ اس قدر رعب سے پکارنے کے بعد لازماً ملزم کو بڑی کڑی سزا دی جاتی تھی، از قسم کالا پانی ــــ پھانسی ــــ یا پھر عمر بھر کی جیل ــــ ظاہر ہے کہ یہ نعرہ لگانے والے کہ اُردو کی ہر صنف رو بہ زوال ہے، میرے سامنے پیش کر بھی دیے گئے تو میں ان میں سے کسی کو پھانسی پر چڑھانے سے تو رہی ــــ میں مصلحتاً خاموش تو ہو رہی ہوں لیکن یقین مانیے کالا پانی بھجوانے، پھانسی چڑھوانے اور عمر بھر کی جیل کروا دینے کی تمنا دل ہی دل میں مچل رہی ہے ــــ!!

میری اس قسم کی تمہید سے یقیناً آپ جان گئے ہوں گے کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ اُردو ادب رُو بہ تنزل نہیں ہے۔ لیکن یہ تو بتایئے کہ آپ خود کو کن لوگوں میں شمار کرتے ہیں —— مجھے تو کچھ یوں محسوس ہو رہا ہے کہ آپ کو بھی کچھ یہی وہم ہے کہ اُردو ادب مر گیا۔ ورنہ آپ ایئر میل کے کاغذ پر سُرخ ٹائپ سے یہ نعرہ پہلے نہ چھپواتے ——"اگر موجودہ اُردو ادب، رُو بہ تنزل ہے تو اس کے کیا اسباب ہیں ——؟" آپ نے خود گویا اس بات کو شرفِ اولیت بخشا ہے کہ ہاں صاحب! کیا کریں اُردو ادب بالکل رو بہ تنزل ہے ——!)

آپ کا خط ملا تو میں ٹال گئی —— میں کدھر ان گورکھ دھندوں میں پڑوں —— میں کون ایسی بڑی معروف لکھنے والی ہوں۔ کچھ اُول جلول بک دوں گی تو بڑے لوگ کہیں گے "یہ اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے ——؟" مگر اب آپ کا دوسرا خط بھی آگیا —— مجھ سے یوں اپنے سوال کا جواب نہ مانگیے —— اس قسم کے سوالوں کا جواب تو بس کرشن چندر دے سکتے ہیں یا پھر عصمت آپا —— مگر آپ تو بضد ہیں کہ مجھ سے بھی پوچھ کر ہی رہیں گے —— بخدا اگر آپ مجھ سے یہ کہتے کہ آسمان سے چاند لا دیجئے تو میں اتنی اُلجھن میں نہ پڑتی —— کیونکہ آج کل چاند پر جانا ایسی کوئی مشکل بات نہیں رہ گئی ہے —— آج چاند پر پہنچے ہیں، کل ممکن ہے چاند کو اٹھا کر زمین تک بھی لا سکیں —— مگر آپ کا یہ سوال کہ اُردو ادب رُو بہ تنزل ہے تو کیوں ——؟ بڑا مشکل ہے —— یہ بتایئے پھر وہ لوگ میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے جو اس نعرے کے حق میں ہیں کہ اُردو ادب رُو بہ تنزل ہے؟ (انتقاماً وہ مجھے کالا پانی بھجوانا چاہیں گے ——!)

بھئی آخر اس لفظ 'تنزل' سے آپ کیا مراد لیتے ہیں ——؟ جہاں تک میں سمجھ سکی ہوں آپ کا یہی مطلب ہے کہ اُردو افسانے میں اب وہ پہلی سی بات نہیں رہی —— میں نہیں مانتی —— حالانکہ یہ طے ہے کہ میرے ماننے نہ ماننے سے کچھ بگڑے گا سُدھرے گا نہیں —— حالات بالکل وہی رہیں گے —— (اور مانوں بھی کیوں ——؟ میں تو یہ دیکھتی ہوں کہ اُردو افسانے میں آج نت نئے موضوع سما چکے ہیں —— اگر کل (گزرا ہوا کل) اُردو افسانہ بچہ تھا تو آج جوانی کی حدوں کو چھو رہا ہے —— بعض دل جلے یہ کہتے ہیں کہ اُردو افسانے پر جمود طاری ہے —— اور یہ کم بخت جمود اس لیے طاری ہے کہ کرشن چندر فلمی دنیا میں چلے گئے ہیں —— اب آپ بتایئے کیا کرشن چندر بے چارے کو بال بچے، بیوی، گھرداری، روٹی کپڑے کی ضرورت نہیں ہے ——؟ عصمت آپا فلمیں بنانے لگی ہیں بس اسی لیے اُردو افسانے پر یک لخت بڑا سخت قسم کا جمود طاری ہو گیا ہے —— صاحب! آپ کا دھندا اگر ادب ہے تو اس پر آپ کا پیٹ پلنے سے تو رہا —— اگر یہ لکھنے والے ادب کے ذریعے چار پیسے کماتے ہیں تو کمانے دیجئے، ان پر یوں الزام تو نہ لگایئے —— آپ کے پاکستان کا حال تو معلوم نہیں —— ہمارے بھارت کا یہ حال ہے کہ اگر اس قسم کی بحث اٹھتی ہے تو تان بمبئی والوں پر آکر ٹوٹتی ہے جہاں ایک سے ایک بڑھیا ادیب، افسانہ نگار اور شاعر فلمی دنیا میں گھس پڑا ہے ——! ایک عام خیال یہ ہے کہ جب شاعر اور افسانہ نگار کو پیٹ بھر روٹی مل جاتی ہے تو اس کے قلم کا زور گھٹ جاتا ہے —— یہاں والے تو یہی کہتے ہیں کہ جب تک یہ لوگ فلمی دنیا میں نہ گئے تھے، خوب لکھتے تھے لیکن اب انھوں نے پہلے تو لکھنا ہی چھوڑ دیا ہے اور لکھتے بھی ہیں تو بلا بتر ——

کم از کم میں اس دلیل کو ماننے کے لیے تیار نہیں —— آج ہمارے بیشتر ادیب ایسے ہیں جو صرف اچھا لکھتے ہی نہیں بلکہ اچھا کھاتے اور پہنتے بھی ہیں —— پھر ان لوگوں کے بارے میں آپ کیا کہیں گے ——؟ میرے سامنے نوان لکھنے والوں کی ایک فوج کی فوج ہے جو کل بھی اتنی ہی خوبصورت تحریریں پیش کرتے تھے جتنی کہ آج —— یہ ضرور ہے کہ ان میں سے بعض لوگ خاموش ہو گئے ہیں، کچھ ایسے ہیں جو ایک آدھ افسانہ لکھ لیتے ہیں اور پھر کئی دنوں کے لیے چُپ سادھ لیتے ہیں —— مگر ان کی اتنی سی خطا پر یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اُردو افسانے کا زوال ہو گیا —— اگر واقعی اُردو افسانے کا زوال ہو گیا ہے تو پھر آج بھی اس کی اتنی مانگ کیوں ہے ——؟ یہ آپ ایڈیٹر لوگ ہی تو ہیں نا جو افسانہ نگاروں کو مسلسل

خط پر خط بھجوائے جاتے ہیں کہ افسانہ بھیجئے —— پھر ہمارے پڑھنے والے پرچہ خریدتے ہیں تو شاعری اور تنقید کے لیے نہیں —— وہ تو بس افسانوں پر جان دیتے ہیں —— آئے دن افسانوں کے مجموعے چھپ رہے ہیں۔ نئے نئے افسانہ نگار، نئے نئے موضوع لے کر محفلِ ادب میں آ رہے ہیں —— دنیا حرکت اور ترقی پذیر ہے —— شاید آج جتنے موضوع لکھنے والے کے سامنے ہیں اس سے پہلے کبھی نہ تھے، اور یہ آپ فرمائیں گے کہ افسانہ ہی وہ صنف ہے جس میں ہر موضوع کو بڑی خوبصورتی اور گہرائی سے سمیٹا جا سکتا ہے ——

ہاں کسی حد تک تنقید کے سلسلے میں ضرور کہا جا سکتا ہے کہ مائل بہ زوال ہے، لیکن میں اس موضوع پر اس سے زیادہ کچھ لکھنا نہ چاہوں گی —— پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ میرا میدان نہیں، دوسرے یہ ڈر ہے کہ مجھ پر انگارے برسنے لگیں گے —— ہاں افسانے کے زوال کی مخالفت میں چاہوں تو صفحے سیاہ کر سکتی ہوں لیکن یہاں بھی مجھے ڈرنا پڑ رہا ہے —— وجہ بس یہی ہے کہ لوگ کہنے لگیں گے کہ جمعہ جمعہ آٹھ دن لکھنا شروع کیے ہوئے ہیں اور باتیں اتنی بڑی بڑی —— خود افسانے لکھ رہی ہیں تو سمجھ بیٹھی ہیں کہ اردو افسانہ بڑا ترقی پذیر ہے —— ہونہہ ——

کچھ دن پہلے باتوں باتوں میں ایک صاحبہ کے سامنے کہہ گئی —— "نقوش" بڑا خوب صورت پرچہ ہے ——!

"ہاں! اسی لیے نا کہ اس میں کہانیاں چھپتی ہیں ——؟"

خدیجہ مستور

اردو افسانے کے زوال اور ترقی کی بحث کو نقوش میں چھیڑ کر آپ نے واقعی بڑا اچھا کام کیا ہے۔ ادیبوں سے بھی اس معاملے میں رائے لینا یقیناً سود مند ہوگا۔ ممکن ہے کہ اب اس بحث کا بخیر و خوبی انجام ہو جائے۔ ویسے میرا پختہ خیال ہے کہ جنہیں لکھنے کا شوق ہوتا ہے ان کے لئے موضوعات کی کمی نہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ کسی نے افسانے کے زوال کا شوشہ چھوڑا ہے اور لینے والے اسے لے اڑے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس خیال میں ذرا سی بھی صداقت نظر نہیں آتی۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ اردو افسانہ آج بھی اتنا ہی مقبول اور معیاری ہے جتنا کہ دس پندرہ برس پہلے تھا۔ اگر آپ پچھلے دس برس کے افسانوں کا انتخاب کرنے بیٹھ جائیں تو احساس ہوگا کہ اس دور میں کیسے کیسے شاہ پارے لکھے گئے ہیں۔ کچھ افسانے تو ایسے ہیں کہ آپ پچھلے بیس برس کے افسانوی ادب میں ان کا جواب نہ ڈھونڈ سکیں گے۔

بہرحال یہ حقیقت ہے کہ کچھ عام قارئین کے دل میں یہ خیال گھر کر گیا ہے، اور وہ سوچنے لگے ہیں کہ افسانہ انحطاط پذیر ہے۔ ان کی رائے کچھ تو تعصب (برے معنوں میں نہیں) کا نتیجہ ہے اور کچھ پس منظر اور حالات سے بے خبری کا! اس خیال کے شکار حضرات یہ بھول جاتے ہیں کہ آزادی کے بعد پرانے ادیب دو ملکوں میں بٹ گئے ہیں۔ پاکستانی قارئین کو ہندوستان کے مقبول ادیبوں کے افسانے پڑھنے کو کم ہی ملتے ہیں، اور پاکستانی ادیبوں کی تخلیقات ہندوستانی قارئین تک پوری طرح نہیں پہنچ پاتیں۔ دونوں ملکوں کے ادیب اپنے اپنے ملک کے قارئین اور رسائل کو ترجیح دیتے ہیں اور انہیں دینا بھی چاہئے۔

کرشن، عصمت، بیدی، حیات اللہ انصاری، احمد عباس، بلونت سنگھ وغیرہ کے بہت تھوڑے افسانے ہم پاکستانیوں کی نظر سے گزرتے ہیں۔ ادھر بھی یہی حال ہے کہ ندیم، غلام عباس، ہاجرہ، قرۃ العین، مفتی وغیرہ کا ایک آدھ ہی افسانہ ہندوستانی قارئین کو نصیب ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ خلا نامور ادیبوں کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اس لئے نئے افسانہ نگار چاہے کتنے ہی اچھے افسانے لکھیں، عام قارئین کے نزدیک یہ خلا پُر نہیں ہوتا۔

نئے افسانہ نگار جو کچھ لکھ رہے ہیں، ان میں جوش ہے، خلوص ہے، موضوع میں ندرت ہے، ترقی کا احساس ہے، مگر یہ عجیب بات ہے کہ کچھ ادیب کسی نہ کسی مشہور لکھنے والے سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ افسانے کے انحطاط کا شوشہ نئے ادیبوں کی اس کمزوری سے بھی زور پکڑ رہا ہے۔

کسی بڑے ادیب سے متاثر ہونے کا یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ اردو افسانے میں انحطاط پیدا ہو رہا ہے۔ بلاشبہ نئے ادیب افسانے کی ترقی میں برابر اضافہ کر رہے ہیں، بس دیکھنے والی آنکھیں چاہئیں۔

اردو افسانہ ۱۹۳۰-۴۰ء کی طرح اب نو وارد نہیں ہے۔ اس کا ایک مقام، ایک معیار اور ایک مزاج بن چکا ہے۔ ۱۹۳۰-۳۵ء میں ہر اچھا افسانہ ادب میں ایک اضافہ تصور کر لیا جاتا تھا، اسے ناپسندیدہ روایت کو توڑنے اور کسی حصار سے ٹکرانے کی اجازت بھی مل جاتی تھی۔ مگر آج صرف ایک اعلیٰ افسانہ ہی جو تکنیک، زبان و بیان اور کردار نگاری کے اعتبار سے مکمل ہو، وہی داد کا مستحق تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگر آج ہی کے معیار پر ۱۹۳۰-۴۰ء اور ۱۹۴۶-۵۹ء کے اچھے افسانوں کو پرکھا جائے تو موخر الذکر میں زیادہ سچے موتی ملیں گے، بلکہ یہ دیکھ کر حیرت ہوگی کہ ۱۹۴۷ء تک جن افسانوں کے ڈھنڈورے پیٹے گئے تھے وہ موجودہ معیار پہ پورے نہیں اترتے۔ میں خود اپنے افسانوں کو جو ۱۹۵۰ء سے پہلے لکھے گئے تھے، ان کا اب کے افسانوں سے موازنہ کرتی ہوں تو بے حد نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ یہی معاملہ دوسرے افسانوں کا بھی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بحث کی خاطر کوئی دھول بھری عینک لگا لے یا ایسے نقادوں کی ہاں میں ہاں ملانے لگے جن کا شوق لکھنے اور بولنے تک محدود ہوتا ہے۔

ترقی اور تنزل کا فیصلہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ اگر کچھ لوگ پیچھے ہٹے ہیں تو ان سے دگنے آگے بھی بڑھے ہیں یا نہیں جو نئے فن کار پیدا ہوئے ہیں ان میں کتنی صلاحیت ہے۔ میں اگر اچھے نئے افسانہ نگاروں کا نام گنانے بیٹھوں اور ان کے فن کا جائزہ لینے لگوں تو یہ رائے مقالہ کی صورت اختیار کر جائے گی۔ مشکل یہ ہے کہ مجھے مقالے لکھنے نہیں آتے (الحمدللہ کہ لکھنے نہیں آتے۔ اس لئے کہ میرا قلم فن کاروں کے ساتھ بے رحمی نہیں برت سکتا) اور نہ آپ نے مجھ سے مقالہ لکھنے کو کہا ہے۔ بہر حال قارئین جو اس قسم کے شبہ میں مبتلا ہیں وہ خود دیکھیں کہ پچھلے دس برس میں کتنے نئے نام اُبھرے ہیں، انہوں نے اردو افسانے کو کتنے نئے زاویے، اور کتنے نئے کردار اور موضوعات دیئے ہیں۔ اور اردو افسانے کو کتنا آگے بڑھایا ہے۔ رطب و یابس کو خاطر میں نہ لایئے۔ کیونکہ یہ ایسی جنس ہے جس کی چور بازاری کا موقعہ نہ تو ماضی میں آیا اور نہ مستقبل میں ایسا کوئی امکان ہے، پہلے بھی عام تھی اور اب بھی کم نہیں ہے۔ ہمیں تو صرف اچھے اور اعلیٰ افسانے دیکھنا ہیں میں تو اس معاملے میں ذرا بھی مایوس نہیں ہوں۔ بعض وقت تو چھوٹے موٹے پرچوں میں بھی بڑے اچھے افسانے مل جاتے ہیں۔

افسانے کے انحطاط کی پینک پھیلانے میں ہمارے اکثر ناشرین نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ انہوں نے انٹ شنٹ ناولیں، الٹے سیدھے افسانوں کے مجموعے اور فضول فضول سے تراجم چھاپ چھوپ کر لوگوں میں یہ خیال عام کیا ہے کہ اردو افسانے میں تو کچھ رہا ہی نہیں۔ مجھ سے نہ جانے کتنے لوگ یہ کہہ چکے ہیں 'اب تو افسانوں کا کوئی اچھا مجموعہ مشکل ہی سے دستیاب ہوتا ہے'۔ اور جب یہ شکایت کسی ناشر تک پہنچائی تو جواب ملا کہ "صاحب! اردو افسانے کی مارکیٹ نہیں ہے"۔

اب اس معصوم جواب کے بعد ان سے کون کہے کہ قبلہ اگر اردو افسانے کی مارکیٹ نہیں ہے تو یہ رسائل کے انبار کیسے بکتے چلے جاتے ہیں اور آپ اس حقیقت سے کیوں کتراتے ہیں کہ نوے فی صد قارئین سب سے پہلے افسانہ ہی پڑھتے ہیں۔

میں یہ ماننے کو تیار ہوں کہ جلد یا بدیر، اردو میں معیاری ناولوں کی تعداد تیزی سے بڑھے گی اور اس سے افسانہ کسی حد تک ضرور متاثر ہوگا، مگر اسے ہم انحطاط کا نام نہیں دیں گے، ارتقاء ہی کا نام دیں گے۔ اس ارتقاء کے بعد بھی افسانے کی ایک الگ جگہ باقی رہے گی اور ناول نگار بھی کسی نہ کسی حد تک اس کا سہارا ڈھونڈنے پر مجبور رہے گا۔ کسی اور وجہ سے نہیں تو مدیرانِ جرائد کی فرمائش پوری کرنے کے لئے ہی افسانے لکھے جاتے رہیں گے۔ اگر افسانہ ختم ہو گیا، یا زوال اور انحطاط کا شکار ہو گیا تو ادبی جرائد کو کون پوچھے گا؟

صالحہ عابد حسین

کیا اُردو زبان ختم ہو رہی ہے؟ کیا اردو ادب کی ہر صنف روبہ تنزّل ہے؟ یہ خیالات آج کل صرف ذہنوں ہی میں نہیں گونج رہے بلکہ زبان و قلم سے بھی ٹپک رہے ہیں۔ اور ان کے پھیلانے میں اردو کے مخالفوں سے زیادہ اس کے حامی اور پرستار پیش پیش نظر آتے ہیں۔ بے شک اس بے دلی کے کچھ ٹھوس وجوہ بھی ہیں، لیکن سب سے بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ آزادی کے بعد اُردو کو ہندوستان میں ہندی کا اور پاکستان میں انگریزی کا مقابلہ کرنے میں جو دشواریاں پیش آ رہی ہیں انہوں نے ہماری ہمتوں کو پست کر دیا ہے اور ہماری آنکھوں میں کچھ ایسا اندھیرا چھا گیا ہے کہ ترقی تو ایک طرف ہمیں اپنے ادب میں جان ہی نظر نہیں آتی۔ ہم اپنے مایوسانہ خیالات سے ان اُبھرتے ہوئے فن کاروں کی ہمت شکنی کا باعث ہوتے ہیں جو اردو کی خدمت کو اپنا مقصدِ حیات بنانا چاہتے ہیں۔ اور ان پرانے فن کاروں کے ساتھ ظلم کر رہے ہیں جو حالات کی ناسازگاری کے باوجود اپنی زبان و ادب کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ ہم صرف یہ دیکھتے ہیں کہ آج نہ غالبؔ و اقبالؔ جیسا شاعر اردو میں موجود ہے نہ شبلیؔ و حالیؔ جیسا انشاپرداز، نہ رسواؔ اور پریم چند کا سا ناول نگار ——— اور مایوسی سے سر ہلا کر کہتے ہیں ہائے افسوس اردو ادب کا ستارہ اپنی چمک دکھا کر ڈوب گیا ؎

خوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود

مگر تاریخ کے طالبِ علم جانتے ہیں کہ تاریخ افراد کی ممنونِ احسان تو ہے مگر ان کی پابند نہیں۔ اقبالؔ، غالبؔ، حالیؔ اور پریم چند کی سی عظیم شخصیتیں تاریخِ ادب میں روز روز پیدا نہیں ہوا کرتیں۔ لیکن ادب ان کے بغیر بھی زندہ رہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان سربرآوردہ افراد کی بدولت اس کے سرمائے میں بیش بہا اضافہ ہوتا ہے۔ بعض وقت وہ ان کی وجہ سے راہِ ترقی میں کوئی نیا موڑ بھی اختیار کرتا ہے۔ لیکن یہ سمجھنا کہ اگر آج بظاہر پہلے کی سی دیوقامت شخصیتیں نظر نہیں آ رہی ہیں تو ہمارے ادب کی ترقی کی راہ بند ہو گئی، درست نہیں:

ہر چند اگلے جو اہلِ فن تھے   سلطانِ قلمروِ سخن تھے
آگے ان کے فروغ پانا   سورج کو چراغ ہے دکھانا
یہ بحرِ سخن سدا ہے باقی   دریا نہیں پائے بند ساقی

پھر یہ بھی تو دیکھئے کہ کسی شخص کی قدر و قیمت اور قد و قامت کا پورا اندازہ خود اس کے عہد میں مشکل سے کیا جا سکتا ہے۔ اکثر یہ غلطی ہوتی رہی ہے کہ ایک بڑے فن کار کو اس کے ہم عصروں نے چھوٹا اور چھوٹے کو بڑا سمجھ لیا۔ یہ تو مستقبل ہی بتائے گا کہ ہمارے اس دور میں بڑے فن کار تھے یا نہیں اور تھے تو وہ کون سے تھے؟

مجھے اس وقت پورے اردو ادب سے بحث کرنا مقصود نہیں بلکہ اس کی صرف ایک صنف یعنی ناول کے بارے میں کچھ کہنا ہے اردو ناول کی صورتِ حال آج کل بہت دلچسپ ہے۔ ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ موجودہ ناول روبہ تنزل ہے۔ پہلے جیسے فن پارے اب نہیں لکھے جاتے۔ دوسری طرف یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ یہ دور ناول کا دور ہے۔ اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج افسانے کے مقابلے میں ناول کی مقبولیت نہ صرف عوام میں بلکہ خواص میں بھی پہلے سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ یہاں تک کہ ناشر افسانوں کے مجموعوں سے بے اعتنائی برتتے ہیں اور ہر ناول خواہ وہ کسی درجہ کا ہو ہاتھوں ہاتھ لے لیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہر سال ہزاروں نہیں تو سینکڑوں ناول چھپ رہے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ ناولوں کی اس کثرت ہی کی بدولت یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اردو کا ناول روبہ تنزل ہے۔ اس لئے کہ رومانی، جاسوسی اور جنسی ناولوں کے کنکروں کے ڈھیر میں جو ٹھنوڑے سے قیمتی پتھروں کے ریزے چھپے پڑے ہیں۔ ان پر مشکل ہی سے نظر پڑتی ہے۔ ان بے شمار جعلی، بے معنی اور گھٹیا جذبات کو ابھارنے والے حصوں کو (جن میں سے بیشتر انگریزی کے گھٹیا ناولوں کے کہیں زیادہ گھٹیا چربے ہوتے ہیں) دیکھ کر اگر صاحبِ ذوق ادب دوست یہ فیصلہ کریں کہ ہمارا ناول گر رہا ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

قبل اس کے کہ میں آپ کے سامنے اپنے اس دعوے کا ثبوت پیش کروں کہ ہمیں اردو ناول سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے اور اس کا مستقبل ایسا تاریک نہیں جیسا ہم سمجھتے ہیں۔ میں اردو میں ناول کی نشوونما کا ایک سرسری جائزہ لینا چاہتی ہوں۔

قدیم طرز کی داستانوں سے قطع نظر جو بہت عرصے سے لکھی جا رہی تھیں، ناول کی عمر اردو ادب میں سو سال کی بھی نہیں۔ اس کی بنا در اصل مولوی نذیر احمد نے ڈالی جن کے مقصدی ناول باوجود بعض فنی کمزوریوں کے آج بھی اپنا ایک بلند مقام اور درجہ رکھتے ہیں۔ نذیر احمد کے بعد اس میدان میں اور بہت سے لوگوں نے قدم رکھا جن میں سرشار، شرر، رسوا اور سجاد حسین سب سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ سرشار کے ناول ایک گٹھے ہوئے مربوط پلاٹ کی کمی کے باوجود اپنے زمانے کی معاشرت کی جاندار تصویریں ہیں۔ خصوصاً "فسانۂ آزاد" ان کا ایسا کارنامہ ہے جس پر اردو ادب فخر کر سکتا ہے۔ شرر نے بے شمار تاریخی اور نیم تاریخی ناول لکھ کر اردو میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ ان کے ناولوں میں اندازِ بیان کی یکسانی اور کردار نگاری کی کمی نے فنی اعتبار سے بڑی کمزوری پیدا کر دی۔ پھر بھی کچھ تو موضوع کی وجہ سے اور کچھ مصنف کی انشاپردازی کے کمال سے انہیں اپنے زمانے میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ سجاد حسین اور رسوا نے اپنے اپنے رنگ میں بڑے عمدہ ناول لکھے۔ خصوصاً رسوا کا "امراؤ جان ادا" تو مبصروں کے نزدیک ہر لحاظ سے ایک مکمل ناول ہے۔

اور اس کے بعد پریم چند اردو ادب کے آسمان پر ایک روشن ستارہ بن کر چمکے۔ انھوں نے مختصر افسانوں کے بیش بہا سرمایہ کے ساتھ ساتھ نئے طرز کے دلچسپ، دلکش اور دل نشین ناولوں سے بھی اردو کے دامن کو مالا مال کیا۔ مانا کہ پریم چند ناول نویسی میں اتنے کامیاب نہیں بنتے افسانہ نگاری میں پھر بھی ان کے ناول فنی اور ادبی خوبیوں سے مالا مال ہیں اور اردو کا بیش قیمت سرمایہ ان کے یہاں گہری جذبات نگاری اور سچی کردار نگاری ہے۔ ان کے زمانے کے سیاسی اور سماجی اور معاشی حالات کی اصلی جھلکیاں، خصوصاً دیہاتی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ انسانی سیرت کی خامیوں اور خوبیوں کا متوازن جائزہ ہے۔ اور ان سب چیزوں میں ان کا فنی خلوص ایسے حسین و دلکش رنگ بھرتا اور ایسا تاثر پیدا کر دیتا ہے کہ وہ قاری کے ذہن پہ اپنا گہرا نقش چھوڑ جاتے ہیں جو کبھی نہیں مٹتے۔

کچھ عرصے تک اردو ناول پر پریم چند کی چھاپ نظر آتی رہی لیکن ان کے پیروؤں میں سے کوئی بھی ان کے پائے کا نہ تھا یہاں تک کہ جدید ترین طرز کے ناول کا دور آیا۔ اس کی تخلیق کا سہرا ترقی پسند گروہ کے سر تھا جو اردو کی ہر صنفِ ادب میں نئے نئے

تجربے کر رہا تھا۔ اس نے اردو کو نئے خیالات، نئے تقاضوں اور نئے زمانے سے روشناس کیا۔

ترقی پسند ادیبوں کا یہ گروہ جن میں سے اکثریت اشتراکی خیال کی تھی۔ ایک طرف اپنا ایک خاص سیاسی اور معاشی نقطۂ نظر رکھتی تھی، اور ادب بھی ایک ذریعہ قرار دیتی تھی۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کا اور ان کی ہر تخلیق پر اسی کی چھاپ دیکھی جا سکتی تھی۔ ساتھ ہی ان کا مغربی ادب کا مطالعہ زیادہ وسیع تھا۔ اور انہوں نے فن کی باریکیوں پر غور کیا تھا۔ اس لئے انہوں نے جو فن پارے تخلیق کئے اس میں تکنیک کی اہمیت کو خاص طور پہ مدنظر رکھا۔ ان کے دور میں جدید طرز کی نظم اور نئے افسانے نے بڑی ترقی کی۔ نئے نئے انداز اور اسلوب سے ادب کو مالا مال کیا۔ کچھ عرصہ تو ایسا معلوم ہوتا رہا کہ وہ ہر صنف ادب پر چھا گئے ہیں۔ چنانچہ ناول نگاری میں بھی ان ہی کا ڈنکا بجنے لگا۔ خصوصاً کرشن چندر کا شکست، عصمت کا ٹیڑھی لکیر اور عزیز احمد کے دو ایک ناول بہت مقبول ہوئے۔ انہوں نے اردو دنیا میں ایک ہلچل مچا دی۔ کرشن چندر کے دل کش اندازِ بیان، ہلکی ہلکی رومانی آنچ میں تپی ہوئی حقیقت نگاری سے ان کا ناول ہر نوجوان کے دل کی دھڑکن بن گیا۔ عصمت کی ٹیڑھی لکیر نے "بورژوا" طبقے کے کھوکھلے پن، گھریلو زندگی کے گھناؤنے پہلوؤں، نفسیاتی الجھنوں اور جنسی ناآسودگی کے مرقعے کچھ اس انداز میں پیش کئے کہ لوگ چونک چونک پڑے۔ اور اس کے ساتھ ان کی زبان کی سادگی، بے ساختگی اور روانی، اندازِ بیان کی شوخی اور تیکھے پن سے پھڑک پھڑک (اور کبھی کبھی بھڑک بھڑک) اٹھے۔ ایوانِ جاگیرداری اور زمینداری کی گرتی ہوئی دیواروں اور اس کے مکینوں کی مسخ ہوتی ہوئی شکلوں کو ان فن کاروں نے اس موثر طریقے سے پیش کیا کہ پڑھنے والے عش عش کرنے لگے۔ اور جدید ناول کے روشن مستقبل کے خواب دیکھنے لگے۔

مگر دیکھتے دیکھتے یہ جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا۔ نہ قاری کے دل میں ایسے ناولوں کو پڑھنے کا شوق باقی رہا نہ فن کار کے دل میں لکھنے کی وہ لگن رہی۔ ان میں سے چوٹی کے ادیبوں نے یا تو ناول لکھنا چھوڑ ہی دیا یا لکھا بھی تو عجب بے دلی سے، تھکے ہوئے انداز میں۔ اس میں وہ جان، وہ تڑپ وہ خلوص نہ تھا جس کی پڑھنے والوں کو تلاش تھی۔ باقی دوسرے درجے کے ادیبوں نے جو ناول لکھے وہ اس سے بھی گھٹیا اور بے رنگ تھے۔

اس کی اور بھی وجوہ ہو سکتی ہیں اور ہیں۔ لیکن ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ زندگی کی یک رخی تصویر بہت دنوں تک لوگوں کو اپیل نہیں کر سکتی۔ مختصر کہانی میں یہ منفی انداز یعنی محض سماج کی خامیوں کا خاکہ اڑانا کامیابی سے نبھ سکتا ہے۔ اس لیے کہ افسانہ زندگی کی ایک سرسری جھلک دکھاتا ہے۔ پوری زندگی کی تصویر کشی کرنے کا دعویدار نہیں۔ اس کے برعکس ناول میں ہم زندگی کی پوری تصویر دیکھنا چاہتے ہیں۔ بلکہ ایک حد تک اس کی بھی توقع رکھتے ہیں کہ وہ ایک برتر اور بہتر زندگی کی نشاندہی کرے۔ صرف زندگی کی تلخیاں، محرومیاں اور آلودگیاں، ظلم و جہالت، وحشت و بربریت کے مرقعے ہمارے ذوقِ نظر کی تسکین نہیں کر سکتے۔ جب تک اس کے ساتھ ساتھ کچھ اس کا اشارہ نہ ہو کہ ہم اس ظلمات کو پار کر کے آبِ حیات تک پہنچ سکتے ہیں، ہم ناول میں جیتے جاگتے چلتے پھرتے کردار، موجودہ زندگی کی حقیقی تصویر بھی چاہتے ہیں اور آنے والے برتر نظامِ حیات کا نقشہ بھی۔ ان ملکوں کے فن کار جہاں اشتراکی نظام قائم ہو چکا ہے۔ برتر اور بلند زندگی کا ایک واضح تصور رکھتے ہیں (اس سے بحث نہیں کہ آپ کو ان سے اتفاق ہے یا اختلاف) اس لیے وہ اپنے ناولوں میں زندگی کے مکمل مرقعے پیش کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے دیس کے اس گروہ کے لکھنے والوں کے ذہن میں خود ہی ابھی یہ پوری طرح صاف نہیں کہ اس انقلاب کے بعد جو وہ لانا چاہتے ہیں زندگی کا کیا نقشہ ہوگا، اس لیے وہ دوسروں کو کیا دکھائیں؟ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس صنفِ ادب سے جس میں مکمل نقشہ کشی کرنی پڑتی ہے منہ پھیر لیا یا لکھا تو بے دلی سے لکھا۔ جس کی وجہ سے گزشتہ دس بارہ سال سے یہ خیال لوگوں میں عام ہونے لگا کہ اردو کا ناول روبہ تنزل ہے۔

لیکن ادب دراصل کسی کی جاگیر نہیں۔ اگر کچھ مشہور ادیبوں نے ناول لکھنا چھوڑ دیا یا ناول نویسی کا پہلا سا معیار قائم نہ رکھ سکے تو آپ یہ کیوں طے کر لیں کہ اُردو ناول پر ہمیشہ کے لیے زوال آگیا اور وہ اب کبھی پنپ نہیں سکتا۔

ذرا تصویر کا دوسرا رخ بھی تو دیکھئے۔

پچھلے پندرہ بیس سال سے دھیرے دھیرے چپکے چپکے ناول نگاروں کا ایک نیا طبقہ ابھرا ہے۔ جس کو اب تک ہمارے نقاد بڑی حد تک نظر انداز کرتے رہے ہیں۔ ان میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو نہ اشتراکی نظام کے پرستار ہیں نہ سامراجی طاقتوں کے مداح۔ نہ وہ قدیم کے دشمن ہیں نہ جدید کے مخالف۔ وہ قدیم اقدار اور پرانی قابل قدر روایات پر بھی نظر رکھتے ہیں اور نئے زمانے کے تقاضوں اور رجحانات سے بھی آگاہ ہیں اور ان دونوں کو سمو کر ایک نئے نظامِ حیات کی تعمیر کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ ان کے ہاں ہمیں ایک مثبت نصب العین کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ وہ سماج کی کمزوریاں اور خامیاں دکھانے سے نہیں چوکتے مگر اسی کے ساتھ اپنی معاشرت کا روشن رُخ بھی پیش کرتے ہیں۔ ان میں اکثر ایسے لوگ ہیں جو ناول کی تکنیک کی باریکیوں سے ناواقف ہیں۔ چونکہ انھوں نے بدیسی زبانوں کے بہترین فن پاروں کا مطالعہ کم کیا ہے، ان کے ہاں وہ رچاؤ، وہ پختگی، وہ فنی مہارت ابھی پیدا نہیں ہوئی جو کسی عظیم شاہکار کو جنم دیتی ہے۔ لیکن ان کمزوریوں کے باوجود ان کے ہاں فن کاری کا وہ خلوص موجود ہے جو ناول کی جان ہے۔ مشاہدے کی گہرائی اور جذبات کی سچائی ان کے کرداروں میں جان ڈال دیتی ہے اور وہ زندگی کی ایک جیتی جاگتی تصویر پیش کرنے میں جو ناول کا اصل جوہر ہے کامیاب ہو جاتے ہیں۔

ان فن کاروں میں، جن کا میں نے اوپر ذکر کیا مرد عورت دونوں شامل ہیں لیکن عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ ناول نگاری فرصت اور اطمینان چاہتی ہے اور آج کی دنیا میں مرد کو فرصت و اطمینان بہت کم نصیب ہوتا ہے۔ مگر کم سے کم ہندوستان میں بہت سی عورتوں کو اب بھی گھروں کی محفوظ چار دیواری میں کسی نہ کسی حد تک یہ انمول نعمت میسّر ہے۔ پھر ہمارا غریب مرد ادیب اس پر مجبور ہے کہ افسانہ نویسی اور ناول نگاری سے اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالے۔ اس لیے بعض وقت اچھے اچھے فن کاروں کو یہ کرنا پڑتا ہے کہ جب ضرورت مجبور کرے تو جلد سے جلد ایک ناول لکھ لکھا کر تیار کر دیں تاکہ اس کا جو قلیل معاوضہ ملے اس سے بال بچوں کا پیٹ بھریں۔ عام طور پر عورت کو ابھی یہ مجبوریاں نہیں۔ وہ ابھی تک لکھنے کو ذریعہ معاش بنانے پر مجبور نہیں۔ یوں بھی اسے دام سے زیادہ کام عزیز ہوتا ہے۔ وہ اسی وقت لکھتی ہے جب اس کے دل کی لگن اُسے لکھنے پر مجبور کر دے۔ پھر جب تک وہ اپنی تحریر سے خود مطمئن نہ ہو جائے ناشر یا اڈیٹر کا اصرار اُسے مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ مقررہ وقت کے اندر مسودہ اس کے حوالے کر دے۔ پھر عورت جس نظر سے زندگی کو دیکھ سکتی ہے ـــــ خاص طور پر گھریلو اور خاندانی زندگی کو جو اس ذات کا محور ہے، جس طرح اس کی باریکیوں، خامیوں اور خوبیوں کا مشاہدہ اور مطالعہ کر سکتی ہے۔ وہ مرد کے بس کی بات نہیں، ساتھ ہی جذبات و احساسات کی شدّت اور گہرائی جو اُسے قدرت نے عطا کی ہے، اس کو یہ صلاحیّت بخشتی ہے کہ وہ ان تاثرات کو کامیابی کے ساتھ پیش کر سکے۔

ہو سکتا ہے کہ آپ یہ سمجھیں کہ میں اپنی صنف کی وکالت میں مبالغہ کر رہی ہوں۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ بعض مرد ادیبوں کے بھی بہت اچھے ناول چھپے ہیں۔ مثلاً ابھی کچھ عرصہ پہلے فضلؔ کا ناول خونِ جگر ہونے تک شائع ہوا۔ اور وہ اردو ادب کے سرمائے میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ اِکا دکا اور بھی اچھے ناول چھپے ہیں جن میں بعض پرانے لکھنے والوں کے اور بعض نئے کے ہیں۔ مگر اس میں

شک نہیں کہ اچھے ناول نگاروں کی صف میں روز بروز مردوں کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے اور عورتوں کی بڑھ رہی ہے۔

مثال کے طور پر میں چند نام ان پرانی اور نئی لکھنے والیوں کے پیش کروں گی جنھوں نے ناول نگاری میں امتیاز حاصل کیا ہے۔ اے۔ آر خاتون، فاطمہ مبین۔ زبیدہ خاتون۔ عائشہ جمال۔ الفت منہاس۔ عذرا جمال وغیرہ وغیرہ۔ حمیدہ سلطان کا ابھی صرف ایک ناول جو بہت پرانا لکھا ہوا ہے سامنے آیا ہے۔ مگر سنا جاتا ہے کہ وہ کوئی اور ناول بھی لکھ رہی ہیں۔ رضیہ ظہیر جو پختہ کار ترقی پسند افسانہ نگار ہ حال ہی میں ناول کی طرف متوجہ ہوئی ہیں اور ان کے دو ناول شائع ہو کر خاصے مقبول ہوئے ہیں۔

قرۃ العین ہماری ان پختہ کار ناول نگاروں میں ہیں جنھیں ہم ترقی پسند گروہ اور اس جدید گروہ دونوں سے وابستہ کر سکتے ہیں۔ ان کا مغربی ادب کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور وہی صرف ایک ایسی ناول نگار عورت ہیں جنھوں نے تکنیک کی باریکیوں کو سمجھا اور برتا ہے۔ ایک خا حلقے میں ان کے ناول خاصے مقبول بھی ہیں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ ان کے ناولوں کے اندازِ بیان اور زبان وغیرہ پر اس قدر مغربیت چھائی ہوئی ہے کہ عام طور پر لوگوں کے لیے ان کا سمجھنا ہی دشوار نہیں ہوتا بلکہ ان سے لطف اندوز بھی نہیں ہو سکتے اور مطلب سمجھنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ ا ثقافی "دور ہو جائے تو وہ موجودہ دور کی بڑی ممتاز ناول نگار بن سکتی ہیں۔"

اردو کے ایک ممتاز نقاد وقار عظیم نے اپنے ایک مضمون عورتوں کے ناول میں بعض ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے جس سے میرے خیالات کی تائید ہوتی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"عورتوں کی ناول نگاری کا اگلا دور تخیل اور تصور پر حقیقت اور صداقت، مقصد پر فن، سادگی پر حسنِ بیان، جذباتی جو اور ولولہ انگیزی پر غور و فکر کی گہرائی و توازن، اور شاعری پر نفسیات کے غلبے کا دور ہے۔ اور اس دور میں ناول نگار خواتین نے اپنی فک وسعت پیدا کر کے کہانیوں کے پس منظر میں زیادہ پھیلاؤ پیدا کیا ہے۔ ان کے مشاہدے اور تخیل نے گھر کی زندگی سے باہر قدم نکال ک معاشرتی زندگی کے پیچیدہ مسائل اور سیاست کے اثرات اور فرد و جماعت کی زندگی کے قریبی تعلق کا احاطہ کر کے اسے اپنی گرف میں لے لیا ہے اور اس لیے رفتہ رفتہ اس دور کے ناولوں نے فنی حیثیت سے ایک ایسا رتبہ حاصل کیا ہے کہ ان کے کارنامے م ناول نگاروں کے لیے رشک کا باعث بنے ہیں۔۔۔۔۔۔۔"

آگے چل کر ایک ناول نگار خاتون کے ناولوں پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے۔ "۔۔۔۔۔ جس چیز کو ہم فنی خلو کہتے ہیں اس کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ فن کار کو اپنے موضوع کے ساتھ دلچسپی، جذباتی تعلق کے علاوہ اس سے پوری واقفیت ہو۔ مشا کی مدد سے اپنے موضوع کی جزئیات کا علم حاصل کرنے کے بعد اس پر غور و فکر، اس کا فنی ڈھانچہ ترتیب دینا، اس کے ڈھانچے کے مختل اجزا میں ربط و تناسب پیدا کرنا، کہانی کو دلچسپ طریقے سے شروع کر کے ایسے مرحلوں سے گزارنا کہ وہ پڑھنے اور سننے والوں کے لیے شوق انگیز بن سکے اور نقطۂ عروج تک پہنچ کر ایک ایسے انجام کی صورت اختیار کر لے جو فکر انگیز بھی ہو اور منطقی بھی۔۔۔۔۔ یہ اج کہانی کے فنی تقاضے ہیں۔ اس فنی تقاضے کی دوسری اہم کڑیاں یہ ہیں کہ قصہ گو کو (اس کی جگہ ناول نگار سمجھیے) واقعات کی اٹھان اور رفتار اور کرداروں کے ارتقا کے باہمی تعلق کا پورا احساس ہو۔ وہ ہر قدم پر اس کا خیال رکھے کہ پلاٹ کی رفتار کے ساتھ سا کردار کا نقش برابر زیادہ واضح ہوتا جارہا ہے اور جوں جوں کردار کی شخصیت زیادہ نمایاں اور واضح ہو رہی ہے، پلاٹ کی دلچسپی، اور تکن اور شوق انگیزی میں اضافہ ہوتا جارہا ہے اور ان چیزوں میں ناول نگار کے بیانات اور کرداروں کے مکالمے برابر کا حصہ لے رہے

یں اور ان کی مدد سے کہانی دلچسپ تر بنتی اور برابر اپنا سفر جاری رکھتی ہے ......" پھر اس کے ناولوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان میں فنی کے یہ مطالبات بھی بوجوہ احسن پورے ہوتے نظر آتے ہیں اور یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ ناول نگار نے اپنے ناولوں کے لیے صرف یسے موضوع اختیار کیے ہیں جو نہ صرف اس کی نظر میں اہم ہیں بلکہ ان کی اہمیت ایک خاص زمانے کے معاشرے کے افراد کے لیے مسلم ہے۔ اس نے اپنے موضوع کے اظہار میں موضوع اور فن دونوں کو پوری طرح سمونے کی کوشش کی ہے ...."

اور آگے چل کر عورتوں کے ناولوں کی مجموعی صفات بیان کرنے کے بعد وہ کہتے ہیں کہ "ان ناولوں کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ نوں نے عہدِ حاضر کی منتشر اور مضطرب زندگی کے لیے ایک ایسی معاشرتی زندگی کا تصور اور ضابطہ پیش کیا ہے۔ جس میں عورت اور مرد ں کر حیاتِ اجتماعی کے لیے سکون و راحت مہیا کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں ......"

اور آخر میں یہ اعتراف بھی کرتے ہیں کہ "فن کے نقطۂ نظر سے عورتوں کے لکھے ہوئے ان قصوں اور ناولوں کا قابلِ رشک امتیاز یہ ہے نھوں نے فن کی سادگی کو جو یقیناً مقصد کے خلوص کی پیدا کی ہوئی ہے، کہانی کا سب سے اہم معیار بنا دیا اور اس طرح ناول نگاری کی تاریخ میں اس یت کو غیر فانی مقام دیا ہے کہ کہانی لکھنے والا اپنے مقصد کے معاملے میں مخلص ہو اور اس مقصد کو کہانی کے انداز میں بیان کرنے کی اہمیت کا س رکھتا ہو تو اس کی کہانی پڑھنے اور سننے والے کے لیے دلکش اور دل نشین ہو جاتی ہے ......"

میں یہ دعوےٰ تو ہرگز نہیں کرتی کہ ان موجودہ لکھنے والوں (جن میں "لکھنے والیوں" کی اکثریت ہے) کے ناول ہر حیثیت سے مکمل یں ان میں خامیاں نہیں ہیں۔ لیکن ان کو دیکھ کر ہمیں یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ ناول کے مستقبل سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اور یہ اُس ید حق ہے کہ یہ فنی کار روز بروز زیادہ ترقی کریں گے اور زندگی کی جو جیتی جاگتی سچی تصویریں یہ پیش کر رہے ہیں ان کا موضوع اس وقت محدود سہی یک ایسا دن بھی آ سکتا ہے جب ان میں آفاقیت پیدا ہو جائے گی۔ ممکن ہے کہ ان ہی میں سے ایک آدھ عظیم فن کار بھی نکل آئے جو ئے، ڈکنس اور بالزاک کی ٹکر کا نہ سہی مگر اپنے رنگ میں نذیر احمد، رسوا اور پریم چند تو بن ہی سکتا ہے۔

عشرت رحمانی

اردو ڈرامہ نگاری کے عروج و زوال کی داستان جو آپ نے چھیڑی ہے وہ طویل بھی ہے اور عریض بھی، اور آپ کا مطالبہ ہے اختصا د اس طول کو ایجاز طلب کر کے عرض کرتا ہوں ـــــ کہ لوگ کہتے ہیں:

"اردو ادب میں ہر صنف کی اپنی ایک روایت، اور اس روایت کے ساتھ ترقی و زوال کی ایک تاریخی حکایت۔ لیکن اردو ڈرامہ نگاری بارے میں ہمارے بعض مغرب زدہ ناقدینِ ادب کا خیال ہے کہ اس کی نہ کوئی روایت ہے نہ تاریخ! کچھ حضرات فرماتے ہیں اگر ہمارے ڈرامے وئی روایت ہے تو وہ "ابسن" اور "برنارڈ شا" سے شروع ہوتی ہے، مگر تاریخ کے شاہد اوراق کو جھٹلانے کی ان میں لیاقت ہے اور یت۔ اس لیے صرف باتوں ہی باتوں میں ٹالنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔

بات اصل میں یہ ہے کہ اردو ڈرامے کی روایت کا آغاز "اندر سبھا" سے ہوا اور اس کی تاریخ ۱۸۵۲ء سے شروع ہو کر ایک دی پرانی ہو چکی ہے۔ لیکن اس سو برس کے طویل عرصہ میں یہ روایت ابتدائی منزلوں سے گزر کر جس بلندی تک پہنچی، وہ عالمی ادب میں اس کی ی کا ہی مقام سمجھا جا سکتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی مختصراً یہ ہے کہ جہاں اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ڈراما اسٹیج اور ادب کے

امتزاج سے تخلیق کے پیکر میں ڈھلتا ہے۔ یہاں اس فنی کلیہ کو بھی تسلیم کرنا لابدی ہے کہ کسی ادب کا ڈراما اپنی قومی عصری زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے اور ڈراما ادب کی وہ عظیم صنف ہے جو بیک وقت موسیقی شاعری اور رقص (اداکاری) فنون لطیفہ کی کئی اصناف کا مرکب ہے۔ اور اس لیے یہ صنف زندگی کے اسرار و رموز کو مؤثر انداز میں انسانی دل و دماغ تک پہنچانے میں دیگر اصنافِ ادب سے زیادہ مؤثر و مفید ثابت ہوتی ہے۔ چونکہ ڈراما اسٹیج کی یکجائی اور حرکت و عمل سے مکمل ہوتا ہے۔ اس لیے بھی اس کے اثرات کا دلوں کی گہرائیوں تک پہنچنا آسان اور بہ تعجیل ممکن ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر ادب میں ڈراما کا مقام جدا اور بلند تسلیم کیا جاتا ہے۔

”آیا اردو ادب میں ڈراما اس مقام تک پہنچ سکا ہے؟ اس سوال کا جواب بآسانی نفی میں ہے۔ اسباب کی تفصیل کیلئے ہماری صد سالہ تاریخ گواہ ہے۔

اردو ڈراما عہد آغاز سے لے کر خاتمہ تک کسی دور کی زندگی کی عکاسی نہ کر سکا اور نہ اس صنف سے اخلاقی و تہذیبی نتائج برآمد کرنے کی سعی کی گئی۔ ابتدا سے ہمارے اسٹیج پر مافوق البشر باتیں اور زندہ کرامات کی گھاتیں اس انداز و قرینہ سے پیش کی جاتی رہیں کہ ہمارے ڈراموں میں شاعری۔ موسیقی اور اداکاری وغیرہ کے تفریحی عناصر بدرجۂ اتم شامل رہے مگر انسانی جذبات کی ترجمانی ممکن نہ ہو سکی اس لیے ہمارا ڈراما دلوں کی گہرائیوں میں گھر کرنے کے لائق نہ بن سکا۔

ہمارے قدیم اسٹیج کے ڈراما نگار اپنی بلندی کی منزلوں میں بھی ایسے ڈرامے پیش نہ کر سکے (یا تو کم علمی کے سبب، وہ ایسا کرنے کے قابل نہ تھے یا تجارتی اغراض کے مدنظر کرنا نہیں چاہتے تھے) جن میں حیات انسانی کی انفرادی کشمکش اور اجتماعی تصادم کی کیفیت سامنے آ سکے۔ بات یہ بھی تھی کہ ہمارے اسٹیجی ڈرامہ نگاروں کی اکثریت کی نگاہیں زندگی کی عام صلاحیتوں سے آگے نہ تھیں وہ حقیقت کی گہرائیوں تک نہ پہنچ سکتی تھیں۔ چنانچہ ان کے ڈراموں کے پلاٹ معمولی معاشرتی اخلاقی اصلاح یا ”عشق و محبت“ کے سطحی تصورات پر مبنی ہوتے تھے اور ان کے کردار، مکالمے اور ڈرامائی تدبیرگری میں زندگی اور فنی حقائق کے نشانات مفقود تھے۔ ان ڈرامہ نگاروں میں اکثر حضرات عالمی ادب میں ڈراما نگاری کی تاریخ اور فنی عظمت کی تاریخ و تاثرات سے بھی نابلد تھے اور اپنے دور کی زندگی کے عصری تقاضوں سے ناآشنا تھے۔ اس لیے ان کے ہاتھوں ہماری ڈرامائی روایت کو آگے بڑھنے میں کوئی مدد نہ ملی۔ اس کے علاوہ ادب آشنا ارباب قلم نے ڈراما نگاری کی طرف سنجیدگی سے توجہ نہ کی۔ مثال کے طور پر مرزا رسوا لکھنوی کے ناول ادبی اور فنی تقاضوں کے لحاظ سے عالمی ادب کی ہم آہنگی کرتے نظر آتے ہیں لیکن ڈراما نگاری کی طرف ان کی معمولی سعی ”لیلیٰ مجنوں“ کی عام اسٹیجی قسم سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اسی طرح احسن لکھنوی اور آغا حشر کاشمیری کے ڈراموں میں شکسپیئر کے پلاٹ اور کردار کے چربے تک بے جان اور بے کیف نظر آتے ہیں۔ کیونکہ ان حضرات کو زندگی کے تخلیقی پیکر تراشنے کا وقوف و درک حاصل نہ تھا۔ وہ صرف تفریحی ضروریات کی تکمیل کو فنی ارتقا سمجھتے رہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا قدیم اسٹیج، آرائش و زیبائش اور اداکاری کے لحاظ سے خاصی بلندی تک پہنچ سکا تھا لیکن ڈراما نگاری کے پست معیار کی بدولت یہ عمارت آسمان سے زمین پر آ رہی، اور بالآخر ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ اسٹیج کے ساتھ قدیم ڈرامہ نگاری کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جدید تعلیم اور تہذیب کے ترقی یافتہ دور میں غیر فطری غزل کی طرح خیالی دنیا کا کھوکھلا اسٹیج اور پست فطرت ڈراما بے وقت کی راگنی بن گیا۔ اگر اس زمانہ میں دیگر اصناف ادب کی طرح ہماری ڈرامہ نگاری میں بھی جدید رجحانات اور تنقیدی شعور کا عمل دخل ہو جاتا۔ تو یہ گرتی ہوئی عمارت منہدم نہ ہوتی۔ مگر بقول شاعر؎

جب دل نہ رہا امید کیسی
جڑ کٹ گئی نخلِ آرزو کی

اسٹیج اور تھیٹر ختم ہوا۔ ڈرامہ نگاری کی طرف توجہ کیوں کی جاتی یا دوسرے الفاظ میں اچھے ڈرامے لکھے جاتے تو اسٹیج کو سدھارنے اور قائم رکھنے میں مدد مل سکتی۔

ہماری فلم سازی نے بہ ظاہر بہت ترقی کی ہے لیکن حقیقت میں نظریں پردۂ سیمیں پر بھی بے جان تصویریں چلتی پھرتی ناچتی گاتی دیکھ کر اپنے اس شعبۂ فن سے بھی مایوس ہی ہوتی ہیں۔ موجودہ فلمی کہانیوں میں بھی سطحی تفریحات کے سامان وافر ملتے ہیں لیکن زندگی اور زندگی کے عام تقاضوں کا عکس بھی نظر نہیں آتا۔ یہ اس فن کا حال ہے جس کی ترقی کا دور ہے تو ڈرامہ نگاری کی پست حالی کا کیا کہنا جس کی زندگی کے آثار ہی نہیں۔ دراصل ڈرامہ صرف چھپنے اور پڑھنے کی چیز نہیں۔ ڈرامے میں برکت اسٹیج کی حرکت میں ہے۔ اس لیے معیاری ڈرامے کی تلاش ہی عبث ہے۔

"پس چہ باید کرد؟"

جدید اسٹیج اور تھیٹر کا احیاء کیونکر ممکن ہوگا؟

معیاری انداز میں اچھے ڈرامے کس طرح اور کون لکھے گا۔ جو تفسیرِ حیات بن کر اُردو ادبیات میں صحیح مقام حاصل کر سکیں؟

دراصل سوال تو یہ ہے جس کا جواب غور و فکر کیلئے پیش کرنا ہے۔

شاعری

جوش ملیح آبادی

تجارتِ اقوال

دورِ عتیق میں کہیں کہیں علوم و افکار کی دو چار، اِکا دُکا، دکانیں تھیں تو ضرور، مگر خریداروں کی اس قدر کمی رہتی تھی کہ دکاندار، دن بھر، مکھیاں مارتے پھرتے تھے۔

البتہ اس کے برعکس اس دور میں روایات و اقوال کو بے حد فروغ حاصل تھا، اس کے بازاروں میں گاہکوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ اور تمام عالم میں بالعموم، اور ایشیا میں بالخصوص تاجرانِ اقوال کو ہر طرح کی سہولتوں اور رعایتوں سے نوازا اور ان کو انکم ٹیکس سے بھی معاف رکھا جاتا تھا۔

یہ تجارت، پورے کرۂ ارض کا احاطہ کیے ہوئے تھی، ہر چند اس زمانے کا بحری و بری سفر نہایت ہی صعوبت انگیز و خطرناک ہوا کرتا تھا، لیکن تاجرانِ اقوال ہمت نہیں ہارتے تھے، اپنے مال کو اونٹوں، خچروں اور بادبانی کشتیوں پر، لاد لاد کر وہ تمام دنیا میں پہنچتے، اور اپنے بھولے بھالے گاہکوں کے ہات مال فروخت کر کر کے کثیر دولت اور وسیع ناموری حاصل کیا کرتے تھے۔

اس بے امنی کے زمانے میں، قافلوں کا لٹ جانا ایک معمولی سی روزمرہ کی بات تھی، لیکن نہیں معلوم کہ کس اندرونی خوف کے باعث، راہزن اور قزاق ان کے مال کو ہات تک نہیں لگاتے تھے۔

اسی کے ساتھ ساتھ ان اقوال فروشوں کی یہ بھی ایک بڑی جیت تھی کہ کوئی حکومت ان کے مال پر کسی قسم کی چنگی، یا ڈیوٹی کا بارِ مطلق نہیں ڈالتی تھی۔ اور حکومتوں کی اس فیاضی کی بنا پر دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں انھوں نے اپنی ایجنسیاں قائم کر کے، ہر خطے میں ان کے جال بچھا دیئے تھے۔

ان پُراسرار سوداگروں کا یہ ایک عجیب ترین "رازِ تجارت" (TRADE SECRET) تھا کہ ہر چند ان کے ایجنٹوں کو یہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ قیمت کے معاملے میں کسی سے کوئی رعایت نہ کریں، لیکن، بڑی شدّت کے ساتھ انھیں یہ تاکید بھی کر دی گئی تھی کہ وہ کچھ ایسے دلنشین و مربیانہ انداز سے کاروبار چلائیں کہ چالاک سے چالاک خریداروں کو بھی اس امر کا معمولی سا گمان بھی نہ ہونے پائے کہ ان سے لین دین کیا جا رہا ہے بلکہ اس کے برعکس وہ اس بات پر ایمان لے آئیں کہ ان سے معاملہ کرنے والے ان کے محسن و راہبر ہیں اور وہ ان پر ہی نہیں ان کی سات پشت پر احسان کر رہے ہیں، ایسا احسان جو اس دنیا میں بھی کام آئے گا، اور مر جانے کے بعد بھی ان

کا ہاٹ بنائے گا۔

اپنے مال کو کسی ایک جماعت تک محدود نہ رکھنے، بلکہ اُسے ہر جماعت اور ہر مکتبِ خیال کے لوگوں میں مقبول بنا دینے کی خاطر اس تجارت کے بانیوں نے تمام صوبوں میں، معمولی ایجنٹوں کے ساتھ ساتھ، چند "شاہ ایجنٹ" بھی مقرر کر دیئے تھے۔

یہ "شاہ ایجنٹ" کسی ایک جماعت کے مجموعۂ اقوال کے ایجنٹ نہیں تھے، بلکہ انھوں نے تمام عالم کے جمیع اقوال کو اپنے گداموں میں بھر لیا تھا، اس لیے ان کی تجارت کی کوٹھیاں بین الاقوامی گاہکوں کا مرکز بن گئی تھیں، اور ان کی شخصیتیں ایک ایسے پاٹ دار سنگم میں تبدیل ہو گئی تھیں، جن کے گھاٹ پر مُوحد و مُشرک، مُفلس و مُنعم، شاہ و گدا، یعنی "شیر" اور "بکری" دونوں پانی پیا کرتے تھے۔

رفتہ رفتہ ان سوداگروں کو وہ حیثیت حاصل ہو گئی، جو، یادش بخیر، کسی زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی (EAST INDIA COMPANY.) کو حاصل تھی، فوج اور پولیس کے تمام بڑے بڑے افسر، حکومت کے تمام مقتدر اعیان، اور یہاں تک کہ خود مطلق العنان و جابر بادشاہ تک ان کے زیرِ اثر آ گئے، اور ان کے مشوروں کی روشنی میں امورِ خسروی کو انجام دینے لگے۔

اب کیا تھا، ان کی "اخلاقی وجاہت" کی پشت پر مادی اقتدار بھی ہات باندھ کر کھڑا ہو گیا، اور وہ سوداگروں کی جماعت سے نکل کر اب "سرکاروں" یعنی بے تاج کے شاہوں میں شمار ہونے لگے۔

اگر دیدہ وری کے ساتھ تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اس کی سطروں کے مابین اور اس کے چھپے ہوئے الفاظ کی پشت پر، بڑی آسانی کے ساتھ، اُس مجرمانہ سازش کے خط و خال کو دیکھا جا سکتا ہے، جس نے "تاجر" و "تاجور" کے مفاد کی خاطر، عامۃُ النّاس کو، اقتدار پرستی، کاہلی، توکُّل، قناعت و معرفتِ دنیا کی لوریاں دے دے کر، اس طرح سُلا دیا تھا کہ تمام ایشیا مُفلسی، کاہلی، جہالت، اوہام پرستی، اور بیماری کے بستر پر پڑا ہوا آج تک کروٹیں لے رہا ہے۔

اسی طرح ایک زمانۂ دراز تک لیل و نہار کا سُرمئی دھارا بہتا رہا —— لیکن آخر کار روحِ اِرتقا کو غیرت آ گئی، اور درد رسیدہ روزگار کی بے شمار کروٹوں نے بسترِ وقت پر جو شکنیں ڈال دی تھیں وہ تلواریں بن بن کر اُبھر آئیں، اور دیکھتے ہی دیکھتے اُن اٹھی ہوئی تلواروں نے تمام مطلق العنان بادشاہوں کے سَر قلم کر کے رکھ دیئے، اور ان کے سَر قلم ہوتے ہی اِن بادشاہوں کے شانوں پر رکھ کر بندوق چلانے والے تاجروں کے بھاری بھر کم اور کلاہ دار عمامے بھی دھڑ سے زمین پر گر پڑے۔

سوداگرانِ اقوال کے واسطے یہ صورتِ حال بہت خطرناک تھی، شاہی جاہ و جلال ان کی پشت سے ہٹ چکا تھا، اور وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ اُنھوں نے درباروں میں جو کھیل کھیلا تھا، اس کی وجہ سے دانش وَروں کی نظروں سے بھی وہ گر چکے ہیں، لیکن داد دینا پڑتی ہے اُن کے حواس کی جمعیت اور ان کی ہمت کے اِستحکام کی کہ انھوں نے اس نازک وقت میں، فرنگیوں کی سی مُسلّمہ ثابت قدمی کے ساتھ، نامُساعد حالات کا مردانہ مقابلہ کرنے پر اپنے کو بہت جلد آمادہ و کمر بستہ کر لیا، اور شاہی کے غروب کے بعد جو جمہوریت طالع ہوئی تھی، اس کو متاثر کرنے کی مُہم کا آغاز کر دیا۔

یہ صحیح ہے کہ تمام جمہوریتوں نے انھیں منہ نہیں لگایا، پھر بھی بعض جمہوریتوں نے، جن کے مزاج میں شاہی بو باس تھی، اپنے نظریات کی تبلیغ اور اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کی خاطر، ان کی سَرپرستی قبول کر لی۔

اس طرف سے مطمئن ہو کر انھوں نے اپنے اقتدار میں توازن و پہنائی پیدا کرنے کی خاطر اپنی ایک ٹریڈ یونین (TRADE UNION)

بھی بنا ڈالی، تاکہ اس قلعے سے بھی، نامساعد حالات پر گولہ باری کی جاسکے۔ ابھی اُن مقتدر و مقدس تاجروں کو اطمینان کی سانس لیے زیادہ مُدت نہیں گزری تھی کہ ایک نیا فتنہ اُٹھ کھڑا ہوا، یعنی ایک دوسرا (پہلے انقلاب سے کہیں زیادہ خطرناک) انقلاب آگیا، خطرناک اس لیے کہ وہ سیاسی نہیں، نشاۃ ثانیہ کا پیدا کردہ ذہنی انقلاب تھا۔

اب ان سوداگروں کے حواس اڑ گئے، اس لیے کہ وہ اچھی طرح یہ دیکھنے لگے کہ ذہنی انقلاب کی تلوار عین ان کی شہ رگ کے سامنے چمک رہی ہے۔

خطرے کو سر پر منڈلاتے دیکھا تو انھوں نے اپنی سرپرست جمہوریت کے ایوانوں میں "المدد، المدد" کے نعرے لگائے۔ اور جمہوریتوں سے جب امداد کا وعدہ لے لیا، تو اپنی ٹریڈ یونین کی مدد سے انھوں نے اس نئے انقلاب کے خلاف مکروہ الفاظ کو ترتیب دے کر ایسے ایسے نعرے تراشے جو عوام کے دلوں میں اس کی نفرت پیدا کرسکتے تھے، اور انھوں نے پیشہ ور قلموں کو خرید کر مطابع و منبر اور مجلس و محراب سے ذہنی انقلاب کے قلعوں پر آگ برسانے کے واسطے تمام آتش فشاں پہاڑوں کے دہانوں کو اُس کی طرف موڑ دیا۔

لیکن جب انھوں نے یہ دیکھا کہ اس تمام شور و غل اور اس تمام سب و شتم کے باوجود جدید خیالات اور عمیق افکار کے کارخانوں کا ڈھلا ہوا مال، اِدھر اُدھر بازاروں میں آنے اور ملکوں میں پھیلنے لگا تو انھوں نے اپنے زیرِ اثر ملکوں کے تمام نشرِ علوم کے چنگی خانوں، اور مبادلۂ افکار کی تمام بڑی بڑی بندرگاہوں پر زبردست پہرے بٹھا دیئے کہ دانش کدوں کے مال کی درآمد و برآمد پر کڑی نگاہ رکھی جائے، زبردست نگرانی کی جائے، خیالات و افکار کے مال کو کہیں اترنے نہ دیا جائے، ناگزیر حالات کی بنا پر مال اُتر آئے، تو، آنکھ بچا کر، اُسے جلا ڈالا جائے، یہ بھی نہ ہوسکے تو اس پر پچیس ہزار فی صدی چنگی اور ڈیوٹی لگادی جائے اور اُن گماشتوں کو یہ مخفی ہدایت بھی کی گئی کہ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس گھات میں بھی لگے رہیں کہ مُبلغانِ افکارِ نو پر شرمناک جرائم، یا بغاوت کی تہمت لگا کر انھیں جیلوں میں بند کرادیں، اور سب سے اچھا تو ہے کہ، رگ پٹھے کو بچاتے ہوئے، بن پڑے تو انھیں ایسی چابک دستی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیں کہ دُنیا کو یہ کہہ کر، —— آسانی کے ساتھ، دھوکا دیا جاسکے کہ "بعض نامعلوم اسباب" کی بناء پر، ان دیوانوں کی پوری جماعت نے مجموعی خودکشی کرلی ہے۔

دورِ گذشتہ کا ادب

سو بندہ پرور اس پس منظر کی منزلِ اول میں، جب کہ "تاجر" و "تاجور" کی سازش نقطۂ عروج پر تھی، اور زندگی کے تنگ سے تنگ کوچوں میں بھی اقوال کی شہنائیاں بج رہی تھیں، آپ کا اردو ادب معرضِ وجود میں آیا تھا۔

ظاہر ہے کہ ایک ایسے تاریک پس منظر کے بطن سے جو اُدب پیدا ہوگا، اس کے خال و خط کیسے ہوں گے۔ اور ایک ایسے رُوندے ہوئے معاشرے سے جو ادیب اٹھیں گے، ان کا لہجہ کیا ہوگا۔

نباضانِ ادب کو اس کا احساس، اعتراف اور قلق ہے کہ اس دورِ قدیم کا ادب محض ایک لفنگا اور لُقّا ادب ہے، اور ہمارا تقریباً تمام نثری و شعری سرمایہ، اُس جنس آلودہ، افلاس دریدہ، اقوال جنبیدہ، روایات سوختہ، اور اوہام گزیدہ علیل معاشرے کا پروردۂ و تربیت دادہ ہے، جس کے تاریک ایوانِ دماغ میں روشنی اور ہوا کے داخلے کو حرام قرار دے دیا گیا تھا، اور اُس کے ساتھ ساتھ ہمارا ادب صدیوں کے جسمانی و ذہنی مریض اُمراء و سلاطین کے اُن خوشامد خواہ، قصیدہ طلب، مسخرگی آموز، اور عیاشی افروز اوچھے درباروں کا

ساختہ و پرداختہ ہے، جن کی بظاہر بلند و بباطن پست زرّیں چھتوں کے نیچے انسانی جودتِ طبع کو فشار دیا جاتا، اور خودداری و عزتِ نفس کو برہنہ ہو کر ناچنے پر مجبور کر دیا جاتا تھا۔

ہمارا اُس دَور کا نثری سرمایہ اس قدر کم، اور علمی نقطہ نظر سے، اس قدر مبتذل ہے کہ اس کی طرف اشارہ کرنے سے بھی شرم آتی ہے اور ہمارے گُل و بلبل، شمع و پروانہ، خنجر و ناوک، آشیانہ و قفس، اور برق و صیاد کے طواف کرنے والے شعری دائرے میں فرضی طوائفوں کے کوٹھوں، فرضی وصل کی سرمستیوں اور فرضی ہجر کی چیرہ دستیوں کی اس قدر تھکا دینے والی ریل پیل ہے کہ اُن جھوٹے کاغذی پھولوں کے، بسیلے ہوئے، تہ خانے میں اُترتے ہی ذوقِ ادب کی فضا میں ایک ایسا گلا روندھ دینے والا حبسِ عظیم محسوس ہوتا ہے کہ کن پٹیوں کی رگوں میں چھریاں سی چبھنے لگتی ہیں۔ ہمارے ادب نے کم سے کم بانوے فی صدی محض وضعداری، اور فیشن کے طور پر، اتنے بے پایاں جھوٹے آنسو بہلائے ہیں کہ اگر اس کے صرف ایک دیوان کے آنسوؤں کو نچوڑ لیا جائے تو تمام دنیا کے تمام ادبی کتب خانے اس کے ایک گوشے میں غرق ہو کر رہ جائیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے شعری عالم میں سچے عشق اور حقیقی زندگی کا ایک آدھ ذرّہ کبھی کبھی ضرور جھلک اُٹھتا ہے، اور تلاش کیجیے تو کوئی ایک آدھ جیتا جاگتا، سچ مچ کا معشوق بھی نظر آ جاتا ہے، اور اسی کے دوش بدوش بعض ایسے آبدار شعر بھی مل جاتے ہیں کہ آج کا اعلیٰ ذوقِ ادب تک اُن پہ سر دھننے لگتا ہے، لیکن یہ سب کچھ اس قدر قلیل ہے جیسے آٹے میں نمک، —— یا سینکڑوں میل پھیلے ہوئے ریگستان کے کسی مختصر سے گوشے میں سبزہ زار کی لہک، یا پرانے مجرم کے سینے میں ضمیر کی کھٹک۔

فرنگی کے دَورِ عروج کا ادب

اس اخلاقی اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ اگر شیطان کا مطالبہ بھی جائز ہے تو اسے بھی رَد نہ کرنا چاہیئے، ہم اپنے کو اس امر کے اعتراف پر مجبور پاتے ہیں کہ ہرچند فرنگی کے دَورِ غلامی نے ہمارے بعض اعلیٰ اصولِ حیات اور بعض اعلیٰ اقدار کو مجروح کر کے خود ہماری نظروں سے تقریباً گرا دیا تھا، لیکن اس کے باوجود ہم اس لحاظ سے اس کے شکر گزار ہیں کہ، زندگی کے تمام دیگر اہم شعبوں کے ساتھ ساتھ، اُس نے ادب پر بھی اس قدر روشنی ڈالی کہ ہماری آنکھیں کُھل گئیں، اور ادب کی پہنائی و عظمت کا ہم کو، ایک بڑی حد تک اندازہ ہو گیا اور فرنگی کی بخشی ہوئی اُس ادب آگاہی کے باعث ہم نے یہ ارادہ کر لیا کہ ہم اپنے ادب کے سینے کو چوڑا کر کے اُسے دنیا کے عظیم ادبیات کے پہلو میں بٹھا دیں گے۔

چنانچہ اس مقصد کے حصول کی خاطر ہم نے اپنے ادب کے چہرے پر نیا غازہ لگایا، اُسے نئی کاٹ کا خلعت پہنایا، اس کو نیا لہجہ بخشا، اس کی طرفِ کُلاہ میں جواہر جڑے، اس کے میدان کو وسعت دی، اس کے قامت کو درازی عطا کی، اور اس کے پرانے تلمیحات و علامات کو نئے معنی سے مزّین کر دیا۔

لیکن پھر بھی ہم اس کی عمارت کو قطعی طور پر صحیح اور حقیقی بنیادوں پہ قائم کر دینے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ ہم نے ساغر تو نئے بنا لیے، لیکن اُن میں شراب وہی پرانی اور کچی بھری رہی، اور ہمارے ادب کی پیشانی پر اقوال و روایات کی جو چھاپ لگی ہوئی تھی، اس پہ نیا رنگ تو ہم نے ضرور چڑھا دیا، لیکن اس چھاپ کے نشان کو ہم مٹا نہیں سکے۔ جو لوگ ادب ناسنج تھے۔ انھوں نے ہماری اس دور کی "عروسِ ادب"

کی جانب جب نگاہ اٹھائی تو اس کے نئے عروسی جوڑے اور اس کے نئے نئے گہنوں کو دیکھ کر وہ اس دھوکے میں پڑ گئے، کہ وہ کوئی نئی نویلی ہے، لیکن اہلِ نظر نے جب اُس کی طرف نگاہ اٹھائی تو کہنے لگے ارے یہ تو وہی جانی پہچانی ڈھڈو ہے، جو دادا میاں کے جلسۂ روایات و اقوال میں ناچا کرتی تھی۔

فرنگی کے دورِ زوال کا ادب

فرنگی کے دورِ زوال تک آتے آتے دنیا بہت کچھ بدل چکی تھی، اب علم و ادب اور فنِ انتقاد کے گداموں میں بہت زیادہ مال آچکا تھا، اور کتابوں، رسالوں اور اخباروں کی صورت میں علم و ادب کے پیغام بَر ہم تک روزانہ پہنچنے لگے تھے، اور انگریزی علم و ادب کے ساتھ ساتھ، دنیا کے وہ تمام تصانیف بھی ہمارے سامنے آ گئے تھے، جن کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا تھا، اور اس وقت تک فلسفے اور سائنس کی جو رفتار تھی، اُس سے بھی قدم ملانے کی ہم سعی کرنے لگے تھے۔

ابھی ہم اس دور سے گزر ہی رہے تھے کہ آل انڈیا نیشنل کانگریس پر، نام خدا، جوانی آ گئی، ہم نے اُس کے ماتھے پر حُبِّ وطن کا دمکتا ہوا ٹیکا دیکھا، اور وہ ہمیں اس قدر بھایا کہ اُس ٹیکے کی دمک ہمارے ادب کی رگوں میں خونِ تازہ بن کر گردش کرنے لگی۔ اور، اربابِ سیاست کے دوش بدوش، ہمارے ادیب، انگریز سے لڑنے کی خاطر، میدانِ جنگ میں کود پڑے۔

کانگریس نے ہمارے ادب کو صرف حُبِّ وطن اور جذبۂ آزادی ہی کی دولت نہیں بخشی، اس نے ہمیں وطن کا بھرپور شعور بھی عطا کیا اور ہمارے ادیبوں کو وطن کے تمام ذہنی و مادی معاملات و مسائل، اور جملہ مناظر و مظاہر سے بھی آشنا و مانوس کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب زندگی میں پہلی بار سمجھی، بوجھی، اور محسوس کی ہوئی باتیں، ادب کا جزو بننے لگیں، اور حرارتِ جذبات و وسعتِ معلومات کی بنا پر، ہم اس دھن میں لگ گئے کہ اپنے ادب کو نئی بنیادوں پر تعمیر کریں، لیکن یہ تعمیر ابھی مشکل کمر کمر بلند ہوئی تھی کہ ہندوستان کو تقسیم کر کے آزاد کر دیا گیا۔

آزادی کے بعد کا ادب

سب سے پہلے میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ صرف اردو ادب پر ہی نہیں، تمام کرۂ ارض کے ادب اور بالخصوص شعری ادب پر آج کل ایک سخت جمود طاری ہے، لیکن یہ مضمون چونکہ اردو ادب پر ہے، اس لیے اردو پر جو جمود طاری ہے، اس کے اسباب یہ ہیں کہ۔

(۱) جب آزادی آئی تو عین اپنے پیچھے پیچھے ہولناک بربادی کو بھی لگا لائی، بالکل اسی طرح جیسے کوئی عید کا چاند دیکھ کر خوش خوش گھر میں آئے، اور گھر آتے ہی اپنے اکلوتے بیٹے کو مردہ پائے۔

آزادی کے حاصل ہوتے ہی، "چلی سمتِ غیب سے وہ ہوا" کے مانند، دیکھتے ہی دیکھتے پاگل پن کی ایسی ہولناک آندھی آ گئی کہ انسانوں کے سر، دھڑا دھڑ، زمین پر گرنے لگے، اور لاکھوں لاشیں گلیوں میں تڑپنے لگیں۔

ہوا میں دفعتہً اس قدر سمیت آ گئی کہ کیا ہندو، کیا مسلمان، سب کے سب، ایک بڑے پیمانے پر، بورانے ہو گئے، آنکھیں اُبل آئیں، بال کھڑے ہو گئے، اور منہ سے جھاگ نکلنے لگے۔ (دیکھو دھرتی بھئی (ہو گئی) بورانی۔ بابا۔ دھرتی بھئی بورانی)۔

ہندوستان و پاکستان کی زمین پر خون کی ندیاں بہا دی گئیں، عبادت گاہوں اور مکانوں میں آگ لگا دی گئی، عورتوں کی عصمتوں

کو لوٹ لیا گیا، بوڑھوں، بچوں اور بیماروں تک کو تہ تیغ کر دیا گیا، ایشیا کی تاریخی و مسلّمہ حمیت، غیرت، بُردباری، اور شرافت کو، چوراہوں پر ننگا کر کے، فرنگی کے کلیجے میں ٹھنڈک ڈال دی گئی، اور مُسلم و ہندو، کی ناک کو، جڑ سے کاٹ کر، دور پھینک دیا گیا۔

جو قتل سے بچ گئے، وہ، بیک بینی و دو گوش بھاگ کھڑے ہوئے، پاکستانی ہندو، اپنے بھائیوں کے ملک یعنی ہندوستان چلے گئے، اور ہندوستانی مسلمان اپنے برادرانِ ملی کے ملک یعنی پاکستان چلے آئے۔ کھاری پانی کی مچھلیاں، میٹھے اور میٹھے پانی کی مچھلیاں کھاری پانی میں جھونک دی گئیں، میٹھے پانی نے اِن پر پھنکار کر منہ مارا، کھاری پانی نے اُن کو اچھل کر ڈس لیا۔

ہندو اور مسلمان دونوں اپنے بھائیوں کی طرف اس امید پر بھاگ کر آئے تھے کہ وہ دوڑ کر انھیں کلیجے سے لگائیں گے، خود دھوپ میں بیٹھیں گے، اُنھیں چھاؤں میں بٹھائیں گے، مگر پناہ طلب ہندوؤں اور مسلمانوں کے دل سے، یہ دیکھ کر، خون کی بوندیں ٹپکنے لگیں کہ ان کے بھائیوں نے پھیکے تبسم سے بھی اُن کا استقبال نہیں کیا، بلکہ انھیں دیکھتے ہی وہ دانت نکال نکال کر اُن پر اُسی طرح خوخیانے لگے جس طرح کسی بھالو کو دیکھتے ہی محلے بھر کے کُتے، یکجا ہو کر، اُس پر بھونکنے لگتے ہیں۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر ہندوستان سے آنے والوں نے دل ہی دل میں کہا کہ اللہ اکبر ہم تو اپنے کنبوں کو کٹوا کر، اپنی آب رو کو لُٹوا کر، اپنے گھروں کو تج کر، اور ملک کو بٹوا کر، دولت پاکستان کو، اپنے سروں پر، اتنی دور سے، لاد کر یہاں لائے ہیں، لیکن ہم نے جب وہ دولت اِن بھائیوں کے قدموں پر لا کر ڈال دی ہے، تو یہ لوگ، احسان ماننا، اور شکریہ ادا کرنا تو بڑی چیز ہے، اُلٹے ہمارے مُنہ پر تھوک رہے ہیں؛ ہمیں برا بھلا کہہ رہے ہیں، اور ہمیں ایسی تیکھی اور خوف آمیز نظروں سے دیکھ رہے ہیں، جیسے ہم چور ہیں، اور آنکھ بچا کر، ان کے خزانے میں در آئے ہیں۔

لو وہ بھی کہہ رہے ہیں یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتے تو آگ لگاتے نہ گھر کو ہم

اسی کے دوش بدوش، اُن گندی اور آدمی کو خود اپنی نظر سے گرا دینے والی جھونپڑیوں میں رہنے والے ان انسانوں کے ساتھ، دونوں ملکوں کی شفیق حکومتوں نے بھی کچھ ایسا دل توڑ دینے والا برتاؤ کیا کہ ان بے چاروں کے سینوں میں یہ آرزو مچلنے لگی کہ کاش ہم اپنے وطن میں اپنے دشمنوں کے ہات قتل ہو جاتے، مگر یہاں نہ آتے۔

ان، اور اس قسم کے دیگر شرمناک حالات نے اس قدر مفلسی پیدا کر دی وہاں کے ہندوؤں، اور یہاں مسلمانوں کی نیتوں میں فتور پڑ گیا، اُن کے خاندانی مزاج کے شیشے پاش پاش ہو گئے، ان کے اخلاق کے مُنہ سے بو آنے لگی، اور ان کی خودداری و عزتِ نفس اور غیرت و حمیت کی رگ سے خون کا فوارہ جاری ہو گیا۔

جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ وہ نیک لوگ بھی جو کبھی جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ بات بات پر لاکھوں جھوٹے قرآن اور گنگا جل اٹھانے اور جعلی دستاویزیں بنانے لگے، اور ان کی شریف بہو بیٹیاں، جنھوں نے گھر کی چار دیواری سے قدم نکالنے کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا، گلی گلی ماری ماری پھرنے اور ٹکے ٹکے پر اپنے جسم فروخت کرنے لگیں۔

اور اس صورتِ حال کا بدترین عبرتناک پہلو یہ ہے کہ جب ہندو اور مسلمان مردوں نے اپنی بہو بیٹیوں کی اس روش کو بھانپ لیا تو صرف اتنا کیا کہ انھوں نے گھبرا کر آسمان کو دیکھا، آنکھیں بند کر لیں، اور زہر کا سا گھونٹ پی کر چپ ہو رہے اس لیے کہ انھوں نے

سوچا کہ اس کاروبار کو روک دیں گے تو پھر کھائیں گے کیا۔

احتیاج است، احتیاج است، احتیاج

ان موت سے بھی تلخ تر حالات میں کیونکر ممکن تھا کہ ہندوپاک کے بے چارے ادیب، منڈلاتی ہوئی بھوکوں، گرجتی ہوئی رسوائیوں، جلتی، ٹھٹرتی اور ٹپکتی ہوئی جھونپڑیوں، ٹوٹی ہوئی امیدوں، سلگتی ہوئی تمناؤں، کڑھتے ہوئے بھائی بہنوں، سسکتی ہوئی ماؤں، ایڑیاں رگڑتے ہوئے باپوں، بلکتے ہوئے بچوں، کتراتی ہوئی حکومتوں، اور گالیاں دیتے ہوئے میزبانوں کے حلقۂ خارستان میں پلتھی مار کر بیٹھ جاتے "اور دم بخود رہ جانے" کے عوض، ادب کے ساز اٹھا کر گانا شروع کر دیتے۔ اب رہے مقامی ادیب جو "گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا" کی ذیل میں آتے ہیں، ان پر یہ بلا نازل ہو گئی کہ باہر سے آجانے والوں کی بنا پر چیزوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں، ہزار روپے ماہانہ کی آمدنی والا بھی اس قابل نہیں رہا کہ اُلٹے تنکے سے رہنا تو بڑی چیز ہے، دونوں وقت گوشت تک کھا سکے، تو وہ سب لوگ، دانت پیس پیس کر، کہنے لگے کہ ہمارے ادب کی "سول ایجنسیاں" ختم کرنے، گرانی کے لانے اور ہم سے ذہنی و مادی حصہ بٹانے والے یہ روسیاہ سوتیلے بھائی کہاں سے آکر ٹپک پڑے، اور اس وجہ سے مقامی ادیب بھی ان حالات سے کچھ اس قدر سٹ پٹا گئے کہ، ایک دم سے، دم سادھ کر بیٹھ گئے، اور خرابۂ ادب میں ایک عبرتناک سناٹا بولنے لگا۔

اس سناٹے کے درمیان کبھی کبھی پردیسیوں کے دردناک گیت گونجنے لگے، جن میں راہبروں کو راہزن، آزادی کو "زنجیر" بہاروں کو "خزاں" اور صبحوں کو "شبِ تار" کہہ کر دل کی بھڑاس نکالی جاتی تھی، لیکن ذلتوں کے تواتر، اور بے روزگاریوں کے تسلسل نے اس دردناک ادب کا بھی، چند روز کے بعد، گلا گھونٹ دیا، اور قصرِ ادب بھائیں بھائیں کرنے لگا۔

(۲) ادبی جمود کی دوسری وجہ یہ ہے کہ جس تہذیب، ثقافت اور اردو کو، ہندوؤں کی چیرہ دستیوں سے بچا کر، اس لیے پاکستان لایا گیا تھا کہ اسے جی بھر کر یہاں پروان چڑھایا جائے گا، جب وہ تہذیب، ثقافت اور اردو یہاں آئی تو انھوں نے یہ دیکھا کہ اس کی ناک بڑی کاٹ ڈالی گئی ہے اور اس عمل سے یہ ثابت کر دیا گیا ہے کہ تہذیب، ثقافت اور اردو کے نعرے تو عوام میں جوش پیدا کرنے اور ان کے جوش کے بل بوتے پر ملک کو تقسیم کرانے کے لیے ایجاد کیے گئے تھے، بانیوں کا مقصد تو کچھ اور ہی تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے یہ تماشہ بھی دیکھا کہ اردو کی سرکاری دفتروں میں کوئی پرسش نہیں ہے، انگریزی اخباروں کو عزت اور اردو اخباروں کو ذلت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، انگریزی کتابیں پڑھی جاتی ہیں، اردو کتابیں پڑھی نہیں جاتیں، انگریزی فلمیں چلتی ہیں، اردو فلمیں ٹھپ ہو کر رہ جاتی ہیں، عمّالِ حکومت اور اعیانِ شہر اپنے دوستوں اور قرابت داروں سے بھی انگریزی ہی میں باتیں کرنے میں اپنے کو باون گز کا خیال کرتے ہیں، لیکن اردو میں لب کشائی کرتے وقت انھیں اپنا قد چھوٹا نظر آنے لگتا ہے، سرکاری اور غیر سرکاری اکابرِ ملک نے اپنے اپنے ناموں کے ساتھ انگریزی حروف کے سابقے لگا رکھے ہیں، کوئی "وائی، ڈی، عباس" ہیں، کوئی "جے سی قلندری" ہیں، کوئی "ڈبلیو، زیڈ اصفہانی" ہیں، اور کوئی صاحب ہیں "ٹی بی انصاری"۔

اور اس کے ساتھ، بڑی تشویش کے ساتھ انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہاں تو اردو کے مقابلے کے لیے، لے دے کر، صرف ایک ہندی تھی، لیکن یہاں تو پانچ چھ زبانیں، ڈنڈ پیل کر، اردو زبان سے کشتی لڑنے کی خاطر، لنگوٹ کس چکی ہیں تو ان کے ذوقِ تخلیق کا دل ٹوٹ گیا، اور نبضیں چھوٹ گئیں۔

(۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ سرکار دربار میں ادیبوں کی کوئی پرسش نہیں ہوتی ہے کسی چھوٹی بڑی تقریب میں انھیں مدعو نہیں کیا جاتا ہے، ذلت کی حد یہ ہے کہ ان کو صحافیوں کے برابر بھی نہیں مانا جاتا، اور اُن کے ساتھ جو رعائتیں روا رکھی گئی ہیں، انھیں ان سے بھی محروم رکھا جاتا ہے، نہ ان کے واسطے کوئی خاص کالونی آباد کی گئی ہے، نہ ان کو شائستہ مکان ہی دیئے گئے ہیں، نہ ان کے واسطے کوئی ادبی کتبخانہ ہی قائم کیا گیا ہے، اور جب تک ان کے ہات پاؤں چلتے رہیں، انھیں کوئی معقول وظیفہ نہ دے کر اس بات پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ ادب کی تخلیق کے عوض، روٹی پیدا کرنے میں اپنا وقت ضائع کرتے پھریں، نہ ان کے تصانیف کی طباعت و اشاعت کا کوئی بندوبست ہے، نہ وہ دیگر ممالک ہی میں روانہ کیے جاتے ہیں، نہ ان کے مجموعوں کے تراجم ہی کا کوئی انتظام ہے، نہ ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت اور معالجے ہی کی کوئی پروا ہے، اس لیے انھوں نے جب یہ بگڑا ہوا کھیل دیکھا تو تخلیق ادب سے ان کا دل سرد ہو کر رہ گیا۔

(تمام ادیب موجودہ دور کی حکومت کے شکرگزار ہیں کہ اس نے از کار رفتہ ادیبوں اور انکی موت کے بعد انکے ورثا کے وظائف کی بجٹ میں گنجائش رکھی ہے، لیکن جس وسیع تر توجہ کی ضرورت ہے، ابھی تک ادیبوں کے حال اور ان کے مسائل کی جانب وہ توجہ مبذول نہیں کی جا رہی ہے، اسی کے ساتھ ساتھ پاکستان میں جو "رائٹرز گلڈ" کی بنیاد ڈالی گئی ہے، ہر چند یہ تحریک نہایت ہی حوصلہ افزا اور قابل داد ہے، لیکن ہنوز اس میں وہ استواری نہیں آسکی ہے کہ وہ تمام ارباب قلم کے مسائل کو حل کر سکے)۔

(۴) چوتھی وجہ یہ ہے کہ چونکہ ہندوستانی و پاکستانی، دونوں ایک نہایت ہی پست قوم کے افراد ہیں، اس لیے دنیا کی بلند مرتبت قوموں کے مانند اُن میں علم ہے نہ حلم، نظر ہے، نہ خبر، ذکاوت ہے نہ شرافت، قدر دانی ہے نہ جوہر شناسی۔

ظاہر ہے کہ جو قوم خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس قدر گھٹیا ہوتی ہے، اس کے ادیب بھی گھٹیا اور چھوٹے بھیا ہوتے ہیں، اور چھوٹے بھیئے اُدبا کی ایک نہایت ہی نمایاں خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ یہی نہیں کہ وہ کسی ادیب کو اپنا ہم پایہ نہیں سمجھتے، بلکہ وہ اپنے علاوہ کسی کو حقیقی ادیب ہی تسلیم نہیں کرتے یا کم سے کم ان میں ہر فرد اپنے کو "لنکا کا باون گز" والا سمجھتا ہے، اور دوسروں کو فقط بالشتیا، اور انا کی یہی وہ بیماری ہے جس کے باعث شہر ادب کے ہر "باورچی ٹولے" کا ادیب، اپنے کو کم سے کم نعمت خان عالی خیال کرتا ہے۔

اور جب ان "نعمت خانوں" کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلاں ادیب اُبھر رہا ہے اور اس کی مقبولیت کا میدان وسیع تر ہو رہا ہے، تو یہ سب کے سب انگاروں پر لوٹنے لگتے ہیں، ان کی نیندیں حرام ہو جاتی ہیں، ان کے منہ کا مزا کھٹا ہو جاتا ہے، اور پھر یہ تمام لوگ چشم و ابرو، زبان و قلم اور مطبع و مجلس سے اُس اُبھرتے ہوئے ادیب پر، ایک دم سے، حملہ آور ہو جاتے ہیں، اور اس کے ادب پر ایسے چھچھورے الفاظ کے تیر مارتے، اس کی شخصیت پر ایسے شرمناک بُہتان تراشتے، معاشرے کو اُس کے خلاف بے سر و پا افسانوں کی معرفت نفرت دلاتے، اور اس کے خلاف ایسی "خطرناک اقدامات" کی جھوٹی رپوٹیں درج کرا کے حکومت کو اس کے خلاف بھڑکاتے ہیں جن کا شریف قوموں کے ادیب تصور بھی نہیں کر سکتے۔

وہ اس پروپیگنڈے میں یہاں تک غلو کرتے ہیں کہ دوڑ دوڑ کر، اُن مخصوص محلوں میں جاتے ہیں جہاں "حضرت بدبو، شاہ مجذوب" کے ماننے والوں کی اکثریت رہتی ہے، اور وہاں وہ اس اُبھرتے ہوئے ادیب کی "بداخلاقیوں" اور "بداعتقادیوں" کی داستانیں سنانے کے بعد یکایک اپنے گلے کی رگوں کو، مصنوعی غیظ و غضب سے، پھلا کر آخر میں یہ بھی کہتے ہیں اور تو اور کل اُس

مردودِ اعظم نے ہمارے سامنے حضرت بدھو شاہ مجذوب کو بھی گالیاں دی تھیں۔

ہندوستانی و پاکستانی ادب کی ایک دوسری بدبختی یہ بھی ہے کہ ان دونوں بدقسمت ملکوں میں صوبوں کی نفرت اس قدر پھیلی ہوئی ہے کہ ایک صوبے کا ادیب دوسرے صوبے کے ادیب کا سر اتار لینا چاہتا ہے۔ لیکن ہندوستان کا وہ صوبہ جس کو پہلے یو۔ پی کہتے تھے، اور اب وہ "اُتر پردیش" کے گنوارو نام سے پکارا جاتا ہے، ہندوستان و پاکستان کے تمام صوبوں میں ایک نہایت ہی عجیب صوبہ ہے۔ یہ وہ صوبہ ہے جس کو تہذیب و تخیل کے لحاظ سے، غیر منقسم ہندوستان کی ناک سمجھا جاتا تھا، اور مہابھارت میں بھی اُس کے باشندے، فخر کے ساتھ، یہ بات کہتے نظر آتے ہیں کہ ہمارا پوچھنا کیا، ہم تو اُودھ کے رہنے والے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس صوبے اور بالخصوص اودھ کی تہذیب و تخیل، اور وہاں کے باشندوں کی فطانت و ذہانت بے نظیر تھی، لیکن یہی نعمتیں "اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شدی" کے طور پر اس کے حق میں بالآخر زہر بن گئیں۔ بات یہ ہے کہ جب تخیل وسیع ہوتی ہے تو آدمی کاہل ہو جاتا ہے، اور کاہل ہوتا ہے تو عمل کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ اس قانونِ قدرت، نیز دیگر آسائشوں کی بدولت یہ صوبہ روز بروز عمل سے دور ہوتا گیا، اور آخر کار کاہلی کے مرض میں گرفتار ہو کر اس کے ہاتھ پاؤں شل ہو کر رہ گئے، لیکن قدرت کے قانونِ تلافی و تاوان کے تحت اس کی زبان بے حد تگڑی ہو گئی، اور لطیفہ و طنز کاری کا تاج اس کے سر پر جگمگانے لگا۔ اس کی لطیفہ گوئی کو تو رفتہ رفتہ اس کی زبردست کاہلی کی پیدا کردہ مفلسی نے تقریباً مرجھا کر رکھ دیا، لیکن اس کے طنز کا ڈنک زیادہ لانبا ہو گیا، اور جب یہ دھارا اس کے ادیبوں تک پہنچا تو صرف یہی نہیں کہ وہ تمام صوبوں کے ادیبوں کو بری طرح مجروح کرنے لگے، بلکہ اپنی اس فوج پر حملہ آور ہو جانے والے ان ہاتھیوں نے پلٹ کر، خود اپنے ادیبوں کو بھی کچلنا شروع کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ان طنز باریوں سے غیر منقسم ہند کے تمام صوبوں کے بہت سے ادیب مُرجھا گئے، اور خود اِس صوبے کے بھی اُن ادیبوں کی نبضیں چھوٹ گئیں جن کی طاقتِ اندفاع غیر معمولی نہیں تھی۔

(۵) پانچویں وجہ یہ ہے کہ جن جذباتِ نفرت و محبت کے دھاروں پر ادب کا سفینہ چلا کرتا تھا، سیاسی و معاشرتی حالات کے تغیرؔ اور ذہنی ارتقا کے پیدا کردہ جذباتی اختلاط کے باعث وہ دھارے اب تقریباً پایاب ہو چکے ہیں۔ پہلے جذبۂ نفرت ہی کو دیکھئے، دیگر جذبات کے مانند ہمارا جذبۂ نفرت، بھی پہلی سی شدت کھو چکا ہے، اور اس کے ساتھ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارا ملک اب آزاد ہو چکا ہے، فرنگی سات سمندر پار جا چکا ہے، اور کوئی حریف بھی اس وقت ہمارے ملک پر حملہ آور نہیں ہے تو ہمیں اس کا کوئی موقع نظر نہیں آرہا ہے کہ ہم نفرت انگیز ادب کی تخلیق کر سکیں۔ اب رہیں ہماری آپس کی آویزشیں، رقابتیں، اور چھوٹی موٹی نفرتیں، سو ان میں اس قدر جان نہیں ہے کہ وہ کسی مسلسل یا نمایاں ادب کی بنیاد بن سکیں اور ان سے کام لے کر ایک دوسرے کی ہجو کی بنیاد پر کوئی عمارت کھڑی کر دی جائے۔ اور اس کے دوش بدوش جب کہ زمینداروں کی تلوار اور کسان کے ہل کے مابین وہ اگلی سی آویزش باقی نہیں رہی ہے، نیز سرمایہ داری کی برق اور مزدور کے نشیمن کے درمیان بھی وہ پہلی سی دشمنی موجود نہیں ہے، اس لیے یہ موضوع بھی اب اس قدر ٹھنڈا ہو چکا ہے کہ ادب کی گرمیٔ بازار نہیں بن سکتا۔

اب آئیے محبت کی جانب پہلے یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں، کہ نوعِ انسانی میں "حُبِّ ذات" کے علاوہ اور کسی قسم کی حُب کا کوئی وجود نہیں پایا جاتا، وہ جس خارجی یا داخلی چیز یا ہستی سے محبت کرتا ہے، وہ اس کی حبِ ذات کا ایک پرتو ہوتا ہے، اور جب حُبِّ ذات کا رشتہ کسی محبوب چیز یا ہستی سے منقطع ہو جاتا ہے، اُسی لمحے کے اندر اس کی محبوبیت فنا ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس لیے

حبت کی یہ دس بڑی قسمیں جو ذیل میں درج کی جا رہی ہیں، دراصل حُبِ ذات ہی کے دریا کی شاخیں اور اُسی کے جمال کی جھلکیاں ہیں۔ حُبِ اُقربا، حُبِ مولد، بِ احباب، حُبِ وطن، حُبِ مال و جاہ، حُبِ ایمان، حُبِ مناظر، حُبِ انسان، حُبِ آگاہی، حُبِ جمال یعنی عشق۔ ان سب پر ترتیب وار ر ڈال کر یہ دیکھنا ہے کہ یہ ادب کی تخلیق پر کیا اثر ڈالتی ہیں۔

حُبِ اُقربا

یعنی اسلاف و اخلاف اور خاندان کی محبت۔ ارتقائے ذہن سے ماقبل جذباتی دور میں یہ محبت بہت جاندار اور قوی تھی، ہرچند س وقت بھی وہ کارفرما ہے، لیکن اب اس میں آن زیادہ ہے، جان کم ہے۔ اب اس جذبے کے تحت قبائل کے درمیان انتقام کی تلواریں نہیں لتی ہیں، بچوں کو ماں باپ کلیجوں سے چمٹائے نہیں بیٹھے رہتے ہیں، بلکہ تعلیم کی غرض سے انھیں دوسرے ملکوں میں بھیج دیتے ہیں۔ روزمرہ کی زندگی یں اب ماں باپ کہاں رہتے ہیں، اُن کے بچے کہاں، اخلاف کو اپنے اسلاف کی یاد بھی اب اس بری طرح نہیں ستاتی، جیسے پہلے ستایا کرتی تھی۔ پھر ملک کی تقسیم نے خاندانوں کے افراد کو ایک دوسرے سے جدا کر کے اس جذبے کو قابلِ افسوس حد تک سرد کر دیا ہے، اور ان کے درمیان سایۂ حضور بہ از برادر دور“ کی ایسی دیوار آ کھڑی ہوئی ہے کہ وہ ایک دوسرے کو بھول سے گئے ہیں ؎

جو شخص کہ ہجر عبید ہو جاتا ہے — من جملۂ ”بکر“ و ”زید“ ہو جاتا ہے
دوری مسلسل وہ بلا ہے اے جوشؔ — رشتوں کا لہو سفید ہو جاتا ہے

اس لئے اس جذبے میں اب ایسی شدت باقی نہیں رہی ہے کہ یہ کسی مسلسل یا نمایاں ادب کی بنیاد بن سکے۔ ع طولِ فرقت سے بہت بیتابیاں کم ہو گئیں

حُبِ مولد

اس جذبے کی ان لوگوں کو خبر نہیں ہوتی، جو اپنے دیارِ پیدائش میں زندگی بسر کرتے ہیں، یہ جذبہ صرف غربت میں بیدار ہوتا ہے، جو ایک زمانے میں پردیسی کے دل کو بہت ہی بری طرح زخمی کر دیا تھا ؎

رہ گیا اپنے گلے میں ڈال کر بانہیں غریب
عید کے دن جس کو غربت میں وطن یاد آ گیا

لیکن اب سیر و سیاحت کا ذوق اس قدر بڑھ چکا ہے، نقل و حمل کے ذرائع میں اتنی فراوانی و سرعت آ چکی ہے، اور ”دیارِ اغیار“ میں متوسط درجے کے انسانوں کے واسطے بھی آسائشوں اور دل بستگیوں کی اس درجہ ریل پیل ہو چکی ہے کہ ؎

بیٹھ جاتا ہوں، جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

کا رونا رونے کا اب کوئی موقع باقی نہیں رہا ہے۔

البتہ ارباب ادب میں تقسیم کے بعد یہ جذبہ نہایت شدت کے ساتھ بیدار ہوا تھا جس کی بناء پر دردناک ناولوں، ڈراموں، افسانوں، گیتوں اور نظموں کا ایک سیلاب آ گیا تھا، اور پاک و ہند کی فضا فریادوں سے گونج اٹھی تھی، لیکن اُدباء کی مسلسل تنگدستیوں

اور متواتر پریشانیوں نے آخرکار ان فریادوں کو آہستہ آہستہ ہچکیوں، اور پھر اُن ہچکیوں کو رفتہ رفتہ سسکیوں میں بدل ڈالا اور اُس کے بعد ناتوانی اس قدر بڑھ گئی کہ لبوں پر صرف ایک ایسی ہلکی سی آہ گاہ گاہ باقی رہ گئی، جو ادب کا لباس نہیں پہن سکتی۔

حُبِّ احباب

یہ بڑی ہی جاندار، شوخ اور بھڑکیلی محبت ہوتی ہے، اس لیے کہ اس کی پشت پر ایسی گاتی، بھاؤ بتاتی، وارداتیں اور ایسی مہکی مہکی راتیں ہوتی ہیں کہ انھیں کوئی حساس آدمی تادمِ نزع فراموش نہیں کر سکتا، اور جب احباب دنیا سے اٹھ جاتے ہیں، تو انسان اپنے کو بالکل تنہا محسوس کرنے لگتا ہے، اور نئے لوگوں کے درمیان اپنے کو اجنبی سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور یہی وہ وقت ہوتا ہے کہ آدمی کے دل سے جب خون کی بوندیں ٹپکتی ہیں تو وہ ادب پاروں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان درد آمیز پاروں میں سے بعض کی عمر طولانی ہوتی ہے، مگر اس موضوع میں اس قدر وسعت نہیں ہوتی کہ اسے ایک مستقل مشغلہ ادب کی صورت سے جاری رکھا جائے۔

حُبِّ وطن

ہمارے معاشرے میں ابتدا جائے پیدائش کے علاوہ وطن کا کوئی تصور ہی نہیں تھا، وطن کا وسیع تر تصور مغرب کا عطیہ ہے، اور مغرب کے ادب کو پڑھ پڑھ کر ہم نے حُبِّ وطن کو سیکھا ہے۔ لیکن آزادی کے بعد اس حُبِّ وطن کو ادب میں استعمال کرنے کی کوئی خاص صورت باقی نہیں رہی ہے، اور جب تک کہ ہمارے ملک پر کوئی قوم حملہ آور نہیں ہو گی، یا ہمارے ملک کو کسی بلائے عظیم کا سامنا کرنا نہیں پڑے گا۔ ہماری حبِّ وطن خوابیدہ رہے گی۔ اس کے علاوہ ہم انسان کے ذہنی ارتقا کے شکرگزار ہیں کہ اس نے ایک بڑی حد تک ہمارے دائرۂ نظر میں وسعت، ہماری شرافت میں بلندی، ہمارے مزاج میں انسانیت، اور ہماری فکر میں رسیدگی پیدا کر کے ہمیں آواز دی ہے کہ ہم اپنے مدنی تصوّرات کے بیڑے کو حبِّ وطن کی جوئے تنک آب سے ہٹا کر اُخوتِ آفاقی و حبِّ انسانی کے قُلزُمِ ذخّار کی جانب موڑ دیں۔ اور جس دن سے ہم نے ادھر مڑ جانے کا ارادہ کر لیا ہے، حبِّ وطن کا وہ جذبہ، جس پر ہم کبھی ناز کرتے تھے، اب ہمیں لاغر و کوتاہ قامت نظر آنے لگا ہے۔ اور اسی بنا پر اس میں اب وہ پہلی سی طاقت و جاذبیت نہیں رہی ہے کہ وہ ہمارے ادب کا کوئی پائدار قابلِ فخر کارنامہ بن سکے۔

حُبِّ مال و جاہ

یہ چھوٹے دلوں کو موہ لینے والی وہ جاذبِ نظر فضا ہے جس پر لاکھوں "دارا" و "اسکندر" گدوں کے مانند، منڈلاتے نظر آتے ہیں، اور یہ کھوکھلا طمطراق رکھنے والا وہ کاخِ بلند ہے، جس کے آستانے پر اس کرۂ ارض کی ساڑھے ننانوے فی صدی، بھٹکی ہوئی، آبادی ازل سے ماتھا رگڑ رہی ہے، اور ابد تک ماتھا رگڑتی رہے گی، لیکن سچے فن کاروں، پختہ مغز حکیموں، کامل سائنسدانوں، اور حقیقی ادیبوں کی ۱/۲ فی صدی حیرتناک آبادی ایسی بھی ہے، جو آستانۂ مال و جاہ کی سجدہ ریزی کو اپنے واسطے باعثِ ننگ و عار سمجھتی ہے۔ اس گروہ کو اپنے کمال پر اس قدر ناز ہوتا ہے کہ، جذبات کی ترنگ میں آ کر، جب اُس کا کوئی فرد "آستانِ جمال" پر بھی جھکتا ہے

تو اس گمان کے ساتھ نہیں جھکتا کہ اس عمل سے اس کے سر کو بلندی حاصل ہو گئی، بلکہ، اس کے برعکس، وہ اس یقین کے ساتھ جھکتا ہے کہ اس کی پیشانی سے مَس ہو کر خود آستانِ جمال بلند ہو جائے گا۔

اپنی رفعت پر بہت عرشِ بریں کو ناز تھا
مل گئی سنگِ درِ جاناں کو پیشانی مری

یعنی اب عرش کو اپنی رفعت پہ ناز نہیں رہا ہے، اس لیے کہ میری پیشانی کی دولت سے بہرہ مند ہو کر سنگِ درِ جاناں کو اسقدر بلندی حاصل ہو گئی ہے کہ اس کے روبرو، عرش کا نازِ رفعت باقی نہیں رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کوئی لطافت، کثافت اور کوئی صاحبِ کمال جاہ و کمال کے بغیر اپنے وجود کو قائم نہیں رکھ سکتا۔ لیکن اربابِ کمال کا تصورِ جاہ و مال، تمام دنیا سے مختلف ہوتا ہے۔ اس لیے کہ یہ گروہ مال کے صرف اُس قلیل حصے کا طالب ہوتا ہے جو اس کو سکون کے ساتھ بیٹھ کر دماغی کام کرنے کی فرصت و فروخت بخش دے، اور اس طرح وہ جاہ کا بھی وہ قلیل حصہ چاہتا ہے جو اس کے انا کو صرف اس قدر غذا بہم پہنچائے کہ اس صلاحیت اور قوتِ کارکردگی میں اضمحلال پیدا نہ ہو سکے۔ اس متذکرہ بالا صورتِ حال کی بنا پر ادب کی سرکار میں حبِ مال و جاہ کو کبھی اس قدر شایانِ اعتنا سمجھا ہی نہیں جا سکتا کہ اس کے بل پر ادب کی سی دولت کو پیدا کیا جا سکے۔ (بعض ناقص اور گھٹیا قسم کے ادیب حبِ مال و جاہ میں گرفتار ہو کر کاروباری یا زرخرید ادب پیدا کرنے لگتے ہیں، اس تجارت سے وہ اپنی ظاہری حالت کو تو درست کر لیتے ہیں، لیکن ان کی باطنی کیفیت میں سڑاہند پیدا ہو جاتی ہے، اور ادیب کی حیثیت سے وہ اپنی زندگی ہی میں مر جاتے ہیں، سرکارِ برطانیہ کے خریدے ہوئے ادیبوں اور شاعروں کی بدبختیاں ہمارے سامنے ہیں، جو ادب و شعر کی حیثیت سے اب تک پنپ نہیں سکے ہیں)

حُبِّ ایمان

ایمان، انسان سے شدید پرہیزگاری کا تقاضا کرتا ہے، اور اس کے قطعی برعکس ادب آدمی کو لے جاتا ہے، "در کوئے نیک نامی، ما را گزر نہ دادند" کے اُن کوچوں میں جہاں ذوقِ پرہیزگاری کا داخلہ قطعاً ممنوع ہوتا ہے، اور جہاں "من نہ آں رندم کہ ترکِ شاہد و ساغر کنم" کے نغمے گونجتے رہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جس طرح ہر کلیے میں ایک نہ ایک استثنیٰ بالعموم پایا جاتا ہے، اس طرح حبِ ایمان نے بھی چند قابلِ ذکر ادب پارے ضرور پیدا کیے ہیں۔ لیکن ایمان و ادب میں خدا جانے کیسی پائدار لاگ ڈانٹ ہے کہ ان کے مابین گاڑھی چھنتے کبھی دیکھا ہی نہیں گیا ہے۔ اس لیے ان امور پر نگاہ کر کے، وثوق کے ساتھ، یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایمان کے پانی سے ادب کے پودے کو سینچا نہیں جا سکتا۔

حُبِّ مناظر

یہ بات نہیں کہ ہمارے ادب میں مناظر کی عکاسی قطعاً ہے ہی نہیں، لیکن کیفیت و کمیت، دونوں جہات سے، وہ ایسی "اوپری جی والی" ناتمام، ناقص، اور مبہم طور سے محسوس کی ہوئی عکاسی ہے، جس کو ہمارے ادیبوں کی مناظر پرستی و مناظر سنجی کے ثبوت میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا کی تمام ذی حیات مخلوق میں صرف انسان ہی وہ حیوان ہے، جو مناظر سے لطف اندوز ہوتا ہے،

ہرچند حیوانوں میں بندر سب سے زیادہ سیانا ہوتا ہے، لیکن آج تک وہ بھی کبھی اس عالم میں نہیں دیکھا گیا ہے کہ وہ مناظر کی طرف نگاہ جمائے ان سے لطف اندوز ہو رہا ہے، البتہ یہ آدمی ہے جو مناظر سے لطف اٹھاتا ہے، لیکن حسنِ مناظر سے محبت کرنے اور اس سے، جی بھر کے لطف اندوز ہونے کے واسطے شعور کو حسین بلوریں دمک کی ضرورت ہوتی ہے، وہ، بدقسمتی سے، ہمارے ادیبوں کو اب تک میسر نہیں ہوئی ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے ادب میں بہار و خزاں، لالہ زار و چمنستان، طلوع و غروب، اور دشت و دریا کے جو مناظر بیان کیے گئے ہیں وہ اس کثرت کے ساتھ فرضی اور کاغذی پھول ہیں کہ انھیں پڑھ کر اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ ہمارے ادیب مناظر کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے، اور شہر کی تنگ و تاریک گلیوں سے نکل کر کھلے میدانوں اور ویرانوں میں جانے سے انھیں ڈر لگتا تھا۔ ابن بطوطہ نے اپنے مشہور سفرنامے میں ہندوستان کے متعلق یہ تحریر کیا ہے کہ یہ مناظر دشمن و کور ذوق لوگ جب دریا کے کنارے مکان بناتے ہیں تو مکانوں کے دروازے گلیوں کی طرف اور ان کی پشت دریا کی جانب رکھتے ہیں۔ خود میرا حیدرآباد دکن کا ایک واقعہ سن لیجیے، شام کا وقت تھا، میں اپنے ایک دوست کو ساتھ لے کر، جو ایک کالج کے پرنسپل اور بہت زیادہ پرگو شاعر تھے، سکندرآباد جا رہا تھا۔ جاتے جاتے جب "حسین ساگر" کے بند پر میں نے اپنی گاڑی روک لی، تو ان پرنسپل و شاعر نے گھبرا کر مجھ سے رک جانے کا سبب دریافت کیا، میں نے کہا ارے کم بخت ذرا اس پیاری شفق کو تو دیکھ، کیا قیامت ڈھا رہی ہے، تو یہ سنتے ہی میرا دوست مجھ سے بگڑ گیا، شفق کی طرف پشت کر کے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا، ایسی بے ہودہ چیزیں ہم نہیں دیکھا کرتے، تمھاری شاعری کو انھیں لغویات نے خراب کر کے رکھ دیا ہے۔ تم ہندوستان چھوڑ کر انگلستان چلے جاؤ۔ اس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس ملک کے خواص و شعرا کی مناظر بیزاری کا یہ عالم ہے، اس کے عوام کیسے ہوں گے۔

قیاس کن ز گلستانِ من، بہارِ مرا

اس لیے وہ حضرات جو اپنے ادب کو مناظر کی دولت سے مالامال دیکھنے کے تمنائی ہیں ان کی خدمت میں عرض ہے کہ جناب چندے اور انتظار فرمائیں کہ ہمارے شعور میں وہ بلوریں دمک پیدا ہو جائے جو مناظر کے الوان کو جذب کر کے ادبِ مناظر کو وجود میں لاتی ہے۔

حُبِّ انسان

یہ وہ دولت بیدار ہے جو صرف اُن غیر معمولی، چوڑے سینے رکھنے والے، ذہنوں میں پائی جاتی ہے، جو کرۂ ارض ہی کو نہیں، اس پورے نظامِ شمسی کو اپنے سینے میں رکھ لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور ہمارے ذہنوں کی تنگی کا یہ عالم ہے کہ اس بیسویں صدی میں بھی ہم اپنے اپنے صوبوں کے شرمناک ڈربوں اور اپنی اپنی جغرافیائی و ملی عبرتناک کابکوں میں دبکے بیٹھے ہوئے ایک دوسرے پر بری طرح بھونک رہے ہیں۔ پس جو آبادی اصطبل کے لیناڈ میں گرفتار ہو، اس سے حُبِّ انسانی کا مطالبہ کرنا "ظلم بر حیوانات" کے علاوہ اور کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس لیے سردست اس کاشت کار کے مانند خاموش بیٹھے رہیے جو ابر کی تمنا میں آسمان کی طرف بار بار نگاہیں اٹھاتا ہے، اور صبر کے ساتھ ابنائے بشری کی اُس پیمبرانہ کشادگی کا راستہ دیکھیے جو انسان کی محبت پر ابھار کر ادبِ انسانیت کو معرض وجود میں لاتی ہے۔

حُبّ آگاہی

اس نوعیت کی حب نے ابھی تک ہمارے دیار میں نشو و نما نہیں پائی ہے، ہماری زمین اقوال و روایات کے کنکروں اور سنگریزوں سے اسقدر پٹی پڑی ہے کہ اُس پر اُس وقت تک حبِ آگاہی کی تخم ریزی ناممکن ہے، جب تک اس زمین کو تمام سنگریزوں سے یکسر پاک نہیں کر دیا جائے گا۔ ہندو و پاک کی فضا "چو ہر خبر کہ شنیدم، رہے بحیرت داشت۔ ازیں سپس من و ساقی و وضع بے خبری" کے نعروں سے ہنوز بری طرح کانپ رہی ہے، اور ابھی تک "وضع بے خبری" کو ان دونوں ملکوں میں ایک "روحانی شرف" خیال کیا جاتا ہے۔ اور یہ افسوسناک صورت حال ہے کہ اس وقت صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ ہماری دنیا میں آگاہی فروش و عمیق تر دماغی ادب کی ابھی تک فصل ہی نہیں آئی ہے، انتظار کیجئے۔

حُبّ جمال، یعنی عشق

عشق ایک دماغی بحران اور جنسی ہیجان ہے، جو گرجتے جذبات کے ہونکتے سیلاب اور بوکھلائی عقل کے دریائے پایاب کے سنگم پر نمودار ہو کر اپنی کشتی کو، ایک متوالے ناخدا کے مانند، بے پناہ طوفان میں، کھیتا ہوا، پھنکاریں مارتے ہوئے کف در دہان گردابوں کے جبڑوں میں در آتا ہے۔ جس میں عقل کا ضعف، اور جذبات کی توانائی زیادہ ہوتی ہے، اس کا عشق زیادہ جاندار، اور جس میں عقل کا ضعف اور جذبات کی توانائی کم ہوتی ہے، اس کا عشق کم جاندار ہوتا ہے۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ نامساعد حالات کی گیر و دار، برہم والدین و اہل خاندان کی ہیچکار، رقابت کی تلوار، ناصحان مشفق کی بھرمار، معشوقہ کا اغماض و انکار، اور محرومی دیدار و گفتار کے انگارے عشق کو لالہ و گل عطا کرتے ہیں، اور عشق کا پودا، ان انگاروں کی کھاد سے پھلتا پھولتا، پروان چڑھتا، اور نئی نئی کونپلیں نکالتا رہتا ہے۔ لیکن جب نامساعد حالات سپر انداختہ ہو جاتے ہیں، برہم والدین و اہل خاندان ہموار ہو جاتے ہیں۔ رقابت کی تلوار ٹوٹ جاتی ہے، ناصحانِ مشفق تھک کر بیٹھ جاتے ہیں، محبوبہ کا اغماض و انکار، التفات و سپردگی میں تبدیل ہو جاتا ہے، چشم و گوش کے صحن میں دیدار و گفتار کا مینہ برسنے لگتا ہے، اور حسن گرمجوشی کے ساتھ ہم آغوش ہو جاتا ہے، تو عشق کی نبضیں ڈوب جاتی ہیں، اور یہ تمام حسب مراد حالات، بالآخر، عشق کے جنازے کو، اپنے دوش پر اٹھا کر، قبر میں اُتار دیتے ہیں ؎

نہالِ عشق، سیلِ برق و آتش سے پنپتا ہے　　یہ پودا خاک ہو جاتا ہے سعیِ ابر و باراں سے

سو بندہ پرور اب جبکہ پردہ اٹھ چکا ہے، حفاظت حسن کے لیے نہ اب سات پردے ہیں نہ چار دیواری اور نہ کسی پیام رسان، بوا نصیبن، کے خدمات کی ضرورت باقی رہ گئی ہے، اب تو حسن مدرسوں، کالجوں، دکانوں، چائے خانوں، ہوٹلوں، عجائب خانوں، پارکوں، ساحلوں، میلوں ٹھیلوں، ریلوں، نمائشوں، پلیٹ فارموں، گلی کوچوں، بازاروں غرضیکہ چلتی پھرتی زندگی کے تمام چوراہوں اور تمام موڑوں پر موجیں مارتا، چلتا پھرتا، ہنستا بولتا، ترارے بھرتا، اچھلتا کودتا، دندناتا، ناچتا، گاتا۔ تھرکتا۔ چہلیں کرتا، اور آنکھیں لڑاتا نظر آ رہا ہے، اور دو چار بار نظریں ملانے، اور چند شیریں الفاظ کے دام بچھانے کے بعد، آسانی کے ساتھ، رام ہو جاتا ہے تو آپ ہی غور فرمائیں کہ ان پانی کے سے نرم و آسان حالات میں شعلۂ عشق کیونکر بھڑک سکتا ہے؟ اب تو، زیادہ تر، تمدن آلودہ سادگی و پُرکاری، اور فیشن ایبل حیا و طراری کے کبھی نمود بنتے ہے، اور کبھی افتادِ مزاج، یا کسی مصلحت کے زیرِ فرمان، اُن میں سے ایک کو ابھارنے اور ایک کو دبا دینے پر، حسن و عشق کی جلد یا بدیر بے تکلفی

کا مدار ہوا کرتا ہے۔ یعنی اگر افتادِ مزاج یا کسی مصلحت کی بنا پر طراری و پرکاری سے کام لیا جاتا ہے تو فریقین میں پینگ بہت جلد بڑھ جاتے ہیں اور اگر حالات یا مزاج کا تقاضا اس کے برعکس سادگی و حیا کی جانب مائل ہو تو فریقین کے مابین بے تکلفی کے پیدا ہونے میں، کسی قدر، تاخیر ہو جاتی ہے۔ اب ہجر کی راتوں کے تواتر اور ان کی درازی کا سلسلہ بہت مختصر ہو چکا ہے، اب نہ تکیے بھیگتے ہیں، نہ کرب سے کروٹیں ہی بدلی جاتی ہیں، اور نہ دردناک آواز سے کہا جاتا ہے کہ

پھوڑا سا، ساری رات جو پکتا رہے گا دل
تو صبح تک تو ہات لگایا نہ جائے گا

یہ سچ ہے کہ مفلس عاشقوں کے عشق میں، معشوقوں کے متمول، والدین کی جانب سے اب بھی رکاوٹیں پڑا کرتی ہیں، اور جو لڑکیاں جرأت کی کمی، یا اپنے عاشقوں سے اپنی کمزور محبت کے باعث گھر سے بھاگ نہیں کھڑی ہوتیں، ان کے قوی عشق رکھنے والے عشاق خودکشی کر لیتے ہیں، لیکن ایسے انتہائی اقدامات اب نہایت ہی شاذ اور وہ بھی غیر تعلیم یافتہ حلقے میں ہوتے ہیں، اور کم سے کم ننانوے فی صدی نوجوان، کچھ روز تک دردبھرے گیت گا کر اور امارت و افلاس کے دستور کو گالیاں دے کر دوسرے دھندوں میں مصروف ہو جاتے، یا اپنے طبقے کی کسی لڑکی سے شادی کر کے دردناک ادب پیدا کرنا بھول جاتے ہیں۔ البتہ ان میں جو شاعر ہوتے ہیں وہ کبھی کبھی، یادِ ماضی سے متاثر ہو کر، غم انگیز اشعار سناتے رہتے ہیں، اور رفتہ رفتہ ان اشعار میں ایسی تکرار پیدا ہو جاتی ہے کہ ان میں کوئی تازگی باقی نہیں رہتی۔ اس کے علاوہ اب ذہن انسانی کا ارتقا، جذبات کے دریاؤں پر مضبوط بند باندھنے میں، بڑی حد تک کامیاب ہو چکا ہے، جس کے باعث، کم سے کم مہذب معاشرے کے میدان میں اب جذبات اُمڈ بھر کر ٹھاٹیں نہیں مارتے ہیں۔ ان متذکرہ امور کی روشنی میں عصرِ حاضر سے یہ توقع وابستہ کرنا کہ اب بھی وہ عظیم عاشقانہ ادب کو پیدا، اور اس کے تسلسل کو قائم رکھ سکے گا، ایک بے معنی سی بات ہے۔ ان اسباب کے علاوہ، ہمارے ادبی جمود کے تین بڑے سبب اور بھی ہیں۔ یعنی ادب پر سیاست کا افسوسناک دباؤ، ناشروں کا ظالمانہ برتاؤ اور عصرِ حاضر کے مسائل و علوم کا حیرت انگیز پھیلاؤ۔

سیاست کا دباؤ

یوں تو سیاست نے ادب کو ہمیشہ اپنی جانب کھینچا ہے، اور اس کی اکتسابِ زر سے قدرتی بے نیازی کی پیدا کردہ تنگدستی سے فائدہ اٹھا کر، اسے اپنے مسخرے درباروں کی زینت بنایا ہے، لیکن اس دور کی سیاست، جس انداز سے تمام دنیا کے ادب کو رگیدتی، اس کی حق گوئی کو "مزید گرسنگی" اور "فوری گرفتاری" کا خوف دلاتی، اپنے کلیات و نظریات کو فروغ دینے کی خاطر ادب کو خریدتی، اور اپنے گھڑ دوڑ کے میدانوں میں اس کے گھوڑوں کو دوڑاتی، اور انھیں ٹٹیاں پھندواتی رہتی ہے۔ اس کی نظیر تاریخ ادب میں کہیں نہیں ملتی۔ چنانچہ اس گراں باری کی بنا پر آج کا ادب چلتا ہے تو ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کا وزن اسے چلنے نہیں دیتا، اور دو چار قدم اٹھانے کے بعد اس کی سانس پھول جاتی، قدم لڑکھڑا جاتے ہیں، اور وہ چکرا کر گر پڑتا ہے۔

ناشر

جہاں تک کہ گھٹا ٹوپ، جہالت اور پردۂ تجارت میں قزاقی کا تعلق ہے، کنجڑوں قصائیوں اور ناشروں کے مابین صرف اسقدر

فرق ہوتا ہے کہ قصائی ناخواندہ، اور ناشر خواندہ جاہل ہوتے ہیں۔ قصائی جانوروں کو ذبح کرکے ان کا گوشت، ان کی کھال، اور ان کی ہڈیاں فروخت کر ڈالتا ہے، ناشر ادیبوں کو ذبح کرکے ان کا گوشت کھاتا، ان کی کھال کی جوتیاں پہنتا اور ان کی ہڈیوں تک کو چبا ڈالتا ہے۔ حضرت اکبر الٰہ آبادی نے اپنے دور کے ادیبوں کے باب میں جو یہ فرمایا تھا کہ ”ہمارے لخت دل ہیں، آپ کا مال تجارت ہے“ وہ صورت حال آج تک قائم ہے، اور جدید آئین تجارت کی بے نہایت شقاوت، اور موجودہ ادیبوں کی بے نظیر مفلسی نے اسے ایک وسیع تر ادارۂ جور و ستم میں تبدیل کر دیا ہے۔ ان حالات کی بنا پر چونکہ ادیب کو اپنی شہ رگ کے خون کا دھارا فروخت کرنے کے بعد لکڑی کا برادہ ملی ہوئی روٹی کا صرف ایک خشک ٹکڑا حاصل ہوتا ہے، اس لیے آج کل کے ادب کا سرچشمہ خشک ہونے کے قریب آ چکا ہے۔

مسائل و علوم کی پہنائی

عصر حاضر کے دریائے مسائل اور دجلۂ علوم کا پاٹ اسقدر وسیع ہو چکا ہے کہ ندیوں میں اپنے کرتب دکھانے والے ”ناخدا“ حیران و خوف زدہ کھڑے ہوئے ہیں، اور اس تصور سے ان کی پنڈلیاں کانپ رہی ہیں، کہ بار خدایا ہم اس بے پایاں تلاطم کا مقابلہ کیونکر کر سکیں گے۔

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حائل

عصر حاضر ہمارے ادب کو، بڑی گرجتی ہوئی آواز سے، فکر خلاق کی اُن اعجاز آفریں بلندیوں کی طرف پکار رہا ہے، جہاں معاشرتی و معاشی، ذہنی و مادی، اور سیاسی و صنعتی دھاروں میں صحت افروز توازن پیدا کرنے، حیات و ممات کے بے شمار اُلجھے مسائل کو سلجھانے، ارض و سما کی سلوٹوں اور تہوں میں لپٹے ہوئے حقائق کی مہریں توڑنے، قوائے معلوم کے مسخر کرنے، قوائے نامعلوم پر کمند پھینکنے، انسان کو خود اس کے اعضا پر حکمراں بنانے، اور آخر کار نوع انسانی کے برہنہ سر پہ دارائی آفاق کا جگمگاتا ہوا تاج رکھ دینے کی نیت سے ذہنی کارخانوں کی تمام چھوٹی بڑی مشینیں، حیرتناک سرعت کے ساتھ، برابر گردش کر رہی ہیں۔ ہمارا ادب، آنکھیں پھاڑے ہوئے، یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے، لیکن ”خیال زلف جاناں کب ہمارے دل سے نکلے گا“ کے عمیق غاروں میں اس طرح پڑا ہوا ہے کہ ہاتھ پاؤں مار نہیں سکتا، اس کے پاؤں روایات کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں، اس کے کانوں میں اقوال کی روئی ٹھسی ہوئی ہے، اس کی آنکھوں پر عشق کی پٹی بندھی ہوئی ہے، اور اگر اس کے دل میں جست کرنے کا جذبہ، تھوڑی دیر کے لیے، پیدا بھی ہوتا ہے تو اس کے آبا و اجداد اس کے سر پر لاٹھی چارج کرنے لگتے ہیں اور سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہمارے ادب کا مزاج منقولی و فکری ہے، ہمارا ادب حُبِ عورت و امرد کے فرش گل پہ رقص کرنے کا خوگر ہے، اور عصر حاضر اسے حبِ معارف کے محور پر گردش دینا چاہتا ہے۔ اس کجدار و مریز کی صورت حال نے ہمارے بھولے بھالے، کمسن ادب کو بوکھلا کر رکھ دیا ہے، اور وہ اس عجیب و غریب کشمکش و پیچ میں گرفتار ہو کر کہ کیا کرے، اور کیا نہ کرے، اس گوشے میں دبک کر بیٹھ گیا ہے جہاں ”کچھ نہ کرو“ کا سکہ جاری ہے۔

ہمارا ادب جست کر کے اوپر آ جاتا، لیکن وہ اپنے محیط کی زبردست کشش سے اسقدر مجبور ہے کہ، جست کرنا تو بڑی بات ہے وہ اپنے جسم میں جھکنے اور اُٹھنے کی طاقت بھی نہیں پاتا۔ اور یہ بھی ایک بڑی بدبختی ہے کہ اس کی پشت پر لب و رخسار کا تو خاصہ انبار ہے، لیکن علم و فکر کا سرمایہ سرے سے ہی نہیں، اس لیے بے بال و پری کے باعث اس میں پرواز کا بھی کوئی تصور پیدا نہیں ہو سکتا۔ بس ان تمام امور پر نگاہ کر کے میں آپ ہی سے دریافت کرتا ہوں کہ بندہ پرور خدا لگتی کہئے کہ اس موقع پر دنیائے ادب میں بچہ پیدا ہوگا کہ لڈو بٹیں گے؟

فراقؔ گورکھپوری

ہماری پوری زندگی خصوصاً ہماری تہذیبی زندگی جس کا بہت کچھ دارومدار ابتدائی تعلیم سے بلند ترین تعلیم پر ہے۔ ایک بحرانی دور سے گزر رہی ہے۔ اس کا نمایاں اثر یہ پڑا ہے کہ ہمارے سماج میں بڑے اور بھرپور دل و دماغ کے لوگ پیدا نہیں ہو رہے ہیں۔ اس دورِ انتشار و تذبذب میں زبان، ادب اور دیگر علوم کی تحصیل و تعلیم ہمارے یہاں ایک دورِ تعطل یا دورِ زوال و انحطاط سے گزر رہی ہے کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم لوگ آزادی سمیت تہذیبی و تعلیمی و تادیبی لحاظ سے مر رہے ہیں۔ آج تو تہذیب و ادب کوکو زندہ رکھنے کے لئے بہت بڑی زندگی اور بہت بڑے دماغوں کی ضرورت ہے۔ لیکن آج ہمیں وہ زندگی اور ویسے دماغ بھی نصیب نہیں جیسے دماغ انگلستان کو سترھویں، اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں حاصل تھے یا کچھ لحاظ سے خود ہمیں چالیس پچاس برس پہلے تک حاصل تھے۔

ظاہر ہے کہ اس صورت حال میں جم کر دیرپا اور اعلیٰ قدروں کا حامل ادب پیدا کرنے والے کہاں سے پیدا ہو جائیں گے۔ ہم لوگوں کا حال تو خیر سے بہت پتلا ہے لیکن ترقی یافتہ اور طاقتور ملکوں میں بھی ادب ایک بحرانی دور سے گزر رہا ہے۔ اب سے پچاس برس پہلے تک جیسے دیوقامت ادیب یورپ کے متعدد ممالک میں نظر آتے تھے آج نظر نہیں آ رہے ہیں۔ دنیا ایک عالمِ انتشار اور ایک وقفۂ انتظار سے گزر رہی ہے۔ تہذیب و ادب کی تاریخ میں ایسے دور چھوٹے یا بڑے پیمانے پر پہلے بھی آ چکے ہیں۔

اس لئے بالکل ناامید ہو جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ موجودہ صورتِ حال بہت دنوں تک قائم نہیں رہ سکتی۔ ہم دائمی طور پر اپنی تہذیبی اور ادبی صلاحیت کھو نہیں چکے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ آج ہم ادب کے قطب مینار نہیں بنا پا رہے ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ ہم عظیم ادب پیدا نہیں کر پا رہے ہیں، لیکن آج کا شعری و نثری ادب بالکل ہیچ و پوچ نہیں ہے۔ آج ہمارے رسالے اور جریدے ہمارا افسانوی ادب ہمارا تنقیدی ادب ہمارا شعری ادب سب فرداً فرداً اور مل کر ایسے نمونے برابر پیش کر رہے ہیں جو پُر عظمت آفاقی ادب نہ سہی لیکن اچھا ادب ضرور ہیں۔ کم سے کم آج میں یہ کہنے کے لئے اپنے آپ کو تیار نہیں پاتا کہ ہمارا دورِ حاضر کا ادب سرے سے کوڑا کرکٹ ہے یا اس میں موت کا جمود پیدا ہو چکا ہے۔

آج ہمارے ادیبوں یا ہونے والے ادیبوں کو مطالعہ اور تخلیقی غور و فکر کی مدد سے ایسے اسالیبِ بیان پیدا کرنا ہے جو سنجیدہ و تربیت یافتہ احساسات کی حامل ہوں اور جو ہمیں نئے تاثرات دے سکیں۔ ان کے ادب کے دل کی دھڑکنیں بلند آفاقی ادب کے دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہوں۔ ان کے ادب کی چیتنا یا شعور کی سطح اور جڑ بلند اور گہری ہو۔ کسی سیاسی پارٹی یا کٹر سیاسی عقائد کے ہاتھ ادب کو نہیں بک جانا چاہئے۔ یوں اس کی ہمدردیاں ان تمام مقاصد اور کوششوں سے ہونی چاہئیں جن سے انسان کی بھلائی و بہبودی ہے اور جو انسان کو محض خارجی طور پر نہیں بلکہ داخلی طور پر سنوارنے کے موافق ہیں۔ ادب میں غیر ادبی مقاصد کو بھی اگر اچھی طرح ہضم کر لیا جائے تو یہ بہت مستحسن بات ہے لیکن ادب کو مقصد زدہ کبھی نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ ادب کو مقصدیت کیا ادبیت سے بھی اوپر جانا چاہئے کیونکہ ادب کا مقصد ادبیت بھی نہیں ہے، بلکہ ہزاروں پہلوؤں سے رچا ہوا شعورِ کائنات و حیات دینا اور پانا ہے۔ کہا گیا ہے کہ:

GREAT LITERATURE IS SELDOM LITERARY.

بڑا ادب شاذ ہی "ادبی" ہوتا ہے۔ پھر افادی یا مقصدی ہونا تو اس سے بھی اُتری ہوئی بات ہے۔

میکش اکبر آبادی

اُردو شاعری روبہ تنزل نہیں بلکہ روبہ ترقی ہے۔ یہ ایک دعویٰ ہے اور اس پر استدلال کی ایک صورت تو یہ تھی کہ ہر دور کے شعراء کا کلام نقل کر کے موازنہ کیا جاتا، ان کی خوبیوں اور خامیوں کی وضاحت کی جاتی مگر یہ عمل، وقت اور محنت کا متقاضی ہے لیکن اس سے قطع نظر کر کے ہم موجودہ اردو شاعری کو اس کے موضوعات کی کثرت، مضامین کے تنوع، انداز بیان اور اسالیب کی جدّت کے اعتبار سے پہلے ادوار سے ممتاز ثابت کر سکتے ہیں۔ ہمارے شعری ادب میں کتنے نئے شگوفے کھلے ہیں، کتنے انوکھے اسلوب پیدا ہوئے ہیں، کتنے جدید موضوعات و نظریات کا اضافہ ہوا ہے اور کتنے نئے الفاظ و محاورات شامل ہوئے ہیں؟ یہ سب ہمارے دور کے روبہ ترقی ہونے کی ضمانت بھی ہے، علامت بھی اور دلیل بھی۔ اُردو شعر دنیا سے علیحدہ نہیں ہے علیحدہ رہ بھی نہیں سکتا۔ معاشی نظام اور سماج بدلا، مسائل و نظریات بدلے، ضروریات و ذہن بدلا تو ادب کیوں نہ بدلے گا۔ اس تبدیلی کو یہ تو ممکن ہے کہ کوئی پسند نہ کرے مگر کوئی انکار نہیں کر سکتا اس تبدیلی کو تنزل صرف وہی لوگ سمجھیں گے جو زمانے کی طرف پشت کیے کھڑے ہیں اور اس لیے انھیں اس کی رفتار اُلٹی نظر آ رہی ہے۔ اس سے پہلے ہماری ضروریات محدود تھیں اور اسی لیے مسائل اور نظریات بھی محدود تھے، اس کے نتیجے میں ہمارا ادب اور ادبی حلقے بھی محدود تھے۔ اب یہ حدیں ٹوٹ چکی ہیں، مشرق و مغرب ایک ہو رہے ہیں۔ زمان و مکان کے تصور بدل رہے ہیں اور اس لیے ہمارا ادب بھی بدل رہا ہے اور وسیع ہو رہا ہے۔ اس وسعت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ حافظ بجا طور سے ناز کر سکتے تھے کہ ان کے شعر شیراز سے بنگال پہنچے ع

"ایں قندِ پارسی کہ بہ بنگالہ می رود"

بلکہ اگر کوئی غزل لکھنؤ سے دلّی اور دلّی سے لکھنؤ پہنچ جاتی تھی تو مقبولیت کی علامت اور سند سمجھی جاتی ہے لیکن آج کے شاعر کے لیے مقابلہ سخت ہے اب مقابلہ ایک زبان کے شاعر کا اسی زبان کے دوسرے ہم عصر شعرا سے نہیں ہے بلکہ دوسری زبانوں کے ادب کے مقابلے میں اپنی اہمیت ثابت کرنا ہے اور خوشی کی بات ہے کہ ہمارا ادب اس دور میں اس منزل میں کامیابی سے ہم آہنگ ہو رہا ہے۔ یہی اس کے روبہ ترقی ہونے کا بھی ثبوت ہے۔

اس موقع پر اس اہم بات کی طرف متوجہ کرنا بے محل نہ ہوگا کہ جس طرح ہمارے پرانے شاعر اور ادیب عموماً اپنے زمانے کے مسائل سے بے نیاز ادبی نصب العین سے بے پروا اور وسعتِ فکر و نظر سے محروم ہوتے تھے اور ان کی ساری صلاحیتیں ادبی تقلید اور صحتِ زبان و الفاظ میں صرف ہو جاتی تھیں اور آج ہم ان شعرا کو کوئی وقعت نہیں دیتے ہیں اور نہ انھیں قبولِ دوام حاصل ہو سکا، اسی طرح اکثر اردو شعراء آج بھی ایسے ہیں جو الفاظ استعمال کرتے ہیں مگر ان کا محلِ استعمال اور بعض اوقات ان کے معنی بھی نہیں جانتے۔ وہ کسی ایک نظریے کی تائید کرتے ہیں، اس پر نظمیں لکھتے ہیں مگر اس نظریے سے وقوف نہیں رکھتے۔ وہ کسی دوسرے نظریے کی تردید کرتے ہیں مگر اس کی معمولی اصطلاحات سے بھی واقف نہیں ہوتے۔ الفاظ و معانی سے بے پروائی کا یہ عالم ہے کہ بعض مشہور حضرات کے یہاں رہگذر راستہ چلنے والے کے معنی میں اور سبکسار فرض سے سبکدوشی کے محل پر اور مضمون ممنون کے قافیے کے ساتھ استعمال ہو سکتا ہے اور کوئی انھیں نہیں ٹوکتا۔ دوسری طرف ایک گروہ ایسا پیدا ہو رہا ہے جو ہمیں ہدایت کرتا ہے کہ موسم (سین کے زبر سے) غلط ہے، سمت (سین کے زبر سے) غلط ہے،

جلوہ (جیم کے زبر سے) غلط ہے اور اس طرح کے بے شمار الفاظ جو اُردو میں مقبول، رائج اور خواص کی زبانوں پر چڑھ چکے ہیں غلط ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ عربی، فارسی میں ان کا جو تلفظ اور جو اعراب لغات میں ہیں وہ صحیح ہیں اور اسی طرح اردو والوں کو بھی لکھنا اور بولنا چاہیے۔ جن کی معلومات لغاتِ کشوری تک محدود ہوں ان سے تو کچھ عرض کرنا فضول ہے مگر تعجب یہ ہے کہ بعض اہلِ نظر بھی اس کے محرک اور مؤید نظر آتے ہیں۔ اگر یہ لَے اسی طرح بڑھتی رہی تو بعض حضرات یہ بھی کہنے لگیں گے کہ جمنا غلط یمنا صحیح ہے، برس غلط ہے ورش صحیح ہے اور رات غلط ہے راتری صحیح ہے کیونکہ اگر یہی قاعدہ صحیح ٹھہرا کہ عربی فارسی کے الفاظ عربی فارسی لغت کے مطابق بولے جائیں تو ہندی اور سنسکرت کے الفاظ کو بھی ان ہی زبانوں کے لغت کے مطابق بولنے کا مطالبہ کیا جانا چاہیے۔

اسی طرح فنِ عروض کی پابندی اور مروجہ بحور و اوزان میں محصور ہو جانا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ ہاں ضرور ان میں اضافہ کرنا چاہیے اور دوسری زبانوں کے الفاظ کی طرح اوزان بھی لینے چاہئیں مگر یہ کام شعور اور واقفیت کے ساتھ کرنا چاہیے۔ عدم علم اور ناواقفیت کو ہنر بنانا کسی طرح بھی قابلِ تعریف نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ اپنی زبان اور اپنے ادب کے مزاج کا بھی لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ وہی چیزیں ہماری غذا بن سکتی ہیں جو ہمارے مزاج اور ماحول کے مطابق ہوں۔ جو چیز ہم ہضم نہ کر سکیں وہ کبھی بھی ہمارے لیے مناسب نہیں ہے۔ تجربہ بہت اچھی چیز ہے مگر تجربے کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔ انسان خاک پھانک کر اور قطب مینار سے پھلانگ لگا کر تجربہ نہیں کرتا۔ اچھائی برائی موقع محل کے اعتبار سے اپنی نوعیت بدل لیتی ہے اور ترک و اختیار میں ہمیں اپنی ملکی قومی اور ادبی خصوصیات اور مزاج کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ خصوصاً جہاں تک بحور و اوزان کا تعلق ہے میں انھیں موسیقی کے اصول سے بے نیاز نہیں سمجھتا۔ یہ دراصل موسیقی ہی کے اوزان ہیں اور موسیقی ہر ملک و قوم کی علیحدہ ہوتی ہے، اس کا لحاظ ہے ورنہ نظم و نثر کا فرق اٹھ سکتا ہے۔

اسی طرح نئے الفاظ، نئے اسلوب اور نئے تجربوں کا ہمیں خیر مقدم کرنا چاہیے لیکن اگر اسلوب ہو اور سلیقہ نہ ہو، الفاظ ہوں اور ان کا محل نہ ہو، تخلیق ہو شعور نہ ہو، فکر ہو فن نہ ہو تو اسے ادب کس طرح کہا جائے گا۔

غلطی سب کرتے ہیں اور سب سے غلطی ہو سکتی ہے مگر غلطی سے بھی غلطی کرنے والے کے مقام کا تعین اور اندازہ ہوتا ہے۔ ایک مبتدی اور نو آموز کی غلطی اور ایک منتہی کی غلطی میں فرق ہوتا ہے۔ اس سے آپ یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ غلطی کرنے والا کس حیثیت کا ہے۔ پاؤں چلنا سیکھنے والا بچہ بھی گرتا ہے اور ہوائی جہاز اڑانے والا بھی لیکن دونوں کی استعدادیں اور مقام علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ روایات سے بغاوت اور روایات سے جہالت میں فرق کرنا چاہیے۔ ایجاد اور بے راہ روی یقیناً ایک نہیں ہو سکتیں۔ ضرورت ہے کہ موجودہ طریقۂ تعلیم میں اصلاح کی جائے، ادب میں تنقید و احتساب کی نوعیت میں ترمیم کی جائے، علوم و فنون اور دوسری زبانوں کے صالح ادب کو اُردو میں منتقل کیا جائے اور ایسا ماحول پیدا کیا جائے کہ بغیر ضروری علم حاصل کیے کوئی اس راہ میں قدم نہ رکھ سکے۔

سیّد عبدالحمید عدمؔ

ادب میرے اپنے ذاتی نظریے کی بے لوث روشنی میں زندگی کی خلاقانہ اور جمالیاتی قوتوں کے ایک اٹل طبعی عمل کا نام ہے لہٰذا مجھے اس وقت شدید تکلیف دہ حیرت ہوتی ہے جب مجھے بتایا جاتا ہے کہ اُردو زبان میں چھپنے والے اخبار و رسائل کے مدیرانِ کرام یا قارئینِ کرام یا دیگر اربابِ رائے اس رجحانِ خیال کے حامی ہیں کہ اردو ادب پر (خدانخواستہ) اس وقت تعطل یا غنودگی کا عالم طاری ہے۔

مجھے اس سلسلے میں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ ادب جب اپنی جبلّی ساخت کی خاصیت سے قانونِ ارتقا کا ایک جزوِ لاینفک ہونے کی حیثیت رکھتا ہے تو اس کے متعلق یہ کہنا کہ اس میں "ٹھہراؤ" یا باسی پن پیدا ہو گیا ہے بعینہٖ ایسا ہے جیسے سالہا سال سے بہنے والے کسی خودرو چشمے کے متعلق یہ حکم لگا دیا جائے کہ اس نے دفعتاً اپنی روانی کو طلاق دے دی ہے۔

میرے نزدیک اس قابلِ رحم غیر فطری میلان کی دو بیّن وجوہ ہو سکتی ہیں:-

۱۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ دورِ حاضرہ کے اُردو زبان میں شائع ہونے والے اخبار و رسائل کی تعداد کچھ اس بے تحاشگی سے بڑھ گئی ہے کہ اچھے بُرے کا امتیاز قریب قریب ختم ہو گیا ہے اور جس قسم کا مواد بھی انھیں اشاعت کے لیے موصول ہوتا ہے اس کو چھاپ دینے کے علاوہ کوئی دوسرا چارۂ کار انھیں نظر نہیں آتا۔ اسی صورتِ حال کے پیشِ نظر احتجاجاً انھیں منہ بسور کر یہ نعرہ بلند کرنا پڑتا ہے کہ اُردو ادب اپنی زندگی کے آخری سانس گن رہا ہے حالانکہ ان افراد کا کثیر حصّہ نہ تو ادیب ہونے کا گنہ گار ہو سکتا ہے اور نہ یہ لوگ ادب کی اعلےٰ اقدار کو سمجھنے کے اہل گردانے جا سکتے ہیں۔

ادب کے ان جعلی ٹھیکیداروں کو اتنی بھی تو واقفیت نہیں کہ ادب کے کسی بھی سنہرے اور ارتقائی دور میں نابغہ (GENIUS) قسم کے لوگ صرف محدودے چند ہوتے ہیں۔ پوری کھیپ کی کھیپ نہیں ہوتی۔

۲۔ دوسرا طبقہ خدا کے فضل سے ہمارے لائقِ صد احترام ڈاکٹر صاحبان کا ہے جن میں سے بہ استثنائے چند تمام کے تمام روایتی اور کتابی واقع ہوئے ہیں۔ یہ بزرگ عمداً اور مصلحتاً موجودہ دور کے کسی بھی عظیم شاعر یا ادیب کے حق میں "حرفِ خیر" استعمال کرنا اپنی علیل اور نازک مزاج ڈاکٹری کی موت سمجھتے ہیں۔ یہ ڈاکٹر چونکہ بنیادی طور پر کثرتِ مطالعہ یا RESEARCH کی پیداوار ہوتے ہیں اس لیے ان کا "مُردہ پرست" ہونا کوئی ایسی اچنبھے کی بات نہیں بلکہ میری ناقص رائے میں تو ان کا "زندہ پرست" ہونا ضرور محلِ نظر ہو سکتا ہے۔ البتہ یہ بزرگ آپس میں کتنے بھی مختلف الخیال کیوں نہ ہوں ایک مصالحتِ مشترکہ ان میں ضرور پائی جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی غلط انفرادی اور اجتماعی اہمیت کو برقرار رکھنے کی غرض سے حال کی چکاچوند کر دینے والی اقدار سے آنکھیں بند کر کے ماضی کے پُرسکون اور پناہ بخش اندھیروں میں نجات ڈھونڈھنے کو اپنے حق میں سعادتِ عظمےٰ خیال کرتے ہیں۔ ایک عرصہ سے احساسِ کہتری اور کیفیتِ تذبذب نے ان کو بُری طرح مرعوب کر کے مزار پرستی کا دین اختیار کرنے پر قانع کر رکھا ہے۔ ان میں سے بیشتر بزرگ ایسے مبالغہ آمیز حُسنِ عقیدت سے میر تقی کے مزار کے ارد گرد دھونی رمائے بیٹھے ہیں ——— ع

کہ روحِ میر بگوید "معاف فرمائید"

مجاورینِ ستودہ صفات و قائم بالذّات کے اس مقدس گروہ کی "بسیار فہمی" کی برکت سے نئی پود کے کئی ذہین اور ہونہار قلم کار غیر شعوری طور پر غیر مستحسن تقلید و تسلیم کی غلط راہ پر گامزن ہو کر اپنے ذاتی میلانِ فکر کی صالح قوتوں سے بھی محروم ہو چکے ہیں۔ اسی مسموم و مذموم کیفیتِ توکّل کو زندگی کے دانش کدے کے عظیم ڈاکٹر علّامہ اقبال نے ذہنی غلامی سے تعبیر کیا ہے ؎

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

دکاتیرِ کرام کی اس لاعلاج بوالعجبی کا ہی یہ ایک ادنےٰ کرشمہ ہے کہ ایسے متروک، کریہہ الصوت اور گنوار قسم کے الفاظ

جو مدت مدید سے مر اور دفن ہو چکے ہیں آج کل پھر کھوٹے سکے کی طرح رائج ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ابھی خاصی سمجھ بوجھ رکھنے والے "نو واردانِ بساطِ سخن" اسی قبیل کی مجذوبانہ بڑ ہانکنے کو کمالِ فن تصور کرتے ہیں ع

صحرا صحرا بستی بستی تیرے دوانے پھرتے ہیں

اب بتائیے کہاں یہ لوگ اور کہاں حضرت میر تقی کی ذاتِ گرامی۔ قدما نے تو ایسے الفاظ زمانے کے وقتی لسانی رواج اور اپنی نفسیاتی افتاد کے پیشِ نظر استعمال کیے ہیں لیکن یہ "مقلدانِ بے دلیل" اس ترقی یافتہ دور میں ان الفاظ کا اعادہ کر کے قدما کی عصمت سے چادر اٹھانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

اجی حضرت! آپ دور کیوں جاتے ہیں ذرا "نقوش" ہی کو اٹھا کر دیکھ لیجیے اور فرمائیے کہ اس کے کون سے ورق میں آپ کو "ٹھہراؤ" یا "تعطل" کا کوئی ہلکا سا سایہ بھی نظر آتا ہے اور اردو ادب کے جنم سے لے کر اب تک وہ کون سا ایسا "جریدہ" اشاعت پذیر ہوا ہے جو اس صحیفے سے ٹکر کھا سکتا ہے؟

آخر میں میں کچھ اشعار دورِ رواں کے شعرا کے نقل کرتا ہوں یہ فیصلہ آپ حضرات خود کر سکتے ہیں کہ یہ اشعار اردو ادب کے کون سے روشن ترین دور کی تخلیقاتِ عالیہ سے کم وزن ہیں۔

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں — مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں — تو میرا شوق دیکھ مرا انتظار دیکھ
روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل — آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر
اقبال

اے محتسب نہ پھینک مرے محتسب نہ پھینک — ظالم شراب ہے ارے ظالم شراب ہے
اے رحمتِ تمام مری ہر خطا معاف — میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا
جگر

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لیے — اگر رسول نہ آتے تو صبح کافی تھی
جوش

میرے منتقدوں کو مری راہ شوق میں — ہر گام پہ نشان ملا سجدہ گاہ کا
مری دنیا کا سرمایہ ہے عقبیٰ — بڑی تنخواہ کا زور و زموں میں
حفیظ

کیا کہوں کیا ہے خدا اور مذاہب کا ہجوم — اک حقیقت پہ ہیں چھائے ہوئے افسانے چند
غمِ زمانہ نہیں اک عذاب ہے ساقی — شراب لا مری حالت خراب ہے ساقی
اختر شیرانی

ذرا یہ حشر مرا نامۂ اعمال نہ دیکھ — اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آئے ہیں
تاثیر

وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں — اچھا کیا جو مجھ کو فراموش کر دیا
لطیف غنی

ایک بت ایک ہی بت کا ہوں پجاری اختر — اپنے اس شرک پہ توحید کا دعوے ہے مجھے
ہری چند اختر

جہاں پناہ مجھے بازوؤں میں لے لیجے — مری تلاش میں ہیں گردشیں زمانے کی
ندیم

آخر میں ایک سادہ رندِ باصفا کے چند ایک شعر سن لیں جسے لوگ سید عبدالحمید عدم کہتے ہیں ؎

تو آئے گا تجھے آنا پڑے گا مجبوراً — وہ اس لیے کہ مجھے انتظار ہے تیرا

کون سُنتا ہے صدا نزدیک کی ——— بے خبر جا دور سے آواز دے
ان میں اور ہم میں فاصلہ ہی کیا! ——— زندگی درمیان پڑتی ہے
صبحِ محشر کو ملتوی کر دو ——— ہو گئی میکدے میں رات مجھے
میں نے ہر ایک چیز کو اپنا سمجھ لیا ——— مجھ کو خبر نہ تھی یہ تری کائنات تھی
دنیا ترے وجود کو کرتی رہی تلاش ——— ہم نے ترے خیال کو یزداں بنا دیا
کہتے ہیں عمرِ رفتہ کبھی لوٹتی نہیں ——— جا میکدے سے میری جوانی اٹھا کے لا
محشر میں اک سوال کیا تھا کریم نے ——— مجھ سے وہاں بھی آپ کی تعریف ہو گئی
جیسے کہ ہاتھ میں نے دو عالم پہ رکھ دیا ——— محسوس یوں ہوا ترے دامن کو تھام کر
تازگی ہے تری جوانی کی ——— آئینے تو بہت پرانے ہیں
جل بھی جا بد نصیب پروانے ——— شمع کی زندگی دراز نہیں
مری جوانی کے گرم لمحوں پہ ڈال دے گیسوؤں کا سایہ ——— یہ دوپہر کچھ تو معتدل ہو تمام ماحول جل رہا ہے

مجید امجد

زیرِ نظر سوالات پر رائے زنی کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ یہ مسئلہ نقادوں کے بس کا ہے۔ میں ہرگز اپنے آپ کو اس کے اہل نہیں پاتا۔

میں نے گزشتہ آٹھ دس برس کے اندر اُردو کی جدید شاعری کی جو چیزیں پڑھی ہیں ان کو ہرگز اس نقطۂ نظر سے نہیں پڑھا کہ کل مجھے ان کے متعلق چند مخصوص سوالات کا جواب دینا ہوگا۔ بہرحال اپنی رائے بغیر کسی اُلجھاؤ کے بیان کرنے کی کوشش کروں گا، میں ہرگز اس بات پر اصرار نہیں کروں گا کہ میری رائے یا میرا تجزیہ درست ہے۔

ایک بات ظاہر ہے، ایک بات ناقابلِ انکار ہے، کہ جمود یا انحطاط کا الزام موجودہ دور پر منطبق نہیں ہوتا؛ غزل ہو کہ نظم دونوں اصناف یقیناً نئی نئی وسعتوں اور گہرائیوں سے روشناس ہوئی ہیں۔ میری نظر میں ان نئی وسعتوں کے اندر اب چند ایسے موڑ بھی آ گئے ہیں جہاں سے گذرتے وقت ادیبوں اور شاعروں کو بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

سب سے پہلے غزل کو لیجیے، یہ ماننا پڑے گا کہ گزشتہ دس برس کے اندر یہ صنف موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے نئی منزلوں کی طرف بڑھی ہے لیکن بعض نئے اور بلاشبہ فنکار غزل گویوں کے ہاں ان دنوں تعمیرِ الفاظ کا رجحان پیدا ہو چلا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کے پاس کہنے کی کوئی بات نہیں لیکن اچھوتی زمینوں کے ردیف و قوافی کے خمیر سے اور تو تراشیدہ تراکیب اور غیر مانوس الفاظ کے پردے میں وہ ایک ایسا طلسمِ اظہار بپا کر لیتے ہیں جو قاری کو ایک حیران کن دنیا میں لا کھڑا کر دیتا ہے۔ اس دنیا کے اندر ہر

صنعت گری اور رنگینی ہوتی ہے لیکن جذبے کی دھڑکن نہیں ہوتی۔ اس بات کے کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایوانِ شعر کی خشتِ اوّل انسانی تجربہ سے اُبھرنے والے افکار ہیں! اور یہ امر بے حد اہم ہے کہ آج بھی اکثر غزل کہنے والے ایسی غزل کہہ رہے ہیں جس میں نہ صرف نئے نئے الفاظ اور اچھوتی تراکیب ہیں بلکہ جس کے اندر مشاہدہ و تجربہ کی وہ نئی اقالیم بھی در آئی ہیں جو اس سے قبل جہانِ غزل میں کم دیکھنے میں آئی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کسی بھی دور کے لیے یہ اکتساب کم باعثِ فخر نہیں۔

نظم کے بارے میں اتنا کہوں گا کہ موجودہ دور میں نظم نے اپنے اندر، میری مراد ہے اپنی ہیئت کے اندر جو لچک پیدا کی ہے، وہ نظم کی روایت کا ایک اہم عنصر بن گئی ہے۔ اب اس ہیئت کے اندر اظہار کے اسلوب کے لیے قدم قدم پر ٹھوکر کا سامنا ہے، یہاں بھی ایک رجحان ان دنوں ایسا ابھر رہا ہے جس کی جلو میں "تکرارِ خیال" کی بدعت روپذیر ہو رہی ہے۔ نظم کی ہیئت کی لچک سے فائدہ اٹھانے کی بجائے بعض نظم گو نظم کی سطور کو مترادف جملوں کا جھمیلا بنانے لگ پڑے ہیں جس سے نظم کے مجموعی تاثر میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ ان دقتوں کے باوجود بھی اس دور میں ایسی نظمیں اکثر و بیشتر سامنے آتی ہیں جن میں خیال و صورت ایک دوسرے میں گتھ منتھ اور گھل مل گئے ہیں اور اگر یہ تجزیہ درست ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ گزشتہ دس بارہ سال کے اندر نظم نے قدم آگے نہیں بڑھایا؟

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب شعر کی مختلف اصناف نئی وسعتوں میں، نئی منزلوں کی طرف گامزن ہیں تو پھر یہ جمود کا نعرہ کیا حقیقت رکھتا ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جمود کا الزام ادب پر عائد نہیں ہوتا، جمود تو صرف قاری پر طاری ہے، پڑھنے والے جامد ہو گئے ہیں۔ آزادی کے بعد ہمارے معاشرے پر جو حالات مسلط رہے ہیں ان میں صرف ایک چیز زندہ رہی ہے "ہوسِ زر!" لوگ زندہ رہے ہیں، چغتائی کی تصاویر سے جمالیاتی لذت حاصل کرنے کے لیے نہیں، بلکہ خوبصورت کرنسی نوٹوں کی فراہمی کے لیے۔ ایسے معاشرے کے اندر کسی نے مطعون ہونا تھا تو ادب اور فن ہی نے ہونا تھا، ورنہ اگر کوئی سچے دل سے غور کرے تو اسی دور کے اندر ملاقات (فیض احمد فیض)، وادیٔ نیل (یوسف ظفر)، کیلنڈر (منیر نیازی)، سمندر اور انسان (حمایت علی شاعر) اور اس قسم کی اور بیسیوں نظمیں نظروں کے سامنے آئی ہیں جنھیں ادب کا کوئی طالب علم نظر انداز نہیں کر سکتا۔

جگن ناتھ آزاد

آپ نے ایک نعرے کا رشتہ ایک ادبی مسئلے کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ آخر ایک نعرے کا ادب کے ساتھ کیا تعلق؟ مجھ سے آپ نے اُردو شاعری کے بارے میں پوچھا ہے۔ اصل میں بقول استاذِ محترم ڈاکٹر سید محمد عبداللہ ان مسائل پر بحث کرنا نقادوں کا کام ہے، شعراء کا نہیں لیکن آپ کے حکم کی تعمیل میں اس مسئلے پر اپنے خیالات مختصر الفاظ میں آپ کے سامنے رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

آپ نے دو ٹوک جواب مانگا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ کسی ادبی مسئلے پر دو ٹوک بات کرنا مجھے ادبی مزاج کے خلاف نظر آتا ہے ادب دو اور دو چار سے بہت مختلف شے ہے لیکن اگر دو ٹوک جواب دینا ضروری ہے تو میرا جواب یہ ہے کہ موجودہ اردو شاعری قطعاً روبہ تنزل

نہیں ہے۔ اب رہے دلائل تو وہ میں اس مصرعے میں پیش کر سکتا ہوں کہ ؎

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

اگر آپ اجازت دیں تو میں اس مسئلے کو ایک دوسری طرح سے چھیڑوں گا۔ دراصل اقبالؔ نے ہماری شاعری کو ایسی بلندیوں سے آشنا کر دیا ہے کہ ان بلندیوں تک اقبالؔ کے بعد آنے والے شعراء کے لیے پہنچنا دشوار ہی نہیں قریب قریب ناممکن ہو گیا ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر ہم اکثر اس طرح سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ جب اقبالؔ کی شاعری سے زیادہ بلند شاعری معرضِ وجود میں نہیں آ رہی ہے ——— اور یقیناً ۱۹۳۸ء سے آج تک ایسا نہیں ہو سکا ہے ——— تو ہماری شاعری روبہ تنزل ہے۔ یہ تنزل شاعری میں نہیں ہے بلکہ ہمارے سوچنے کے ڈھنگ میں ہے۔ ہم نے اپنی سوچ بچار کو اس حد تک محدود کر لیا ہے کہ ہم اچھے برے، بلند پست، روبہ ترقی روبہ زوال کی تقسیم سے آگے جا ہی نہیں سکتے۔ علمی دنیا میں ایسا بھی ہو سکتا ہے بلکہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے کہ ایک فن پارہ بلند نہ ہونے کے باوجود پست نہ ہو۔ اچھا نہ ہونے کے باوجود برا نہ ہو اور روبہ ترقی نہ ہونے کے باوجود روبہ زوال نہ ہو۔ جہانِ رنگ سیاہ اور سفیدی پر مشتمل نہیں ہے اور بھی رنگ ہیں۔ اوقات دن اور رات ہی میں منقسم نہیں ہیں۔ موسم سردی اور گرمی ہی میں بٹے ہوئے نہیں ہیں۔ ایک موسم جب دوسرے میں ملتا ہے تو مدت تک لمحہ بہ لمحہ اس کی تبدیلی محسوس ہوتی رہتی ہے۔

اقبالؔ کی شاعری کے بعد اتنی عظیم اور اتنی بلند شاعری واقعی نظر نہیں آ رہی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمالہ کی بلند ترین چوٹی ماونٹ ایورسٹ پر جا کر ہمالہ کا سارا حسن ہی ختم ہو گیا ہے اور شملہ، نینی تال اور مری میں جو بلندی میں ایورسٹ سے کہیں کم ہیں کوئی حسن ہی نہیں کوئی جاذبیت ہی نہیں۔ شاعری ایک جلوۂ صد رنگ بلکہ جلوۂ ہزار رنگ ہے، اس میں عظمت اور حسن کے کئی پہلو ہیں۔ جہاں تک اردو کا تعلق ہے ہماری نگاہیں ایک ہی پہلو پر جم کر رہ گئی ہیں جو بہت عظیم بھی ہے اور بہت حسین بھی' اور وہ ہے اقبالؔ کی شاعری۔ لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اقبالؔ کے بعد اردو شاعری اپنے حسن کے اور جلوے دکھانے سے معذور ہو گئی ہے۔ اقبالؔ کی شاعری اپنے عصر کے دل کی دھڑکن ہے اور اقبالؔ کے انتقال کے بعد سیاسی اور سماجی دنیا اس تیز رفتاری سے چلی ہے کہ اقبالؔ کی زندگی میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اب یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے اکثر شعراء نے ۱۹۳۸ء کے بعد کی دنیا کے مسائل کو بڑے حسن، بڑی دلآویزی اور بڑے فن کارانہ انداز سے اپنی شاعری میں سمویا ہے۔ خود ہندوستان میں اور ہندوستان کی تقسیم کے بعد ہند و پاکستان دونوں ملکوں میں انفرادی اور اجتماعی زندگی نے ایسی کروٹیں بدلی ہیں کہ اقبالؔ کی شاعری اپنی تمام عظمت اور حسن کے باوجود ان کے ذکر سے خالی ہے۔ اس ضمن میں جوشؔ ملیح آبادی، حفیظؔ جالندھری، فراقؔ گورکھپوری، جمیلؔ مظہری، آل احمد سرورؔ، فیضؔ، محمد فیضؔ، سردار جعفری، سکندر علی وجدؔ اور قتیلؔ شفائی کی تخلیقات خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان شعراء کی تخلیقات عظمت کے اعتبار سے "مسجدِ قرطبہ" یا "ذوق و شوق" کے مقابلے کی نہ سہی لیکن یہ کہنا کہ ان شعراء کی شعری قوتِ تخلیق نے فکر و نظر کے قافلے کو آگے نہیں بڑھایا، حقیقت سے روگردانی ہے۔ ان شعراء نے یقیناً اس رستے کو ہموار کیا ہے جس پر ایک نہ ایک دن کوئی ایسا شاعر گامزن ہوگا جو اردو کا چوتھا بڑا شاعر کہلانے کا مستحق ہوگا۔

نظموں کے ساتھ ساتھ ایک لحظہ غزل کو بھی دیکھ لیجئے گا۔ اقبالؔ کی غزل کے متعلق میں یہ سمجھتا ہوں کہ جس طرح اس کی نظم انتہائی بلندیوں تک پہنچی ہے اسی طرح غزل کو بھی اقبالؔ کے سوزِ دروں اور نفسِ گرم کی بدولت ایک ایسی لطافت اور گداز عطا ہوا ہے کہ اردو شاعری ابھی تک اس کا جواب پیش کرنے سے قاصر ہے لیکن اس لطافت اور گداز اور بلندیِ فکر کے باوجود جب ہم جگرؔ کی غزل کو دیکھتے ہیں تو ایسے

واردات قلبی کی لذت سے آشنا ہوتے ہیں جو اقبال کے یہاں مفقود ہے۔ اسی طرح فراق کی غزل میں ایسی کیفیت اور سرمستی کا پتہ چلتا ہے جس کا سراغ فراق کی غزل کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتا۔ آخر یہ کیا ضروری ہے کہ ہم جگر اور فراق کی غزل میں اس فکری گہرائی کا کھوج بھی لگائیں جس سے اقبال کی غزل عبارت ہے۔

ایک لمحے کے لیے موجودہ اُردو شاعری کا ذکر چھوڑیے۔ قدیم اُردو شاعری ہی کو لیجیے۔ آخر اس شاعری کی پانچ صد سالہ تاریخ میں کتنے شعراء نے اپنے ماحول کو چونکایا ہے۔ ان کی تعداد تین ہی ہے نا؟ میر، غالب اور اقبال۔ میر کا زمانہ ہے ۱۷۲۱ء سے ۱۸۱۰ء، غالب ۱۷۹۷ء سے ۱۸۶۹ء اور اقبال ۱۸۷۳ء سے ۱۹۳۸ء۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا میر کے بعد غالب کے آنے تک اُردو شاعری روبہ تنزل رہی؟ اور کیا غالب کے بعد اقبال کے آنے تک اُردو شاعری روبہ تنزل رہی؟ ایک نابغہ کے بعد دوسرے نابغہ کے آنے میں ہمیشہ وقت صرف ہوتا ہے اور درمیانی وقفہ ضروری نہیں کہ ادب یا شاعری کے تنزل کا زمانہ ہو۔ دریاؤں اور سمندروں میں ہمیشہ رَو کے اندر ایک رَو چلتی ہے۔ بعض دفعہ چھوٹی رَو مخالف سمت کو بھی چلتی ہے لیکن اس سے بڑی رَو کی سمت یا رفتار متاثر نہیں ہوتی۔ اگر آج آپ کو زیادہ تر شاعری دوسرے یا تیسرے درجے کی نظر آ رہی ہے تو یہ اس بڑی رَو کے اندر ایک چھوٹی رَو کا کام کر رہی ہے جو اس سے بے نیاز ہے اور جسے اپنی سمت کا بھی علم ہے اور رفتار کا بھی۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ ادب کا ہر دور نابغوں سے پُر ہو۔ کسی زبان اور کسی ادب میں آج تک ایسا نہیں ہوا۔ ہر بڑے شاعر کے دور میں چھوٹے شاعروں کی بھرمار ہوتی ہے فردوسی، رومی، حافظ اور سعدی اپنے اپنے دور کے تنہا شعراء نہیں تھے۔ ایک ایک کے سینکڑوں ہم عصر تھے اور آج شاید ان تمام کا ذکر نہ "شعر العجم" میں موجود ہے نہ ای۔ جی براؤن کے تذکرے میں۔ انگریزی ادب ایک شیکسپیئر کے بعد آج تک دوسرا شیکسپیئر پیدا نہیں کر سکا تو کیا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ شیکسپیئر کے بعد انگریزی ادب روبہ تنزل ہے؟ یہ صحیح ہے کہ ہمارے یہاں اقبال کے بعد عظیم شاعری کی تخلیق نہیں ہوئی لیکن حسین اور بہت اچھی شاعری کی تخلیق کا عمل بدستور جاری ہے۔ یہ سوتے بند نہیں ہوئے مسلسل پھوٹ رہے ہیں۔

یہاں مجھے یہ کہنے کی بھی اجازت دیجیے کہ آپ کے سوال کی نئی بوتل میں مجھے قدرے پُرانی شراب کی جھلک نظر آ رہی ہے اور وہ ہے یہ سوال کہ کیا اُردو شاعری جمود کا شکار ہو رہی ہے؟ یہ سوال اس زمانے میں برِصغیر ہند و پاکستان میں اٹھا تھا جب انجمن ترقی پسند مصنفین اپنے عروج سے ہم کنار ہونے کے بعد صحیح معنوں میں روبہ تنزل تھی۔ اس وقت اس سوال کے ساتھ جو سیاست وابستہ تھی وہی سیاست بالآخر انجمن ترقی پسند مصنفین کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی۔ اس انجمن نے جہاں ابتدا میں شعراء اور ادباء کے سامنے فکر و نظر کی نئی راہیں کھولیں وہاں یہ انجام کار ایک سیاسی جماعت کا ادبی محاذ بن کر ان پستیوں کا شکار ہو گئی جن سے سیاست کی زندگی بالعموم عبارت ہوتی ہے۔ اس انجمن کے افراد کی گروہ بندیوں کی داستان کو چھیڑنے کا یہاں موقع نہیں لیکن یہ آواز اوّل اوّل اسی انجمن کے ان سرکردہ اراکین نے بلند کی جنھوں نے اپنے مخصوص حلقے سے باہر کے فن کاروں کی ادبی تخلیقات کو نہ غور سے دیکھنے کی زحمت گوارا کی اور نہ انھیں کسی قسم کی اہمیت دینا ضروری خیال کیا۔ سیاسی جماعت کا ادبی محاذ بننے کے باعث اس انجمن کے اکثر افراد کا فکر و نظر اسی طرح محبوس ہو گیا کہ ان کی ادبی تخلیقات کا معیار روز بروز گرتا گیا۔ شروع شروع میں تو انھوں نے تحسینِ باہمی کے اصول سے کام لے کر کچھ مدت تک اپنی گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھالا لیکن جب صورتِ حال بالکل بے قابو ہو گئی تو انھوں نے "ادب میں جمود" "شاعری میں جمود" کا نعرہ لگانا

شروع کر دیا حالانکہ ادب یا شاعری میں جمود نہ اس وقت تھا نہ اب ہے۔ وہ جس صورتِ حال کو جمود کا نام دے رہے تھے وہ ان کے اپنے قلب و نظر کی تنگیِ داماں تھی۔ اگر یہ خود ہی چند مرجھائی ہوئی کلیوں پر قناعت نہ کرتے تو تنگیِ داماں کا علاج گلشن میں ہر وقت موجود تھا۔

اصل میں آپ کے سوال میں لفظ "موجودہ" بڑی غلط فہمی پیدا کرنے کا باعث بن رہا ہے۔ اس لفظ سے کسی خاص دور کا تعین تو ہوتا نہیں۔ بات چیت کرتے وقت خیال بھی پندرہ بیس سال پہلے کی شاعری تک جاتا ہے اور پندرہ بیس سال فرد کی زندگی میں تو اہمیت رکھتے ہیں، ادب اور شاعری کی زندگی میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔ یہاں تو تسلسلِ حیات بڑی مدت کے بعد زمین سے ایک ایسا پھول اُگاتا ہے جس کی خوشبو سے دنیا مہک اٹھتی ہے۔ اقبالؔ جس کے جانے کے بعد ہمیں اپنی بے مائگی کا احساس بہت شدت سے ہونے لگا ہے خود ہی موجودہ دور کا شاعر ہے۔ اصل میں یہ دور اقبالؔ ہی کا دور ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ یہ صدی اقبالؔ ہی کی صدی ہے۔ جو شاعری اقبالؔ پیدا کر سکتی ہے اسے رُو بہ تنزل قرار دینا ایک ایسے احساسِ کمتری کا نتیجہ ہے جس کی قطعاً کوئی ٹھوس بنیاد نہیں۔

اور پھر شاعری جہاں ایک فرد کی شخصیت کی آئینہ دار ہوتی ہے وہاں قوموں کی شخصیت کی بھی آئینہ برداری کرتی ہے۔ زندہ قوموں کی شاعری کبھی رو بہ تنزل نہیں ہوا کرتی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ معترضین کے دلوں کا چور بھیس بدل بدل کر ہمارے سامنے آ رہا ہے یا کہیں آپ یہ تو نہیں چاہتے کہ "نقوش" کے ہر شمارے میں ہر نظم اقبالؔ کی ہو، ہر غزل غالبؔ کی ہو اور ہر افسانہ پریم چند کا ہو؟

سلام مچھلی شہری

میرا خیال ہے کہ اس سوال کا جواب براہِ راست "ہاں" یا "نہیں" میں نہیں دیا جا سکتا۔ میں تو نہیں دے سکتا البتہ اس سلسلے میں میری خواہش یہ ہے کہ میں فوراً اعلان کر دوں کہ "موجودہ اُردو ادب رو بہ تنزل نہیں ہے"۔ اپنی اس خواہش کے اظہار کے لیے میں کچھ سہارے بھی پا رہا ہوں۔ انھیں دلائل تو نہیں کہہ سکتا۔ خواہش اور دلیل کا آپس میں کوئی میل نہیں ہے۔

میں سب سے پہلے ایک شاعر ہوں اس لیے موجودہ اُردو شاعری ہی کے موضوع کو چھو رہا ہوں۔

۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک ہمارے شاعروں میں جو گرمی اور جوش تھا ظاہر ہے کہ آزادی کے بعد وہ نہیں رہا اور ہونا بھی نہیں چاہیے تھا۔ اب ہند و پاکستان کے مسائل الگ الگ ہیں۔ تعمیر پسند شاعروں نے انھیں محسوس کیا اور ان مسائل سے متاثر ہو کر نظمیں لکھیں۔ بزعمِ خویش ترقی پسند شعراء بہار میں بھی خزاں کا پرتو دیکھتے رہے اور اب تک ہر چیز سے بیزار نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنی نظموں کا مواد وطن کی دھرتی اور جیون سے نہیں لیتے بلکہ ہر موڑ پر اس آئیڈیالوجی کا سہارا لیتے ہیں جسے سیاسی طور پر وہ اپنا بنا چکے ہیں۔ ان کا سیاسی نعرہ" جلدی جلدی بدلتا رہتا ہے اور اسی اعتبار سے ان کی شاعری بھی بدلتی رہتی ہے۔ آج بزعمِ خویش ترقی پسند ادب کے تنزل پذیر ہونے کی یہی وجہ ہے۔

لیکن اس قسم کے "ترقی پسند ادب" کو کسی صورت میں بھی مجموعی طور پر "موجودہ اُردو ادب" نہیں کہا جا سکتا اور جہاں تک نئے اور موجودہ اُردو ادب کا سوال ہے وہ تنزل پذیر نہیں ہے ——— میرا دعویٰ ہے کہ صنفِ غزل گوئی میں آج جس تیور سے طبع آزمائیاں ہو رہی ہیں وہ ہر اعتبار سے قابلِ مبارک باد ہیں ——— اگر ہم "ہیرو شپ" کی عادت چھوڑ دیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ نئے شعراء مثلاً ناصر کاظمی اور خلیل الرحمٰن اعظمی وغیرہ بہت عمدہ غزلیں لکھ رہے ہیں۔ میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ آج خود فیضؔ کی غزلیں ان کی نظموں پر بھاری ہیں۔ اور تو اور مخدوم

بھی آج غزلوں کی طرف لوٹ آئے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ہمارا غزل گوئی کی طرف واپس آنا صحت مند نشان ہے یا نہیں؟ میرے خیال میں تو نہیں ہے۔ مایوس اس لیے نہیں ہوں کہ آج نظم گوئی کے میدان میں بھی کام ہو رہا ہے اور ہولے ہولے بڑے اچھے انداز سے ہو رہا ہے ——— پاکستان میں بھی نئے شعراء اچھی نظمیں لکھ رہے ہیں اور ہندوستان میں بھی ——— سمجھ دار ناقد مصطفےٰ زیدی (سابق تیغ الہ آبادی)، احمد ریاض، ابنِ انشاء، خلیل الرحمٰن اعظمی اور معصوم رضا راہی وغیرہ کو صرف مسکرا کر ٹال نہیں سکتے۔ نئی نسل سے ذرا ہی دیر پہلے کے شعراء ساحر لدھیانوی، اختر الایمان اور خود سردار جعفری وغیرہ نے ادھر بہت اچھی نظمیں لکھی ہیں (جعفری کی وہی نظمیں مجھے زیادہ اچھی لگی ہیں جو نعرے نہیں ہیں)

میں اپنے دیش کے اُردو شعراء میں جو نئی تخلیقی اُمنگیں دیکھ رہا ہوں وہ میری نظر میں بہت حسین ہیں ——— وطن کی نئی فضاؤں کو محسوس کرنے اور ہندی ادب سے قریب ہو جانے کے بعد ہماری شاعری میں اور بھی رچاؤ اور زندگی پیدا ہو گئی ہے ——— جگن ناتھ آزاد، عرش ملسیانی اور ساغر نظامی نے اِدھر بڑی حیات بخش نظمیں لکھی ہیں۔ جگر مراد آبادی، فراق گورکھپوری اور روش صدیقی کی غزلوں کا سانچہ بھی بالکل بدل گیا ہے اور ان کے گہرے مطالعے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر دیش کے نئے تقاضوں اور نئے ماحول سے متاثر ہیں ———

تو بھیّا! میں کیسے کہوں کہ موجودہ اُردو شاعری تنزل پذیر ہے ——— میں تو آج نیاز فتحپوری، مجنوں گورکھپوری اور آلِ احمد سرور ایسے ناقدوں کو بھی نظمیں اور غزلیں لکھتے ہوئے دیکھ رہا ہوں اور مانے لے رہا ہوں کہ "جائے استاد خالی ست"! آج بھی شاد عارفی کے کلام کا بانکپن اور پنڈت آنند نرائن مُلّا کی غزلوں کی گہرائی اور گمبھیرتا مجھے سرِ تسلیم خم کر دینے پر مجبور کر دیتی ہے۔

آخر میں بڑی بے باکی سے میں آپ سے یہ کہہ دینا چاہتا ہوں طفیل بھائی! کہ موجودہ اُردو ادب کو تنزل پذیر وہی لوگ کہہ سکتے ہیں جو اپنے "ہیرو شپ" کی عادتوں کے باعث خود "نکمّے" ہو چکے ہیں۔ انھوں نے کچھ لوگوں کے نام رٹ لیے ہیں اور اب جب وہ اپنے رٹے ہوئے ناموں کو بے جان پاتے ہیں تو چلّا اٹھتے ہیں "موجودہ اُردو ادب ہی تنزل پذیر ہے"۔ واہ! یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ بھلا یہ ممکن ہی کیسے ہو سکتا ہے؟ آج جب ماحول نیا ہے، مضامین نئے ہیں، حالات اور مسائل نئے ہیں تو یقیناً نئے لکھنے والے بھی تازہ دم ہیں ——— وہ نئے لکھنے والے یقیناً کام کر رہے ہیں جو خود دار ہیں، جن کی عادت نقّالی نہیں ہے اور جو ہیرو شپ کو بُری عادت سمجھتے ہیں اور ——— اور ساتھ ہی وہ نئے لکھنے والے ناکام ہیں جو اپنی ڈگر آپ نہیں بنانا چاہتے، جو بے حس ہیں اور جو اپنے دیش کی نئی فضاؤں سے متاثر نہیں ہیں ——— !

خود وضاحت کر دوں، یہ جو "دیش" کی بات میں بار بار کر رہا ہوں اس بات کو ملحوظ رکھنا اب بہت ضروری ہے ——— پہلے نیشنل، پھر انٹرنیشنل اور اس کے بعد آفاقی مسائل!! یہی وہ زینے ہیں جن پر ادب کی تخلیقی لہریں بھی یکے بعد دیگرے چڑھتی ہیں۔ آج ہم بھارت کے اُردو ادیب و شاعر سب سے پہلے ان ہی موضوعات کو اپنائیں گے جو اپنے ہیں اور جو ہر اعتبار سے ہم سے قریب ترین ہیں ——— بے شک بعض عالمگیر اور مشترک مسائل بھی ہو سکتے ہیں بلکہ ہیں لیکن انھیں محسوس کرنا، انھیں چھونا اور ان پر طبع آزمائی کرنا ان ہی فن کاروں کو زیب دیتا ہے جو ٹیگور اور اقبال کی عظمت کے دعوے دار ہو سکتے ہوں ——— آج کے اُردو ادب میں مجھے ایک بھی شاعر ایسا نظر نہیں آتا جو اس امر کا دعویٰ دار ہو سکے ——— جوش؟ نہیں! جگر؟ نہیں! حفیظ؟ نہیں! فراق؟ نہیں! فیض؟ بالکل نہیں ——— اس کے لیے ہمیں کم سے کم چالیس برس انتظار کرنا پڑے گا۔ کسی دیش میں کسی عظیم شاعر کا پیدا ہونا کوئی معمولی بات نہیں، اس کے لیے

بڑا انتظار کرنا پڑتا ہے۔

غرض کہ جو ہو رہا ہے ہونے دیجئے، جو کچھ لکھا پڑھا جا رہا ہے اسے جاری رہنا چاہیے —— یہ بہت غنیمت ہے کہ ہم متحرک ہیں اور چل رہے ہیں۔ یونہی چلتے چلتے ایک پر نور منزل تک بھی آ جائیں گے اور ہم میں کوئی نہ کوئی کبھی نہ کبھی عظیم ادیب اور شاعر بھی بن جائے گا —— ہند و پاک میں اردو شعراء کی بات تو الگ رہی ہے، دنیا کے دوسرے بڑے ملکوں کی بھی یہی حالت ہے، دوسری اصناف کو تو نہیں کہتا البتہ شاعری ان ملکوں میں بھی یونہی رینگ رہی ہے۔ "پاسٹرنیک" کے سلسلے میں بڑا طوفان برپا ہوا مگر اس کی تازہ تصنیف (خاص طور پر نظموں کا حصہ) پڑھنے کے بعد میں تو نہیں چونک سکا۔ اس سے اچھا تو آج افریقہ اور امریکہ کے نیگرو شعراء لکھ رہے ہیں۔

آپ کے سوال کے سلسلے میں میرا آخری جواب یہ ہے کہ موجودہ اردو ادب (خاص طور پر شاعری) تنزل پذیر ہرگز نہیں ہے بلکہ وقت کے مطابق ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بہت روشن نہیں ہے!

تنقید

ڈاکٹر نذیر احمد

اُردو تحقیق آزادی کے بعد

جدید تحقیق کی داغ بیل یورپ میں پڑی چنانچہ مشرقی زبانوں کے سلسلے میں بھی اہلِ یورپ ہی نے جدید طرز کے تحقیق کی ابتدا کی مگر مشرقی زبانوں میں صرف کلاسیکی زبانیں ان کی توجہ کا مرکز بنیں۔ اردو جدید زبان تھی اس بنا پر اہل مغرب اس کی طرف بعد میں متوجہ ہوئے۔ اتفاق یہ بھی دیکھیے کہ ہندوستان میں بھی اردو ایک مضمون کی حیثیت سے یونیورسٹی میں بہت بعد میں داخل ہوئی، انھیں وجوہ سے اُردو میں تحقیقی سرمایہ بہت قلیل تھا اور صرف چند محققین کا نام ملتا ہے جنھوں نے اس سرمائے کے بروئے کار لانے میں بڑی کوشش کی تھی۔ ان میں حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر عبدالحق، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، قاضی عبدالودود، پروفیسر مسعود حسن رضوی، حکیم شمس اللہ قادری، شیخ چاند، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، نصیرالدین ہاشمی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں میں ڈاکٹر عبدالحق اس لحاظ سے ممتاز ہیں کہ انھوں نے مختلف سمتوں میں اپنا کام پھیلایا، دکنیات کی سنگلاخ زمین کو ہموار کرنے کی کوشش کی۔ نظم ونثر کی متعدد کتابیں ایڈٹ کیں، اور تذکرے اور لغات اور قواعد کی کتابیں چھاپیں اور اچھے کتب خانے کی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے قدیم مخطوطات کے جمع کرنے کا منصوبہ بنایا، انجمن ترقی اردو کی علمی سرگرمیوں کے ساتھ اس کے ماتحت ایک معیاری تحقیقی رسالہ جاری کیا۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء کے قبل کے تحقیقی سرمائے میں ان کے کارنامے بلحاظ افادیت، و وسعت بہت بڑھے ہوئے ہیں۔

حافظ محمود شیرانی کی محققانہ صلاحیتیں ہر قسم کی تعریف سے مستغنی ہیں، ان کی وجہ سے اردو فن تحقیق سے صحیح معنوں میں ہم آشنا ہوئی، ان کی تحریر کا ایک ایک لفظ تحقیق کے اصول کے مرتب کرنے میں مدد دیتا ہے۔ قاضی عبدالودود دوسرے محقق ہیں جن پر اردو کو بجا طور پر فخر ہو سکتا ہے۔ ان دونوں محققین کی تحریریں یورپ کے کسی بڑے محقق کے مقابلے میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ قدیم اردو کی تحقیق کے سلسلے میں ڈاکٹر زور کی کوشش بھی مستحق ستائش ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد اردو تحقیق میں جان پیدا ہوئی، مختلف سمتوں میں کام بہت تیزی سے شروع ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دس بارہ سال میں قابل ذکر سرمایہ فراہم ہو گیا، اور اگرچہ ہم اس سرمائے پر مطمئن نہیں ہیں، کمیت و کیفیت دونوں اعتبار سے اس میں معتد بہ اضافہ ممکن تھا، پھر بھی تحقیق کی قلیل مدت کے پیش نظر اس سرمائے سے ہم کو بہت زیادہ شرمندگی نہیں ہوتی۔ ذیل میں اس تحقیقی سرمائے کا ایک مختصر سا جائزہ پ

کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے :

(۱) اردو متنوں کی تصحیح کا کام

قدیم شعرا کے دیوان، ادیبوں کی نثری تصانیف، اردو تذکروں اور فرہنگوں وغیرہ کی باقاعدہ تصحیح کا کام تیزی سے ہو رہا ہے گو تصحیح کے معیار کو بلند کرنے کی ضرورت ہے۔ ذیل میں ہر قسم کی کتابوں کی جدا جدا فہرست درج کی جاتی ہے۔

دواوین شعرا

کلیات انشا	محمد عسکری، محمد رفیع	ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد
دیوان فغاں	صباح الدین عبدالرحمن	انجمن ترقی اردو، کراچی
پھول بن	ڈاکٹر عبدالحق	″
من لگن	سخاوت مرزا	″
چندر بدن و مہیار	اکبر الدین صدیقی	مجلس اشاعت دکنی مخطوطات، حیدرآباد
تصویر جاناں	حمید الدین شاہد	″
رضوان شاہ و روح افزا	سید محمد	″
نو بہار عشق	محمد یوسف کوکن	مدراس یونیورسٹی
طالب و موہنی	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد
کتاب نورس	ڈاکٹر نذیر احمد	دانش محل لکھنؤ
کلیات میر	ڈاکٹر عبادت بریلوی	اردو دنیا کراچی
دیوان غالب	مالک رام	آزاد کتاب گھر دہلی
دیوان غالب	امتیاز علی عرشی	انجمن ترقی اردو علی گڑھ
دیوان سراج	ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی	ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد
مثنویات میر بخط میر	ڈاکٹر رام بابو سکسینہ	دہلی
دیوان شیفتہ	صلاح الدین احمد	اکیڈمی پنجاب لاہور
کلیات غواصی	محمد بن عمر	ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد
دیوان داؤد اورنگ آبادی	خالدہ بیگم	حیدرآباد
کتاب نورس (دوسرا[1] ایڈیشن)	ڈاکٹر نذیر احمد	بھارتیہ کلا کیندر دہلی
مثنویات راسخ	ڈاکٹر ممتاز	پٹنہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ ملی ۔ مطبوعہ

---

[1] پہلے ایڈیشن پر معتد بہ اضافہ ہے، خصوصاً مقدمہ اس دور کی تمدنی تاریخ پر حاوی ہے، متن اردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں بھی منتقل کر دیا گیا ہے۔

دیوان محمد علی فدوی	ڈاکٹر محمد حسنین	پٹنہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ ملی۔ مطبوعہ
کلیات عبداللہ قطب شاہ	سید محمد	حیدر آباد
کلیات میر حسن دہلوی	ڈاکٹر وحید قریشی	برائے ڈی۔ لٹ پنجاب یونیورسٹی
کلیات میر حسن دہلوی	ذکی الحق	زیر ترتیب
دیوان میر عبد الولی عزلت	عبد الرزاق قریشی	〃
دیوان بیان	ڈاکٹر عبد الستار صدیقی	〃
دیوان نعیم دہلوی	ڈاکٹر مختار الدین احمد	〃
دیوان شاہ قدرت دہلوی	قاضی عبد الودود	زیر طبع، ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ
مثنوی گلزار نسیم	قاضی عبد الودود	زیر طبع، کتاب نگر لکھنؤ
دیوان حاتم	ڈاکٹر سراج الحق قریشی	مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ڈاکٹریٹ ملی۔
دیوان آبرو	ڈاکٹر مسعود حسین خاں	زیر ترتیب
دیوان یک رو	ڈاکٹر مختار الدین احمد	〃
کلیات جرأت	محمود الحسن	〃
دیوان مبتلا	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	〃
دیوان حسرت (ہیبت قلی خاں)	عابد رضا بیدار	〃
دیوان تسکین	عابد رضا بیدار	〃
مثنوی نو سرہار	ڈاکٹر نذیر احمد	〃

نثری تصانیف

نو طرز مرصع	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد
مقدمہ شعر و شاعری	ڈاکٹر وحید قریشی	لاہور
دریائے لطافت	ڈاکٹر آمنہ خاتون	مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ڈاکٹریٹ ملی۔
لطائف السعادت	ڈاکٹر آمنہ خاتون	ملیہور
رسالہ مراۃ الاذکار	عبد القادر سروری	حیدر آباد
معراج العاشقین	خلیق انجم	دہلی
معراج العاشقین	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	〃
معراج العاشقین	ڈاکٹر نذیر احمد	زیر طبع، انجمن ترقی اردو علی گڑھ
معراج العاشقین	ڈاکٹر عبادت بریلوی	زیر ترتیب

اندرسبھا	وقارِ عظیم	زیرِ ترتیب
فسانۂ عجائب	"	"
رانی کیتکی کی کہانی	"	"
بیتال پچیسی	"	"

فرہنگ[1]

نوادر الالفاظ	ڈاکٹر سید عبداللہ	انجمن ترقی اردو کراچی

تذکرے

تذکرۂ ابن طوفان	قاضی عبدالودود	ادارۂ تحقیقاتِ اردو پٹنہ
تذکرۂ مسرت افزا	"	رسالۂ معاصر پٹنہ
تذکرۂ عشقی عظیم آباد شورش عظیم آباد } یکجا	کلیم الدین احمد	ادارۂ ادب پٹنہ
تذکرۂ شعرائے فرخ آباد	ڈاکٹر مختار الدین احمد	رسالۂ اردو ادب علی گڑھ
تذکرۂ نادر	مسعود حسن رضوی	کتاب نگر لکھنؤ
تذکرۂ خوب چند ذکا	مالک رام	زیرِ ترتیب
تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا	ڈاکٹر مختار الدین احمد	"
تذکرۂ صدر الدین آزردہ	"	"
عمدۃ المنتخبہ	مالک رام	"
تذکرۂ (دیوان) بینی نرائن جہان	کلیم الدین احمد	ادارۂ ادب پٹنہ
تذکرۂ طبقات الشعرائے مبتلا	ڈاکٹر محمد حسن	زیرِ ترتیب
تذکرۂ حیدری دہلوی	ڈاکٹر مختار الدین احمد	"

مخطوطات کی فہرستیں

فہرست اردو مخطوطات (۴ جلدیں)	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	ادارۂ ادبیات اردو، حیدر آباد
وضاحتی فہرست کتابخانۂ سالار جنگ	نصیر الدین ہاشمی	حیدر آباد
فہرست مخطوطات اردو جامعہ عثمانیہ	عبدالقادر سروری	"
فہرست مخطوطات اردو، کتابخانۂ آصفیہ	نصیر الدین ہاشمی	"
فہرست مخطوطات اردو و فارسی و عربی، اٹاوہ	ابرار حسن فاروقی	علی گڑھ

---

[1] اردو کی قدیم لغتوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اس لیے اس سلسلے میں زیادہ کام کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ البتہ تحقیق کر کے لغت لکھنے کی گنجائش ہے۔

فہرست مخطوطات اردو کتابخانۂ رامپور	امتیاز علی عرشی	زیر طبع
فہرست مخطوطات اردو کتابخانۂ انجمن ترقی اردو علی گڑھ	ابرار حسین فاروقی	مکمل ہوچکی ہے
فہرست مخطوطات اردو کتابخانۂ دانش گاہ علی گڑھ،	ڈاکٹر مختار الدین	زیر ترتیب

(۲) ادیبوں اور شاعروں کے متعلق تحقیقی مقالے اور کتابیں

تلامذۂ غالب	مالک رام	دہلی
متفرقات غالب	مسعود حسن رضوی	رامپور
احوال غالب	ڈاکٹر مختار الدین احمد	علی گڑھ
نقد غالب	" "	"
فرہنگ غالب	امتیاز علی عرشی	رامپور
جہان غالب	قاضی عبدالودود	زیر ترتیب
نوادر غالب	ڈاکٹر مختار الدین احمد	"
مآثر غالب	"	علی گڑھ
غالب بحیثیت محقق	قاضی عبدالودود (شامل در نقد غالب)	
میر تقی میر	ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی	علی گڑھ
میر نمبر	(رسالہ ساقی)	
میر اور ان کا کلام	مس زبیدہ قریشی	پنجاب یونیورسٹی
میر (انگریزی)	ڈاکٹر رام بابو سکسینہ	
جلال لکھنوی	ڈاکٹر محمد حسن	کراچی
ولی گجراتی	ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی	بمبئی
راسخ عظیم آبادی	ڈاکٹر ممتاز	پٹنہ یونیورسٹی
مرزا محمد علی فدوی	ڈاکٹر محمد حسنین	"
میر سوز	سید علی حیدر	"
میر حسن دہلوی	ذکی الحق	"
عبدالحلیم شرر	شریف الدین احمد	بمبئی
حالی کا ذہنی ارتقا	ڈاکٹر غلام مصطفیٰ	
قائم چاندپوری	محمد عرفان	آگرہ یونیورسٹی

رتن ناتھ سرشار	ڈاکٹر وشنو گوپال	الہ آباد یونیورسٹی
آیت اللہ جوہری پھلواردی	ایس۔ ایم صدر الدین	پٹنہ 〃
مرزا مظہر جانِ جاناں	خلیق انجم	دہلی 〃
نظیر اکبر آبادی	ڈاکٹر رضی الدین	مسلم یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ ملی
مرزا رسوا	میمونہ خاتون	مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
ذوق	تنویر احمد علوی	〃
ذوق اور ان کا کلام	انصار اللہ خان	جامعہ اردو علی گڑھ
مہدی افادی	آفاق احمد	وکرم یونیورسٹی اجین
بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد	خاور درانی کلیم	پنجاب یونیورسٹی
دبیر، ان کا فن اور زمانہ	مظفر حسن ملک	〃
مصطفیٰ خاں شیفتہ اور ان کے معاصرین	صفیہ عبد الحق	〃
آتش اور ان کا عہد	خواجہ محمد اختر بیگ	〃
مومن دہلوی	ناظر حسن زیدی	〃
نذیر احمد دہلوی	مس کلثوم سلطانہ	〃
رتن ناتھ سرشار	مس آمنہ عنایت	〃
پریم چند	عبید اللہ خاں	〃
جعفر علی حسرت	بشیر احمد علوی	〃

ان میں بہت سے پی، ایچ۔ ڈی کے مقالے ہیں۔ جن میں کچھ کام پورے ہو چکے ہیں، لیکن جو کام پورے نہیں ہوئے ان کا حال معلوم نہیں ہے۔

(۳) اصنافِ سخن کے سلسلے کی تحقیقی کتابیں

(ا) ڈراما اور داستانیں

اودھ کا شاہی اسٹیج	مسعود حسن رضوی	لکھنؤ
اودھ کا عوامی اسٹیج	〃	〃
اردو تھیٹر	ڈاکٹر عبد العلیم نامی	بمبئی
ڈرامہ نگاری کا فن اور اردو ڈراما	محمد اسلم	پنجاب یونیورسٹی
اردو ڈرامے کا ارتقا	....	الہ آباد یونیورسٹی

ہماری داستانیں	وقار عظیم	ادارہ فروغ اردو لاہور	
اردو کی نثری داستانیں	ڈاکٹر گیان چند	انجمن ترقی اردو، کراچی	

(ب) صحافت

اردو صحافت کی تاریخ	محمد عتیق صدیقی	انجمن ترقی اردو علی گڑھ
اردو صحافت	امداد صابری	دہلی
چند مضامین	قاسم علی سجن لال	حیدرآباد

(ج) اصناف سخن

اردو قطعات کا ارتقا	محمد علی ابو محمد	بمبئی یونیورسٹی	
اردو مکتوبی ادب کا ارتقا	ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی	دہلی یونیورسٹی	(ڈاکٹریٹ ملی)
اردو قصیدہ نگاری کا ارتقا	ڈاکٹر محمود الٰہی زخمی	مسلم 〃	(〃)
اردو خطوط نگاری 〃	منشاء الرحمٰن	ناگپور 〃	
اردو نظم نگاری کی تاریخ اور ارتقا	مریاد حسین شیخ	پنجاب 〃	
اردو میں طنز و مزاح	ڈاکٹر سید وزیر آغا	اکیڈمی پنجاب لاہور	
اردو رباعی کا ارتقا	ڈاکٹر سلام سندیلوی	لکھنؤ یونیورسٹی	(ڈاکٹریٹ ملی)
شمالی ہندوستان میں اردو مثنوی کا ارتقا	ڈاکٹر گیان چند	ڈی ۔ لٹ تفویض ہوئی	
اردو انشائیہ کا ارتقا	سیدہ جعفر	عثمانیہ یونیورسٹی	(ڈاکٹریٹ ملی)
اردو مقالہ نویسی کا ارتقا	......	الہ آباد یونیورسٹی	

(۴) لسانیات

اردو لسانیات پر بہت کم کام ہوا ہے، اس میں فیلڈ ورک کی سخت ضرورت ہے ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے اس طرف توجہ کی ہے ۔ ڈاکٹر مسعود حسین کی امریکہ سے واپسی کے بعد اعلیٰ پیمانے پر کام شروع ہو جانے کی امید ہے ۔ اس موضوع پر چند چیزیں جو شائع ہوئی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

اردو زبان کا ارتقا	ڈاکٹر شوکت سبزواری	ڈاکٹریٹ ملی
تاریخ زبان اردو	ڈاکٹر مسعود حسین خاں	مسلم یونیورسٹی
A PHONETIC AND PHONOLOGICAL STUDY OF THE WORDS IN URDU.	ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں	

علم زبان کے دوسرے شعبوں یعنی PHILOLOGY اور PHONETICS پر بھی اردو میں کچھ نہیں ملتا ۔ اس طرف بڑی توجہ

کی ضرورت ہے ۔

علاقائی ادب اور اردو کے دوسرے تحقیقی موضوعات

بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا	ڈاکٹر اختر اورینوی	پٹنہ یونیورسٹی سے ڈی۔ لٹ تفویض ہوئی ۔
سخنوران گجرات	ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی	
بمبئی میں اردو	میمونہ مقدم	
کوکن میں اردو	عبدالشکور قادری	
بہار میں اردو مرثیہ نگاری	نواب کریم	پٹنہ یونیورسٹی
میسور میں اردو کا ارتقا	حبیب النسا بیگم	دہلی یونیورسٹی
اورنگ آباد میں اردو ادب کا ارتقا	خالدہ بیگم	حیدرآباد (عثمانیہ)
میسور میں اردو ادب کا ارتقا	حبیب النسا بیگم	دہلی یونیورسٹی
دکن کے اردو مرثیے	رشید موسوی	حیدرآباد
اردو ادب میں پنجاب کا حصہ	امیر بٹ	پنجاب یونیورسٹی
ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق	میر عبدالحق	〃 (ڈاکٹریٹ ملی)
اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ	ڈاکٹر محمد عزیر	انجمن ترقی اردو، علی گڑھ (ڈاکٹریٹ ملی)
اردو نثر کا لکھنوی دبستان	آمنہ بلبانی	پنجاب یونیورسٹی
اردو زبان میں سفرنامے	قطب النسا	ناگپور یونیورسٹی
اردو میں نعتیہ شاعری	ڈاکٹر سید رفیع الدین	〃 (ڈاکٹریٹ ملی)
اردو میں بچوں کا ادب	ابراہیم یوسف	وکرم یونیورسٹی
اردو میں بچوں کا ادب	راج نرائن راز	دہلی یونیورسٹی
اردو شاعری میں ہندوستانی عناصر	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	〃 (ڈاکٹریٹ ملی)
اردو شاعری کا مذہبی اور فلسفیانہ عنصر	ا۔ د۔ نسیم	پنجاب یونیورسٹی
اردو ادب کے سیاسی و عمرانی میلانات	غلام حسین	〃
اردو شاعری میں فطرت اور مطالعۂ فطرت	شمیم اختر	〃

ان میں بیشتر ڈاکٹری کے مقالے ہیں، اس بنا پر جو کام ابھی تک مکمل نہیں ہوئے ہیں ان کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں ۔

(۶) تحقیقی مقالات

کتابوں کے مقابلے میں اردو مضامین تحقیق کا سرمایہ نسبتاً زیادہ ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ یہ سرمایہ کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے بڑا قابل توجہ ہے۔ ایسے سارے مضامین مختلف رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں، ان کے مجموعے بہت کم شائع ہوئے اس بنا پر ان سے عام طور پر استفادہ نہیں ہو سکتا۔ ہمارا یہ سرمایہ دوسری زبانوں کے تحقیقی سرمائے کا خوش اسلوبی سے مقابلہ کر سکتا ہے۔ ایران میں فارسی زبان و ادب کے متعلق بڑا کام ہو رہا ہے۔ اس ملک میں کام کی رفتار بڑی تیز ہے۔ ہر سال سیکڑوں معیاری تحقیقی کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ اس اعتبار سے ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لیکن تحقیقی مقالات کے اعتبار سے ہم ان سے کسی طرح پیچھے نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان سارے مضامین کی ببلیو گرافی تیار کر کے ان کو قابلِ استفادہ بنایا جائے

ان سارے تحقیقی مضامین کا احاطہ تو نہیں کیا جا سکتا البتہ مقالہ نگاروں میں سخاوت مرزا صاحب اس لحاظ سے قابل ذکر ہیں کہ انھوں نے دکنیات کے سرمایہ میں کافی اضافہ کیا اور بعض مصنفین کے تسامحات کو دور کیا۔ تحقیقی مضامین لکھنے والوں میں قاضی عبدالودود کی شخصیت سب سے ممتاز ہے۔ ان کے مضامین سے اردو تحقیق کا معیار بلند ہو گیا ہے۔ انھوں نے اختلاف آرا مسائل پر جس طرح اظہار خیال کیا ہے وہ کسی حال میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ غالب کی محققانہ صلاحیت پر جس قابلیت سے قلم اٹھایا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ آزاد کی تحقیقی قابلیت کے وہ قائل نہیں اور اس سلسلے میں ان کے مسلسل مضامین نکلے جنھوں نے ہر طبقے کے لوگوں سے داد تحسین حاصل کی۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی کتاب "میر تقی میر" پر ان کا تبصرہ تعریف سے مستغنی ہے۔ اسی طرح دیوان خانہ، بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا۔ تنقیدیات، تاریخ، دہلی کا دبستان شاعری پر ان کی تنقیدیں اور ڈاکٹر عبدالحق بحیثیت محقق ایسی تحریریں ہیں جن سے بعض اوقات ہمت شکنی ضرور ہوتی ہے۔ لیکن ان کی وجہ سے تحقیق کا معیار گرنے نہیں پاتا۔

ان کے علاوہ تحقیقی مقالہ نویسوں میں رشید حسن خاں، امتیاز علی عرشی، ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر زور، ڈاکٹر سید عبداللہ، کلب علی خاں فائق، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر مختار الدین احمد، نصیر الدین ہاشمی، وغیرہ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔

ان میں سے ہر ایک نے اردو ادب و زبان کے گوشوں کو روشن کرنے میں نمایاں خدمت انجام دی ہے۔

(۷) تحقیقی رسالے

اردو میں تحقیقی رسالوں کی کمی نہیں۔ لیکن ان میں کوئی بھی ایسا نہیں جو تحقیقی کام کرنے والے مختلف اداروں اور اشخاص میں تعاون پیدا کرے۔ ان رسالوں میں جو تحقیقی مواد ہے وہ بہت قیمتی ہے اور جیسا کہ اوپر عرض ہو چکا ہے کہ یہ سرمایہ کتابی سرمایہ سے زیادہ قابل توجہ ہے مگر اس سے استفادے کی صورت محدود ہے۔ اردو کے تحقیقی رسالے یہ ہیں:

معاصر پٹنہ: نوائے ادب بمبئی، اردوئے ادب علی گڑھ، اردو کراچی: اورینٹیل کالج میگزین لاہور، ان کے علاوہ ہند و پاکستان کے سارے موقر جرائد تحقیقی مضامین برابر شائع کرتے رہتے ہیں۔ معارف، برہان، نگار، اقبال، نقوش، ادب لطیف وغیرہ کی خدمات نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی طرف سے دو رسالے اردو میں شائع ہو رہے ہیں، ایک یونیورسٹی کے شعبۂ فنون (آرٹس فیکلٹی) کا ترجمان ہوگا جس میں عمرانیات و ادبیات کے سارے مسائل پر بحث ہوگی، اس میں تحقیقی مضامین شائع ہوں گے، دوسرا مجلہ یونیورسٹی کے علوم اسلامی کی طرف سے

زیرِ طبع ہے جس میں اسلام کی تاریخ و ثقافت اور عربی و فارسی و ترکی ادب و زبان پر تحقیقی مضامین شائع ہوں گے۔

۸) تحقیقی ادارے

ہند و پاکستان میں مختلف ادارے اردو کی خدمت میں مصروف ہیں۔ جن میں حسبِ ذیل قابلِ ذکر ہیں۔

ا۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدر آباد، یہ ادارہ تحقیقی و علمی کتابیں شائع کرتا ہے۔ اس کے مطبوعات کی تعداد سوا دو سو کے قریب ہے، اس ادارے کے ماتحت ایک کتب خانہ ہے۔ جس میں بڑی قیمتی قلمی و مطبوعہ کتابیں موجود ہیں۔ ڈاکٹر زور کی سرپرستی میں اس ادارے نے بڑی ناموری حاصل کر لی ہے۔ یہ ادارہ "سب رس" ماہنامہ شائع کرتا ہے۔

(ب) انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی، اس کے اغراض و مقاصد یہ ہیں:-

ایم کی تعلیم کا انتظام
پی۔ ایچ۔ ڈی اور دوسرے تحقیقاتی کام کرنے والوں کی اعانت
تحقیقاتی کام کرنے والے اداروں سے تعاون
ایک جامع کتب خانے کا قیام
مختلف کتب خانوں کے اردو مخطوطات کی فہرست کی ترتیب
نایاب مخطوطات و مطبوعات کی اشاعت
ادارے سے متعلق ایک علمی و تحقیقاتی سہ ماہی رسالے کا اجرا

یہی ادارہ "نوائے ادب" جیسا خالص تحقیقی رسالہ شائع کرتا ہے۔ جس میں اردو زبان و ادب سے متعلق تحقیقی مضامین شائع ہوتے ہیں اور گجرات اور دکن کی غیر مطبوعہ اردو کتابیں بالاقساط شائع ہوتی ہیں۔ اس ادارے میں بعض اہم تحقیقی کتابیں بھی شائع کی ہیں۔ اور بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ سید نجیب اشرف ندوی صاحب کے ماتحت اس ادارے نے اپنے مقاصد میں واضح طور پر کامیابی حاصل کی ہے۔

(ج) ادارہ تحقیقاتِ اردو پٹنہ۔ اس کے روحِ رواں قاضی عبدالودود صاحب ہیں۔ اس کے اہتمام میں متعدد تحقیقی کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ اس ادارے کے ماتحت ایک نمائش ہونے والی ہے جس میں اردو کی نادر قلمی اور مطبوعہ کتابیں پیش کی جائیں گی۔ اس نمائش کی ایک عجیب و غریب خوبی یہ ہے کہ اس میں شامل ہونے والی ساری کتابوں کی مفصل اور وضاحتی فہرست شائع ہو گی جس سے ان کتابوں کے بارے میں اتنی وافر معلومات جمع ہو گی جس سے تحقیق کرنے والوں کے لیے نئی راہیں نکلیں گی۔ قاضی صاحب کی یہ کوشش ستائش سے بالاتر ہے، اور بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ نمائش کی کتابوں کی ایسی مفصل فہرست شاید ہی کسی اور زبان میں مل سکے۔

(د) انجمن ترقی اردو علی گڑھ۔ یہ ایک اشاعتی ادارہ ہے جو ہر سال تحقیقی، تنقیدی، ادبی اور علمی کتابیں شائع کرتا ہے۔ پروفیسر آلِ احمد سرور صاحب کی توجہ سے انجمن نے ایک جامع لغت کا منصوبہ تیار کیا ہے جس کے لیے حکومتِ ہند نے گرانقدر رقم منظور کی ہے۔

(ی) پروفیسر مسعود حسن رضوی صاحب نے کتاب نگر نام کا ایک اشاعتی ادارہ حال ہی میں قائم کیا ہے جس کے ماتحت

متعدد تحقیقی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

(ف) انجمن ترقی اردو پاکستان، اس کے ماتحت علمی و ادبی کتابیں شائع ہوتی رہی ہیں۔ یہ انجمن علمی و ادبی خدمت کے سلسلے میں اپنی پرانی روایت کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ انجمن کی ساری سرگرمیاں ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی توجہ کی رہینِ منت ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان کے بعض اور ادارے اردو کی تحقیقی سرگرمیوں کے بڑھانے میں مصروف ہیں جن کا تذکرہ فی الحال نظرانداز کیا جاتا ہے۔

یہ ہے مختصر سی روداد اردو کے تحقیقی سرمائے کی۔ آخر میں تحقیق کے بعض بنیادی مسائل کا ذکر کر کے یہ مضمون ختم کیا جاتا ہے۔

(۱) متن کی تصحیح سے تحقیق کی ابتدا ہوتی ہے اور جتنا ہی معیار تصحیح اعلیٰ ہوگا اتنا ہی تحقیق کا معیار بلند ہوگا۔ اگر صحیح متن سامنے نہ ہو تو نہ تو شاعر و مصنف کے خیال ہی معلوم ہو سکیں گے اور نہ اس کی زبان ہی کا صحیح تصور کیا جا سکتا ہے۔ جس متن میں الحاق ہو اس میں الحاق کا تعین جس قدر دشوار ہے اتنا ہی ضروری بھی ہے۔ ایڈیٹر کا فرض ہے کہ وہ انتہائی خلوص و دیانتداری سے اس کام سے عہدہ برا ہونے کی کوشش کرے ورنہ مصنف کے بارے میں سارے مطالعات ناقص و ناکام رہیں گے۔

افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ ابھی ہمارا معیار تصحیح پست ہے، ہماری بہت ہی کم کتابیں اعلیٰ معیار پر پوری اتر سکیں گی۔ اس میں ہماری سہل انگاری کے ساتھ زبان کے مسائل سے ناواقفیت[1] کو بھی دخل ہے۔ انگریزی زبان کی چند غلطیوں کی بنا پر اردو ادب سے متعلق کتاب ہدف اعتراض بن جائے گی، لیکن ایسی ہی کتاب اگر اردو زبان کی غلطیوں سے مملو ہو تو شاید درخور اعتنا بھی نہ ہو اور اگر کسی گوشے سے اعتراض بھی ہو تو معقول عذر پیش کر دیا جائے۔

(۱) کتنا بڑا ستم ہے کہ ہمارے چوٹی کے مصنفین و شعرا کا کلام مدون و مرتب نہیں ہو سکا ہے۔ ان سے عقیدت کے باوجود ان کو صحیح طور پر پیش کرنے کا جذبہ مفقود ہے۔ اہم مصنفین کے کلام کا نول کشور ایڈیشن پر اکتفا کرنا بڑی قومی بدنصیبی ہے۔ سب سے بڑی قومی ضرورت یہی ہے کہ ان سارے مصنفین کے کلام معیاری طور پر تصحیح ہو کر اعلیٰ درجے کی طباعت کے ساتھ شائع ہوں۔ جب تک یہ کام نہ ہوگا ہمارا سر شرم سے خم رہے گا۔

(۲) تحقیق کے سلسلے کی دوسری ضرورت MONOGRAPH کی تیاری ہے۔ ابھی اردو میں اس کام کی ابتدا ہوئی ہے میرے خیال میں عموماً اس کی اہمیت نظرانداز ہو رہی ہے حالانکہ یہ مسلمات میں سے ہے بغیر معیاری MONOGRAPH کے زبان و ادب کے سلسلے کے سارے مسائل الجھے رہیں گے۔

(۳) مواد کی فراہمی میں سخت دشواریوں کا سامنا ہوتا ہے۔ کتابخانوں کی تنظیم، بکھرے ہوئے مواد کی فراہمی، چھپے ہوئے مواد کی تلاش کے بغیر تحقیق کا معیار کیونکر بلند ہو سکتا ہے۔ وضاحتی فہرستوں کا فقدان BIBLIOGRAPHICAL کتابوں کی عدم موجودگی سے تحقیقی کام کی صحیح ابتدا ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ کام جتنا مشکل ہے اتنا ہی ناگزیر بھی ہے۔

(۴) تحقیقی کام کرنے والوں کے درمیان باہمی رابطہ پیدا کرنے کی سخت ضرورت ہے، اس کے لیے الگ رسالے چھپنے چاہئیں۔ حال میں ہندوستان اور پاکستان میں تحقیق کرنے والوں کی جو مختصر فہرست شائع ہوئی ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک جگہ کے رہنے والے دوسری جگہ کے کام کرنے والوں سے بالکل بے خبر ہیں۔ ایک ہی موضوع پر بے خبری کے عالم میں دو جگہ کام ہونا سوائے تضیع وقت کے اور کچھ نہیں۔ ایک شخص نے جہاں تک کام کو پہنچایا ہو دوسرے کو وہاں سے شروع کرنا چاہیے۔ ذیل میں اس طرح کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

شمالی ہندوستان میں اردو مثنوی کا ارتقا	ناگپور اور الہ آباد	جنگ آزادی میں اردو کا حصہ	الہ آباد اور لکھنؤ
اردو ادب میں طنز و ظرافت	بمبئی، لکھنؤ اور پنجاب	اردو رباعی کا ارتقا	ناگپور اور لکھنؤ

---

[1] اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے رسم خط کی بعض خصوصیت کو اس سلسلے میں بڑا دخل ہے، حرفوں کے ملا کر لکھنے اور لفظوں کی کثرت کی وجہ سے اردو، فارسی اور عربی میں جتنے اختلاف نسخ ہوتے ہیں اور کسی زبان میں نہیں۔

اردو میں مکاتیب، ادب کا ارتقا	دہلی۔ سندھ۔ ناگپور	قائم چاند پوری	آگرہ۔ ڈھاکہ
رتن ناتھ سرشار	آگرہ۔ ڈھاکہ	اردو ڈرامے کا ارتقا	الہ آباد۔ پنجاب
انیس اور ان کا فن	الہ آباد۔ لکھنؤ	عبد الحلیم شرر	علیگڑھ۔ بمبئی اور پنجاب
مرزا رسوا	علی گڑھ۔ بمبئی	انشائیہ و مقالہ نویسی	الہ آباد۔ حیدر آباد
ابو الکلام آزاد	دہلی۔ علی گڑھ	میر اور ان کا کلام	دہلی۔ پنجاب
میر حسن دہلوی	پٹنہ۔ پنجاب		

اس سلسلے کی ایک دشواری یہ بھی ہے کہ چند دنوں کام کرنے کے بعد کام ناتمام چھوڑ دیا جاتا ہے، اس کی بھی اطلاع نہیں ملتی۔ اس اطلاع کی بھی سخت ضرورت ہے۔

(۵) اکثر تحقیقی کام یونیورسٹیوں میں ہوتا ہے اور کام کے تکملے پر ڈاکٹری کی ڈگری دی جاتی ہے۔ اب ان ڈگریوں کے حصول کا جذبہ ایسا عام ہوتا جا رہا ہے کہ شاید چند دنوں میں یہ ڈگری ایم۔ اے کے برابر ہو جائے۔ ڈگری کے حصول کے جذبہ کی عمومیت اتنی خطرناک نہیں جتنی حصول کے قواعد میں آسانیاں۔ البتہ عمومیت میں اتنا خطرہ ضرور ہے کہ پھر ہر شخص تحقیق کرنے کے درپے ہو جاتا ہے خواہ وہ اہل ہو یا نہ ہو۔ اور اگر ڈگریوں کے حاصل کرنے والوں کی تعداد کی کثرت شعبے کی بڑی کارگزاری خیال کی جائے تو پھر معیار کی پستی اس کا لازمی نتیجہ ہوگا۔ اس بنا پر میری گزارش یہ ہے کہ تحقیق کے معیار کو گرنے سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم تعداد بڑھانے کے جذبے سے دور رہیں۔ دوسری گزارش یہ ہے کہ تحقیقی کام کی نگرانی میں بڑی توجہ کی ضرورت ہے۔ اور اگرچہ ہمارے حالات نامساعد ہیں پھر بھی اساتذہ کی ذمہ داری کم نہیں ہوتی۔ بغیر شفیق استاد کے اچھا کام نہیں ہو سکتا۔

(۶) تحقیق میں بڑی ڈسپلن درکار ہے۔ محقق کو اپنی پسند و ناپسند سے بالاتر ہونا چاہیے۔ اپنی تنقید پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ شخصیت پرستی سے اونچا اٹھنے کی ضرورت ہے۔ پھر مختلف علوم پر بھی نظر ہونا چاہیے۔ زبان و علم زبان سے واقفیت درکار ہے۔

(۷) تحقیق کرنے والے حضرات کی ایک باقاعدہ انجمن ہونی چاہیے جس کے ارکان گاہے گاہے مل بیٹھیں اور تحقیق کے معیار کو بلند کرنے سے ذرائع پیدا کریں۔

اگر ان تجاویز پر عمل ہو تو مجھے یقین ہے کہ اردو تحقیق کے معیار کے بلند ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

نیاز فتحپوری

”کیا موجودہ ادب روبہ تنزل ہے؟“

یہ ہے وہ سوال جو ہندو پاک دونوں جگہ کچھ عرصہ سے سُننے میں آ رہا ہے (ہندوستان میں کم اور پاکستان میں زیادہ) ———— یہ گویا ایک قسم کا DEBATE ہے جس پر موافق و مخالف رائے دینے کی دعوت جاری ہے اور اب تک صدر ——— (اگر کوئی اس کا مقدر ہے) رایوں کے توازن کے پیش نظر کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکا۔

اس سے قبل کئی بار طفیل صاحب نے مجھے اس موضوع پر اظہار خیال کی دعوت دی لیکن یہ موضوع مجھے ہمیشہ کچھ اُلجھا ہوا سا نظر آیا اور

اسے میں بہ لطائف الحیل ٹالتا رہا لیکن اب کہ اصرار نے زیادہ سنگین صورت اختیار کر لی ہے، خاموش رہنا مناسب نہیں، گو جانتا ہوں کہ نتیجہ کے لحاظ سے یہ بے معنی سی بات ہوگی۔

میں نے ابھی ابھی یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ سوال مجھے بہت اُلجھا ہوا نظر آتا ہے، اس لیے سب سے پہلے اسی کی وضاحت ضروری ہے —— اس سوال کے مبہم ہونے کا سبب یہ ہے کہ ادب کے حدود اس میں مقرر نہیں کیے گئے اور یہ صراحت کبھی نہیں کی گئی کہ ادب سے ان کی مراد کیا ہے ——؟

ادب بڑا وسیع المعنی لفظ ہے جس میں علومِ نقلیہ و عقلیہ بھی شامل ہیں۔ اس لیے اگر میں اس کے صحیح مفہوم کو سامنے رکھ کر اپنی رائے ظاہر کروں تو وہ یقیناً اس رائے سے مختلف ہوگی جو اس کے محدود معنی کے پیشِ نظر میں قائم کر سکتا ہوں۔

چنانچہ مختصراً میں دونوں کے متعلق اپنی رائے ظاہر کیے دیتا ہوں۔

اگر اس جگہ ادب سے مراد محض ادبِ لطیف ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم صرف اس بات پر غور کریں کہ اس وقت شاعرانہ رجحان کیا ہے۔ افسانہ یا ناول نویسی کس سطح پر ہے اور انتقاد نگاری کس منزل سے گزر رہی ہے —— یہ گفتگو بڑی فرصت چاہتی ہے جو اس وقت مجھے حاصل نہیں —— تاہم جو لٹریچر اس قسم کا پیش کیا جا رہا ہے اس کے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اُردو افسانہ نگاری کا دور ہند و پاک دونوں جگہ یقیناً انحطاطی دور سے گزر رہا ہے —— اور یہی وہ سبب تھا کہ بعض ادیبوں نے افسانہ نگاری سے اعراض کر کے ناول نویسی اختیار کر لی جو یقیناً ایک گزرے ہوئے دور کا اعادہ تھا اور غالباً اس سے زیادہ ناکام و مایوس کن ——

اس میں شک نہیں کہ بعض ناولوں میں عہدِ حاضر کے موجودہ رجحانات بھی پائے جاتے ہیں لیکن وہ رجحانات مستعار ہیں تجرباتی نہیں۔ ان میں روسی ادب کی تقلید کی گئی ہے لیکن بہت ناکام، کیونکہ روسی ادب میں واقعیت و تجربہ ہے اور یہاں محض تصوّر و قیاس —— اس لیے مجھے امید نہیں کہ قدرِ اوّل کا کوئی ناول نویس ہمارے یہاں پیدا ہو سکے۔

ہند و پاک کے بہت سے ادیب اس سے قبل اچھے افسانہ نگار سمجھے جاتے تھے لیکن اب ان میں سے اکثر ختم یا خاموش ہو گئے اور بعض نے معاشی مجبوریوں کی وجہ سے افسانہ نگاری کو اپنا پیشہ بنا لیا اور اس قدر گر گئے کہ اب ان کا عدم و وجود برابر ہے۔

جنسیاتی افسانہ نگاروں کا حال بھی قریب قریب یہی ہے۔ بعض کا یہ فن جوانی کے ساتھ ختم ہو گیا اور بعض جو موجود ہیں ان کا یہ حال ہے کہ ان پر شاید جوانی کبھی آئی ہی نہیں۔ وہ حُسن و شباب پر فلسفیانہ گفتگو تو کر سکتے ہیں لیکن تجرباتی جوشش و صداقت کا ان کے یہاں کوسوں پتہ نہیں —— ہو سکتا ہے کہ اس کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ اس وقت ملک خاص اقتصادی و سیاسی بحران سے گزر رہا ہے اور اب سوال ذوق و وجدان کا نہیں بلکہ ضرورت و مصلحت کا ہے اور یہ احساس آرٹ کے لیے سمِ قاتل کا حکم رکھتا ہے۔

قریب قریب یہی حال ہماری موجودہ شاعری کا ہے کہ اس میں تصنع و آورد کی تو بے شک بہت سی خوشنمائیاں پائی جاتی ہیں اور ندرت و جدت کی بھی کمی نہیں لیکن صداقت و خلوص مفقود ہے۔

رہا انتقادی لٹریچر سو کمیت کے لحاظ سے تو اس کی کمی نہیں لیکن کیفیت کے لحاظ سے وہ کچھ نہیں ہے —— وہ یکسر مغرب کی نقالی ہے اور وہاں کے انتقادی نظریوں کی تفصیل —— جن کو دیکھ کر بعض اوقات یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ناقدین غالباً انھیں سمجھ بھی نہیں سکے ہیں، مغربی اصطلاحوں کا ترجمہ تو انھوں نے بے شک کر لیا ہے لیکن انھوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ ان کا انطباق ہمارے یہاں کی شاعری پر ہو سکتا ہے یا نہیں، اور اگر ہو سکتا ہے

تو کس طرح۔ اس کے لیے بڑے وسیع مطالعہ اور ذہنی تکمیل کی ضرورت ہے جس سے ہمارے اکثر نقاد محروم ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اس وقت کی تمام انتقادی تصانیف ایک ہی انداز کی ہیں اور ان میں فرق صرف زبان و بیان کا ہے۔

اب رہی ادب کی وہ شاخ جس کا تعلق افادی علوم و فنون سے ہے سو اس میں بے شک ترقی کے آثار نظر آتے ہیں اور اس وقت ملک کے بعض ادارے اس سلسلے میں اچھی خدمات انجام دے رہے ہیں خصوصیت کے ساتھ پاکستان میں یہ رجحان زیادہ بڑھتا جا رہا ہے اور اس دوران میں وہاں بعض بڑی اہم تاریخی تصانیف شائع ہو چکی ہیں گو ان میں تراجم زیادہ ہیں۔

صحافتی ادب ہندوستان میں بہت زیادہ رُو بہ انحطاط ہے لیکن پاکستان میں اس وقت بعض بڑے اچھے معیاری رسائل و جرائد شائع ہو رہے ہیں جو صوری و معنوی دونوں حیثیتوں سے قابلِ قدر ہیں۔

عبدالماجد دریابادی

آپ مجھ دقیانوسی کو خواہ مخواہ گھسیٹ کر ترقی پسندوں کی بزم میں لانا اور نقلِ محفل بنانا چاہتے ہیں —— ع

اب میں تمہارے کام کا ہم نفسو! رہا نہیں

مجھے کیا خبر کہ "ادب کی ترقی" آپ کسے کہتے ہیں اور ادب کے "تنزل" کا معیار آپ حضرات کے نزدیک کیا ہے۔ میں تو اپنے نقطۂ نظر سے تنزل ہی تنزل پاتا ہوں —— یعنی حقائقِ زندگی سے غفلت میں ہر روز اضافہ!

ڈاکٹر محی الدین زورؔ

اُردو تنقید رُو بہ زوال نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس موضوع سے متعلق جو نئی نئی کتابیں آئے دن شائع ہوتی رہتی ہیں وہ کیفیت اور کمیت دونوں کے لحاظ سے اس قابل ہیں کہ کوئی زندہ اور شگفتہ زبان ان پر فخر کر سکتی ہے۔

ان کتابوں اور مجموعوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو کے بعض بڑے نقاد اس صنفِ ادب کی جدید تحریکوں اور قدروں سے ناواقف نہیں ہیں اور برابر کوشش کر رہے ہیں کہ ترقی یافتہ زبانوں کے تنقیدی رجحانوں اور خصوصیتوں سے اُردو کو محروم نہ رہنے دیں۔ آج سے ۳۲ سال قبل ۱۹۲۷ء میں جب میں نے روحِ تنقید چھپوائی تھی اور اس کے دو سال بعد تنقیدی مقالات شائع ہوئے تھے تو اس صنفِ ادب پر کوئی فنی کتاب موجود نہ تھی۔ اب بھی فنی کتابوں کی کمی ہے اور ترقی یافتہ زبانوں میں اصولِ تنقید پر جس پایہ کی کتابیں اس عرصہ میں لکھی گئی ہیں ان کے ہم پلّہ کوئی کتاب اُردو میں موجود نہیں اور اس لحاظ سے اُردو کا تنقیدی ادب بہت کمزور ہے مگر جس معیار کے تنقیدی مضامین لکھے جا رہے ہیں اور ان کے مجموعے شائع ہو رہے ہیں ان کے پیشِ نظر اُردو زبان کسی بھی ترقی یافتہ زبان سے پیچھے نہیں نظر آتی۔

اس سلسلہ میں ایک تلخ حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ اُردو کے تنقید نگاروں اور کسی حد تک تنقید کے نام سے کتابیں شائع کرنے والے ناشروں کا یہ عیب کسی صورت میں قابلِ درگذر نہیں ہو سکتا کہ دو چار نقادوں کے مضامین یا تحقیقی مقالوں کو جمع کر کے ایک ایسے عنوان سے مجموعہ چھپوا دیتے ہیں کہ نام یا سرورق دیکھنے والوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید اس میں فنِ تنقید پر ضروری معلومات اور معیاری مضامین درج ہوں گے۔ لیکن کتاب کھول لینے پر پتہ چلتا ہے کہ جو مضامین شاملِ کتاب ہیں ان میں ایک بھی صحیح معنوں میں تنقیدی نہیں ہے۔

اگرچہ روحِ تنقید کو شائع ہوئے ۲۳ سال گزر چکے ہیں اور اس کے متعدد ایڈیشن بھی چھپ چکے ہیں اور اس کے بعد حامد اللہ افسر صاحب کی نقدِ ادب کے بھی شاید کئی ایڈیشن شائع ہوئے مگر میں سمجھتا ہوں کہ اُردو کے اکثر و بیشتر نقاد اب بھی تنقید نگاری کے صحیح فرائض اور ذمہ داریوں سے واقف نہیں ہیں اور نہ ان بنیادی اصولوں کو جانتے ہیں جن پر اس فن کا انحصار ہوتا ہے۔ لیکن اس ایک عام کمزوری کے باوجود یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ اُردو تنقید رُو بہ زوال ہے۔ جس پایہ کے تنقیدی مضامین گذشتہ چند سالوں سے اُردو کے رسائل میں شائع ہو رہے ہیں ان کو پیشِ نظر رکھ کر بحیثیتِ مجموعی جو رائے قائم کی جا سکتی ہے وہ بڑی خوش آئند ہے۔

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ۔

۱۹۵۴ء میں میری ایک کتاب چھپی جس کی سُرخی ہے "اُردو میں تنقید"۔ اس میں میں نے اور باتوں کے علاوہ جدید اُردو نقادوں کو منشیانِ تنقید کہا۔ اس وقت میں سنجیدہ تھا مگر پاکستان آکر بغیر ہنسے زندہ رہنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوا اس لیے اب میں ان لوگوں کو ایک مزاحیہ فقرے سے یاد کرتا ہوں یعنی منشی کے بجائے بابو کہتا ہوں اور منشیانِ تنقید کے بجائے اسی طرح تنقید بابو کہتا ہوں جیسے ریل پر سوار ہونے والے عوام ٹکٹ دینے والے منشی کو ٹکٹ بابو کہتے ہیں۔ ان پر ابھی میں نے ایک مضمون لکھا ہے جس کی سُرخی ہے "تنقید اور تنقید نگاری" اور جو "ساقی" کے اکتوبر نمبر میں آرہا ہے۔ یہ مضمون ظاہر ہے مزاحیہ رنگ لیے ہوئے ہے مگر اب بھائی طفیل صاحب کا حکم نہیں تو خواہش ضرور ہے کہ "اس مسئلہ پر پوری سنجیدگی سے غور کیا جائے" لہٰذا کچھ دیر ہی کے لیے سہی پھر سنجیدہ ہو کر اپنی رائے عرض کرتا ہوں۔

کسی فارسی شاعر نے کہا تھا "شعر مرا بمدرسہ کے برد؟" حقیقت یہ ہے کہ شعر ہی نہیں بلکہ کوئی فن ہو جہاں مدرسہ میں پہنچا اور اس کی رُوح ختم ہو گئی۔ مذہب پیغمبر کے ہاتھ سے فقیہوں کے پاس پہنچا اور ختم، ادب یونیورسٹیوں وغیرہ میں آیا اور منشی گیری ہوا۔ اصل میں ہر فن کی طرح تنقید کسی فرد کی اپنے مخصوص فن کی بابت یا اس کے ہم نوا فنکاروں کی بابت رائے کا نام ہے۔ ایک وقت آتا ہے جب کہ شاعری پست درجہ پر پہنچ جاتی ہے اور اس کو ہر طرف سے صلواتیں سُنائی جاتی ہیں۔ اس وقت ایک پیدائشی شاعر سر فلپ سڈنی "اپالوجی فور پوئٹری" لکھتا ہے یا حالی "مقدمہ شعر و شاعری" لکھتا ہے۔ ان دونوں تصانیف میں کچھ پُرانے اصولوں، کچھ پُرانے اقوال کو جمع کر کے شاعری کو ایک نئی حیثیت دی گئی اور اس کی رُوح کو پھر سے تازہ کرنے کا نیا اعلان کیا گیا اور ساتھ ہی دونوں شاعروں نے اپنے عمل سے بھی یہ ثابت کر دیا ہے کہ شاعری نہ مری ہے نہ مر سکتی ہے۔ اسے تنقید کہا جاتا ہے۔ آگے بڑھ کر ایک ڈرائڈن آتا ہے۔ اپنی قوم کی ڈرامائی شاعری کی ان سب خصوصیات کو جمع کرتا ہے جو مخصوص طور پر قومی ہیں، ان کو اصولوں میں تبدیل کرتا ہے اور وہ چیزیں جو یونانی یا فرانسیسی نظریۂ ڈرامہ کے مطابق نقص گنی جاتی تھیں اب قومی ڈرامے کی نمایاں خصوصیات ہو جاتی ہیں۔ اصول وضع کرنے کی بجائے وہ تمام ادب کا جائزہ لیتا ہے اور ہر بڑے شاعر کی فطرت کو جملوں اور فقروں میں اس طرح اتار دیتا ہے کہ یہ جملے اور فقرے آخری لفظ ہو جاتے ہیں۔ پوری قوم کا ایک نیا مذاقِ سخن بن جاتا ہے۔ اب تنقید اعلیٰ درجہ پر پہنچ گئی۔ اس کا جو بیج بویا گیا تھا اس میں سے بڑا درخت اُگا جس کی ٹہنیاں اور پتے پورے ادب پر چھا گئے۔ ہمارے یہاں حالی کے بعد کوئی ڈرائیڈن آیا؟ نہیں —— تنقید ہمارے سڈنی یعنی حالی ہی تک آئی تھی کہ ایک دم معلمین کے ہاتھوں میں پہنچ گئی جو اپنے آپ بزعمِ خود نقاد کہلاتے۔ یہ ویسے ہی ہوا جیسے کہ تقطیع سکھائی جائے پھر اس کے مطابق الفاظ بٹھانا سکھایا جائے اور کچھ مشق کے بعد سیکھنے والا شاعر ہو جائے اور شاعر کہلاتا پھرے۔

تنقید اور تخلیق ساتھ ساتھ چلتی ہے اور ہر بڑا شاعر کم از کم اپنے فن کا بڑا نقاد ضرور ہوتا ہے۔ میری نظر میں اُردو کے سب سے بڑے نقاد

میر، غالب، میر انیس اور اقبال ہیں۔ میر انیس کے سلسلے میں میری ایک کتاب "مرثیہ نگاری اور میر انیس" موجود ہے جس میں میں نے اس کے سوا اور کچھ نہیں کیا کہ میر انیس کے مراثی ہی سے اصول لے کر یہ دکھاؤں کہ مراثی کا فن کیا ہے اور اسے کیسے جانچنا چاہیے؛ اقبال پر بھی بہترین تنقید ان کے اشعار ہی میں ملتی ہے مگر جب ہم تنقید کے مخصوص فن کا خیال کرتے ہیں تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ باوجود اعلیٰ ترین تنقیدی شعور کے اقبال نقاد نہیں بلکہ شاعر ہیں۔ بات کیا ہے اقبال اور دوسرے بڑے شاعروں نے وہ کام نہیں کیا جسے ہم تنقید کہتے ہیں۔ یہ کام کیا ہے؟ ڈرائیڈن اپنے دور کا سب سے بڑا شاعر تھا اور ملٹن پر اس کی تنقیدیں بہت ہیں، ویسے ہی جیسے اقبال کے اکثر اشعار کسی نہ کسی شاعر پر مکمل تنقید ہیں مگر جس کام سے ڈرائیڈن مکمل نقاد ہو گیا وہ اس کے نثر میں واضح، مربوط، مسلسل اور معنی خیز مضامین ہیں۔ سارا معاملہ یہ ہے کہ شاعر اور نقاد اسی طرح ایک ہیں جیسے کسی سکّے کے دونوں رُخ۔ شاعر جہاں تخلیق کرتا جاتا ہے وہاں تنقید بھی کرتا جاتا ہے۔ اس کی سر پر خامہ نوائے سروش ہے مگر خامہ، اس کا قط، کاغذ اور حروف کی صورت وغیرہ بھی اس کی نظر میں ضرور ہیں مگر نوائے سروش اگر خامہ وغیرہ کی طرف توجہ مبذول کرے اور پھر شاعر تخیل کی دنیا سے نکل کر زمین کی دنیا میں آجائے یا بیماری کے عالم سے بیماری کی تشخیص اور تحلیل وغیرہ میں لگ جائے اور اپنا پورا حال بجائے کراہ کراہ کر ادا کرنے کے مفصل، اس طرح بیان کرے کہ معالج کو اس کا مرض پہچاننے میں دقت نہ ہو تو وہ تنقید نگار کے دائرے میں آجاتا ہے۔ اصل میں تنقید اس دور کا فن ہے جس میں تخیل پر ذہن غالب ہو جاتا ہے صنّاع چیزیں بناتا ہے مگر بنانے سے زیادہ ان امور پر غور کرنے لگتا ہے کہ کیا بنایا اور کیسے بنایا اور کیسے بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ غور و فکر ذہن کا کام ہے اور ذہن کی زبان نظم نہیں بلکہ نثر ہے اور نثر کے ساتھ کسی بات کو کہہ دینے ہی پر اکتفا نہیں ہوتی بلکہ اسے سمجھانا، اس پر بحث کرنا، اس کی مثالیں دینا وغیرہ بھی آجاتا ہے۔ نظم شاعری کے لیے ہے، نثر فلسفے کے لیے اور تنقید نگاری کرتے وقت شاعر فلسفی ہو جاتا ہے جس کا موضوع اپنا فن ہوتا ہے —— منطق، مابعد الطبعیات، نفسیات وغیرہ سے کام لیتا ہے مگر ہوتا وہ فنکار ہی ہے اس لیے ایک نیا فن پیدا کر جاتا ہے جو اس کے فن پر فن ہوتا ہے۔ اگر فن کو تنقیدِ حیات کہا جائے تو تنقید کو تنقیدِ حیات پر تنقید کہا جائے۔ ہمارے یہاں کوئی ہے ایسا جو یہ حرکت کر رہا ہو؟ شاید کہیں چھپا ہوا ہو مگر دکھائی تو دیتا نہیں۔

ہمارے یہاں کیا ہو رہا ہے۔ ایک پورا درجے کا درجہ نقاد کا بیٹھا ہوا ہے۔ نئے داخلے بھی ہو رہے ہیں۔ نقاد کی حیثیت درجے میں کرسی کے حساب سے متعین ہے۔ جو پہلے آیا وہ بہتر یا بعد میں آنے پر بھی آگے کی کرسی پر بیٹھ گیا تو بھی اوّل درجہ میں شامل ہو گیا۔ عجیب حالات کے نقاد ہیں۔ تخلیق ان کے بس کی چیز ہی نہیں ہے اس لیے پست چیز ہے۔ ان کی ساری کائنات چند ڈگریاں، ایک علمی ادارے میں عہدہ اور یورپ کے پروفیسروں کی چند کتابیں جن کو یہ تنقید سمجھ کر اس طرح سمجھے ہیں کہ اگر ان پروفیسروں کو خبر ہو جائے تو خودکشی ہی کر لیں۔ اُردو کے ایک جدید بہت ہی بڑے نقاد کو آئی۔ اے۔ رچارڈس 'I.A. RICHARDS' کو جدید دور کا سب سے بڑا نقاد کہتے سُنا۔ اتفاق سے آئی۔ اے۔ رچارڈس سے خود ملنے کا موقع آیا اور اردو کے بڑے نقاد بھی ساتھ تھے۔ میں نے اپنے بڑے نقاد کی آنکھیں کھولنے کے لیے رچارڈس سے پوچھا "آپ بڑے نقاد ہیں؟"

"میں —— میں ——؟" کہہ کر اس نے مجھے تعجب سے دیکھا۔ "میں نقاد نہیں، ایستھٹکس کا پروفیسر ہوں۔"

ہمارے بڑے نقاد نے یہ سُنا نہیں، یا اگر سُنا تو غور نہیں کیا یا اگر غور کیا تو ٹال گئے کیونکہ یہ ایک ان کی ہستی کو بالکل فنا کر دینے والی بات ہے ——!

غرض ہمارے یہاں جو آج کل بڑے نقادوں کا درجہ بیٹھا ہوا ہے (حاضری لینے کی ضرورت نہیں نام سب کو معلوم ہیں) وہ حد سے حد

اگر کچھ کر پاتا ہے تو یہ کہ ادب کی پروفیسری کرے مگر افسوس تو یہ ہے صحیح پروفیسری بھی ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ یوں آٹھویں یا دسویں درجے کا وہ لڑکا بھی نقاد ہے جو میر کے کلام کی خصوصیات امتحان کی کاپی پر تفصیل سے بیان کرتا ہے اور واضح کر کے مثالیں دیتا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر وہ بی۔ اے یا ایم۔ اے کے درجے میں ہر جگہ سے مواد جمع کر کے ایک مسلسل اور مدلل مضمون بناتا ہے اور اس طرح تنقید نگاری کی سیڑھی پر ایک درجہ اونچا بڑھتا ہے۔ پھر وہ کسی ایک موضوع کو لے کر اس پر تھیسس لکھ ڈالتا ہے اور ڈاکٹر کی مہر اس پر لگ جاتی ہے۔ اب اسے جو نقاد نہ کہے اس کی ایسی کی تیسی۔ وہ پروفیسر ہو جاتا ہے اور مضامین لکھتا ہے جو پہلے رسالوں میں چھپتے ہیں پھر مجموعوں کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ اس کے شاگرد خریدتے ہیں اور وہ لافانی نقاد ہو جاتا ہے۔ یہ پروفیسرانہ تنقید نگاری کی سیدھی سڑک ہے۔ اس میں کچھ کھٹکا نہیں مگر اپنے ان نقادوں کا کوئی مضمون اٹھا لیجئے یا سب مضمون پڑھ ڈالیے۔ پہلی بات یہ معلوم ہوگی کہ انھیں ادیب یا ادب پارے سے غرض نہیں مثلاً مضمون غالب پر ہے تو غالب سے غرض نہیں ہے بلکہ مارکسی تنقید سے غرض ہے اور مارکسی تنقید کی لکڑی سے غالب کی ٹانگ توڑی جا رہی ہے۔ پھر جس نظریۂ تنقید کو ہمارے ادیب پر عائد کیا جا رہا ہے اس کو بفضلہ نقاد صاحب سرے سے سمجھے ہی نہیں ہیں۔ دو چار جملے لے بھاگے ہیں، ان کا غلط ترجمہ کیا ہے اور اس غلط ترجمے کے اندھیرے میں اپنے قومی مصنف کو تلاش کر رہے ہیں بالکل انھی چھ اندھوں کی طرح جو ہاتھی کو دیکھنے گئے تھے۔ کاش کہ ان مضامین کو پڑھ کر ہمیں ہنسی ہی آتی، نہیں صاحب منشی گری پر بھی ہنسی نہیں آتی۔ یا قبول کیجئے یا غصہ کیجئے۔ ایک منشی نے آپ کو چیک لکھ کر دیا۔ الفاظ میں چار سو روپیہ اور اعداد میں تین سو لکھا تو آپ ہنسیں گے کہ اپنا اور اس کا سر ٹکرا دیں گے۔ غرض یہ منشی گیری چل رہی ہے اور ایسی چل گئی ہے کہ چلتی ہی چلی جائے گی چاہے ادب سسک سسک کر ڈھیری کیوں نہ ہو جائے۔

میں آگے کچھ اور لکھتا مگر طفیل صاحب کا سگنل یاد آگیا اور اس پر یہ لکھا ہے: "جو کچھ لکھا جائے وہ بے شک مختصر ہو۔" اچھا صاحب! قلم روک دیا۔ آگے ہمیں کچھ کہنا بھی نہیں ہے اور اپنے بس میں جتنے اختصار کے ساتھ کہنا تھا اتنے اختصار سے کہہ بھی دیا مگر آپ کے سگنل پر یہ بھی رقم ہے "مگر بات دونوں صورتوں میں دو ٹوک ہو" اس نے تو ہمیں تذبذب میں ڈال دیا۔ اچھا صاحب! چلیے بات دو ٹوک بھی ہو جائے۔ چھوڑیئے ان سب تنقیدی جائزوں، اشاروں اور کنایوں کو۔ پطرس ایک فنکار تھا، اس نے چند ایک تنقیدی ٹکڑے بھی چھوڑے ہیں۔ یہ تنقید ہیں —— فیض ایک شاعر ہے، اس کے کچھ تنقیدی مضامین ہیں، یہ تنقید ہیں —— عصمت ایک افسانہ نگار ہیں، نظر سطحی ہے، علم واجبی واجبی ہے مگر تنقید کر سکتی ہیں۔ اس قسم کے بہت سے اور ہیں جنھوں نے اپنے فن پر غور کیا ہے اور اس کی بابت کچھ نئی باتوں کی وضاحت کی ہے، ان کو آگے لائیے، ان سے زبردستی لکھوائیے۔ میں نے اپنے ایک مضمون "فنِ تنقید نگاری" میں جو "نئے دور" کے کسی نمبر میں چھپا، یہ بتایا تھا کہ تنقید نگاری کے تین درجے ہوتے ہیں۔ سب سے نیچا درجہ یہ کہ کوئی فنکار اپنے فن پر یا اپنے سے فن کار پر ایسا ایک مضمون لکھے کہ ہمیشہ کے لیے یادگار ہو جائے جیسے فرانسس ٹامس کا شیلی پر مضمون۔ اس سے اونچا درجہ یہ ہے کہ کوئی ادب میں انقلاب لانے والا جو اپنے فن کو اصولوں کی نئی شکل میں پیش کر کے قوم کی نظر اور اس کا مذاق بدل دے جیسے سڈنی، ورڈسورتھ، حالی۔ سب سے اونچا درجہ یہ کہ اصول وضع کرے، مذاق بدلے اور تمام روایات کا جائزہ لے کر ہر ایک بڑے فن کار کی بابت ایک دائمی رائے چھوڑ جائے جیسے ڈرائیڈن، جانسن، کولرج، میتھو آرنلڈ۔ خیر اوپر والے دو درجوں والے نقاد نہ معلوم کہاں سے ٹپک پڑتے ہیں مگر تیسرے درجے والے نقاد سے اسٹیج خالی نہیں ہوتا۔ ہمارے یہاں بھی ہے مگر منشیانِ تنقید نے انھیں کہنی مار کر پیچھے کر دیا ہے۔ کہنی مارنے کا طریقہ یہ ہے کہ درجوں میں لڑکوں سے کہا، "ہاں بھئی! افسانہ ان کا میدان ہے، تنقید کے دائرے میں نہ آئیں تو اچھا ہی ہے۔" لڑکے سمجھنے لگتے ہیں کہ منشی گیری ہی تنقید ہے اور منشی جیوں کو ہی سراہتے پھرتے ہیں "فلاں سائنٹیفک نقاد ہیں، فلاں مارکسی نقاد ہیں، فلاں سوشل نقاد ہیں، فلاں نفسیاتی نقاد ہیں۔

غرض اس لپاڈگی کی بجائے فنِ تنقید کو بڑھانے کی ضرورت ہے ورنہ ہم تنقید کے نام پر جو کچھ پڑھتے ہیں یہ قطعاً تنقید نہیں، بخدا تنقید نہیں ہے

یہ سب ہمارے سالمقہ مذاق ہے۔

مظفر علی سیّد

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اُردو ادب رُو بہ زوال ہے یا اسے جمود، تنزل قسم کا کوئی عارضہ لاحق ہوا تو سب سے پہلے یہ واضح کرنا ان کا فرض ہے کہ وہ کون سے رسائل کا مطالعہ فرماتے ہیں؛ ان میں کن کن لوگوں کے رشحاتِ قلم متعدد بار پڑھنے کے بعد یہ خیال ان کے ذہنوں میں جاگزیں ہوا ہے؛ اور اگر وہ رسالے پڑھنے کی بجائے کتابیں دیکھتے ہیں تو کیسی اور کن مصنفین کی لکھی ہوئی؛ پھر اس کے بعد یہ بتانا بھی ان پر واجب ہے کہ وہ موجودہ اُردو ادب کا کس خاص دور سے مقابلہ کرتے ہیں؛ میر و سودا کے دور سے، حالی و آزاد کے دور سے، اقبال کے دور سے یا ترقی پسند ادب کے دور سے؟ مجھے یقین ہے کہ اکثر "زوال پسند" ان سوالوں کا صاف صاف جواب دینے کی بجائے کھسکتے اور کنی کتراتے پائے جائیں گے۔

ایسے لوگوں کے ذہن میں (چلیے فرض کیے لیتے ہیں کہ اس نام کی کوئی چیز ان کے پاس ہے) کئی ایک مفروضے اور مغالطے ایسے پائے جاتے ہیں جنھیں دور کیے بغیر اس بحث کو آگے نہیں بڑھایا جا سکتا۔ وہ کہیں گے تقسیمِ ملک کے بعد اقبال جیسا شاعر اور پریم چند جیسا افسانہ نگار پیدا نہیں ہوا۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ انگریزی ادب کی پوری تاریخ میں ایک ہی شیکسپیئر اور ایک ہی ڈکنس ہوا ہے۔ فارسی میں نہ حافظ کا کوئی مثیل ہے نہ سعدی کا۔ پھر یہ فن کار ہمارے دور سے بھی اتنا ہی تعلق رکھتے ہیں جتنا اپنے اپنے دور سے۔ کیا پچھلی پچیس صدیوں نے ہومر کا کوئی جواب پیش کیا؟ اگر اس زاویے سے دیکھیے تو پورے انسانی ادب کی تاریخ، ادب کے زوال کی تاریخ نہیں؟

بات یہ ہے کہ ادب کی دنیا میں نہ ارتقا ہوتا ہے نہ تنزل۔ وہ جو ڈاروِن کا نظریہ کہا جاتا ہے اس کا انسان کے جسم سے تو کوئی رشتہ ہوگا انسان کے ذہن میں ایسی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ فلسفے کی تاریخ میں، ادب کی تاریخ میں نئے مقامات اور نئے زاویہ ہائے نظر پیدا ہوتے ہیں مگر ان کی حیثیت ارتقا یافتہ جسد کی نہیں ہوتی۔ ہر دور کا انسانی ذہن اپنے مسائل کو اپنے طور پر حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنے سرمایۂ ماضی سے تھوڑا بہت کام لیتا ہے، اپنی طبع کی جودت اور اپنے جذبۂ تخلیق کو کام میں لا کر اپنی ہم عصر زندگی کو قابلِ برداشت بناتا ہے۔ ادب چونکہ انسانی ذہن کی پیداوار ہے اس لیے بندروں، بن مانسوں کے مطالعے سے نکالے ہوئے اصولوں کا اس پر اطلاق نہیں ہوتا۔

فلسفہ و نفسیات پڑھانے والے کہیں گے کہ ان مضامین نے افلاطون و ارسطو کے زمانے سے لے کر اب تک بے پناہ ترقی کی ہے۔ جی ہاں! ایک قسم کی ظاہری ترقی ضرور کی ہے مگر اس سے اس کی نوعیت میں کوئی اضافہ ہوا؟ یعنی فلسفہ و نفسیات نے کوئی ایسا کارنامہ انجام دیا جو پہلے کے فلاسفہ اور ماہرینِ نفسیات سے بن نہ پڑا تھا؟ اس کی اہمیت میں تھوڑا بہت اضافہ ایک نہ ایک زمانے میں ضرور ہوا ہے، وہ بھی کسی تسلسل کے بغیر، مگر اہمیت میں اضافے کو ارتقا کا نام نہیں دیا جا سکتا اور اس کی کمی کو تنزل نہیں کہہ سکتے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ ایک خاص وقت میں فلسفہ یا نفسیات نے لوگوں پر زیادہ اثر ڈالا ہو مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ وہ فلسفہ اور وہ نفسیات ہی اونچے درجے کی تھی؟

تنقید کا فن چونکہ ایک طرف ادب و شعر اور دوسری طرف فلسفہ و نفسیات سے پیوست ہے اس لیے یہ بحث ناگزیر تھی اور جدید تنقید کے اکثر معترضین کو ٹٹول کر دیکھیے تو ایسے ہی مغالطہ آمیز فتوے ان کی زبان پر جاری و ساری ملیں گے۔

حقیقتاً تو بات یہاں ختم ہو جانی چاہیے مگر ہمارے دور میں جمود اور تنزل کا نعرہ کچھ VESTED INTERESTS کی طرف سے اتنے

زور سے لگایا جا رہا ہے کہ اس نعرے کی ماہیت کی بجائے ان نعرے بازوں کا نفسیاتی معائنہ ضروری ہو گیا ہے۔ ہر مریض کی طرح ان کے مرض کی جڑ بھی ماضی کی خواب گاہوں میں پوشیدہ ہے۔ ان کی زندگیوں کا کارنامہ یہ ہے کہ مختلف شخصیتوں اور گروہوں کی حاشیہ نشینی میں انھوں نے ایک مدت جانبداری، صوبائی تعصب، دوست نوازی، اقربا پروری، گروہ بندی اور موقع پرستی کا بازار گرم رکھا ہے ۳۵ء سے لے کر ۴۷ء تک بلکہ کچھ کچھ تو اس کے بعد جو ریوڑیاں بانٹی گئی تھیں آزادی کے بعد ہی اس کا محاسبہ شروع ہو گیا تھا اور ایک باغی نوجوان پود ان لوگوں کو ابھرتی ہوئی نظر آنے لگی تھی۔ تحریص و ترغیب کا کوئی ذریعہ ان کے بس میں نہ تھا جو نوجوانوں کو پیش نہ کیا گیا ہو اور کئی ایک تو دانہ و دام کی ازلی کشمکش کا شکار بھی ہو گئے۔ پھر بھی محاسبے کا دروازہ بند نہ ہو سکا چنانچہ ان لوگوں نے جمود اور تنزل کا صور بڑے زور سے پھونکنا شروع کیا۔ کاش کہ انھوں نے اتنے ہی زور سے بہتر لکھنے کی کوشش کی ہوتی یا اپنے آپ کو قابو میں رکھا ہوتا۔

بعض لوگوں نے تو نعروں کے ساتھ ساتھ الزام تراشی کا کمال بھی دکھانا شروع کیا۔ ایک ایڈیٹر صاحب نے لکھا کہ ادیبوں کی نئی نسل قہوہ خانوں میں بیٹھ کر فضول گپ زنی میں وقت ضائع کرتی ہے (یہ بھول گئے کہ انجمن تعریف و توصیف باہمی یا حلقۂ احباب ادب میں شریک ہونے سے تو فضول گپ زنی ہی بہتر ہے) یہ بھی کہ تخلیقی ادب میں خونِ جگر کو صرف نہیں کرتی (تو آپ کیا قاضیِ شہر ہیں؟ اپنے افسانے ڈرامے چھاپتے چلے جائیے۔ کوئی ضرور ہے کہ نئی نسل آپ کی کتابوں کے انبار پر تھیسس لکھ کے پی۔ ایچ ڈی کا رتبہ حاصل کرے) نوجوانوں کو نصیحتیں اور پند نامے جاری ہونے لگے۔ ایک صاحب نے روتی صدا لگائی کہ نوجوان نقاد میر و غالب پر مضمون لکھتے ہیں اور وہ بھی ایسے کہ کسی طالب علم کے کام نہ آ سکیں (حالانکہ خلاصہ نویسی اساتذہ کا کام ہے) اور اپنے ہم عصر ادب کی طرف آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھتے (کیسے دیکھیں جب کہ رسالوں میں سوا قصیدے کے کوئی چیز چھپتی ہی نہیں)

مگر اس جوابی طعن و تعریض سے (جس میں نئی نسل حق بجانب ہو گی) افہام و تفہیم کی بجائے غلط فہمیاں بڑھنے کا احتمال ہے۔ ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ نئے دور کی تنقید (جس سے مراد ۴۷ء سے لے کر آج تک کی وہ تحریریں ہیں جو ادبی تخلیقات اور مسائل کے بارے میں لکھی گئی ہیں) کیا پایہ رکھتی ہے اور اس پر مختلف لوگ جو اعتراض کرتے ہیں تو در اصل کیا کہنا چاہتے ہیں؟ ان کے پاس کیا دلائل ہیں اور وہ کتنے وزنی ہیں۔ سب سے پہلا اعتراض نئی تنقید پر یہ کیا جاتا ہے کہ اس میں جھلاہٹ، بیزاری، مایوسی اور ضرورت سے زیادہ بُت شکنی پائی جاتی ہے، ایسی بُت شکنی جو بتوں کے ساتھ ساتھ ادب کا کعبہ بھی توڑ پھوڑ سکتی ہے۔ یہ شکایت ہندوستان کے نوجوان نقادوں کے بارے میں کی گئی ہے مگر پاکستان میں بھی جہاں تنقید کی نئی آواز کو مختلف طریقوں سے دبایا گیا ہے اور جہاں تنقید کا رواج بھی ذرا کم ہے، یہی شکایت بزرگوں کی زبان پر ہے۔ ہندوستان میں اس آواز کے بلند ہونے کی ایک وجہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ وہاں پاکستان سے کہیں زیادہ انجمن ترقی پسند مصنفین (یہ یاد رکھیے کہ انجمن اور تحریک ہم معنی لفظ نہیں ہیں) کا اثر و نفوذ رہا ہے اور اس کے سربراہوں کے اقوال و اعمال اور خیالات و تخلیقات سے نئی نسل کو اکثر اختلاف کا موقع پیش آیا ہے خصوصاً ان نوجوانوں کو جنھوں نے تحریک کی آبیاری میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ گویا انجمن کی پالیسی اور طریقِ کار سے اختلاف پیدا ہوا۔ علیگڑھ میں خلیل الرحمٰن اعظمی اور شہاب جعفری، حیدر آباد دکن میں (جہاں اُردو ادیبوں کی نئی نسل خاصی سرگرم ہے) وحید اختر اور عالم خوندمیری کی تحریریں ایسے ہی وجود میں آئیں۔ ان کے بارے میں جو رویّہ اختیار کیا گیا اسے کسی طرح سراہا نہیں جا سکتا۔ ایک لحاظ سے یہ اختلاف چند ایک مطلق العنان ادیبوں کی قوت کو چیلنج تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ ادب کے بارے میں ایک بدلا ہوا زاویہ بھی پیش کرتا تھا۔ چنانچہ نوجوانوں کی تحریروں میں تیزی اور تندی آنے لگی جسے کچھ لوگوں نے جھلاہٹ اور بیزاری سے تعبیر کیا حالانکہ یہ تحریریں سنجیدہ غور و فکر اور سوجھ بوجھ سے لکھی گئی تھیں اور ان کے جواب میں جو مناظرانہ رنگ اختیار کیا گیا وہی قابلِ اعتراض تھا۔ اس بحث کو اس تطہیر، گروہ بندی اور تنقیدی انتشار کے پس منظر میں دیکھیں جو ۱۹۲۴ء سے ۱۹۴۹ء تک انجمن ترقی پسند کے سربراہوں نے پیدا کی تھی

تو ان کی اہمیت آشکار ہوتی ہے۔ افسوس کہ ان تحریروں کا کوئی مجموعہ اب تک شائع نہیں ہوا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے جو پوری ترقی پسند تحریک پر ایک تاریخی نظر ڈالی ہے وہ بھی ابھی تک کتابی شکل میں نہیں آئی مگر جس کسی نے آجکل پر ان کا سلسلہ مضامین پڑھا ہے یا ان کا مجموعہ مضامین "فکر و فن" دیکھا ہے وہ جان سکتا ہے کہ ان کی تنقیدوں میں مطالعہ، زاویۂ نظر اور سنجیدگی کا کتنا اونچا معیار ہوتا ہے۔ اس کے برعکس علی سردار جعفری نے جو ترقی پسند ادب (جلد اول) کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے اس میں اقبال اور پریم چند کے بارے میں اچھے ٹکڑے موجود ہیں مگر انھوں نے ابھی تک ہم عصر ادب کو چھوا نہیں اور اس لحاظ سے کتاب کا نام کچھ مناسب نہیں لگتا کیونکہ یہاں تک تو محض دیباچہ ہے۔ دیکھیں آگے بھی چلتے ہیں یا نہیں، اور اگر چلتے ہیں تو کتنا انصاف کرتے ہیں۔

احتشام حسین نے لکھنؤ ریڈیو سے خلیل الرحمٰن اعظمی کی 'فکر و فن' پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ خلیل صاحب بنیادی طور پر شاعر ہیں اس لیے تنقید کے میدان میں ...... ان سے اس توازن اور مضبوط نقطۂ نظر کی توقع نہیں کی جا سکتی جو نقادوں کے یہاں موجود ہوتا ہے (نشریہ کے اصل الفاظ یاد نہیں پھر بھی مفہوم یہی تھا) اب اگر نقادوں سے مراد احتشام حسین کی اپنی ذات ہے تو ممکن ہے آپ کو یا مجھے زیادہ اختلاف نہ ہو مگر کسی تنقید نگار کی یہ کوئی برائی نہیں کہ وہ شاعر یا افسانہ نگار بھی ہے۔ باقی رہا "بنیادی طور پر" کچھ ہونے کا مسئلہ تو اس کا فیصلہ اتنی جلدی کرنا مناسب نہیں۔ "فکر و فن" کا لکھنے والا اس حد تک تو شاعر ہے کہ شاعری کی عزت کرتا ہے اور کسی شاعر کی شہرت کو قدر بنا کے پیش نہیں کرتا۔ اس کے علاوہ اظہارِ علم کی ترنگ میں اینڈی بینڈی زبان نہیں لکھتا، اصطلاحات کے پتھر نہیں لڑھکاتا، فلسفہ، ادبِ مغرب اور معاشیات و سیاسیات سے واقفیت جتانے پر ساری ہمت مرکوز نہیں کرتا۔ سیدھی سادی شگفتہ سی نثر لکھتا ہے۔ جو خود سمجھتا ہے دوسروں کو بھی سمجھا سکتا ہے اور اندازِ نظر میں تازگی اور ندرت کا احساس دلاتا ہے۔ اس کی رائے سے آپ کو اختلاف ہو سکتا ہے پھر بھی وہ اسے مدلل بنانے کی پوری کوشش کرتا ہے، کسی بات کو فتوے یا تحکم کے لہجے میں نہیں کہتا۔ اگر اس کا نام تنقید نہیں تو پھر یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ تنقید ہمیں درکار بھی ہے یا نہیں۔

یہیں سے نئی تنقید کی چند ایک خصوصیات کا پتہ چلتا ہے۔ جھلاہٹ اور بیزاری کلیم الدین احمد کے یہاں بھی تھی مگر وہ اس درجے کی تھی کہ سارے ادب کی تاریخ کو چند ایک معمولی شاعروں پر قربان کر دیا جائے۔ ایک آدھ آدمی اس طرز کا آج بھی ملے گا جو اپنے کسی دوست، کسی عزیز یا بزرگ کے کلام پر سارے اُردو ادب کو قربان کر دے مگر اس کو آج وہ اہمیت حتیٰ کہ وہ بدنامی بھی نہیں مل سکتی جو پندرہ بیس برس پہلے ملنی بہت آسان تھی۔ آج کے نقادوں میں جو تیزی تندی پائی جاتی ہے وہ سب سے پہلے تو بدلی ہوئی قدروں کی علامت ہے، پھر بے انصافی، ریاکاری اور مجرمانہ خموشی کا چکر توڑنے کے لیے ایک کاری حربہ ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس حربے سے بے انصافی بھی ہو سکتی ہے مگر خیر تھوڑی بہت بے انصافی تو ان حالات میں ہو ہی جاتی ہے۔

دوسری خصوصیت جو نئی تنقید میں پائی جاتی ہے یہ ہے کہ اب تنقید کی زبان پہلے سے سہل اور آسان ہو گئی ہے اس میں طنز و ظرافت کا استعمال بھی جو پہلے نہ ہونے کے برابر تھا بڑھنے لگا ہے۔ گویا آج کی تنقیدی تحریروں میں تازگی اور شگفتگی، سادگی اور روانی سے گلے ملتی نظر آتی ہے۔ اس کے ساتھ معنی و مفہوم اور مواد پر محنت بھی ہوتی ہے جو اگرچہ سطح پر نظر نہیں آتی (آخر نقاد یہ کیوں بار بار ظاہر کرے کہ وہ بہت پڑھتا ہے؟) مگر غور سے پڑھنے پر آشکار بھی ہو سکتی ہے۔ وہ لوگ جنھیں پہلے مفکرینِ تنقید کہا جاتا تھا ایک ایسی زبان میں مانگے تانگے کے افکار درج کرتے تھے جو نہ ان کی سمجھ میں آتی تھی نہ کسی اور کی۔ البتہ مرعوب ہونے والوں پر اچھا خاصا رعب ڈالتی تھی۔ اب یہ اندازِ تحریر بھی اگلے برس کی تیلیوں میں گنا جاتا ہے۔ پہلے چند لوگ ایسے بھی ہوئے ہیں جو سادگی اور روانی کا مطلب بے مغزی سمجھتے تھے۔ آج کل ان کا مصرف یہ ہے کہ طالب علموں کے لیے "مددگار کتابیں"

' تالیف کریں اور اس کو تصنیف کا نام دیں۔ ان کی سادگی اور روانی ایک ناجائز خوبی ہے۔ وہ اپنے اور پڑھنے والوں کے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں ڈالتے ایک صفحے کی بات پر پچاس صفحے سیاہ کر دیتے ہیں اور پھر مختلف کتابوں میں ایک ہی مضمون کو سو ڈھنگ سے باندھتے ہیں۔ اس سے جسمانی محنت کا تصور تو پیدا ہوتا ہے مگر ذہنی ریاضت کا یہاں کوئی سوال نہیں۔ ایسے لوگ جب کہتے ہیں کہ نئی نسل محنت نہیں کرتی تو بجا کہتے ہیں اس لیے کہ ایسی محنت کا ادب سے کوئی تعلق نہیں۔

جہاں تک مطالعے اور مواد جمع کرنے کی محنت کا دخل ہے تو ہمارے دور میں اس کا معیار بھی کم ہونے کی بجائے بڑھا ہے۔ اُردو کی نثری داستانوں پر گیان چند جین کی کتاب پڑھیئے یا اُردو تھیٹر پر ڈاکٹر عبدالعلیم نامی کے جو مضامین اُردو ادب (علی گڑھ) نوائے ادب (بمبئی) اور ادبِ لطیف میں چھپے ہیں انھیں دیکھئے۔ کیا آج سے پندرہ بیس سال پہلے کی تنقید یا تحقیق اتنی محنت اور ریاضت سے لکھی گئی تھی؟ کیا پرانے لوگ جو مختلف یونیورسٹیوں میں آج بھی درسِ ریاضت دیتے رہتے ہیں۔ ایسی کوئی کتاب تصنیف کر پائے ہیں جس میں اتنا نیا مواد ہو اور جس میں اتنی زیادہ باتیں اتنے کم لفظوں میں کہی گئی ہوں؟ یہاں تک کہ آج کی ایک درمیانہ درجے کی کتاب مثلاً مسیح الزماں کی اُردو تنقید کی تاریخ (جلد اول) بھی اس موضوع کی تمام پرانی کتابوں سے زیادہ مواد اور متوازن نقطۂ نظر کی حامل ہے۔ یہ کتابیں جن کا ذکر ابھی ہوا پیشہ ورانہ علمی تنقید کی پیداوار ہیں مگر نئے پرانے شاعروں، ادیبوں پر اور ادب کے مسائل پر جو مضمون ہمارے رسالوں میں نکلتے رہتے ہیں ان کا درجہ بھی پچھلے زمانے کے خاص نمبروں سے کم نہیں۔ ہندوستان کے جن نئے نقادوں کا اوپر ذکر ہوا ان کے علاوہ مجتبیٰ حسین، محمد حسن، اسلوب احمد انصاری، سلیم احمد، محمد صفدر، وحید قریشی، ریاض احمد، حنیف فوق، سجاد رضوی، خورشید الاسلام، سعید احمد رفیق، عطا محمد اور سجاد باقر رضوی کے چند ایک مضامین اس کا ثبوت ہیں۔ اس کے علاوہ چند ایک شاعروں اور افسانہ نگاروں نے بھی ہمارے زمانے میں کچھ خیال انگیز مضامین لکھے ہیں اور دلچسپ اور مفید بحثیں اٹھائی ہیں جیسے انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر، ناصر کاظمی اور ابنِ انشا ـــ ان لوگوں کی تحریریں، اور باتوں کو چھوڑیئے ادب اور تنقید سے جس لگن اور جس سنجیدہ دلچسپی کا سراغ ملتا ہے وہ پندرہ بیس برس پہلے مفقود نہیں تو کم یاب ضرور تھی۔ ان میں سے مجتبیٰ حسین، محمد حسن، اسلوب احمد اور سلیم احمد کے سوا کسی کے مجموعے نہیں چھپے مگر جو لوگ پچھلے دس بارہ سال سے اُردو کے اچھے رسائل پڑھتے رہے ہیں وہ ان نقادوں کی تحریروں سے ناواقف نہیں ہوں گے چاہے اس بات کو چھپائیں یا ظاہر کریں۔

کسی بھی دور کی تنقید میں چند خصوصیات ایسی ہوتی ہیں جو صرف اسی دور سے مخصوص ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ہمارا زمانہ ابھی رَو میں ہے اور اس رَو کو پکڑ کے ابھی سے اس پر کوئی لیبل لگانا درست نہیں۔ پھر بھی جو خصوصیات کسی بھی دور کی تنقید میں تلاش کرنی چاہئیں جیسے مطالعہ، انصاف اور اسلوب ہمارا دور اس سے بس خالی ہی نہیں بلکہ ماضی قریب سے بہتر ہے۔ چند ایک جستجوئیں اس میں ایسی بھی پائی جاتی ہیں جو بڑھ کر ایک نئی تحریک کا روپ بھی اختیار کر سکتی ہیں مثلاً ماضی کی نئے سرے سے جانچ پڑتال جو حالی و شبلی کے دور سے شروع ہوئی اور جسے ترقی پسند تحریک نے رجعت پسندی سمجھ کر ختم کرنا چاہا۔ ہمارے نئے نقادوں نے اسی رشتے کو وہاں سے پکڑا ہے جہاں حالی، شبلی اور آزاد نے اسے چھوڑا تھا۔ مکتبی نقادوں کے یہاں جو تاریخ اور جائزے کا رسمی انداز پایا جاتا ہے اور جس کا تنقید سے کوئی تعلق نہیں، اس سے یہاں بحث نہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ ذخیرۂ ماضی میں سے وہ چیزیں ڈھونڈ ڈھونڈ کے نکالی جائیں جن کی ہمیں واقعی ضرورت ہے اور ایسے نکالی جائیں کہ ان کی اہمیت و معنویت آج کے ادب میں واضح ہو۔ یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو صبر و تحمل تو بے شک کم رکھتے ہوں مگر ذہانت و فطانت سے محروم نہ ہوں۔ پھر ہر مسئلے پر ماضی کی حمایت اور ہر پرانی بات کا جواز پیش کرنے پر مجبور نہ ہوں۔ ہمارے دور سے پہلے ایسے نقادوں کا وجود نہ تھا۔

دوسری بات یہ کہ تنقید ادب کا ضمیر ہے اور بے ضمیری سے آپ ہزار کام کر سکتے ہوں اچھی تنقید نہیں لکھ سکتے۔ ہمارے دور کا ادب

ہماری قوم کا ضمیر ہماری نئی تنقید میں جس طرح کروٹیں لیتا نظر آتا ہے آج سے پندرہ بیس برس پہلے اس کا سُراغ بھی بہت کم ملتا تھا ——— اگر اب بھی کوئی کہے کہ ماضی قریب کے مقابلے میں ہماری تنقید یا ہمارا ادب تنزل پذیر ہے تو اس کی زیادہ سے زیادہ بنیاد یہ ہوگی کہ ہمارے نوجوان لکھنے والے ابھی اتنے معروف نہیں، ابھی ان کی تحریریں رسالوں اخباروں میں بکھری پڑی ہیں، ابھی ان کے خیالات لوگوں پر واضح نہیں ہو سکے۔ سوال یہ ہے کہ اس میں نئی تنقید کا کیا قصور ہے؟ ہماری پوری قومی زندگی کا یہی عالم ہے!

نصیر الدین ہاشمی

اگر اب اُردو ادب کے کسی شعبے پر اظہارِ خیال کے لیے قلم اٹھایا جائے تو اس کو دو حصّوں میں تقسیم کرنا ناگزیر ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کی علیحدہ علیحدہ صراحت کے بغیر ہم کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے کیونکہ ہندوستان اور پاکستان میں اُردو کی ترقی یا زوال کے اسباب یکساں نہیں ہیں۔

اگر ہندوستان میں اُردو تنقید کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ آزادؔ، حالیؔ، شبلیؔ نے جو راہ نمائی کی تھی زمانہ مابعد کے آنے والے نقادوں نے ان پر عمارتیں تعمیر کیں اور ان کی تنقیدیں آزادؔ، حالیؔ اور شبلیؔ سے آگے بڑھ گئیں کیونکہ مابعد کے نقاد انگریزی، فرانسیسی، جرمنی اور روسی ادب اور تنقید سے واقف تھے اس لیے انھوں نے اپنی تنقیدوں میں مغربی خیالات، مغربی قدروں اور مغربی رجحانات کو بھی سمونے کی کامیاب کوشش کی ہے اس لیے ان کی تنقیدیں اپنے پیشرو اصحاب کی تنقیدوں سے زیادہ بلند مرتبہ، زیادہ عمیق اور زیادہ وسعت رکھتی ہیں مثلاً عبد الرحمٰن بجنوری، پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر آل احمد سرور، ڈاکٹر احتشام حسین، ڈاکٹر زور، پروفیسر عبد القادر سروری، مجنوں گورکھپوری، فراق گورکھپوری وغیرہ، ان تمام اصحاب نے اُردو تنقید کے متعلق جو کچھ لکھا خواہ وہ مستقل کتابیں ہوں یا مضامین ہر طرح قابلِ قدر ہیں، ان کی جامعیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے اُردو کی تنقیدوں میں اچھا، مفید، سود مند اور بلند مرتبہ مسالہ شامل کیا۔ اس کے بعد وہ زمانہ آتا ہے جب کہ ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم ہو گئی ملک کی تقسیم کے ساتھ ہی اُردو کے ادیب اور نقاد بھی تقسیم ہو گئے۔ اس کی وجہ سے اُردو کی ترقی پر بہت بڑا اثر پڑا اور اس کی ترقی کی راہیں مسدود ہو گئیں۔

ہندوستان میں ہندی سرکاری زبان قرار دی گئی اور رسم الخط ناگری قرار پایا۔ اس کا اثر اُردو کی ترقی پر ہونا ناگزیر تھا چنانچہ ہوا۔ تقسیم سے پہلے اُردو کے مراکز اُتر پردیش اور خصوصاً لکھنؤ، الہ آباد، اعظم گڑھ، علی گڑھ، آگرہ، گورکھپور وغیرہ تھے، دہلی دارالسلطنت ہونے کے ساتھ اُردو کے ادیبوں، شاعروں، نقادوں کے لیے مرکز کی حیثیت رکھتا تھا، انجمن ترقی اُردو کا صدر مقام تھا۔ حیدر آباد جامعہ عثمانیہ اور دار الترجمہ کے باعث اُردو کی ترقی کا ایک بلند مقام تھا، سلطنتِ آصفیہ کی سرکاری زبان اُردو تھی۔ بہار بھی اُردو کا ایک مرکز بنا ہوا تھا۔ کئی ادیب اور نقاد اُردو کی ترقی میں منہمک تھے۔

اب ان تمام مقاموں میں اُردو کی حیثیت گھٹ گئی اور اس کا مقام پست ہو گیا۔ اُتر پردیش جو اُردو کی نشو و نما کا اصلی گھر تھا اب اُردو کی ترقی کے لیے سدِّ راہ بن گیا۔ جو طلبا آج اُتر پردیش کے کالجوں میں پڑھتے ہیں وہ اُردو زبان صرف بول چال کی حد تک استعمال کرتے ہیں اور لکھ پڑھ نہیں سکتے۔ اکثر کالجوں میں اُردو کی اہمیت گھٹا دی گئی۔ جو مخصوص پروفیسری اُردو کے لیے ہوتی تھی وہ اب فارسی کے ساتھ ملا دی گئی۔ اُردو کے کئی پریس بند ہو گئے یا منتقل ہو گئے اور کتابوں کی نکاسی بند ہو گئی۔ اتر پردیش میں بجز علی گڈھ یا اعظم گڈھ کے کوئی مقام ایسا نہیں رہا جس کو اُردو کا غمگسار کہا جا سکے۔ دہلی بھارت کا پایہ تخت ہے، اب یہاں کے بود و باش کرنے والوں میں ایک بڑا حصّہ ایسا ہے جو اُردو سے واقف نہیں ہے دفاتر

کی زبان انگریزی ہے یا ہندی۔ دہلی میں اردو کے بہی خواہ اس کو باقی رکھنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ان کی آواز نقار خانہ میں طوطی کی آواز ہے۔ حیدر آباد میں حکومت کی زبان اس وقت انگریزی ہے اور آئندہ تلنگی ہوگی۔ جامعہ عثمانیہ کی تعلیمی زبان اُردو کے بجائے انگریزی ہو چکی ہے اور دارالترجمہ اُردو تراجم کا کام نہیں کرتا، اُردو کا ذخیرہ جل گیا ہے، کئی مطابع بند ہو گئے یا منتقل ہو گئے۔ کئی پبلشروں نے اپنی دکانیں منتقل کر دی ہیں۔ غرض ہندوستان میں اُردو کا موقف امید افزا یا شاندار نظر نہیں آتا۔ جو اصحاب اُردو کی تابانی یا درخشانی کی امید رکھتے ہیں وہ بڑی حد تک خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔

اُردو کے اکثر نقاد اپنی عمر کا بڑا حصہ ختم کر چکے ہیں۔ ان کی جگہ لینے والا کوئی نہیں ہے۔ اب کوئی اچھی کتاب جو بلند معیار کی حامل ہو اور اچھے خیالات اور جدید رجحانات سے مملو ہو، لکھی نہیں جائے گی۔ اگر لکھی جائے گی تو اس کی طباعت دشوار اور اگر طبع بھی ہو تو اس کی نکاسی مشکل ہے۔ اس وجہ سے کوئی اچھی تنقیدی کتاب منظرِ عام پر کیسے آئے؟

اُردو کے جو معیاری ماہوار یا سہ ماہی رسائل ہیں یعنی معارف، آج کل، برہان، سب رس، صبا، نگار، نیا دور، اُردو ادب، نوائے ادب، علی گڑھ میگزین وغیرہ یا ہفت روزہ خصوصاً "ہماری زبان" میں جو تنقیدیں شائع ہوتی ہیں وہ بلند معیار کی نہیں ہوتیں، ان میں عمق نہیں ہوتا، سطحی ہوتی ہیں، ان کو تنقیدی حیثیت سے اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ اس طرح تنقیدی سرمایہ میں کوئی اضافہ نہیں ہو رہا ہے۔ موجودہ اُردو تنقید میں ٹھہراؤ آ چکا ہے جب اضافہ نہیں ہو رہا ہے تو ترقی کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔ بہرحال یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ہندوستان میں "اُردو تنقید" کی ترقی مسدود ہے۔

اس کے بعد جب پاکستان میں اُردو کے بارے میں سوچتے ہیں تو واضح ہوتا ہے کہ قائدِ اعظم نے اُردو کے سرکاری زبان ہونے کا بارہا اعلان کیا تھا مگر قائدِ اعظم کی آنکھیں بند ہوتے ہی سیاسی اُلٹ پھیر میں خود غرض لیڈروں نے بنگلہ زبان کو بھی سرکاری زبان کا درجہ دے دیا۔ بنگالی زبان جو بنگال سے باہر بولی اور سمجھی نہیں جاتی اور مسلمانوں کا مذہبی، اخلاقی، ثقافتی، تمدنی، تہذیبی، تاریخی ذخیرہ جو اُردو میں ہے اس کا عشرِ عشیر بھی بنگالی زبان میں نہیں لیکن اس کے باوجود بنگالی زبان کو اُردو کا ہم پلہ اور اُردو کے ساتھ مساوی درجہ دینے کی جو کوشش کی گئی ہے اس سے بھی اُردو کو نقصان پہنچا ہے۔

ان حالات میں پاکستان میں بھی موجودہ اُردو تنقید کے متعلق صحیح طور پر اظہارِ خیال کرنا دشوار ہے کیونکہ پاکستان میں شائع ہونے والی ایک آدھ تنقیدی کتاب کے مطالعہ اور بعض رسالوں کے تنقیدی مضامین سے صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

بہرحال میں پاکستان میں تنقیدی شعور اور اس کے پروان چڑھنے کے بڑے امکانات دیکھتا ہوں۔ ابھی جو حالت ہے وہ عرض کر چکا ہوں۔ کھل کر کہوں گا تو اپنا کلیجہ چھلنی کرنا ہوگا۔

ڈاکٹر محمد حسن

تنزّل اور انحطاط کا سوال عام طور پر ترقی کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ میری رائے میں تو ابھی تک ماضی یا حال میں اردو تنقید نے خاطر خواہ طور پر ترقی کے میدان میں قدم ہی نہیں رکھا اور اپنا بنیادی کام انجام ہی نہیں دیا۔ یہ صحیح ہے کہ اردو میں تنقیدی سرمایے کی ضرورت اور اہمیت کا احساس اب کہیں جا کر عام ہوا ہے لیکن اس سرمایے کی باضابطہ فراہمی کا کام ابھی تک ابتدائی منازل میں ہے۔

تنقید کی بنیادی ضرورتیں تین ہوتی ہیں۔ ایک تنقیدی معیاروں کی وضاحت، دوسرے جن ادیبوں یا تخلیقات پر تنقید کی جائے ان کی

صراحت اور ہمدردانہ مطالعہ۔ اور تیسرے اپنے دور کی نظر سے روایات کو پرکھنا اور ادب اور سماجی بصیرت کا رشتہ واضح کرنا۔ اصولی باتیں تو ہمارے ہاں کبھی کبھی ہوتی رہی ہیں لیکن اگر کوئی انصاف پسند یہ سوال کر بیٹھے کہ اردو میں مختلف اصناف کے پرکھنے کے اصول وضع کئے گئے ہیں یا نہیں اور آخر وہ معیار کیا ہے جس پر حسن و قبح کا فیصلہ دیا جاتا ہے تو گنے چنے چند مضامین ہیں یا مقدمہ شعر و شاعری، شعر العجم کے سو صفحے، مراۃ الشعر اور اسی قسم کے دو ایک پرانے صحیفے ہیں۔ شاعری پر فلسفیانہ بحث، یا ادب کی ماہیت اور سماج سے اس کے تعلق پر تفصیلی گفتگو ابھی نہیں ہوئی ہے۔

پھر جن ادیبوں پر تنقید لکھنی ہے ان کے بارے میں مواد کی فراہمی نہیں ہوئی ہے۔ ہم اپنے مشاہیر کے حالات نہیں جانتے۔ ان کے کلام کے صحیح متن ہمارے پاس موجود نہیں ہیں۔ مثلاً سوداؔ ہی کو لیجئے۔ سوداؔ کے مروجہ دیوان میں کتنی غزلیں، مثنویاں قائمؔ کی ہیں کتنی سوزؔ کی ہیں اور کتنی خود سوداؔ کی لکھی ہوئی ہیں ان کی صراحت بھی ابھی نہیں ہوئی ہے۔ تذکروں میں سے اکثر ایسے ہیں جن سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ بہتیرے غیر مطبوعہ پڑے ہیں۔ اب اگر کوئی صاحب کسی استاد کے کلام پر تنقید لکھ ڈالیں اور محض مروجہ دیوان پر رائے زنی کر دیں تو یہ انصاف کی بات تو نہ ہوگی۔

ادب اور سماجی بصیرت کے تعلق کو لیجئے تو ہم جن ادیبوں کا تذکرہ کرتے ہیں ان کے ذہنی پرداخت اور ماحول کے بارے میں ہماری معلومات ناقص ہیں۔ ہماری سوشل ہسٹری ابھی تک مدون ہی نہیں ہوئی۔ نہ ہم نے اس دور کے علوم و فنون، تہذیب و تفکر کا جائزہ لیا ہے نہ اس دور کے تصورات کو سمجھا ہے کہ ان سے روح عصر تک رسائی ہو سکے۔ فارسی کی استعداد کم سے کم تر ہوتی جا رہی ہے۔ نئی نسل اس زبان سے بے گانہ ہے جس نے ہمارے مشاہیر کے ذہنوں کو اپنے سانچے میں ڈھالا تھا۔ پھر مشرقی تصوراتِ تنقید کے ذریعے سے ان مشاہیر کو سمجھنے کے بجائے محض مغربی تنقید کے ذریعے سے ہم ان پر فیصلہ صادر کرنا چاہتے ہیں۔

غرض ابھی تک نہ یہ طے ہوا ہے کہ کیسے تنقید لکھی جائے نہ یہ طے ہوا ہے کہ کس پر تنقید لکھی جائے اور نہ یہ طے ہوا ہے کہ کس واسطے لکھی جائے یعنی تنقید کے بنیادی اصول، اس کا خام مواد، اس کی سمت — ابھی کچھ بھی طے نہیں ہے۔ پہلے اصول طے ہوں پھر صحیح متن مرتب ہوں۔ پھر سوشل ہسٹری کی تدوین ہو اور مشرقی اندازِ تنقید پر گرفت ہو تب تنقید سے انصاف ہو سکے گا۔

مگر یہ تو روایات کے محاکمے کی بات ہوئی۔ عصری ادب کے بارے میں تنقید کا رویہ کیا ہونا چاہئے یا کیا رہا ہے؟ یہ سوال قدرے تفصیل طلب ہے۔

جہاں تنقید کا یہ کام ہے کہ وہ قدیم سرمایے کے مرتبے کا تعین کرے، اصول و ضوابط طے کرے اور تہذیبی تاریخ کی روشنی میں ادب کا مطالعہ کرے وہاں اس کا یہ کام بھی تو ہے کہ اپنے دور کے تخلیقی سرمائے کی تراش خراش اور اس کی رہبری کا فریضہ بھی انجام دے۔ تنقید کا فریضہ ادبی ضمیر کی حفاظت بھی ہے اور اس کی تشکیل بھی۔ پچھلے ۲۰ برس میں یہ کام برا بھلا ہونے لگا تھا۔ ترقی پسند تنقید نے تخلیق کا نیا جوش بخشا تھا۔ نئے فانوس روشن کیے اور ان میں نئی بصیرت کی شمعیں جلائیں اس سے تازگی بھی حاصل ہوئی اور تجربہ بھی۔ تنقید کی رہبری کی اس آواز میں چھا جانے کا انداز تھا۔ اس میں کمزوریاں بھی تھیں۔ اس نے اقبال کو فاشسٹ اور غزل کو سامنتی دور کا نشان قرار دیا ان باتوں پر آج جی بھر کر ہنسا جا سکتا ہے مگر اس دور کی تنقیدی بصیرت ہی کا کارنامہ تھا کہ تخلیق کے سوتے پھوٹے اور صنوبر کے سایے سے نکل کر ہمارا ادب حقیقت اور سماجی شعور کی سرحدوں تک جا پہنچا۔

پھر ہماری تنقید میں نئے مغربی مکاتیب کی پیروی اور ماثر پذیری بھی عام ہوئی۔ تحلیل نفسی کے ذریعے ادیب کی شخصیت کے اندر جھانکنے کا اور اس کی تخلیقات کی پرکھ کا کام بھی شروع ہوا۔ سماجی پس منظر کا ذکر بھی آنے لگا۔ سماجی شعور پر بھی زور دیا گیا اور فنی پینتروں کی جگہ

خیال کی گہرائی اور اس کے وزن و وقار کا چرچا ہوا خیال اور نفس مضمون کی لے کہیں کہیں ضرورت سے زیادہ بڑھ گئی اور اسی رو میں تنقید کے مختلف مکاتیب افراط و تفریط کے ساتھ سامنے آئے۔

سنہ ۵۵ء کے قریب ایک بحرانی دور آیا۔ ترقی پسندی سے نئی نسل کا اعتبار اٹھنے لگا۔ جب جدید تنقید کی زوال آمادگی کا ذکر کیا جاتا ہے تو عام طور پر یہی دور پیش نظر ہوتا ہے۔

پہلے اس سوال پر غور کر لیا جائے کہ زوال ہوا بھی ہے یا نہیں! یوں دیکھئے تو اس دور میں تنقید کی کتابیں بڑی تعداد میں لکھی گئی ہیں۔ احتشام حسین کے ایک سے زیادہ تنقیدی مجموعے اس دور میں چھپے۔ مجنوں گورکھپوری۔ کلیم الدین احمد۔ فراق گورکھپوری۔ آل احمد سرور۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، عابد علی عابد، وقار عظیم، عبادت بریلوی، ابواللیث صدیقی، ممتاز حسین، شوکت سبزواری، سردار جعفری، سجاد ظہیر، مجتبیٰ حسین، وحید قریشی، محمد حسن عسکری اور دوسرے اہم نقادوں کے ایک سے زیادہ مجموعے اور تصانیف اسی دور میں شائع ہوئیں۔ پھر یہ سب تنقیدی مضامین کے مجموعے ہی ترتیب نہیں دے رہے تھے بلکہ ان میں سے بعض نے کسی نہ کسی موضوع پر مستقل اور مبسوط کتابیں تصنیف کی ہیں پھر ان کے علاوہ ان گنت مضامین مختلف ادبی رسالوں میں چھپے کچھ مضامین کے چرچے بھی ہوئے ان پر بحثیں بھی ہوئیں گرماگرمی بھی رہی اور کیچڑ بھی اچھالی گئی“۔

ان تصانیف کے بارے میں عام طور پر دو باتیں کہی جا سکتی ہیں ایک یہ کہ ان میں توازن اور سنجیدگی مقابلتاً زیادہ ہے۔ اگر ان کا مقابلہ اختر حسین رائے پوری اور ترقی پسندی کے ابتدائی دور کی تنقیدوں سے کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ نیا لب و لہجہ زیادہ متوازن ہے۔ اس میں افراط و تفریط کم ہے۔ مضامین میں بھی کچھ سنجیدگی اور ٹھہراؤ آ گیا ہے دوسرے یہ کہ تنقید اور تحقیق کے درمیان جو دیوار کھڑی ہو گئی تھی وہ گر رہی ہے اور اب ہمارے نقاد تحقیق کی ضرورت اور اہمیت کا اعتراف بھی کرنے لگے ہیں۔ اس کی طرف رجوع بھی ہوئے ہیں۔ اس دور میں ہمارے آپ کے دیکھتے دیکھتے تحقیق مقبول ہونے لگی ہے۔ نقاد خود بھی اس میدان میں جوہر دکھانے لگے ہیں۔ یوں بھی ادبی دنیا میں قاضی عبدالودود کی ”عیارستان“ اور ڈاکٹر نذیر احمد کی کتاب ”تحقیقی مطالعے“ اب زیادہ دلچسپی سے زیر مطالعہ آتی ہے۔ یہ دونوں باتیں فال نیک ہیں کیونکہ تحقیق تنقید کے لیے خام مواد کا کام کرتی ہے اور جب خام مواد ہی سرے سے غیر موجود ہو تو معمار کے لیے ضروری ہے کہ اپنا کام کرنے سے پہلے خام مواد کی فراہمی کا کام کرے۔

ہمارے نقادوں نے عہد حاضر کا ادبی تجزیہ کرنے سے دلچسپی ظاہر نہیں کی ہے۔ اب سے کچھ عرصے پہلے تنقید کی رہبری اس درجے تک پہنچ گئی تھی کہ ہمارے تخلیقی فن کاروں میں سے بہت سے اس سے سوچنے سمجھنے کے بنے بنائے سانچے لینے لگے تھے اب تنقید نے معنی خیز خاموشی اختیار کر لی اور ہمارے عصر کے ادیبوں کے جیتے جاگتے مسائل میں الجھنا چھوڑ دیا۔ اسی وجہ سے تنقید کی زوال آمادگی کا احساس پیدا ہوا حالانکہ تنقیدی سرمایے میں پچھلے دس سال میں خاصہ اضافہ ہوا ہے اور خاصہ معقول اور نسبتاً باوزن اضافہ ہوا ہے۔

یہ صورت حال آخر کیوں پیدا ہوئی؟ اس کا تجزیہ مختلف مسائل کے سلسلے میں پہلے بھی اپنے مضامین میں پیش کر چکا ہوں۔ سنہ ۱۹۵۵ء کے بعد بے یقینی کا دور آیا ترقی پسندی کے خلاف ردعمل شروع ہوا۔ ترقی پسندوں نے نفس مضمون پر زور دیا تھا۔ اب فنی اور جمالیاتی پہلو پر زور دیا جانے لگا۔ ترقی پسندوں نے تنقید کو سائنٹفک اور خارجی بنانے کی کوشش کی تھی اب تنقیدی مضامین میں داخلی اور تاثراتی لب و لہجہ پیدا کرنے کی کوشش ہونے لگی۔ ہلکے پھلکے تاثرات کو ہلکے پھلکے انداز میں پیش کرنے کا نام تنقید قرار پانے لگا۔ ترقی پسندوں نے سماجی شعور پر زور دیا تھا ہم اس کے ردعمل کے طور پر سماج وغیرہ کے تذکرے سے جی چرانے لگے۔ اور عصری مسائل اور غیر ادبی سوالات سے گریز کرنے لگے۔

خیر یہ جو کچھ ہوا سو ہوا مگر غضب یہ ہوا کہ بے یقینی نے سارے بت تو شہ نشینوں سے اتار پھینکے ان کی جگہ پُر نہ کی یہ سنگھاسن خالی رہے

بت پرستی اچھی بات نہیں مگر خالی دماغ اور کھوکھلے جذبات اس سے بھی برے ہیں۔ ہم نے ایک خیال کو رد کیا تھا بہت خوب تھا مگر اس کی جگہ پر دوسرا خیال، دوسری سمت یا دوسرا تصور اپنانے کے بجائے ہم خیال سے گریز کرنے لگے۔ ذمہ داری سے حیات اور اس کے مسائل پر بات کرنے سے ہچکچانے لگے۔ شاعر ہچکچائے غزل کی طرف رجوع ہوئے نقاد ہچکچائے کلاسیکی ادب کی ناپ تول تک خود کو محدود رکھنے لگے۔ کھل کے بات کہنے کا یارا نہ رہا۔ کون اوکھلی میں سر دے کون دنیا بھر کا برا بنے۔

میرے نزدیک اردو تنقید، جدید اردو ادب کی مانند، عقیدے کے گہن سے گزر رہی ہے۔ اردو ادب میں اعصابیت کا دور ختم ہوا ہے۔ اندھی تقلید کی لے مدھم ہوئی ہے۔ اب نئے یقین کی شمعیں روشن کرنے کا وقت ہے مگر حالات پہلے سے زیادہ پیچیدہ ہیں۔ خیال آفریں بات کہنا مشکل ہے۔ اور اس پر نئی نسل کا ایمان پیدا کرنا اس سے زیادہ مشکل ہے کیونکہ وہ کچھ شکی مزاج بھی ہو گئی ہے اور کچھ زیادہ تیز مزاج بھی۔ اردو تنقید نئے خیال کی منتظر ہے۔ نئے خیال کے جنم داتا ایک یا ایک سے زیادہ ہمہ گیر اور ہمہ جہت شخصیت شخصیتوں کی منتظر ہے جو پھر سے روح عصر سے اس کا سمجھوتہ کرا سکیں اور تخلیق کی دنیا کو پھر سے ہمارے عہد کی ٹیڑھی میڑھی دنیا سے ہم آہنگ کر سکیں۔

یہ دنیا زیادہ ٹیڑھی میڑھی ہو گئی ہے اور اسی لیے دو ٹوک بات کہنا یا دو ٹوک فلسفے پر یقین و اعتماد پیدا کرنا زیادہ دشوار ہو گیا ہے اب وہ سیدھا سادا نعرا کہ دنیا دو کیمپوں میں بٹی ہوئی ہے اور جو ہمارے ساتھ نہیں ہے ہمارا دشمن ہے کام نہیں دیتا اب ادیبوں کو زیادہ سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے اور تنقید میں زیادہ کس بل چاہیے۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ ابھی یہ کس بل ہمارے یہاں پیدا نہیں ہوا ہے۔

اس عقیدے کی کمی کا علاج کیا ہو؟ عام طور پر دو راستے تجویز کیے جاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کسی ایسے عقیدے کا پتہ لگایا جائے جو سبھی ادیبوں کو اپنے دامن میں پناہ دے سکے مثلاً انسانیت دوستی (HUMANISM) تاکہ اس سے گروہ بندی اور مردم بیزاری دونوں روگ ختم ہوں دوسرے یہ کہ نئے عقیدوں کی بنیاد پر چھوٹی چھوٹی جماعتیں پیدا ہوں جو نئے سرے سے حالات کا اپنے طور پر جائزہ لیں اور ان کے پیش نظر نئے حل پیش کریں۔

یوں تو دونوں راستوں کو اپنایا جا سکتا ہے مگر جو بات انتہائی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ نئے حالات کے جائزے اور نئی تجویزوں کے گرد مختصر حلقے کام شروع کر دیں۔ یورپ میں کیوبزم۔ ایکسپریشنزم۔ دادا ازم۔ فیوچرزم۔ نہ جانے کتنی تحریکیں چلیں کتنے گروہ بنے ان گروہوں نے نئے اسالیب تنقید پیدا کیے تخلیق کے نئے اصول تراشے اور نئے سوتے کھول دیے۔ آخر ہم کب تک اپنے خلوت خانوں میں بیٹھے "جمود جمود" کا ورد کیا کریں گے، کیا ہمارا کام صرف مروجہ عقائد کو رد کرنا ہی ہے، کیا مثبت عقیدے کا پتہ لگانا ہمارا کام نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ع

مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

مگر قطعی اور اثباتی آواز ہی اردو تنقید میں نیا خون اور نیا ولولہ پیدا کر سکتی ہے۔

اس صورت حال کا ایک مداوا یہ بھی ہے کہ سنجیدگی، خارجیت اور صبر و تحمل سے پچھلے دس سال کے تہذیبی حالات، تحریکات اور ادبی میلانات کا تجزیہ کیا جائے۔ ہر چند پرانے لکھنے والوں کے قلم بہت کچھ تھک گئے ہیں اور نئے لکھنے والوں میں دو ایک کے سوا کسی نے عصری مسائل پر قلم نہیں اٹھایا ہے۔ پھر بھی "نقوش" یہ خدمت انجام دے سکتا ہے کہ مختلف الخیال نقادوں میں سے چار پانچ کو تفصیلی طور پر اس دور کا جائزہ لینے کی دعوت دے اور یہ چار چھ جائزے — تفصیلی جائزے جو سرسری نہ ہوں اور ان میں سے ہر ایک بہ تمام اصناف پر حاوی ہو — یکجا کر کے ایک شمارے میں چھاپ دے تاکہ اس دور کے رجحانات کے بارے میں اردو ادیبوں کی تخلیقات کے بارے میں مختلف الخیال لوگوں کی رائیں اور ان کے تجربے سامنے آجائیں اور ان سے ایک ایسا آئینہ تیار ہو جائے جس میں نیا عہد اپنے خدوخال دیکھ سکے۔ پھر کوئی نہ کہے گا کہ اردو تنقید نے اپنے منصب کا لحاظ نہیں رکھا اور ممکن ہے اس جائزے سے سوچ بچار کے نئے موڑ پیدا ہوں اور تنقید و تخلیق میں نیا ولولہ جاگ اٹھے!

طنز و مزاح

شوکت تھانوی

ادارۂ نقوش نے ایک حل طلب معمہ ارسال کیا ہے:

ادب اردو کی مختلف اصناف میں سے آپ صرف مزاحیہ ادب کے متعلق یہ بتایئے کہ وہ رُو بہ زوال ہے کہ نہیں۔ اگر ہے تو اس کے اسباب کیا ہیں اور نہیں ہے تو اس کے دلائل کیا ہیں؟

کتنا مختصر سا سوال ہے مگر کتنا تفصیلی جواب چاہتا ہے، حالانکہ اس سوال کا بذریعہ تار بھی جواب دیا جا سکتا ہے کہ۔ ع

ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

مگر اس جواب کے بعد اس کی شرح لکھنے کو کہا جائے گا۔ لہٰذا میں اس دوگونہ عذاب میں مبتلا ہونے کے بجائے پہلے ہی سے یہ شرح کیوں نہ لکھ بھیجوں ——

اردو ادب میں مزاح کا عنصر ترقی اور تنزل کے بجائے ناپ تول کا متقاضی ہے اور میرا خیال یہ ہے کہ اس کو ترقی اور تنزل کے بجائے آمد و خرچ کے پیمانوں سے ناپنا زیادہ صحیح ہوگا۔ اس لئے کہ اس سوال پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اردو کا مزاحیہ ادب ترقی یا تنزل کے بجائے آمد و خرچ کے غیر متوازن ہونے کا شکار بنا ہوا ہے۔ مزاح نگار پیدا کم ہو رہے ہیں اور مر زیادہ رہے ہیں۔ اور جو باوجود کوشش کے نہ اب تک مر سکے ہیں نہ خودکشی کر سکے ہیں ان کو تنقید نگار مار ڈالنے کی مساعی جمیلہ میں اس لئے مبتلا نظر آتے ہیں کہ جب وہ مر جائیں تو ان کی لاشوں سے زندہ مزاح نگاروں کو ٹکرا کر پاش پاش کرتے رہیں۔ یہ تنقید نگار جو مردہ ادب کے مجاور اور زندہ ادیب کے جلاد ہوتے ہیں مدتوں سے اس شغل میں مبتلا ہیں کہ جو زندہ ہیں ان کو مار ڈالیں تاکہ ان کو دفن کر کے ان کے مزاروں پر قوالیاں کرائیں اور صاحبانِ حال سے نذرانے وصول کریں۔ یہ حضرات ادب کو تو زندہ دیکھنا چاہتے ہیں مگر ادیب کو نہیں۔

معاف کیجئے گا یہ تو میں کچھ اور عرض کرنے لگا۔ سوال یہ ہے کہ مزاحیہ ادب ترقی کر رہا ہے یا نہیں۔ اس کا سیدھا سادا جواب صرف یہ ہے کہ مزاحیہ ادیب جس ذوق و شوق کے ساتھ مر رہے ہیں اس ولولے کے ساتھ پیدا نہیں ہو رہے ہیں۔ اور اس اعتبار سے مستقبل یقیناً تاریک نظر آ رہا ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے یعنی اودھ پنچ والے دورِ عروج کے رو بہ زوال ہونے کے بعد ایک طویل سناٹا چھایا رہا۔ مگر وہ دن گزرے ابھی زیادہ مدت نہیں ہوئی ہے جب مزاحیہ ادب کے بڑے چرچے شروع ہو گئے تھے اور بیک وقت بہت سے مزاح نگار بساطِ ادب پر

نظر آنے لگے تھے مگر اللہ جانے کس سنجیدہ بزرگ کی نظر لگی کہ یہ محفل برہم ہونا شروع ہو گئی۔ فرحت اللہ بیگ گئے۔ عظیم بیگ چغتائی گئے، ملا رموزی بھی بہر حال جیسے کچھ بھی تھے بچھڑ گئے، اور یہ پت جھڑ اب تک جاری ہے جس کے تازہ شکار پطرس اور عبدالمجید سالک ہیں۔ جانے والوں کی اس طویل فہرست کے بعد آنے والے دروازے سے کوئی بھی داخل ہوتا نظر نہیں آیا۔ چند نئے مزاح لکھنے والے اِدھر اُدھر نظر ضرور آئے مگر ابھی ان کو جانے والوں کا جانشین نہیں کہا جا سکتا۔ اس اعتبار سے خود فریبی ہوگی۔ اگر یہ کہا جائے کہ فلاں کا انتقال ہو گیا۔ فلاں کی رحلت ہو گئی، فلاں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا، باقی سب خیریت ہے۔ آمد و خرچ کے اس غیر متوازن ہونے کا اثر یقیناً مزاحیہ ادب پر پڑ رہا ہے۔ ویسے تو ہنسنا اور رونا دونوں ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ دعا کیجیے کہ ان کا محلِ وقوع بدلنے نہ پائے۔

کنہیا لعل کپور

طفیل صاحب! آپ نے نہایت ٹیڑھا سوال کیا ہے۔ یعنی کیا اردو طنز و مزاح زوال پذیر ہے؟ ٹیڑھا جواب بھی ملاحظہ فرمائیے۔ ہے بھی اور نہیں بھی۔

"ہے۔"

کیونکہ ۱۔ اگر نہ ہوتا۔ تو آپ یہ سوال نہ کرتے۔

۲۔ اگر یہ کہیں کہ نہیں ہے۔ تو اِسے نظر لگ جانے کا ڈر ہے۔

اور نہیں ہے کیونکہ

۱۔ کمال ہمیشہ زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ ابھی اردو طنز و مزاح کو کمال کہاں نصیب ہوا ہے کہ اس کے زوال کا ذکر کیا جائے۔

۲۔ تقسیم ہندوستان کے بعد چند بہت اچھے طنز اور مزاح نگار منظرِ عام پر آئے ہیں۔ جن میں فکر تونسوی۔ غلام احمد فرقت۔ نبیدہ لاہوری۔ امجد حسین۔ احمد جمال پاشا اور محمد خالد اختر پیش پیش ہیں۔ فرقت کی "کفِ گل فروش"۔ فکر کی "تیرِ نیم کش"۔ امجد حسین کی "جملہ معترضہ" اور احمد جمال پاشا کی "اندیشۂ شہر" (جو ابھی پریس میں ہے) مزاحیہ ادب میں لائقِ قدر اضافہ ہیں۔

۳۔ شوکت تھانوی ابھی زندہ ہے۔ اس کی زندہ جاوید تخلیقات "بارِ خاطر" اور "قاعدہ بے قاعدہ" پچھلے دنوں ہی میں لکھی گئیں۔

۴۔ محمد خالد اختر کی "۲۰۱۱" اردو مزاح میں نئی چیز ہے۔ جسے نظر انداز کرنا تنقیدی بد دیانتی ہوگا۔

۵۔ خاکسار کے تین مجموعے "نوکِ نشتر" "بال و پر" اور "نرم گرم" تقسیم ملک کے بعد شائع ہوئے۔ چوتھا مجموعہ اس سال کے آخر تک چھپ جائے گا۔

۶۔ ڈاکٹر شفیق الرحمٰن نے کم از کم تین اچھے مجموعے ۱۹۴۷ء کے بعد پیش کئے۔ ان کے چند مضامین مثلاً "تزکِ نادری" اور "جہاز باد سندھی" پیروڈی کے بہترین نمونے قرار دیے جا سکتے ہیں۔

۷۔ مجید لاہوری مرحوم نے نثر اور نظم میں مزاح نگاری کی نئی طرح ڈالی۔ انھوں نے رمضانی۔ مولوی گل شیر خاں اور ٹاٹا مجی ٹوب جی ایسے لافانی کردار مزاحیہ ادب کو دیئے۔

آپ شاید دریافت فرمانا چاہیں گے کہ ہمارے مزاح اور طنز نگار اول درجہ کی تخلیقات کیوں پیش نہیں کر رہے۔ اس کی وجوہ یہ ہیں۔

۱ - سودا نے ایک پٹھان کی ہجو لکھی۔ اس نے خنجر نکال لیا۔ وہاں ایک خنجر کا معاملہ تھا۔ یہاں ساری کی ساری قوم خنجر اٹھائے پھرتی ہے۔ بے چارہ طنز نگار اتنے وار روکنے کے لئے ڈھال کہاں سے لائے۔

۲ - جن موضوعات کو طنز کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ جیسے قانون۔ مذہب۔ حکومت۔ انہیں 'احتیاطی نظر بندی' کی حمایت حاصل ہے۔

۳ - ریڈیو اور فلموں نے طنز و مزاح کا معیار اتنا پست کر دیا ہے کہ لکھنے والے بدحواس ہو گئے ہیں۔

۴ - مزاح نگار قبل از وقت ضعیف ہو گئے ہیں۔ اس حادثے کی ذمہ داری آب و ہوا، شراب بندی یا گرانباری اولاد پر ہرگز عائد نہیں ہوتی۔

۵ - اچھے مزاح نگاروں نے سازش کر رکھی ہے کہ اردو طنز و مزاح کو تہی دامن کر کے چھوڑیں گے۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے اٹھتے جا رہے ہیں۔ چراغ حسن حسرت۔ مجید لاہوری۔ پطرس اور سالک کی اموات اسی سازش کا شاخسانہ ہیں۔

فکر تونسوی

میرا خیال ہے طفیل بھائی! کہ پہلے اس امر کی تحقیقات ہو جانی چاہئے کہ طنز اور جمود کا آپس میں کوئی تعلق بھی ہے یا نہیں۔ کیونکہ مجھے یہ شک ہے کہ جمود ایک علٰحدہ ادبی صنف ہے اور طنز الگ ادبی صنف۔ جمود کے ایک صنف ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ گزشتہ چند برس میں جمود پر اتنا زیادہ ادب تخلیق کیا گیا۔ کہ تم "نقوش" کا ایک ضخیم جمودی ادب نمبر نکال سکتے ہو۔

اچھا چلئے، بحث و تمحیص کی خاطر جمع رکھنے کے لئے ہم فرض کر لیتے ہیں کہ طنزیہ ادب میں بھی جمود آ چکا ہے۔ اگرچہ انڈین سٹینڈرڈ ٹائم کے مطابق میں یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ کون سی تاریخ کو کتنے بج کر کتنے منٹ پر آیا تھا۔ کیونکہ ادب وقت کی قید سے مبرّا رہتا ہے اور طنزیہ ادب تو بالکل مبرّا رہتا ہے ——— مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ ریڈیو حکام نے مجھے حکم دیا کہ آٹھ اکتوبر کو گیارہ بج کر چالیس منٹ پر تم ایک طنزیہ ادب لکھ دو۔ ہمیں براڈکاسٹ کرنا ہے۔ میں نے اعتماد نفس کے مارے "ہاں" کر دی۔ لیکن اچانک سات اکتوبر کو میرے طنز پر جمود آ گیا۔ یعنی قلم اٹھایا تو طنز غائب۔ یا عالم الغیب! تو نے میرے طنز کو کہاں غائب کر دیا۔ تو کچھ لمحے بعد ہاتف نے صدا دی۔ کہ وہ تو عقل پر ریڈیو کی پڑ گیا۔ کیونکہ تم نے جو طنزیہ فیچر لکھا اس میں ایک بکری کا کردار بھی آتا تھا۔ اور ریڈیو حکام نے خوف سے کانپ کر کہا کہ بکری کے تصور سے چونکہ ذہن آٹومیٹک طور پر گاندھی جی کی طرف چلا جاتا ہے اس لئے اپنے طنزیہ ادب میں سے "بکری" کا کردار نکال دو ——— کیونکہ ہم گاندھی جی کے متعلق کوئی طنزیہ ادب برداشت نہیں کر سکتے۔

چنانچہ جب میں نے بکری نکال دی تو جمود آ گیا۔ کیونکہ بکری کے بغیر طنز کی نانی مر گئی۔ اور جب نانی مر گئی تو ریڈیو حکام نے خوش ہو کر کہا۔ کہ فکرؔ صاحب! اب آپ کے طنز میں جمود نہیں رہا۔ بلکہ پگھلاؤ آ گیا ہے۔

ما حصل اس نکتہ کا یہ ہے طفیل بھائی! کہ ایک تو طنز پر جمود کے لئے کوئی مخصوص وقت نہیں متعین کیا جا سکتا۔ اور دوسرے یہ کہ بکری نکال دینے کے بعد طنز پانچ وقت کا ایک متقی اور پرہیزگار نمازی بن کر رہ جاتا ہے۔ لہذا اتقا اور پرہیز کو اگر آپ جمود کہہ دیں تو چار و ناچار مجھے بھی یہ بات ماننی پڑے گی۔ جیسے "اہل ریڈیو" کی مان لی تھی۔

آپ یوں سمجھ لیجئے کہ بکری ایک سمبل ہے طنزیہ مواد کا۔ بکری نکال دو تو مواد کا ٹنٹا ختم۔ لہذا صرف ہیئت ہی ہیئت میدان میں باقی رہ جاتی ہے۔ اور ہیئت کیا صرف ہیئت ترقی کرتے کرتے اتنی زیادہ حسین ہو جاتی ہے کہ اس پر نہ نظر ٹھہرتی ہے، نہ دماغ۔ یعنی بالکل

"سرریلزم" ہوجاتی ہے۔ اگر چارلی چیپلن کو یہ یقین ہوجاتا کہ "سرریلزم" کے ذریعے بھی طنزیہ فلمیں بنائی جاسکتی ہیں تو وہ ہالی وڈ سے کبھی نہ بھاگتا مگر وہ بھاگ گیا۔ کیونکہ وہ بکری پر مرتا تھا۔ اس کے حسین وجمیل اور منقش سٹیچو پر نہیں۔ وہ سٹیچو جس کے نیچے لکھا تھا "بکری" مگر وہ بکری کی بجائے بجلی کا کھمبا دکھائی دیتا تھا۔

مگر ہندوستان اور پاکستان میں تو یہ صورتِ حالات نہیں ہے۔ (یہ میرا ذاتی یقین ہے، ممکن ہے صورت حالات موجود ہو) بلکہ میں تو کہتا ہوں، دنیا بھر میں ایسی صورت حالات نہ ہے اور نہ کبھی پیدا ہوا کرتی ہے۔ طنز کی غذا ہے مضحکہ خیز کیفیتیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے جب تک انسان قائم ہے، مضحکہ خیز کیفیتیں بھی قائم رہیں گی۔ کم یا زیادہ، دبی چھپی یا کھلی، اس سے بحث نہیں ——— تو کیا ہم نے یہ طے کرلیا ہے کہ ہندوپاکستان میں انسان نے پیدا ہونا ترک کردیا ہے۔ یا اس نے مضحکہ خیز حرکتوں سے توبہ کرلی ہے! اگر ہم اس ترک وتوبہ کو متفقہ طور پر مان لیتے ہیں تو طنز میں جمود کو مان لینے میں کوئی ہرج نہیں ——— مگر جمود کا مطلب ہے اشیا کا جم جانا، یعنی حیات کی نفی کرنا۔ ابھی کل ہی کی بات ہے۔ ایک اپ ٹو ڈیٹ جنٹلمین ایک غلیظ سے کتے کے پلّے کو گود میں بٹھائے بڑے پیار سے تھپک رہے تھے۔ میں نے پوچھا، کیوں جناب! یہ پوزیشن کیوں؟ تو وہ بولے "ارے یار! یہ کم بخت میرا دس روپے کا نوٹ نگل گیا ہے، جو اس کے حلق میں اٹک گیا ہے۔ سوچتا ہوں، شاید پیار دلاسے سے یہ اُگل دے تو اس بیچارے کی اذیت ختم ہوجائے۔"

چنانچہ طفیل جی! جب ہمارے ہند وپاکستان میں ابھی کتا موجود ہے، دس روپے کے نوٹ بھی موجود ہیں، اور کتے کی اذیت دور کرنے والے "عقلمند" بھی موجود ہیں تو ماننا پڑے گا کہ طنز بھی موجود ہے، اور اگر موجود نہیں ہے تو وہی ایک چیز جسے ڈاکٹر اقبالؔ نے "نگاہِ مردِ مومن" کہا تھا۔

میں یہاں طنز نگار کو "مردِ مومن" کا "نگاہ بردار" کہنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ اس کے ساتھ ہی یہ کہنا بھی کوئی بڑی بات نہیں کہ ہمارے ہاں کئی طنز نگار "نگاہ بردار" نہیں بلکہ صرف "قلم بردار" ہیں۔ مگر "قلم برداری" بری بات اس لئے نہیں ہے کیونکہ قلم مارکیٹ میں نہایت عام اور سستے داموں مل جاتی ہے۔ کانسٹی ٹیوشن میں مارکیٹ سے قلم خریدنا "وطن دشمنی" تصور نہیں کی گئی۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ مارکیٹ میں "نگاہِ مردِ مومن" نہ عام ملتی ہے نہ سستی۔ آپ ذرا سوچیے کہ "اودھ پنچ" گروپ اور پطرسؔ، حسرتؔ اور سالکؔ نے یہ نگاہ کتنے مہنگے داموں خریدی تھی۔ جانِ عزیز کے عوض۔ کنہیا لعل کپور نے یہ نگاہ خریدی تو بمبئی کے مارواڑی فلم سازوں نے اسے "کنڈم" کرکے واپس بھیج دیا۔ کہ یہ نگاہ تو ہمیں "پنڈل" کردے گی۔ چنانچہ کپور کی یہ نگاہ آج بھی اس کے پھٹے ہوئے کوٹ کا "ہول" بنی ہوئی قصبہ موگا میں دکھائی دے جاتی ہے۔ جبکہ بمبئی کے فلم سٹوڈیوز میں "نئی لوگ" کا "قلم بردار طنز" "ہٹ" جارہا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں بورس پیسٹرنک نے "ڈاکٹر ژواگو" میں اپنی یہ نگاہ استعمال کی تو "روس بدر" ہوتے ہوتے بچا۔

اس لئے طفیل میاں! سراسیمگی کی کوئی وجہ نہیں۔ اور نہ جمود کو آڑ بنا کر تن آسانی کا خطرہ لاحق ہے۔ ہمارے ہاں سب کچھ موجود ہے۔ قلم بھی ہے، مضحکہ خیز کیفیتیں بھی ہیں۔ اور کسی حد تک "نگاہِ مردِ مومن" بھی موجود ہے۔ گویا کسی چیز میں جمود کا وجود نہیں ہے۔ اس لئے طنزیہ ادب میں جمود کی کھوج کرنا ایک تفریحی اور لذت انگیز انحراف ہے اور کچھ نہیں۔ اس لئے ڈر کیسا؟

اور میں نے جو یہ کہا ہے کہ ہمارے ہاں "کسی حد تک نگاہِ مردِ مومن" بھی موجود ہے تو اس لئے کیونکہ طنز نگار ہمیشہ آٹے میں نمک کے برابر ہی ہوتے ہیں۔ اور اس کیس میں محاورے والے نمک کی اہمیت گھٹتی نہیں بلکہ بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً تعداد اور مقدار کے

حساب اگر ہمارے ہاں کے شعرائے کرام آٹا ہیں تو طنز نگار نمک ہیں۔ اس لئے تعداد کی کمی جمود کی مظہر نہیں بلکہ کوالٹی کی مظہر ہے۔ پورے انگلستان میں ایک برنارڈ شا تھا۔ جس کے ایک ایک لفظ پر "طلائی پونڈوں" کے داؤں لگا دیے جاتے تھے۔ مگر اس "نمک" کی منفرد خصوصیت یہی تھی کہ اس کے ایک ذرے کے چھڑکنے پر پورے برطانیہ کے زخموں سے ٹیسیں اٹھنے لگتی تھیں۔ ایوان ہائے تک لرز اٹھتے تھے۔ مگر اس کے باوجود ہر انگریز کے لبوں پر یہ شعر رہتا تھا کہ ؎

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

طفیل بھائی! میں شاید "عارضی بندوبست" کے طور پر یہ مان لوں کہ ہمارے یہاں طنزیہ ادب میں وہ "رندی و سرشاری" کم کم ہے جو ہمارے "متاخرین" کا شیوہ رہی۔ مگر پھر بھی میں اس کشتِ ویراں سے مایوس نہیں ہوں۔ اسے صرف "نگاہِ مردِ مومن" کے نم دینے کی ضرورت ہے۔ اور پھر طنز نگار کے لئے تو نم بھی بہت کم چاہئے۔ کیونکہ وہ تو اظہار کے لئے ادبی قواعد و ضوابط کا بھی محتاج نہیں رہتا۔ اس پر تو اظہار کے ہزاروں راستے ہر وقت کھلے رہتے ہیں۔ وہ تو بکری کا نام لے کر بھی طنز کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس بکری کا رخ ریڈیو اسٹیشن کی طرف نہ کر دیا جائے۔ آمین، آمین!!

ہذا من فضلِ ربّی

احمد ندیم قاسمی

اس چھوٹی سی سڑک کو بلدیہ "پام لین" کہتی ہے۔ دس برس قبل میں نے اسے نخلستان کہنا شروع کر دیا۔ اور اب کیفیت یہ ہے کہ چند روز پہلے اسی سڑک پر ایک ہرکارہ "پام لین" کا راستہ پوچھتا پھر رہا تھا۔ کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھیے گا کہ نخلستان کے بنگلوں پر کھجوروں کی چھتریاں سایہ کیے کھڑی ہیں۔ جی نہیں۔ یہاں یوکلپٹس ہے، شیشم ہے، نیم ہے۔ مگر کھجور کا کوئی ایک بھی پیڑ نہیں۔ کہتے ہیں پرانے زمانے میں یہاں کسی کا مزار تھا اور اس مزار کے احاطے میں کھجور کا ایک درخت ہر وقت آسمان کی طرف انگلی اٹھائے کھڑا رہتا تھا۔ پھر جب شہر پھیلا تو مزار کے متولی نے احاطے کو مزار سمیت بیچ ڈالا اور کسی دوسرے مزار میں نکل گیا۔ یہاں ایک بنگلہ تعمیر ہوا۔ خدا جانے اس بنگلے کا اصل مالک کون تھا۔ مگر مجھے اتنا یاد ہے کہ اباجان مرحوم نے یہ بنگلہ ایک دیوالیہ ہندو سیٹھ سے خریدا اور اس کے ماتھے پر سے "رام نواس" کے الفاظ مٹا کر "ہذا من فضلِ ربّی" لکھوا دیا۔ میں اسی "ہذا من فضلِ ربّی" میں رہتا ہوں۔

کہتے ہیں اس احاطے کا خریدار بڑا خوش ذوق آدمی تھا۔ اس نے مزار کو تو ہموار کر دیا مگر کھجور کے درخت کو نہ چھیڑا۔ اس کی رائے میں صرف اسی ایک درخت نے سارے بنگلے کے ماحول کو الف لیلوی رنگ دے رکھا تھا۔ بلدیہ نے اسی درخت کی رعایت سے اس چھوٹی سی سڑک کا نام "پام لین" تجویز کیا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعد میں بنگلے کے کسی مالک نے اس درخت کو کاٹ کر اس سے اپنے گیراج کی چھت کے شہتیر کا کام لیا۔ اباجان مرحوم نے اس شہتیر کو نکلوا کر وہاں لوہے کا گاڈر لگوا دیا اور شہتیر اپنے ایک مزارعہ کے ہاتھ بیچ دیا۔ یہ مزارعہ ہماری زمینوں پر اپنے لیے ایک کوٹھا کھڑا کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یاد ہے، میں نے اباجان مرحوم سے کہا تھا کہ پرانا دیمک خوردہ شہتیر ہے اور آپ نے اسے گیراج سے اسی لیے نکلوایا ہے کہ کہیں چھت گر کر موٹر کار کو پچکا نہ دے۔ اسے بیچیے۔ بے چارے کو مفت دے دیجئے۔ کڑک کر بولے "کیا وہ ہماری زمینوں کی مفت دیکھ بھال کرتا ہے کہ میں اسے اتنی بہت سی لکڑی مفت میں دے دوں؟" خدا بخشے اباجان مرحوم بڑے دل لگی باز تھے۔

تو وہ میں عرض کر رہا تھا کہ میرا بنگلہ نخلستان میں ہے اور میں "ہذا من فضلِ ربّی" میں تنہا رہتا ہوں۔ تنہا ہی سمجھیے کیونکہ چار نوکروں اور ان کی بیویوں اور بچوں کا ساتھ بھی کوئی ساتھ ہے۔ البتہ سال ڈیڑھ سال پہلے جب میں نے خوشیا کو مالی رکھا تو میری تنہائی میں ذرا سی جھری پیدا ہوئی۔ وہ یوں کہ خوشیا نے آتے ہی میرے بنگلے کے لان اور پھلواری پر یوں لگ کر محنت کی کہ اب بھی سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے۔ صبح منہ اندھیرے آتا تھا اور شام کے جھٹپٹے میں واپس جاتا تھا۔ میں نے ایک دن خوش ہو کر اسے دس روپے انعام میں دے دیے۔ تین چار دن کے بعد پھر دس روپے دے دیے۔ چند دن گزرے تو پھر دس روپے تھما دیے۔ انعام و اکرام کی اس فراوانی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میری کوٹھی کا لان بہت خوبصورت ہو گیا تھا اور ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کی بیوی بہت خوبصورت تھی۔ اتنی خوبصورت کہ اب بھی سوچتا ہوں تو ہاتھ سگرٹ کیس کی طرف بڑھتا ہے۔ صبح جب میں

ناشتہ کر کے لان میں نکلتا تھا تو خوشیا ہاتھ اٹھا کر اور اس کی بیوی آنکھیں جھکا کر مجھے سلام کرتے تھے اور اپنی نظروں کے ساتھ میری نظروں کا تعاقب کرنے لگتے تھے جیسے اپنی محنت کی داد مانگ رہے ہیں۔ اور میں داد دینے میں بخیلی سے کام نہیں لیتا تھا۔ کبھی دس کا نوٹ۔ کبھی پندرہ کے نوٹ میں نے انھیں اتنا انعام دیا کہ وہ انعام لینے سے گھبرانے لگے مگر میں انعام دیتا رہا۔ بات یہ ہے کہ خوشیا انعام لیتا تھا تو اس کا رنگ اُڑ جاتا تھا مگر اس کی بیوی کے چہرے پر اکٹھے بہت سے رنگ آجاتے تھے۔ ایک دن کیا ہوا کہ میں لان میں ٹہلنے نکلا تو مجھے خوشیا کہیں نظر نہ آیا صرف اس کی بیوی ایک طرف کھرپا چلا رہی تھی۔ وہ سر جھکائے اٹھی اور سر جھکائے بیٹھ گئی۔ ایسا لگا جیسے مالن نے میرے ہونٹوں سے لگا ہوا پانی کا گلاس چھین لیا ہے۔ آج میں نے اس کی آنکھوں کے جھکنے کا منظر بھی نہیں دیکھا تھا اس لیے عجیب تشنگی سی محسوس ہونے لگی۔ سوچا۔ شوہر کے بغیر کچھ زیادہ ہی شرما رہی ہے۔ ابھی خوشیا آئے گا اور میں اسے انعام دوں گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں برآمدے میں آ بیٹھا تو ذرا دیر کے بعد وہ آئی۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں گلاب کے پھول تھے اور آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ اسی حالت میں وہ بولی "صاحب جی، آپ کا کمرہ کون سا ہے؟" میں نے کہا "سب کمرے میرے ہیں۔ کیوں" بولی "نہیں جی۔ جہاں آپ سوتے ہیں۔ مالی آج بیمار ہے۔ اس نے کہا ہے کہ آپ کے سونے والے کمرے میں یاد سے پھول لگا دوں" مجھے شرارت سوجھی۔ میں نے پوچھا "پھول کہاں ہیں؟" اس نے پہلی بار میری طرف دیکھا اور دونوں ہاتھوں کو ذرا سا ہلا کر بولی "یہ ہیں" (یقین کیجیے اتنی کالی اور بڑی اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں میں نے صرف تصویروں میں دیکھی ہیں) میں نے کہا "کہاں ہیں؟ مجھے تو نظر نہیں آرہے ہیں۔ مجھے تو صرف ایک پھول نظر آرہا ہے" اس کی ٹکٹکی بندھ گئی تو میں نے کہا۔ "مجھے تو ابھی صرف ایک پھول نظر آرہا ہے۔ مجھے تو صرف تم نظر آرہی ہو"

اس کے چہرے پر گلاب ہی گلاب کھل گئے اور گلاب کے پھول اس کے ہاتھوں سے گر پڑے۔

جی نہیں۔ وہ میری طرف نہیں بڑھی۔ منطق کا تقاضہ بھی یہی تھا اور میں نے انھیں انعام سے بھی مالا مال کر دیا تھا مگر وہ پگلی تو بھاگ کھڑی ہوئی۔ لان میں بھی نہیں گئی جہاں اس کا کھرپا اور قینچی وغیرہ رکھے تھے۔ وہ سیدھی باہر گئی اور اس کے بعد، کوئی ڈیڑھ سال ہونے کو آیا ہے، نہ وہ آئی ہے نہ خوشیا آیا ہے۔ اپنی تنخواہ تک لینے نہیں آئے۔ احمقوں کو میری کوئی بات بری لگ گئی۔ اب بھی تو ان کو یاد آتی ہے تو منہ کا ذائقہ ایسے لطیف ہو جاتا ہے جیسے الائچی کھا لی ہو۔ خدا جانے آج کل کہاں ہیں رہیں اسی شہر میں ہوں گے مگر نہ جانے کس بنگلے میں ہیں۔ بہر حال جہاں رہیں خوش رہیں۔ ذرا سے بے وقوف تھے ورنہ اچھے لوگ تھے۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ میں "ہٰذا من فضل ربی" میں تنہا رہتا ہوں۔ نخلستان چار بنگلوں پر مشتمل ہے۔ یہ بنگلے ایک قطار میں ہیں۔ ان کے سامنے سے گزرتی ہوئی سڑک کے اس طرف شیشم کے درختوں کا ایک گنجان ذخیرہ ہے۔ پہلا بنگلہ میرا ہے اور چوتھا سجاد کا ہے۔ سجاد میرا پرانا لنگوٹیا یار ہے مگر اس سے میری بول چال آج تک بند تھی اور اس کی وجہ معمولی نہیں۔ سجاد کے بنگلے سے آگے کھیت شروع ہو جاتے ہیں۔ اس لیے یہ بنگلہ نخلستان کی چھوٹی سی سڑک کا ٹرمینس ہے۔ ویسے کھیت والوں کے ساتھ اس کے تعلقات اتنے اچھے ہیں کہ ضرورت پڑے تو کار کو کھیتوں میں سے گزار کر چار پانچ فرلانگ پرے ایک کچی سڑک تک لے جاتا ہے جو شہر کے لیے اچھے خاصے شارٹ کٹ کا کام دیتی ہے۔ مگر میں نے اس سے ہمیشہ بحث کی ہے کہ شارٹ کٹ کی ایجاد پیدل چلنے والوں نے کی ہے اور موٹر کار والوں کو اس سے کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیے مگر نہیں مانتا۔ بہر صورت دو برس پہلے کی بات ہے کہ ایک دن میں اپنی کار میں شہر کی طرف سے آیا۔ اپنے بنگلے میں مڑ ہی رہا تھا کہ پیچھے سے سجاد اپنی چھوٹی سی کار میں آیا اور میری کار کے ایک پچھلے پہیے کا مڈگارڈ ادھیڑ کر چلتا بنا۔ میں اگر حواس قائم نہ رکھتا تو میری کار اپنے بنگلے کی حد بندی سے ٹکرا کر سامنے سے بھی پچک جاتی مگر میں نے حد بندی سے بس کوئی ایک انچ کے فاصلے پر کار روک لی۔ اترا اور کار کے پیچھے جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک مڈگارڈ کاغذ کی

طرح پھٹا ہوا ایک طرف لٹک رہا ہے۔ میں نے یہ کار بلیک میں خریدی تھی پچیس ہزار میں۔ اور اب مجھے بلیک میں اس سے کہیں زیادہ دام مل رہے تھے مگر میں اسے بیچنے کو تیار نہیں تھا۔ بہت کم اتنی اچھی کاریں میرے ہاتھوں سے نکلی ہیں۔ ادھڑا ہوا مڈگارڈ دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا۔ نخلستان کے آخری سرے کی طرف نظر اٹھائی تو یہ دیکھ کر خوشی سی ہوئی کہ سجاد کی کار بھی باہر ہی رکی کھڑی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی کار کو بھی کوئی نقصان پہنچا ہے ورنہ کیوں رکتی۔ مگر یکایک اس خوشی پر غصہ غالب آگیا اور میں کار میں سے نکل کر سجاد کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سجاد وِیل کے سامنے بیٹھا ہنسی سے بے حال ہو رہا ہے۔ اس کا سارا خون اس کے چہرے اور کانوں میں جمع ہے۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ پیٹ کو ہاتھوں سے دبا رکھا ہے۔ مگر ہنسے جا رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ اپنی سیٹ پر کود پڑا اور اس زور کا قہقہہ مارا جیسے اس کے پھیپھڑے کی دھجیاں اڑ گئی ہیں۔ پھر ہاتھ باہر نکال کر اس نے اپنی کار کو یوں تھپتھپایا جیسے گھوڑ دوڑ میں اول آنے والے گھوڑے کو تھپتھپاتے ہیں۔ میرے تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ تو اس نے اپنی کار میرا مذاق اڑانے کے لیے روک رکھی ہے! چوری بھی اور سینہ زوری بھی!

میں نے گرج کر کہا "کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم نے میری کار کا مڈگارڈ ادھیڑ کر رکھ دیا ہے"

وہ بڑی مشکل سے ہنسی پر ضبط پاتے ہوئے بولا "تو میں ہنس کیوں رہا ہوں؟"

"بڑے حرامزادے ہیں آپ" میں نے کہا۔

وہ یکایک سنجیدہ ہو گیا۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں مجھے گھورنے لگا اور پھر ایک دم اسی شدت سے ہنسنے لگا۔

میں نے کہا "بڑے اُلّو کے پٹھے ہیں آپ"

وہ پھر سنجیدہ ہو گیا مگر اب کے سنجیدہ ہی رہا۔ کار کو اسٹارٹ کر کے اپنے بنگلے کے اندر یوں لے گیا جیسے کار نہیں چلائی، راکٹ چھوڑا ہے۔ میں وہیں کھڑا تھا۔ جب اس نے پورچ میں بریکیں لگا کر کار روکی اور پہیوں سے اتنے زور کی چیخیں بلند ہوئیں کہ اس کے سب ملازم اس کی طرف بھاگے۔ پھر اس نے کار میں سے نکل کر اُدھر کا دروازہ اس زور سے بند کیا کہ ادھر کا دروازہ کھل گیا اور وہ پاؤں پٹختا ہوا اندر چلا گیا۔

تیری ایسی کی تیسی! میں نے سوچا۔ اور وہاں سے چلا آیا۔ اس کے بعد میں بنگلہ نمبر ۴ میں آج تک نہیں گیا۔ اور نہ سجاد میرے پاس آیا۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ سجاد سے میری بول چال یوں بند ہوئی۔ بہر حال سجاد کو ماریئے گولی۔ مجھے تو دراصل باقی دو بنگلوں کا ذکر کرنا تھا۔ ان میں سے میرے بنگلے سے ملحق بنگلہ ایک سابقہ خاں بہادر کا ہے جو آزادی کے بعد اپنا خطاب تو قہرِ درویش بر جانِ درویش واپس کر چکے ہیں مگر کہلاتے خان بہادر ہی ہیں۔ بنگلہ نمبر ۳ ایک ایسے صاحب کا ہے جو آزادی کی وجہ سے خاں بہادر ہوتے ہوتے رہ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا عصبی نظام خراب ہو گیا۔ پھر ختم ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی وہ بھی ختم ہو گئے۔ یہ تو میں بتا چکا ہوں کہ بنگلہ نمبر ۴ میں دو برس سے میرا آنا جانا بند ہو چکا ہے۔ رہے باقی دو بنگلے تو وہاں میرے جانے یا وہاں سے کسی کے میرے یہاں آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ بنگلہ نمبر ۲ کے خاں بہادر صاحب سنکی سے آدمی ہیں۔ بنگلے کے ایک تہ پچھلے کمرے میں دن رات بند رہتے ہیں اور کئی برس سے علم ہندسہ کی کوئی نئی شاخ ایجاد کرنے کے درپے ہیں۔ رنڈوے ہیں۔ دوسری شادی کرنے سے پہلے عشق کر بیٹھے۔ ناکام رہے اور علمِ ہندسہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ کبھی کبھی اپنی کئی گز لمبی کار میں ہوا خوری کے لیے نکلتے ہیں تو دکھائی دے جاتے ہیں۔ مگر کار میں بھی انگلیوں پر کچھ گنتے نظر آتے ہیں۔ ان کے علاوہ اس بنگلے میں ان کی اکلوتی بیٹی تابندہ رہتی ہے۔ نفسیات کا ایم۔ اے پاس ہے۔ اور جب دیکھو، لان میں بیٹھی پڑھتی نظر آتی ہے۔ میرے علاوہ بنگلہ نمبر ۳ والوں کی طرح ان کی بھی کئی مربع زمین ہے۔ بلکہ اُن کے تو چند ٹرانسپورٹ کمپنیوں میں حصے بھی ہیں۔ اس لیے چار پانچ ہزار ماہانہ آجاتا ہے۔

بنگلہ نمبر ۳ کے مالک تو چل بسے ہیں البتہ ان کی بیوی زندہ ہیں۔ انھیں اپنی کوٹھی کے لان میں پھولوں کی بجائے سبزیاں اگانے کا شوق ہے۔ ایک بار کدو کی ایک بیل لپک کر بنگلے کی حدِ فاصل پر چڑھ گئی اور پرلی طرف سجاد کے لان میں اتر گئی۔ ظاہر ہے کہ اس میں بھی پھول آئے اور کدو لگے اور یہ کدو سجاد کے نوکروں نے اتار لیے۔ کسی طرح بی بی جی کو اس چوری کی اطلاع مل گئی۔ انھوں نے اس پر وہ آفت مچائی، وہ آفت مچائی کہ ادھر اپنے لان میں اپنے مالی کے کندھوں پر بیٹھ کر سجاد نے انھیں سلام کیا۔ کان پکڑے، معافیاں مانگیں اور بازار سے کدو منگا کر انھیں بھجوائے۔ یوں یہ معاملہ ختم ہوا ورنہ وہ تو "رِٹ" کرنے چلی تھیں۔ ان کی بھی ایک اکلوتی بیٹی ہے۔ نام شگفتہ ہے مگر پژمردہ تخلص کرتی رہی ہے۔ ایف اے میں برسوں تک فیل ہوتی رہی تو السنۂ شرقیہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ان دنوں ہر سال ادیب فاضل کا امتحان دیتی ہے۔ پرچے میں غالب کا کوئی شعر لکھنا ہو اور وہ اسے یاد نہ ہو تو وہیں امتحان کے کمرے میں ارتجالاً شعر کہتی ہے اور غالب کے سر تھوپ کے چلی آتی ہے۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ نخلستان میں کل چار بنگلے ہیں۔ چاروں اتنے خاموش ہیں کہ اگر اپنے بنگلے میں لیٹے ہوئے کھانسی آنے لگے تو یہ خوف رہتا ہے کہ کہیں باقی تینوں بنگلوں میں سوئے ہوئے لوگوں کی آنکھ نہ کھل جائے۔ چاروں بنگلوں کی اپنی اپنی کاریں ہیں۔ سجاد زمینداری کے علاوہ امپورٹ ایکسپورٹ کا کام بھی کرتا ہے۔ اس لیے اس کے ہاں شہر سے بھی کاریں آتی رہتی ہیں۔ باقی تینوں بنگلوں میں ہفتے میں ایک آدھ بار کوئی ملنے والا آ نکلتا ہوگا۔ نخلستان میں ٹریفک بس اتنی سی ہے۔

ایک روز کسی معاشرتی ادارے کا ایک کارکن سائیکل پہ میرے بنگلے میں آیا۔ اور مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ میرے ملازم نے یہ کہہ کر اسے ٹالنا چاہا کہ صاحب سو رہے ہیں۔ ملازم بے چارہ یہ کیسے کہتا کہ تم سائیکل پر آئے ہو اس لیے ہمارے صاحب سے تمھارا کیا کام ہو سکتا ہے۔ کارکن بولا کہ وہ تو بنگلے کا نام پڑھ کر اندر آ گیا تھا۔ میں نے یہ بات سن لی۔ سچ کہوں۔ شرم آ گئی۔ آنکھیں ملتا ہوا باہر آ گیا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور بے نام بے پتے کا ایک دعوت نامہ دے کر پوچھا کہ "کیا آپ آنسہ شگفتہ بانو پژمردہ کا پتہ بتا سکیں گے؟" میں نے اسے بنگلہ نمبر ۳ میں جانے کو کہا اور وہ چلا گیا۔ یہ دعوت نامہ ایک معاشرتی ادارے کی طرف سے منعقد ہونے والے کسی ورائٹی شو میں شرکت کا تھا۔ ڈرامے اور گانے اور مشاعرے کا پروگرام تھا۔ سوچا چندہ دینے کا لالچ ہوگا۔ اس لیے دعوت نامے یوں بغیر کسی نام و نشان کے بانٹے جا رہے ہیں۔ میں نے طے کر لیا کہ پروگرام میں ضرور شرکت کروں گا (آخر گانے کا پروگرام بھی تو تھا) اور کسی نے چندہ مانگا تو دس پندرہ روپے دے دوں گا۔ (مجھے یہاں یکایک اپنا مالی اور مالن یاد آ گئے۔ اچھے لوگ تھے بے چارے) میں یہ دعوت نامہ کہیں رکھ کر بھول گیا۔ تاریخ تو یاد رہ گئی تھی مگر وقت اور پتہ کون بتائے۔ پھر یاد آیا کہ کارکن شگفتہ بانو کو بھی دعوت نامہ دینے گیا تھا۔

میں سلیپنگ گاؤن اور سلیپروں سے بے پروا ہو کر بنگلہ نمبر ۳ کی طرف نکل گیا۔ بنگلے کے لان کو کدو اور کریلے وغیرہ نے ڈھانپ رکھا تھا اور شگفتہ بانو لان کے ایک سرے پر آرام کرسی میں بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ اس لیے آرام کرسی نے اسے چھپا رکھا تھا۔ میں نے شگفتہ کو اس کے بازو سے پہچانا۔ حسن کے معاملے میں میرا نقطۂ نظر میرا اپنا ہے۔ مجھے نہ جسم کی ساخت متوجہ کر سکتی ہے اور نہ چال کی باضابطہ بے ضابطگی۔ میں صرف چہرے دیکھتا ہوں۔ مگر آج پہلی بار شگفتہ کا بازو دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ حسن کا کوئی مرکز نہیں ہوتا۔ یہ منتشر قسم کی کیفیت ہے۔ اب مجھے اس ہم جماعت کا مذاق اڑانے کا افسوس ہے جو ایک لڑکی کے پاؤں دیکھ کر اسے دل دے بیٹھا تھا۔ یہ بازو اتنا سڈول تھا کہ اگر مجھے اردو لغت مرتب کرنے کی توفیق ہوتی تو لکھتا کہ سڈول شگفتہ کے بازو کو کہتے ہیں۔ کدو اور کریلے کے پس منظر میں اس کے بازو کے چمکتے ہوئے خطوط مجھے کبھی نہیں بھول سکتے۔

(نہ جانے وہ مالن کہاں چلی گئی بے چاری)

میں نے شگفتہ کے پاس جا کر کہا "کیا میں حاضر ہو سکتا ہوں؟"

اس نے مجھے پہچان لیا۔ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اٹھ کھڑی ہوئی اور پکاری "امی جان! یہ پہلے بنگلے والے صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔"

میں نے کہا "میں تو آپ سے ملنے آیا ہوں۔"

"کون کس سے ملنے آیا ہے؟" اس کی امی جان ہاتھوں میں کھرپا اور چہرے پر استعجابیہ لیے کریلے اور کدو کے ڈھیر میں سے نکل پڑیں۔ انھوں نے بھی مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ کھرپا زمین پر پھینک کر بڑی طویل و عریض مسکراہٹ کے ساتھ بولیں "آئیے۔ تشریف رکھیے۔"

مجھے کہنا تو نہیں چاہئے تھا مگر کہہ بیٹھا "افسوس ہے مجھے کھرپے پر بیٹھنا نہیں آتا۔"

پہلے تو دونوں دم بخود رہ گئیں۔ پھر بیقرار ہو کر ہنسیں اور دیر تک ہنستی رہیں۔

آج بھی وہ اسی بیقراری سے ہنستی ہیں اور دیر تک ہنستی رہتی ہیں۔ میں جب روزانہ صبح کو کار لے کر شگفتہ کے ہاں جاتا ہوں تو وہ نائیلون کی ہلکی سبز ساری میں ملبوس میرے انتظار میں بھنڈیاں توڑ رہی ہوتی ہے (مجھے ہلکا سبز رنگ بہت بھلا لگتا ہے) مجھے دیکھتے ہی اس کا چہرہ ہنسی پر ضبط کے مارے سرخ ہو جاتا ہے اور وہ پکارتی ہے "امی۔ "فضل ربی" صاحب آ گئے۔" کدو کی بیلوں میں سے آواز آتی ہے "تو پھر انھیں بٹھاؤ کھرپے پر۔" پھر ہم تینوں زور زور سے ہنستے ہیں اور بڑی بی کو وہیں سبزیوں ترکاریوں میں چھوڑ کر کار میں بیٹھتے ہیں اور سڑک پر آ جاتے ہیں۔ کبھی میں کار چلاتا ہوں اور شگفتہ میرے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتی ہے اور میری ٹائی کی ناٹ کو کستی اور ڈھیلا کرتی رہتی ہے۔ کبھی شگفتہ کار چلاتی ہے اور میں اس کے بازوؤں کو دیکھتا ہوں اور انھیں سہلاتا ہوں اور ان سے اپنا چہرہ ملتا ہوں۔ شگفتہ بہت پیاری لڑکی ہے (جب تک کسی عورت کی شادی نہ ہو جائے، میں اسے لڑکی کہنا پسند کرتا ہوں) وہ میری پہلی دریافت ہے (سوچتا ہوں زندگی میں کبھی ایک بار کہیں سر راہے اس مالن سے میری مڈبھیڑ ہو جائے تو مزا آ جائے)۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ شگفتہ بنگلہ نمبر ۳ میں رہتی ہے۔ ایک صبح کو میں روزانہ کے پروگرام کے مطابق شگفتہ کو بنگلہ نمبر ۳ میں اتار کر گھر پہنچا۔ کھانا کھایا۔ سگرٹ پینے لگا تو سگرٹ لائیٹر غائب تھا۔ یکایک یاد آیا کہ واپسی پر لائیٹر شگفتہ کے ہاتھوں میں تھا اور وہ اسے جلا جلا کر مجھے بار بار دھمکی دیتی تھی کہ "جلا دوں تمھاری مونچھیں؟" (جی ہاں۔ میری مونچھیں ہیں)

لائیٹر لینے شگفتہ کے ہاں گیا تو معلوم ہوا کہ وہ بنگلہ نمبر ۲ میں تابندہ بیگم کے ہاں گئی ہے۔ گھر واپس آ کر ملازم کو بنگلہ نمبر ۲ میں بھیجنا چاہا مگر پھر سوچا شگفتہ محسوس نہ کر بیٹھے۔ خود جانا چاہئے۔ خود چلا گیا۔ ملازم نے اندر اطلاع دی۔ پھر مجھے ڈرائینگ روم میں بٹھا دیا۔ شگفتہ وہاں ہوتی تو میرا نام سن کر خود آ جاتی یا کم سے کم اپنی موجودگی کا ثبوت ضرور دیتی مگر دیر تک کچھ نہ ہوا۔ میں اس کے انتظار میں دروازے کے پردوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ بڑے عجیب پردے تھے۔ ان پر اوپر سے نیچے تک چھپی ہوئی تصویروں میں سے کوئی ایک بھی دوسری سے نہیں ملتی تھی۔ کہیں عورت دودھ بلو رہی تھی۔ کہیں کمہار چاک پر کوزہ بنا رہا تھا۔ کہیں میراثی ڈھول پیٹ رہا تھا۔ ایک کسان ہل چلا رہا تھا۔ ایک کولھو چل رہا تھا۔ ایک دیہاتی لڑکی دلہن بنی بیٹھی تھی۔ ایک گھروندے میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ غرض قسم قسم کے دیہی مناظر کی بساط بچھی ہوئی تھی۔ ثابت ہوا کہ تابندہ نفسیات کی طالب علم سہی مگر آثار قدیمہ کی بھی دلدادہ ہے (میں دیہات کو اپنے ملک کے آثار قدیمہ میں شامل کرتا ہوں۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ جب بابر نے حملہ کیا تھا تو جب بھی یہ دیہات ایسے ہی تھے)

یکایک مجھے محسوس ہوا کہ کمرے میں کسی نے عطرِ حنا انڈیل دیا ہے۔ پلٹ کر دیکھا تو تابندہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ وہ ایک اور دروازے سے چپکے سے اندر آ گئی تھی۔ میں تڑپ کر کھڑا ہو گیا اور بولا "معاف کیجئے گا۔ میں آپ کے پردے دیکھ رہا تھا۔"

"میرے پردے؟" تابندہ ہنس کر بولی۔ "جی نہیں۔ میرے ڈرائنگ روم کے پردے۔"

میں جھینپ کر مسکرایا تو وہ بولی "معاف کیجئے گا آپ کو اتنی دیر تک انتظار کی زحمت گوارا کرنا پڑی۔ در اصل میں انسانی رشتوں کی نفسیات کے موضوع پر ایک کتاب پڑھ رہی تھی۔ جس کا آخری باب ختم ہونے کو تھا اور میں ختم کر کے اٹھی (کیا لپ اسٹک لگانا اور عطرِ حنا چھڑکنا نفسیات کی ہر کتاب کا آخری باب ہوتا ہے؟) یہ نفسیات ایسا موذی علم ہے کہ ایک آدھ کڑی غائب ہو جائے تو سارا ڈھانچہ بکھر جاتا ہے۔ آپ کو بھی نفسیات کے مطالعے سے یقیناً دلچسپی ہو گی۔"

"جی ہاں" میں نے کہہ دیا حالانکہ جاسوسی ناول نفسیات میں شامل نہیں ہوتے۔

"تشریف تو رکھیے نا" وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "آپ تو کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ یہ بتائیے کون کون سی کتابیں پسند ہیں آپ کو؟"

"یہ پوچھیے کون کون سے انسان پسند آئے۔" میں نے ہنس کر کہا (بھئی نہ جانے وہ مالن میرے دماغ میں بیٹھی کھرپے سے کیا کر رہی ہے!)

"آپ تو بڑی دلچسپ باتیں کرتے ہیں۔" تابندہ بولی۔ "یہ بتائیے۔ آپ نے کون کون سے انسان پڑھے ہیں۔"

(پھر وہی مالن)

میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے پوچھا۔ "مثلاً کیا ہمارے اس بنگلہ نمبر ۳ والے پڑوسیوں کو پڑھا ہے آپ نے؟"

پھر وہ یوں قہقہہ مار کر ہنسی کہ اگر میں بھی نہ ہنستا تو بد تہذیب ٹھہرتا اس لیے میں بھی ہنسنے لگا۔ (کہیں شگفتہ ہماری باتیں سن نہ رہی ہو!)

تابندہ کچھ اس طرح ہنسی تھی کہ مجھے کہنا پڑا۔ "عجیب سنکی لوگ ہیں۔"

"سنکی؟" وہ بولی۔ "اجی احمق کہئے۔ اسی شگفتہ کو دیکھئے۔ پانچ لاکھ کے بنگلے میں رہتی ہے اور پڑھتی اردو ہے۔"

تابندہ اب کے پھر زور سے ہنسی۔ ظاہر ہے کہ میں بھی اب کے پھر زور سے ہنسا اور بولا "بنگلے کے لان میں گلاب اور گیندے کی جگہ کدو اور کریلے اگا رکھے ہیں!"

اس دفعہ تو تابندہ یوں ہنسی کہ اس کا سارا خون اس کے چہرے میں جمع ہو گیا۔ آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور ———، یہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں چھلکیں اور مجھے لگ گئیں۔ ان آنکھوں پہ دنیا کے ساتوں سمندر قربان۔ (مالن کی آنکھوں سے کتنی ملتی تھیں یہ آنکھیں مگر وہ ذرا زیادہ کالی تھیں۔ کیا تاروں سے جھلکتی ہوئی اندھیری راتوں میں آپ نے سمندری سفر کیا ہے؟)

"اُفوہ" اس نے ہنسی پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "عجیب بے معنی لوگ ہیں۔ توبہ۔" پھر وہ ایک ننھے سے رومال سے آنکھیں پونچھ کر بولی "معاف کیجئے گا۔ آپ ہمارے یہاں پہلی دفعہ آئے ہیں مگر میں یوں باتیں کر رہی ہوں جیسے آپ کو برسوں سے جانتی ہوں۔ ویسے میں آپ کو برسوں سے جانتی ہوں۔ ہزار بار آپ کی آواز سنی ہے۔ ہزار بار آپ کی کار کی آواز سنی ہے۔ رسمی تعارف نہیں تھا۔ ورنہ کبھی کبھی جی چاہتا ہے

کہ کتاب اٹھاؤں اور آپ کے لان میں جا بیٹھوں۔ بڑا خوبصورت لان ہے۔" (بیوقوف تھے دونوں — مالی اور مالن)

"دیکھیے۔ آپ تو کمال کرتی ہیں۔" میں نے کہا۔ "آپ کہیں تو میں اپنا لان آپ کی کوٹھی میں شامل کر دوں۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ آپ نے تو مجھے شرمندہ کر دیا۔ چلئے۔ ابھی چلئے اور لان میں جا بیٹھئے۔ یقین کیجئے میں آپ کو ہمراہ لیے بغیر نہیں اٹھوں گا۔"

"تو چلئے" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے آپ مجھے کشمیر لیے جا رہے ہیں۔"

"آئیے" میں نے دروازے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

وہ دو قدم چل کر بولی۔ "آپ نے یہ تو بتایا نہیں کہ آج آپ یہاں کیسے بھول پڑے۔"

میں نے فوراً کہا (نہ جانے میں نے بغیر سوچے بات کیسے گھڑ لی) "کل کسی ملازم نے بتایا کہ خان بہادر صاحب کی طبیعت ناساز ہے۔ میں نے سوچا۔ تعارف تو نہیں ہے مگر پڑوسی کی حیثیت میں ان کا مجھ پہ اور میرا ان پر حق ہے۔ اس لیے ان کے مزاج پوچھنے چلا آیا۔"

"بالکل خیریت سے ہیں۔" تابندہ بولی۔ "اپنے حساب کتاب میں لگے ہوئے ہیں۔"

"خدا کا شکر ہے۔" میں نے کہا۔ غلط جگہ کہا مگر کہہ دیا۔ دراصل ہم دونوں تیزی میں تھے۔

وہ میرے ساتھ میرے بنگلے میں آ گئی۔ اس نے لان کی طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ وہ سیدھی میرے کمرے میں چلی آئی۔

وہ سیدھی میرے کمرے میں چلی آتی ہے۔ مجھے کان سے پکڑ کر اٹھاتی ہے اور اپنی کار میں بٹھا کر ہوا ہو جاتی ہے۔ یہ کار جہاں سے گزرتی ہے، عطرِ حنا کی لکیریں کھینچتی چلی جاتی ہے۔ تابندہ کی آنکھیں ہر وقت ڈبڈبائی رہتی ہیں۔ میں وجہ پوچھتا ہوں تو وہ کہتی ہے کہ "آنکھوں کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ صحرا، لالہ زار اور سمندر۔ صحرا پیاسا مارتے ہیں۔ لالہ زار سلاتے ہیں اور سمندر ڈبوتے ہیں۔" میں کہتا ہوں "تو لاؤ مجھے ان سمندروں میں ڈوب جانے دو۔" وہ میری طرف یوں دیکھنے لگتی ہے جیسے میں نے اس کی آنکھیں پیسے دے کر خریدی ہیں۔ اور یقین کیجئے کہ جب وہ میری طرف دیکھتی ہے تو میں ڈوب جاتا ہوں۔ پھر یکایک کسی حادثے سے بچنے کے لیے وہ پلکیں لگاتی ہے۔ پہلے بلبلا اٹھتے ہیں اور وہ ہنستے ہنستے اپنا برا حال بنا لیتی ہے۔ یوں یہ آنکھیں اور ڈبڈبا آتی ہیں اور یہ سمندر اور گہرے ہو جاتے ہیں۔ وہ نفسیات کا ایم ! اے پاس کر لینے کے باوجود نفسیات کے معاملے میں بالکل جاہل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ جہالت میری نظر میں اس کا بھولپن بن جاتی ہے۔ جب وہ کہتی ہے کہ "تم عمر بھر صرف میرے رہو گے نا؟" اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ عمر بھر اسی کا رہوں گا تو وہ مجھ سے یوں بیقراری سے لپٹ جاتی ہے جیسے میں عمر بھر اسی کا رہوں گا۔

تو وہ میں عرض کر رہا تھا کہ بنگلہ نمبر ۳ اور بنگلہ نمبر ۲ میں فلاں فلاں لوگ بستے ہیں۔ ضمناً شگفتہ اور تابندہ کا بھی ذکر آ گیا اور آنا چاہیئے تھا کیونکہ شگفتہ کو میں صبح کے بعد اپنی کار میں گھما لاتا ہوں تو تابندہ شام سے پہلے مجھے اپنی کار میں گھما لاتی ہے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ نہ شگفتہ کو میری شاموں کا پتہ ہے نہ تابندہ کو میری صبحوں کا۔ مجھے ان دونوں کی یہ معصومیت بڑی پیاری لگتی ہے۔ (یہاں ایسا محسوس ہوا ہے جیسے مالن کے ہاتھوں سے پھول گر پڑے ہیں)

آج صبح کو جب میں شگفتہ کو دو گھنٹے تک ویران سڑکوں پر گھمانے کے بعد کار کو گیراج میں چھوڑ کر اپنے کمرے میں آیا اور سگریٹ سلگانا چاہا (لائیٹر مجھے دوسرے روز ہی صبح کو مل گیا تھا) تو "ہٰذا من فضل ربی" کے پورچ میں ایک کار آ کر رکی۔ میں نے دروازے میں آ کر گیلری میں سے جھانکا تو یہ بنگلہ نمبر ۴ کا سجاد تھا۔ میرے جسم کا سارا خون سر میں جمع ہو گیا۔ میں پلٹ کر میز کی طرف بڑھا کہ میز کے دراز میں سے اپنا ریوالور نکالوں (میرے پاس جرمنی میک کا ایک فرسٹ کلاس ریوالور ہے) تو اتنے میں سجاد خادم کے ذریعے اطلاع بھجوانے کا تکلف کیے

بغیر اندر آگیا اور پھر مجھ سے لپٹ گیا۔ پہلے تو مجھے شبہ ہوا کہ وہ بُری نیت سے آیا ہے اور مجھے کسی نہ کسی طرح میز کے دراز تک پہنچنا چاہیئے۔ اِس لیے میں نے جسم کو جھٹکے دے کر آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر اس نے مجھے بازوؤں میں جکڑ لیا تھا۔ پھر بولا "میری جان مجھے معاف کر دو میں تم سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ میں دو برس تک تمہارا انتظار کرتا رہا کہ تم اپنی زیادتی پر شرمندہ ہو گے مگر پھر سوچا کہ پہلے میں اپنی زیادتی پر شرمندہ ہو لوں۔ ویسے پیارے۔ تمہاری کار کا مڈگارڈ تو کوئی دوسری کار بھی ادھیڑ سکتی تھی مگر مجھے گالی صرف تم دے سکتے تھے۔ ہے نا؟" پھر اس نے میرا ماتھا اور میرے گال اور میری گردن چوم لی۔

آدھے گھنٹے کے اندر ہماری حالت ایسی ہو گئی۔ جیسے ہم کبھی خفا ہی نہیں ہوئے تھے۔ وہسکی منگائی (جی ہاں بس دن رات میں دو تین بار یہ شوق کر لیتا ہوں) ایک دوسرے کی پیٹھ اور رانوں پر تھپڑ مار مار کر ہم نے دو برس کی ساری دھول جھاڑ لی۔

"میں آج کل بہت خوش ہوں" سجاد بولا "بس صرف تمہاری دوستی کی کمی تھی جو آج مجھے واپس مل گئی۔ اب تو میں بہت ہی خوش ہوں"

میں نے کہا "کیوں؟ کیا کاروبار زوروں پر ہے"

"کاروبار تو ہمیشہ زوروں پر رہا ہے خدا کے فضل سے" سجاد ایک نیا پیگ بھرتے ہوئے بولا "البتہ زندگی میں کچھ کمیاں تھیں ایک تمہارے جیسے دوست کی کمی۔ اور ایک وہ کمی جس پر شاعر لوگ عمر بھر شعر کہتے کہتے مر جاتے ہیں"

"عشق کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

بولا "ہاں۔ عشق کر رہا ہوں اور بڑے مزے کا عشق کر رہا ہوں۔ ابھی ابھی تمہاری پڑوسن تابندہ کو دو گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد کار سے اتارا ہے"

وہ رک گیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ نہ جانے کیوں دیکھنے لگا۔ پھر جب میں نے کہا کہ "جبھی عطرِ حنا کی لپٹیں آ رہی ہیں" تو وہ ہنسنے لگا اور بولا "روز کا پروگرام یہ ہے کہ صبح کے بعد دو گھنٹے تمہاری پڑوسن تابندہ کے ساتھ گزرتے ہیں اور شام سے پہلے کے دو گھنٹے اپنی پڑوسن شگفتہ مجھے اپنی کار میں لے جاتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ نہ شگفتہ کو میری صبحوں کا پتہ ہے نہ تابندہ کو میری شاموں کا۔" وہ میری ران پر ہاتھ مار کر اونچا اونچا ہنسنے لگا۔

میں نے کہا "بڑے اُلو ہو۔ ایک وقت میں دو عشق کر رہے ہو"

ہنسی پر قابو پاتے ہوئے اس نے پوچھا "سناؤ۔ آج کل تم کیا کر رہے ہو؟"

میں نے کہا "یار۔ وہ میرا ایک پرانا مالی تھا نا خوشیا۔ اس کی تلاش میں ہوں۔ اس کے بغیر لان تباہ ہو گیا ہے"

سجاد نے قہقہہ مارا "تم وہی بور کے بور رہے" پھر یکایک سنجیدہ ہو کر بولا "بھئی خدا کے لیے، بتانا کسی کو نہیں"

میں نے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے"

سیّد سجّاد حیدر

پطرس بخاری

ترجمہ۔ قرۃ العین حیدر

ہمارے موجودہ شور رستاخیز میں سجاد حیدر کی رحلت کا سانحہ کچھ دب کر رہ گیا۔ اسے محسوس کیا تو صرف انھی لوگوں نے جن کے لیے ان کی موت ایک ذاتی صدمہ تھی۔ یہ تعجب کی بات نہیں کیونکہ انھوں نے جو کچھ لکھا اس پر کوئی نعرہ چسپاں نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ واقعہ کہ ان کی موت پر اتنی خاموشی رہی المناک ضرور ہے۔ اُردو ادب پر ان کا اثر بہت عظیم تھا۔ بڑی شوخی اور بڑے لطف کے ساتھ انھوں نے اُردو زبان و ادب کے بوڑھے چہرے کو جوانی اور تر و تازگی بخشی اور گو ان کے تجربے کی جسارت کو اب تقریباً فراموش کر دیا گیا ہے لیکن رنگ و روپ کی بہت سی لطافتیں جو انھوں نے پیدا کیں، ابھی باقی ہیں۔

انھوں نے بہت زیادہ نہیں لکھا۔ ان کی تمام تخلیقات جو کتابوں کی صورت میں شایع ہوئیں، سالگرہ کے ایک کم قیمت تحفے کے طور پر ایک چھوٹے سے سفری پیکٹ میں سما سکتی ہیں۔ چند افسانے اور مختصر ناول، چند ڈرامے، کچھ مضامین تنقیدی یا محض مقالات، کچھ ہلکے پھلکے خاکے، شاید کچھ نظمیں اور بس۔ اس کے علاوہ جو کچھ انھوں نے لکھا —— اور وہ بھی زیادہ نہ تھا —— وہ اس دور کے معتبر ماہناموں، مخزن، علیگڑھ میگزین اور معارف کے صفحات پر بکھرا ہوا ہے اور ان کے مسودات میں چند ایک کبھی کبھار "لکھی ہوئی نظمیں بھی ضرور موجود ہوں گی جو شایع کبھی نہ ہوئیں۔

وہ بھاری بھرکم نہیں بلکہ رواں و جواں ادیب تھے لیکن معمولی ہرگز نہ تھے اور اتنا ہمیں بھی معلوم ہے کہ ان کے ادب کی زندگی چند روزہ نہیں۔

"خیالستان" ان کی سب سے مشہور تصنیف ہے۔ اس کی ترتیب اور عنوان دونوں کا خیال انھیں ان کے ادبی دوست اور مداح میر غلام بھیک نیرنگ نے دلایا تھا اور یہ مجموعہ اپنی اشاعت کے چند ہفتوں کے اندر اُردو کی ایسی مقبول تصنیف بن گیا جو بڑی رغبت سے بار بار پڑھی گئی۔ آج ہم اس سے ایک سنگ میل کی حیثیت سے واقف ہیں اور جب ادبی فیشن بدلے گا اور شاید لوگ خیالستان کے شستہ و شائستہ حسن کی طرف متوجہ نہ ہوں گے اس وقت بھی ہمیں ادبی مطالعے کی خاطر اسی کتاب کی طرف رجوع کرنا پڑے گا اور یہیں ان خصوصیات کا سراغ ملے گا جنھوں نے بڑی حد تک اُردو کو اس کا دم خم اور لوچ بخشا ہے۔

سجاد حیدر نصف صدی سے کچھ زیادہ عرصے تک زندہ رہے۔ جوان ہو کر انھوں نے خود کو ہندوستانی مسلمانوں کے تہذیبی نشاۃ ثانیہ کے تموج میں رواں دواں پایا اور اگر آپ اس سے کم جوشیلے الفاظ برتنا چاہیں تو یہ کہیے کہ وہ مسلمانوں کی نئی خود آگاہی کے دھارے میں شامل تھے اور

اختتامِ صدی کے اس عہدِ انقلاب میں ان کا دم قدم بھی شریک تھا جس میں اس ملک کے مسلمان داخل ہو رہے تھے۔ وہ اس دور کی پیداوار بھی تھے اور ممثل بھی۔ انھوں نے علیگڑھ میں تعلیم پائی اور ساری زندگی ان کو نہایت فخر کے ساتھ اس دل پذیر گروہ میں شامل سمجھا گیا جس نے اس مرکز سے باہر آکر ایک نئے مسلم طرزِ فکر اور طرزِ زندگی کی تحریک کی تزئین کی۔ ابھی ہم اس عہد سے اتنے قریب ہیں کہ غالباً آسانی سے یہ نہیں جان سکتے کہ اس تحریک و تزئین کی قدر و قیمت کیا ہے۔ لیکن قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مستقبل کے مؤرخ کو اس اولین دور میں اس قومی وجاہت اور امید کو دوبارہ حاصل کرنے کی تمنا ضرور کارفرما نظر آئے گی جو سلطنتِ مغلیہ کے آخری نام لیواؤں کے بعد ہندوستانی مسلمان اپنی زندگیوں میں کھو چکے تھے۔ اقتدار کی خواہش بعد کے عہد میں پیدا ہوئی اور اس میں سجاد حیدر اور ان کے ہم عصر شریک نہ تھے لہٰذا عمرانیات کے لحاظ سے اقبال کے برعکس سجاد حیدر موجودہ دور سے تعلق نہیں رکھتے۔ اقبال دونوں ادوار میں شامل تھے چنانچہ وہ عظیم ہونے کے ساتھ ساتھ زیادہ لوگوں کی زبانوں پر رہے لیکن سجاد حیدر کی ادبی اہمیت بہرصورت قائم ہے۔

وہ اس نسل کے فرد تھے جس نے مسلمانوں کی زندگی میں ایک ترکیب پیدا کرنا چاہی۔ اس کے اجزائے ترکیبی قدیم و جدید، مغرب اور مشرق، سائنس اور مذہب، عربی اور انگریزی پر مشتمل تھے۔ یہی نظریہ تھا جس نے علیگڑھ اکیڈمی کے لیے "اینگلو اورینٹل" کا نام اختراع کیا۔ اس نظریے کے چند مظاہر نے اکبر الٰہ آبادی کے ایسے لوگوں کو بہت ملول کیا مگر وقت آگے بڑھتا گیا اور جدید مدنیت کے پیغمبر اپنے مشن میں کامیاب رہے۔

اس جدید مدنیت و شائستگی کے لیے سجاد حیدر نے ایک مناسب اور مناسب طور پر ترقی پسندانہ نگارشِ جمیل سے اردو زبان کو روشناس کیا۔ ترکی ٹوپی، مغل شیروانی اور انگریزی پتلون میں ملبوس نوجوان ادیبوں کی ایک پوری نسل اس طرزِ تحریر کی طرف جوش و خروش سے لپکی گویا صرف یہی چیز تھی جس کا وہ اب تک انتظار کر رہے تھے اور یہ واقعہ بھی تھا۔ اس میں وہ سب کچھ موجود تھا جس کی انھیں آرزو تھی۔ یہ اردو تھی مگر ساتھ ہی ساتھ اس میں ایک واضح مغربی رنگ بھی موجود تھا۔ الفاظ عربی اور فارسی کے تھے لیکن ——— اے لیجیے ——— اپل کی پل میں ان الفاظ کی سختی اور بھاری پن غائب ہو گیا ——— !! گویا کسی نے ملٹن کے زورِ بیان میں آسکر وائلڈ کے رنگ کی آمیزش کر دی ہو!

قومی نوجیون کے ساتھ تجدیدِ ماضی کے خواہشمند نوجوانوں نے اس نئے اندازِ تحریر کو بڑے غرور اور بڑے پیار سے اپنایا۔ ان کو مسرت اس بات کی تھی کہ یہ طرزِ تحریر نفیس، ترقی پسند، نرم و نازک اور آزاد خیال تھا۔ مغرور اس وجہ سے تھے کہ یہ طرزِ تحریر قوم کے شاندار ماضی سے بھی وابستہ تھا، مشرقی تھا۔

ترکی نئے امتزاج کا ممثل تھا ——— ترکی جو مشرق اور مغرب کے تہذیبی سنگم پر واقع تھا! یا کم از کم لوگ یہی تصور کرتے تھے لہٰذا یہ بات معنی خیز ہے کہ سجاد حیدر نے اتنی لگن کے ساتھ ترکی یا کم از کم ہندی مسلمانوں کے اس آدرش کی اپنی تحریروں میں جھلک دکھلائی۔

ان کی بیشتر کہانیاں اور ڈرامے "تراجم" ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اصل تصانیف سے ان "تراجم" کا مقابلہ کیا گیا ہے یا نہیں۔ اس لیے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ سجاد حیدر نے اپنے آپ کو صحیح معنوں میں مترجم ہی کی حیثیت سے پیش کیا ہے یا یہ محض ان کا حسنِ بیان ہے یا محض انکسار جو انھیں ایک نئی تکنیک برتنے کی معذرت کے طور پر برتنا پڑا۔ چند داخلی شہادتوں کی بنا پر مجھے شبہ ہے کہ یہ "تراجم" دراصل تقریباً طبعزاد تخلیقات ہیں اور جتنا سمجھا جاتا ہے اس سے کہیں زیادہ اوریجنل واقع ہوئی ہیں۔ ان کی ترغیب سجاد حیدر کو ترکی کے معاشرتی پس منظر نے دلائی کیونکہ جدید مدنیت یورپین کے بجائے ترکی لیبل کے ساتھ کہیں زیادہ دل آویز نظر آ سکتی تھی، گویا مسلمان نوجوان

اپنے تصورات کو ایسے انداز میں پیش کرنا چاہتا تھا جنھیں اجنبی نہ کہا جا سکے۔ اس دور سے پُورم پُور تعلق رکھنے کی وجہ سے سجاد حیدر نے خود اس کشش کو محسوس کیا اور اسے ایک ادبی روپ میں ڈھال کر اپنی نسل کے نثر نگاروں کے سامنے ایک ایسے دل نشیں سمجھوتے کی شکل میں پیش کر دیا جسے نہایت جوش و خروش کے ساتھ قبول کیا گیا۔ انھوں نے ایک ترکی قلمی نام یلدرم اختیار کیا جس نے قلمی نام اختیار کرنے کے نئے فیشن کی بنا ڈالی۔ یہ تفصیل گو غیر اہم ہے لیکن اپنی جگہ پر ایک علامت کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس عہد میں الفاظ کے نت نئے روپ دریافت کیے جا رہے تھے۔ نئے سمبل تلاش کیے گئے جنھیں تصورات اور نئے آدرشوں کے اظہار کے لیے تراشا اور سنوارا گیا۔ نئے رجحان، نئے جذبات و احساسات نئی پُر مسرت اور تخلیقی طرزِ زندگی کے حصول کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ پرانے لیکھکوں نے ادبِ عالیہ اور قدیم کلاسیک کھود نکالے اور وطن پرست سیاحوں اور محققوں کی مانند ہمیشہ نئے نئے خزانے لے کر اپنے دیس کو لوٹے۔ ابو الکلام آزاد، ظفر علی خان، اقبال ـــــ اور ان سے زیادہ واقعیت پسند مصنف ـــــ شبلی، نثر نگار حالی اور سر سید احمد خاں ـــــ سب کے سب کسی نہ کسی طور پر زبان کو مالا مال کرنے کی خاطر دور دور کی سیاحتوں پر نکلے۔ سجاد حیدر کا میدان ان کے مقابلے میں زیادہ بے تکلف اور ذاتی ہے۔ شائستہ، خوش ذوق اور پُر تکلف طرزِ معاشرت، شستہ مذاق، رعنائیِ خیال، نزاکتِ جذبات اور رومانی حُسن کے اظہار کے لیے سجاد حیدر نے ایک نئی زبان کا تار و پود جمع کیا اور اسے پروان چڑھایا اور اُردو نثر کو ایک ایسی مدھرتا عطا کی جو اب تک محض شاعری سے ہی منسوب کی جاتی تھی۔ انھوں نے زبان کو ایک نیا ترنم اور آہنگ اور وزن بخشا جس نے بہت سے خوابیدہ جملوں کو جگایا اور اس بے کیفی اور جھول کو دور کیا جو نثر پر چھا چکی تھی۔

یہ ایک ایسا دل آویز موضوع ہے کہ بری طرح جی چاہتا ہے اس پر تفصیل سے گفتگو کیجیے مگر یہ سطور ایک ایسے دلکش اور جوان طبیعت ادیب کے لیے نذرِ عقیدت کے طور پر لکھی گئی ہیں جو اب دنیا میں موجود نہیں رہا۔ یہ تنقیدی جائزہ نہیں ہے اور میں اس کی کوتاہیوں کا معترف ہوں۔ مجھے امید ہے کہ میرے پڑھنے والے بھی ان کوتاہیوں سے چشم پوشی کریں گے۔

جنابِ سالک

محمد طفیل

شب بیداریاں میری قسمت میں لکھی جا چکی ہیں۔ سونے اور جاگنے کے دورے پڑتے ہیں۔ سونے کے دورے پڑیں گے تو سرِ شام ہی سو جاؤں گا۔ جاگنے کے دورے پڑیں تو مہینوں راتیں جاگ کر گزار دیتا ہوں۔ ۲۷ ستمبر ۱۹۵۹ء کی رات بھی میں نے جاگ کر گزاری تھی۔ کوئی صبح تین بجے کے قریب آنکھ لگی ہوگی۔ بیدار ہوا تو آٹھ بج چکے تھے۔

۲۸ کی صبح، میں بیٹھا شیو بنا رہا تھا کہ اخبارچی اخبار دے گیا۔ میں نے اُس دن خلافِ معمول اخبار نہ اٹھایا۔ شیو کی، نہایا، چائے کی پیالی ہاتھ میں لے کر اخبار کو جا دبوچا۔ اخبار کا ہاتھ میں لینا ہی تھا کہ پیالی والا ہاتھ لرز سا گیا۔ بیگم چلائی ـــ ”ارے میری تو قمیص کا بیڑا غرق کر دیا۔“

مگر میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

”اب چپ کیوں ہو گئے، میری بائیس روپے کی قمیص تھی۔“

میں پھر بھی چپ!

”بولئے بھی۔“

”مولانا عبدالمجید سالکؒ کا انتقال ہو گیا ہے۔“

”انا للہ ـــــ“

بجائے دفتر جانے کے سالک صاحب کو دفنانے چل نکلا۔ مسلم ٹاؤن پہنچا۔ سالک صاحب کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر عبدالسلام خورشید اپنی کوٹھی کے دروازے پر ملے۔ بہت برا حال تھا اُن کا۔ میں نے ان سے کوئی بات نہ کی۔ مبادا رو پڑیں۔ حالانکہ بہانہ میں بھی ڈھونڈ رہا تھا تاکہ میرے بھی دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔

کوٹھی کے احاطے میں پہنچا تو سالک صاحب کے زندگی بھر کے ساتھی مولانا غلام رسول مہر سے ملاقات ہوئی۔ میں نے مہر صاحب سے کہا۔ ”یہ کیا غضب ہو گیا!“

طفیل صاحب خدا کی مرضی!

جب یہ بہت زیادہ بیمار تھے، اُن دنوں تو اللہ نے صحت دے دی۔ اب جبکہ اچھے بھلے تھے تو چل دیئے۔

”کل چار بجے تک بالکل ٹھیک تھے۔ سنسر بورڈ کی میٹنگ کے لیے تیار ہوئے۔ موٹر میں آ کر بیٹھے۔ پھر کسی ضرورت سے واپس

کمرے میں گئے۔ مگر نہ لوٹے۔ نوکر نے آکر دیکھا تو سالک گرے پڑے تھے۔ کچھ کچھ سانس باقی تھے۔ چارپائی پہ لٹایا تو بس چل دیئے۔

اب میں جس کی سنتا ہوں وہ ان کی باغ و بہار طبیعت، ان کے خلوص اور ان کے ادبی کارناموں کی باتیں کر رہا ہے۔ اور دل ہی دل میں رو رہا ہے۔ سنگدلی ہوتی گئے بھی تو چند، یہ سب وہ لوگ تھے۔ جن کا مولانا سے خون کا رشتہ نہ تھا۔ اگر رشتہ تھا تو صرف ادب یا خلوص و محبت کا۔

سالک صاحب سے میری پہلی ملاقات کوئی پندرہ سولہ برس اُدھر، پھول اخبار کے دفتر میں ہوئی تھی۔ سر پہ تُرکی ٹوپی اور ہاتھ میں چھڑی تھی۔ شیروانی اور شلوار پہنے ہوئے تھے۔ پاؤں میں سیاہ رنگ کے بوٹ تھے، خاصی توند تھی۔ جس میں شاید سارے ادیبوں کا غم تھا۔

اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی دہی بڑے کی پلیٹیں لیے چلا آرہا ہے۔ سب ایک ساتھ پکارے۔ ”یہ کیا؟“

سالک صاحب نے کہا ”یہ کیا کے بچے۔ نظر نہیں آتا دہی بڑے ہیں۔“

”کس نے آرڈر دیا تھا؟“

”میں نے“

کسی نے ٹوٹے ہوئے دل سے کہا — ”اچھا“

”مرے کیوں جا رہے ہو۔ اطمینان سے کھاؤ، پیسے میں دوں گا۔“

ہائے اُس ڈانٹ میں کتنا خلوص تھا۔ دہی بڑے کھلائے۔ لطیفے سنائے۔ خود بھی ہنسے اوروں کو بھی ہنسایا۔ مجھے آج یہ تو یاد نہیں کہ لطیفے کیا کیا ہوئے۔ مگر سب مسکرا رہے تھے۔ اٹھتے ہوئے یہ کہا ”کھانے والا کدھر ہے؟“

”کھانے والا کمرہ؟“

”ہاں کھانے والا کمرہ — امتیاز علی تاج کھانے کے کمرہ کو کھانے والا کمرہ کہتا ہے۔“

میں حیران کہ تاج صاحب میرٹھ کے رہنے والے ہیں۔ پکے اہلِ زبان، مگر زبان کی نزاکتوں پہ نظر ہے سالک صاحب کی جو خوب پنجابی ہیں۔

اس ملاقات کے بعد، بیچ میں اکا دکا ملاقاتیں ہوئی ہوں گی۔ جن کا کوئی نقش میرے ذہن پہ نہیں، سالک صاحب بھی بھول بھال گئے۔

ایک دن میں چیک اٹھا کر دفتر انقلاب جا پہنچا۔ سالک صاحب بڑے طنطنے سے بیٹھے ہوئے تھے۔

”میں حاضر ہو سکتا ہوں؟“

”آیئے“

”کیسے آنا ہوا؟“

میرا خیال تھا مولانا کو مجھے دہی بڑے کھلانے والی بات یاد ہوگی۔ اس لیے جواباً کہا۔ ”دہی بڑے کھانے۔“

”دہی بڑے کھانے؟“

”جی ہاں!“

اس پر مولانا نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ جیسے جانچ رہے ہوں کہ یہ آدمی کہیں پاگل تو نہیں — پھر مسکرا کر بولے۔ ”آج کل اپنی دہی نہیں جمتی۔“

میں نے سوچا۔ مولانا کی آج کل دہی نہیں جمتی۔ اس لیے فوراً اپنا تعارف کرانا چاہیئے۔ کیونکہ جس حوالہ سے، میں نے بات کی تھی۔

وہ بچھوڑا، مجھے ہی نہیں پہچان رہے تھے۔ چنانچہ میں نے شرما کر عرض کیا: "میرا نام یہ ہے"

اچھا۔ اچھا۔ ہاں اب یاد آیا۔ آپ سے دارالاشاعت میں ملاقات ہوئی تھی اور ہم سب نے مل کر دہی بڑے کھائے تھے۔ وہی بڑے تو ہندو بناتے تھے۔ اب پاکستان بن گیا ہے۔ اس لیے دہی بڑے کون بنائے؟

اس کے بعد میں سالک صاحب سے جب بھی ملا۔ سرشار ہو کر اٹھا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا۔ جیسے زندگی کے دو چار سال اور بڑھ گئے ہوں۔

ایک بار یہ بھی کراچی گئے۔ میں بھی گیا۔ یہ کسی اپنے کام سے گئے تھے۔ میں کسی اپنے کام سے، مگر ایک دعوت میں ملاقات ہو گئی۔ حال احوال پوچھا۔ نقوش کے سلسلے میں تھپکی دی۔ اتنی تعریف کی کہ میں بھری محفل میں شرمندہ ہو گیا۔ یہ وطیرہ آخر دم تک رہا۔ میرا عرض کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اپنی تعریف و توصیف سالک صاحب کا نام لے کر کر دوں۔ بلکہ عرض یہ کرنی چاہتا ہوں کہ وہ ہر ایک کی اتنی ہمت بندھاتے تھے۔ اتنی ہمت بندھاتے تھے کہ پھر اٹھا ہوا قدم اور دور جا کے ہی پڑتا تھا۔

دوسرے دن پھر ایک اور دعوت میں ملاقات ہوئی۔ معاملہ سلام دعا کی حد تک رہا۔

اتفاق دیکھئے کہ تیسرے دن پھر ایک چائے کی دعوت میں، ملاقات ہو گئی۔ مجھے سُنا کے، صاحبِ خانہ سے، سرگوشی کے سے انداز میں کہتے ہیں ــــ بھائی! طفیل سے میرا پیچھا چھڑا دیجئے۔ لاہور سے چلا تھا تو دانستہ ان کے علم کے بغیر چلا تھا۔ یہاں جہاں جاتا ہوں۔ یہ پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ میں یہ سمجھ رہا ہوں جیسے یہ میری ہی کھانے پینے کی چیزوں پر ہاتھ صاف کرنے کے لیے لاہور سے آئے ہیں۔

میں نے یہ سُنا تو ذرا سی ناک چڑھا دی۔

مولانا یہ سمجھے میں بُرا مان گیا ہوں۔ منہ سے کچھ نہ کہا۔ گلے لگا لیا۔ میں بھی ان کی چھاتی سے ایسے لگ گیا۔ جیسے دنیا بھر کا سکون مل گیا ہو۔

ابھی تھوڑے دنوں کی بات ہے کہ میں نے ایک شرارت کی اور ایک اس مضمون کا سرکلر لیٹر چھاپا کہ مجھے سارے ادیب یہ بتائیں کہ ادب روبہ تنزل ہے یا ترقی پذیر۔

سالک صاحب کا ٹیلیفون آیا ــــ طفیل صاحب یہ آپ نے کیا لکھ کر بھیج دیا ہے۔ جمود و مود والا قصہ۔

"میں آپ سے رہنمائی کا طالب ہوں۔ دو چار سطریں اس پر لکھ دیں۔"

"بھئی کوئی جمود و مود نہیں ہے۔ یہ سب آپ کی شرارت ہے۔"

"جو کچھ بھی آپ کا خیال ہو۔ چند سطریں لکھ کر عنایت فرمائیں۔"

"صحت کہاں سے لاؤں؟"

"میری ضد ہے کہ کچھ ضرور لکھیں۔"

"بہت اچھا۔ قبل از وقت ہی مار ڈالو گے؟"

دوسرے دن سالک کا ملازم آیا اور یہ تحریر لایا:۔

"ادب اردو کے متعلق آپ نے جو استفسار کیا ہے، اس کا جواب میری طرف سے یہ ہے کہ میں اردو ادب کو روبہ تنزل نہیں مانتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ہم کو ادب میں تنزل نظر آتا ہے تو وہ دراصل ماحول اور معاشرے کا تنزل ہوتا ہے۔ جو معاصر ادب میں منعکس ہوتا ہے۔ ہر دور کا اپنا ادب ہوتا ہے چنانچہ ہمارے اس دور کا ادب بھی اپنی خصوصیت رکھتا ہے۔ اگر حالات بہتر نہیں ہیں۔ تو دوسرے اداروں کی طرح

ادب بھی افسردہ ہوگا۔ اگر حالات میں خوشگوار تغیر ہو جائے تو ادب میں بھی "چمک دمک" بڑھ جائے گی۔ پاکستان میں آجکل ادب (یعنی افسانہ شعر اور تنقید) کے بجائے علم و تحقیق کا ذوق زیادہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ فلسفہ، تاریخ، مذہب، تنقید، فکر کی کتابیں اور اعلیٰ درجے کی کتابوں کے تراجم خاصی تعداد میں شائع ہوئے ہیں اور خصوصاً تاریخ کی تالیف اور اس کے مطالعہ کا شوق روز افزوں ہے۔"

ہمارے افسانہ نگار، ہمارے شعراء، ہمارے تنقید نگار بدستور مصروفِ کار ہیں۔ ان کی حوصلہ افزائی کے بھی بعض دروازے کھل رہے ہیں اور آئندہ بھی کھلیں گے۔ جمود، تنزل اور پستی وغیرہ کی مرثیہ خوانی ادیبوں کے لیے حوصلہ شکن ثابت ہوگی۔

میں اس موضوع پر کسی قدر تفصیل سے لکھتا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ علالت کی وجہ سے کسی مربوط و مضبوط تفکر کے قابل نہیں ہوں۔

اگر کسی وقت توفیق ہوئی تو موجودہ ادب کا تجزیہ کر کے اپنے دعوے کے ثبوت فراہم کر دوں گا۔" - عبدالمجید سالک

جس وقت مجھے یہ تحریر ملی تو میں بڑا خوش ہوا۔ اس لیے کہ مولانا نے عین بیماری کے عالم میں بھی میری بات کو نہیں ٹھکرایا تھا۔ میں نے اظہارِ تشکر کے لیے ٹیلیفون اٹھایا۔

"مولانا السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام ——— مل گیا میرا رقعہ؟"

"جی ہاں، اس وقت اسی کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں"

"شکریہ کس بات کا۔ میں اچھا ہوتا تو تمہارے لیے پطرس پر مضمون لکھتا۔ وہ نہ لکھ سکا اور پرچہ چھپ گیا۔ میں نے سارا پطرس نمبر پڑھ لیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس پر تفصیلی ریویو لکھوں۔"

"تو پھر لکھ ڈالیے۔"

"بھئی بات تو وہی ہے صحت والی۔ کیا کروں؟"

میں نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔ "اچھا تو پھر مجبوری ہے۔ السلام علیکم۔"

دوسرے دن ڈاک میں کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا کی پطرس نمبر پر رائے ملی۔ میں حیران رہ گیا۔ میں تصور تک نہیں کر سکتا تھا کہ مولانا، میرے حال پر اتنے مہربان ہوں گے اور اخلاق اور دلداری کا ایسا اعلیٰ نمونہ پیش کریں گے۔

وہ خط بھی پیش کرتا ہوں تاکہ محفوظ ہو جائے:

مسلم ٹاؤن / ٢١ ستمبر ۵۹ء

عزیزم مکرم طفیل صاحب! السلام علیکم

"یہ کہنا تو بہت پامال سی بات ہوگی کہ آپ نے "پطرس نمبر" خوب نکالا۔ کیونکہ آپ تو ہر نمبر خوب ہی نکالا کرتے ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اب تک ادب اردو کی تاریخ میں کسی فرد کے متعلق اسقدر کاوش اور ہمہ گیری سے کام نہیں لیا گیا۔ جو اس نمبر میں بخاری کے متعلق ملحوظ رکھی گئی ہے۔ یہ نمبر نہیں۔ "احمد شاہ بخاری کی لائبریری" ہے۔ جس کے بعد بخاری کے متعلق کسی قسم کی تشنگی باقی نہیں رہتی۔ افسوس ہے کہ سید سجاد حیدر مرحوم کے متعلق آپ کو بخاری کا مضمون نہ مل سکا۔ حالانکہ قرۃ العین حیدر نے اپنے خط میں آپ کو بتا دیا تھا کہ وہ مضمون فلاں اخبار میں چھپا تھا۔

اس نمبر میں خود مجھے بعض ایسی چیزیں پڑھنے کا اتفاق ہوا جو مدت دراز سے میرے ذہن سے اتر چکی تھیں۔ اس نمبر نے بخاری کی یاد کے بیشمار گوشے روشن کر دیے ہیں اور ہم لوگوں کو جو بخاری سے زیادہ قریب تھے ایک دفعہ پھر گویا بخاری کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا موقع بہم پہنچا دیا ہے۔

افسوس ہے کہ میں اپنی معذوری کے باعث اپنے بہترین دوست کے اس یادگاری نمبر میں کچھ نہ لکھ سکا۔"[1]

عبدالمجید سالک

سالک صاحب کی یہ تحریر مرنے سے چھ روز قبل کی ہے۔ کیا معلوم تھا کہ میرے نام ان کی یہ آخری تحریر ہو گی۔

سالک صاحب کی وضع داری کا یہ عالم تھا کہ ہر ایک سے جیتے جی بھی نبھائی اور اُس کے مرنے کے بعد بھی۔ مجید لاہوری سے ان کے بڑے گہرے مراسم تھے۔ مجید مر گیا۔ مگر مولانا کی دوستی نہ مری۔ مجید کے بعد، جو کچھ بھی یہ ان کے اعزہ کے لیے کر سکتے تھے۔ کرتے رہے۔ انتقال سے کچھ ہی روز قبل، مجھے مجید لاہوری کے مجموعہ کلام (کان نمک) کے لیے لکھا:

"کانِ نمک کا ایک نسخہ بھجوا رہا ہوں۔ اسے آپ دیکھ لیں اور کوئی صورت پیدا کر دیں جو لواحقینِ مجید کے لیے سود مند ہو۔ آپ بھی میرے لیے ویسے ہی ہیں، جیسے مجید (البتہ مجید فوت ہو چکا ہے) بہر حال اس ضمن میں جلد کوئی فیصلہ کر ڈالیں۔"

عبدالمجید سالک

میں نے نقوش پریس کے افتتاح کے موقع پر سالک صاحب کو بھی تشریف لانے کی زحمت دی تھی۔ یہ وقت کے پابند عمر بھر رہے۔ مگر اُس دن بڑی دیر سے پہنچے۔ میں نے شکایت کی "مولانا اتنی دیر سے؟"

"مجھ سے شکایت نہ کرو۔ گھوڑے صاحب سے جا کر پوچھو۔"

"گھوڑے صاحب سے؟"

"ہاں! وہ کمبخت چلتا ہی نہ تھا۔"

ان دنوں مولانا کے پاس اپنی موٹر نہ تھی۔ تانگہ پر آئے تھے۔ اس لیے ان کے وقت پر نہ آنے کا سارا گلہ جاتا رہا۔

میرا پروگرام یہ تھا کہ پریس کا افتتاح مولانا کے ہاتھوں کراؤں گا۔ مگر گھوڑے صاحب کی وجہ سے یہ وقت پر نہ پہنچے۔ اس لیے میں نے ایک اور صاحب کو زحمت دے دی تھی۔

میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی کارخانہ اس وقت تک نہیں چل سکتا۔ جب تک کہ کارکنوں کو خوش نہ رکھا جائے۔ چنانچہ میں نے یہ سوچا تھا کہ پریس کے کاریگروں کو ہار، مٹھائی اور پگڑیاں بندھوائی جائیں۔ یہ کام ابھی باقی تھا۔ سالک صاحب آئے تو یہ کام میں نے انھیں سونپ دیا۔

سالک صاحب نے پریس کے کاریگروں کو اپنے ہاتھوں سے پگڑیاں بندھوائیں۔

ایک صاحب نے فقرہ کسا۔ "اخبار نویس تو ساری عمر لوگوں کی پگڑیاں اتارتے رہے ہیں۔ آج یہ اُلٹی بات کیسے؟"

سالک صاحب نے فوراً جواب دیا۔ "اسی لیے تو کھبے ہاتھ سے بندھوا رہا ہوں۔" یہ تھا ان کی حاضر جوابی کا عالم۔ جو ہر موقع پر ان کا ساتھ دیتا تھا اور قدم قدم پر ہر ایک کو ان کی ذہانت کا معترف ہونا پڑتا تھا۔

سالک صاحب اس دنیا سے چلے گئے، یہ حادثہ ضرور ہے، مگر سالک صاحب ایسی ٹھاٹھ دار زندگی اور کتنے ادیبوں نے گزاری ہے؟

---

[1] میرے پاس مولانا کے اور بھی بہت سے خط ہیں، جنھیں فرصت کے وقت ڈھونڈوں گا۔

سالک صاحب نے زندگی بھر حکومت کی ہے۔ لوگوں کے دلوں پر بھی، صاحبِ اقتدار قسم کے لوگوں کی زبانوں پر بھی۔ انقلاب کے ذریعہ انھوں نے لوگوں کے دلوں کو موہا۔ حرف و حکایت کے چرچے رہے۔ ڈنکے بجے۔ اتنا کامیاب مزاحیہ کالم اور کسی سے لکھا نہ جا سکا۔ غرض انھوں نے زندگی بھر جو کچھ لکھا۔ قلم برداشتہ لکھا۔ جو پڑھ گیا سو موتی۔ وہ انہی کی تحریروں پر صادق آتا ہے۔ افکار و حوادث ان کی زندگی بھر کی حاصل تحریریں ہیں۔ انقلاب ہی کی بدولت یہ امیروں اور وزیروں کے مشیر رہے اور ایک وقت وہ بھی آیا کہ حاکمانِ وقت کے فیصلے سالک و مہر کے مشوروں سے ہی انجام پاتے تھے۔ جو یہ چاہتے تھے وہی ہوتا تھا۔ یہ اقتدار اور یہ ہر دلعزیزی اور کتنے ادیبوں کے حصہ میں آئی ہے؟

دوستوں کے لیے تو یہ امرت دھارا تھے۔ یعنی ہر دنیاوی مرض کی دوا سالک صاحب۔ ان کے چلے جانے سے سارے ادیب یتیم ہو گئے ہیں۔ خلوص و محبت کا جنازہ اٹھ گیا ہے۔ محفلیں سونی ہو گئی ہیں۔

میں سالک صاحب کے انتقال کو موت نہیں کہتا۔ موت تو اس کی واقع ہوتی ہے جس کا کوئی نام لیوا نہ رہے۔ سالک صاحب ادب کی دنیا میں باقی ہیں۔ دوستوں کے دلوں میں باقی ہیں۔

اور پھر سالک صاحب کے ہم سالہ رفیق مولانا غلام رسول مہر زندہ ہیں۔ جس دن یہ بھی چل دیں گے۔ اس دن سوچ لیجئے گا کہ سالک صاحب کی موت کا اعلان کیا جائے یا نہ کیا جائے۔

باقی آئندہ

نئی کتابیں

سوز و ساز

ملنے کا پتہ: انارکلی کتاب گھر لاہور ــــ قیمت فی جلد: پانچ روپے۔

ملکی شعرا میں اقبال کے بعد جتنی شہرت حفیظ جالندھری کو نصیب ہوئی وہ اور کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ بے شک یہ راہ حالی کی دکھائی ہوئی تھی مگر لگن اپنی اپنی تھی کہنے کا انداز اپنا اپنا تھا۔ ایک اعتبار سے حفیظ اقبال سے ایک قدم آگے ہیں۔ اقبال صرف خواص کے شاعر ہیں، حفیظ خاص و عام کے۔ اقبال کے کلام کو سمجھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ برخلاف اس کے حفیظ سادہ و پُرکار ہیں، جس سے عالم بھی محظوظ ہو اور عامی بھی۔ حفیظ کا شاہنامہ اسلام، گھر گھر اس عقیدت کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ جس طرح کسی الہامی کتاب کی تلاوت کی جاتی ہے۔ یہ تجربہ تو حالی کے سوا کسی کو نصیب نہ ہوا۔ سنت اور فرض کا فرق جانئے، بات صاف کردوں تو آگے چلوں، میرا مطلب یہ بالکل نہیں کہ حفیظ حالی اور اقبال سے بڑے شاعر ہیں۔ میں نے تو ان کی شاعری کے ایک رُخ کی بات کی ہے۔

زیر نظر کتاب حفیظ جالندھری کا دوسرا مجموعۂ سخن ہے۔ جس میں ان کی کئی مشہور نظمیں ہیں، مثلاً رقاصہ، اور جاگ سوزِ عشق جاگ کے ساتھ "مدینے کے مسافر" اور "میرا سلام لے جا" ایک اس دنیا کا سرمایہ، ایک اُس دنیا کا سرمایہ، مطلب یہ کہ رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔

اس ایڈیشن میں کئی اضافے بھی ہیں، چند نظمیں اور غزلیں، مگر اضافہ خوش آئند نہیں۔ حفیظ صاحب کو چاہیے کہ وہ اپنی عمر کے اس آخری حصے میں اپنے منتخب کلام کے نئے ایڈیشن چھپوائیں۔ چھپ جائیگے اور کمزور چیزوں کا اضافہ کردیں۔

قرآن مجید (مع تفسیر و ترجمہ)

ناشر: تاج کمپنی لمیٹڈ کراچی ــــ ہدیہ چالیس روپے (جو دس دس روپے کی چار قسطوں پر بھی مل سکتا ہے)

کلام تو اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اس لیے اس پر کوئی کیا تبصرہ کرے گا سوائے اس کے کہ یہ دنیا کی سب سے بڑی کتاب ہے اور ایسی کتاب ہے جس میں ہمارے لیے ہدایتوں اور برکتوں کے خزانے بھرے پڑے ہیں۔ اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو اس کی تصحیح اور گٹ اپ کے بارے میں، تاج کمپنی نے خوبصورت قرآن چھاپنے میں جو نام پیدا کیا ہے۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ یہ قرآن پاک بھی انھوں نے اپنی روایتی شان کے مطابق چھاپا ہے۔ یہ قرآن تفسیر و ترجمہ کی خوبیوں سے مالامال ہے۔ ترجمہ ہے شیخ الہند مولانا محمود الحسن کا اور تفسیر ہے مولانا شبیر احمد عثمانی کی۔ پہلے یہی تفسیر و ترجمہ والا قرآن مدینہ پریس بجنور نے چھاپا تھا۔ مگر اب کے تاج کمپنی نے اسے زیادہ ٹھاٹھ اور محنت سے چھاپا ہے۔ قرآن پاک کی نشر و اشاعت میں جتنا اہتمام اور جتنا روپیہ تاج کمپنی نے صرف کیا ہے۔ وہ اور کسی کے بس کی بات نہیں۔ اس پر ان کی ایک لاکھ روپے کی لاگت آئی ہے۔

مکتوبات سر سید

مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی ــــ ناشر مجلس ترقی ادب لاہور ــــ قیمت دس روپے

مکتوبات سر سید پڑھنے سے سر سید کی عظمت کا پتہ چلتا ہے کہ وہ کس بلا کا مخلص انسان تھا اور اس کے دل میں اسلام کی اور مسلمانوں کی بہتری کے لیے کیا کیا امنگیں کروٹیں لیتی رہتی تھیں۔ خطوط سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے جو کام کیا، اسلام کے لیے کیا اور مسلمانوں کے لیے کیا۔ سر سید نے اسلام کو اپنے ذہن کی روشنی میں پرکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ (بعض معاملات میں) روایتی قسم کے مولوی سر سید کے خلاف ہو گئے تھے اور اسے کافر اور بے دین ایسے "معززانہ" القابات سے نواز ڈالا تھا۔ سر سید مزاجاً بذلہ سنج

گے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کبھی کبھی چھیڑ چھاڑ کو بھی پسند کرتے تھے۔ چنانچہ سرسید کا یہ کہنا کہ میں نے مرغی حلال کرنے کی بجائے اگر اس کی گردن مروڑ کر کھالی تو کیا ظلم کیا، مولوی حضرات اس پر بدکے۔ یہ سرسید پہ مصر ہے۔ سوال یہ ہے اگر سرسید مرغی حلال کر کے ہی کھا لیتے تو کیا ظلم ہوتا۔ بہرحال یہ کتاب سرسید کو سمجھنے کے لیے، کام کی چیز ہے۔ اس میں خدا اور رسول سے سرسید کے عشق کا اظہار ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سرسید نے مسلمانوں کی بہتری کے لیے کس طرح تڑپ تڑپ کر زندگی گزاری۔ میری تو دعا ہے آج مسلمانوں میں ایک اور سرسید پیدا ہو —— اس کتاب کو شیخ صاحب نے جس خوبی سے مرتب کیا ہے۔ وہ بیحد قابلِ داد ہے۔ اتنی محنت اور عرق ریزی شیخ صاحب کے علاوہ شاید اور کسی کے بس میں نہ ہوتی۔ کتاب کی قیمت بہت زیادہ ہے پھر ایسے ادارہ کے لیے جو حکومت کے روپیہ سے چل رہا ہو اور مقصد محض خدمت ہو۔

(م - ط)

بیان المطلوب ترجمہ کشف المحجوب

مترجم مولوی فیروز الدین۔ حجم ۲۶۰ صفحات۔ قیمت فی جلد سات روپے آٹھ آنے

ناشر: فیروز سنز لمیٹڈ۔ لاہور

کشف المحجوب تصوف کی ایک لاجواب کتاب ہے۔ یہ عہد غزنوی کے مشہور روحانی بزرگ سید علی ہجویری عرف داتا گنج بخش رح کی تصنیف ہے جن کا مزار پُر انوار لاہور میں ہے۔ یہ کتاب فارسی میں تھی۔ مولوی فیروز الدین بانیٔ فیروز سنز نے مدت ہوئی اس کا اردو ترجمہ کیا تھا جسے ترمیم و اصلاح کے بعد اب خاص اہتمام سے دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اسلام کے وہ تمام حسین خط و خال دلکش انداز میں سامنے آجاتے ہیں جو فقر و غنا، توکّل و رضا، صبر و قناعت، خدمت و محرومیت اور عبادت و شکر کی دل آویز جھلملیوں سے جھانکتے نظر آتے ہیں، کتاب کو زیادہ مفید بنانے کے لیے آخر میں باب وار تلخیص دی گئی ہے تاکہ وہ لوگ بھی اس کے مطالب سے استفادہ کر سکیں جو عدیم الفرصتی یا کسی اور سبب سے اس ضخیم کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کر سکتے۔ ترجمہ نہایت سہل اور رواں ہے۔ کتابت و طباعت عمدہ ہے۔

اَن دیکھی حقیقتیں

مصنف: کوثر نیازی۔ حجم ۱۹۲ صفحات۔ قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے

ناشر: آئینہ ادب۔ لاہور

توحید، رسالت اور آخرت ایسی ان دیکھی حقیقتیں ہیں۔ جن پر ایمان لائے بغیر کوئی مسلمان نہیں رہ سکتا کیونکہ مسلمان کے اخلاق، تہذیب، تمدن اور نظام اجتماعی کی ساری عمارت ان ہی پر قائم ہے۔ مگر اسلام کے ان بنیادی عقائد کو علم الکلامی مباحث اور فلسفیانہ موشگافیوں میں اس طرح الجھا دیا گیا کہ عام سمجھ کے آدمی کے لیے اب ان میں کوئی کشش باقی نہیں رہی ہے۔ ضرورت تھی کہ اس قسم کی تعلیمات کو نہایت سادہ، عام فہم اور جدید انداز میں پیش کیا جائے تاکہ پڑھے لکھے نوجوان کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ باتیں سیکھ سکیں۔ کتاب "ان دیکھی حقیقتوں" میں اسی ضرورت کو پورا کیا گیا ہے۔ نوجوانوں کی ذہنی تربیت کے لیے یہ کتاب مفید ہے۔

(ع - ق)

ہماری کتابیں

بھابی	شوکت تھانوی	۴/۸
نیلوفر	"	۶/-
مولانا	"	۳/۸
غزالہ	"	۶/-
خدانخواستہ	"	۳/-
سودیشی ریل	"	۳/-
کتیا	"	۳/۸
سانچ کو آنچ	"	۳/۸
سسرال	"	۲/۴
کارٹون	"	۳/۸
مابدولت	"	۳/۸
بقراط	"	۲/۴
جوڑ توڑ	"	۴/-
مضامین شوکت	"	۲/۸
قاضی جی (تین حصے)	"	۱۰/۸
غالب کے ڈرامے	"	۲/۸
وغیرہ وغیرہ	"	۳/-
روزن	قتیل شفائی	۳/-
قول و قرار	عدم	۲/۸
پیچ و خم	"	۳/-
نبی امی	عمر ابوالنصر	۵/-

خلفائے محمد	عمر ابوالنصر	۱۰/-
عرب کے تین مدبر	"	۳/-
خالد	عباس محمود العقاد	۴/-
خدیجہ	عبدالحمید الزاہروی	۵/-
شعلۂ طور	جگر مرادآبادی	۷/۸
امراؤ جان ادا	رسوا	۴/-
ملٹو	ابوسعید قریشی	۴/۴
سرکنڈوں کے پیچھے	منٹو	۳/-
آنچل	احمد ندیم قاسمی	۳/-
بازارِ حیات	"	۳/-
عزیزم کے نام	ڈاکٹر تاثیر	۲/۸
ید بیضا	عابد علی عابد	۵/-
سیاستِ الٰہیہ	امام ابن تیمیہ	۲/۸
نقوشِ لطیف	احمد ندیم قاسمی	۶/-
مضامین جمال الدین افغانی		۴/-
پندرہ اگست	رشید اختر ندوی	۲/۴
صاحب	محمد طفیل	۳/-
اندازے	فراق گورکھپوری	۵/-
اردو غزل گوئی	"	۲/-
ہماری داستانیں	سید وقار عظیم	۵/-
انتقاد	سید عابد علی عابد	۳/-

اِدارۂ فروغِ اُردو (ایبک روڈ انارکلی) لاہور

مشرقی پاکستان کی ترقی میں ہمارا حصّہ

مشرقی پاکستان کی صنعتی ترقی کا بہت کچھ انحصار دریائی راستوں کے ذریعہ تیل کی مصنوعات کی تقسیم کاری پر تھا۔ چنانچہ برما شیل نے غیر ملکی زرمبادلہ صَرف کئے بغیر رفتہ رفتہ چھ ایسے جہاز مہیا کر لئے جو آج مشرقی پاکستان کو ۱۹۴۸ء کے مقابلہ میں چوگنی تیل کی مصنوعات بہم پہونچا رہے ہیں۔ ان جہازوں کی بدولت نہ صرف مشرقی پاکستان کی صنعتی ترقی کی رفتار بیحد تیز ہوگئی ہے بلکہ اس خطہ کی صنعتیں اچھا خاصہ زرمُبادلہ بھی کما رہی ہیں۔ برما شیل کو اس بات پر فخر ہے کہ اُس نے مشرقی پاکستان کی صنعتی ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا ہے۔

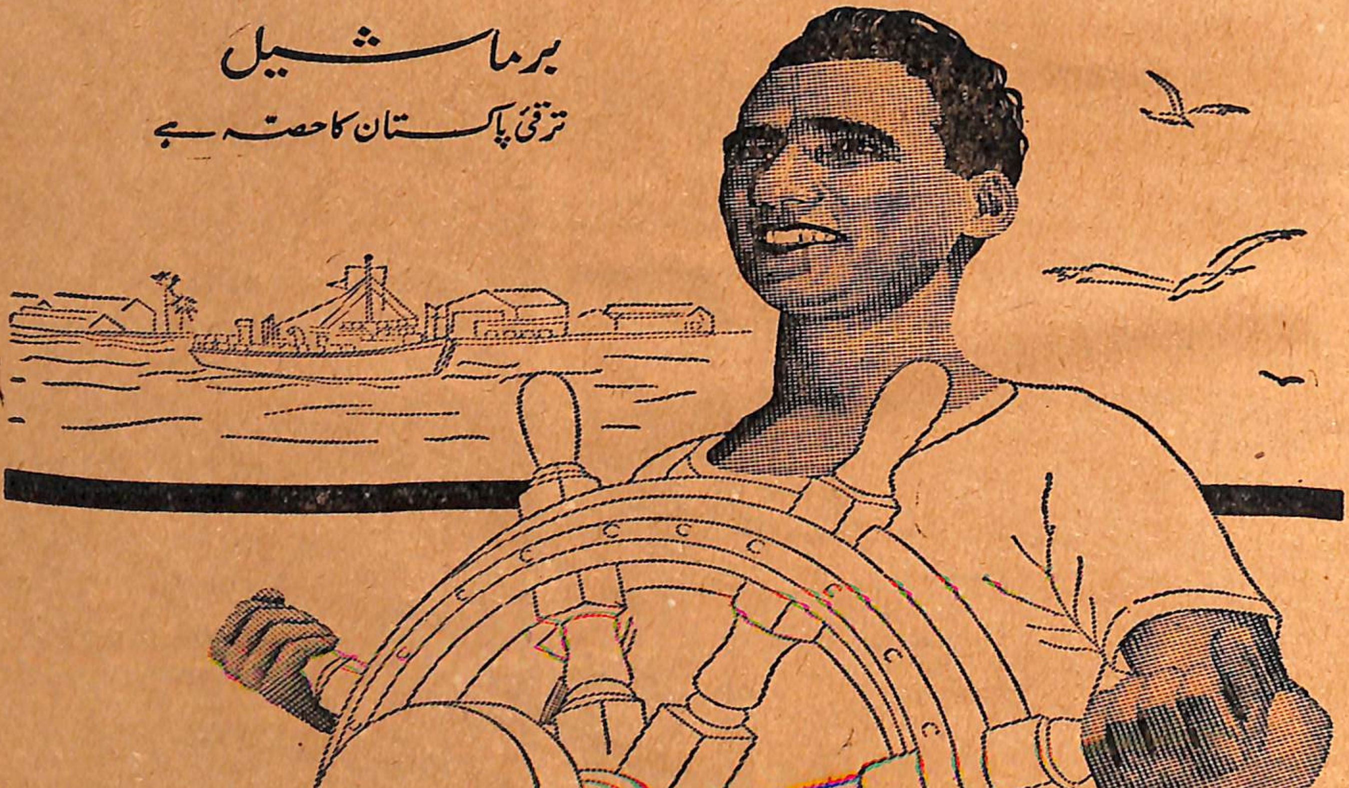

برما شیل

ترقیٔ پاکستان کا حصّہ ہے

BSP—12—59

بے شک پیارا اور بے حد پیارا۔ کیوں نہوتا۔ ماں کی مُمتا، اس کی نگہداشت اور آسٹر مِلک کی خُوبیاں کارگر ہیں۔ دانشمند ہیں وہ مائیں جو اپنے بچوں کی پرورش آسٹر ملِک سے کرتی ہیں۔ خواہ ماں کے دُودھ کی کمی کو پورا کرنے کے لئے دیا جائے یا دُودھ چھُٹ جانے پر، آسٹر ملِک ماں کے دُودھ کا بہترین بدل ہے۔

آسٹر مِلک اعلیٰ اور خاص قسم کے دُودھ سے تیار کیا جاتا ہے۔ اسمیں فولاد مِلایا گیا ہے تاکہ بچوں میں خوُن کی کمی نہونے پائے، اور ہڈیوں اور دانتوں کی مضبوطی کے لئے وٹامن ڈی" بھی شامل کیا گیا ہے۔

جی ہاں! یہی وجہ ہے کہ مائیں پوُرے اعتماد کے ساتھ بچوں کو آسٹر ملِک دیتی ہیں۔

آسٹر ملِک

ماں کے دُودھ کا بہترین نعم البدل

OSTERMILK
DRIED MILK FOOD PRODUCT WITH VITAMIN D AND IRON

GM 1-193UD.

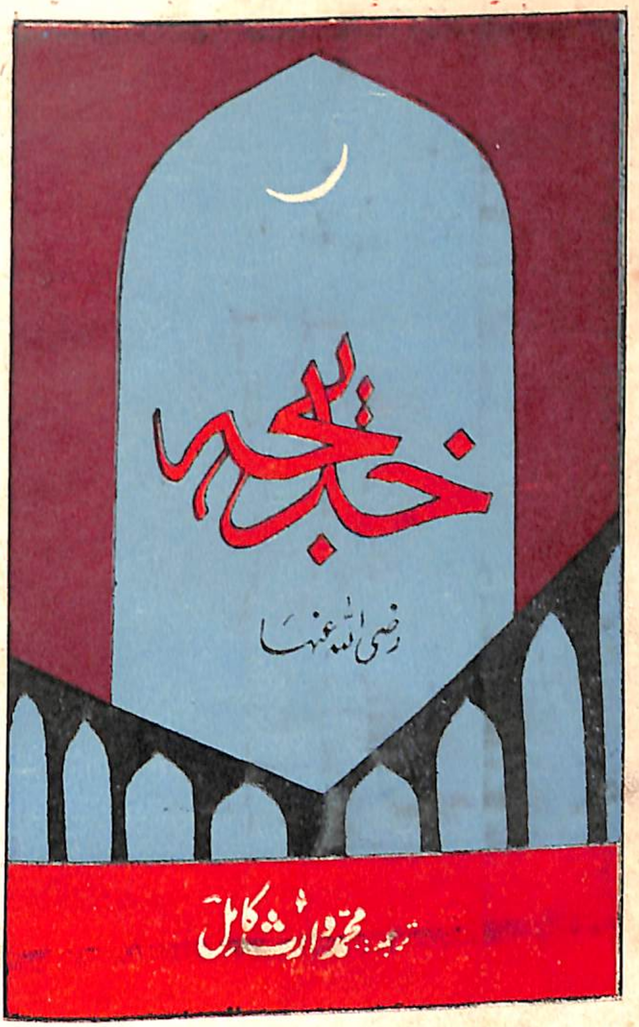

اسلامی تاریخ کے نکھار میں ام المومنین حضرت خدیجہ کا بڑا ہاتھ ہے۔ یہ کتاب اس پاکباز اور ایثار پیشہ خاتون کے حالات زندگی پر مشتمل ہے۔ رسول خدا کا ارشاد ہے کہ خدیجہ نے اس وقت میری تصدیق کی جب قوم مجھے جھٹلا رہی تھی۔ وہ اس وقت مجھ پر ایمان لائی جب لوگ میری بات سننے کو آمادہ نہ تھے۔ اس نے اس وقت راہ حق میں اپنا مال صرف کیا جب کوئی شخص مجھے ایک درہم دینے پر راضی نہ تھا عبدالحمید الزہراوی کی اس تصنیف کا مطالعہ ہدایت کا موجب ہوگا۔

قیمت پانچ روپے

ادارہ فروغ اردو۔ ایبک روڈ لاہور

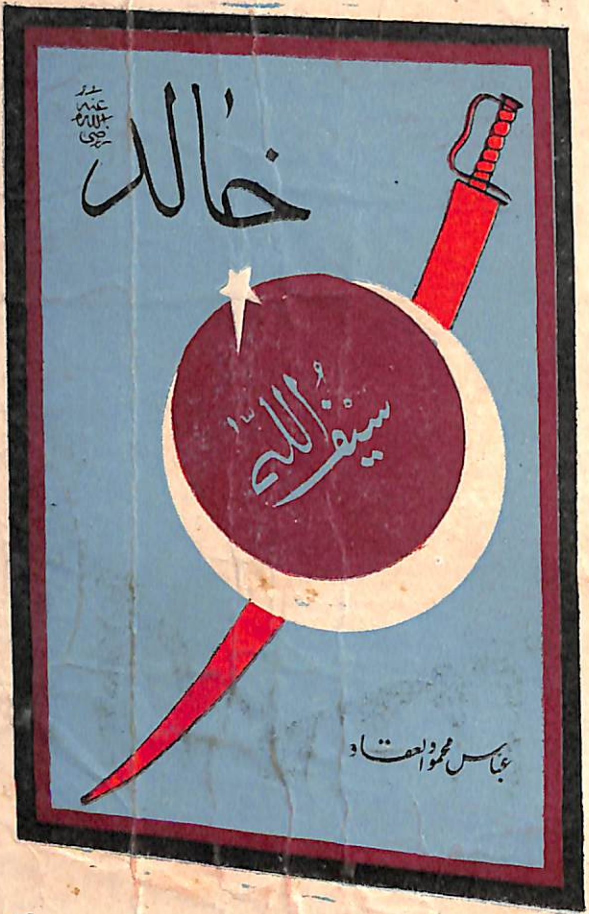
خالد
رضی اللہ عنہ
سیف اللہ
عباس محمود العقاد

حضرت خالد بن ولید کے مجاهدانه کارناموں سے کون واقف
نہیں۔ مگر اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ اس سپه سالار کی شخصیت
میں به حیثیت انسان کے کیا کیا عظمتیں تھیں۔ ذاتی کردار کیا تھا
اور اس نے ان کی جنگی فتوحات پر کیا اثر ڈالا۔ یه کتاب عربی کے
مشہور شخصیت نگار عباس محمودالعقاد کی لکھی ہوئی ہے۔ اور اپنی
نوعیت کے اعتبار سے اردو ادب میں پہلی پیشکش ہے۔ قیمت ۴/-/-

اداره فروغ اردو۔ ایبک روڈ لاہور

نقوش کے قلمکار

جوش ملیح آبادی
فیض احمد فیض
اثر لکھنوی
شاد عارفی
حیرت شملوی
انجم رومانی
سلام مچھلی شہری
جگر مراد آبادی
احمد ندیم قاسمی
آنند نرائن ملا
ساغر نظامی
جگن ناتھ آزاد
روش صدیقی
صوفی تبسم
فضلی
حفیظ جالندھری
معین احسن جذبی
مجید امجد
میکش اکبر آبادی
پروفیسر شور
حفیظ ہوشیار پوری
ابن انشا
ادا جعفری
فراق گورکھپوری
اختر انصاری
عبدالحمید عدم
اختر الایمان
قیوم نظر
قتیل شفائی
غلام ربانی تاباں

کرشن چندر
عصمت چغتائی
ممتاز مفتی
شوکت تھانوی
شفیق الرحمٰن
غلام عباس
کشمیری لال ذاکر
راجندر سنگھ بیدی
سعادت حسن منٹو
ہاجرہ مسرور
قدرت اللہ شہاب
کنہیا لال کپور
حجاب امتیاز علی
تسنیم سلیم چھتاری
اشفاق احمد
خواجہ احمد عباس
اوپندر ناتھ اشک
قرۃ العین حیدر
ابوالفضل صدیقی
امتیاز علی تاج
مہندر ناتھ
صالحہ عابد حسین
اے حمید
علی عباس حسینی
بلونت سنگھ
حیات اللہ انصاری
خدیجہ مستور
اختر اورینوی
دیوندر ستیارتھی
شکیلہ اختر

نیاز فتحپوری
غلام رسول مہر
عبدالمجید سالک
ڈاکٹر یوسف حسین
رشید احمد صدیقی
ممتاز حسین
ڈاکٹر وحید قریشی
مجنوں گورکھپوری
ڈاکٹر سید عبداللہ
مالک رام
ڈاکٹر محمد حسن
عبدالماجد دریابادی
کلیم الدین احمد
مختار الدین آرزو
ڈاکٹر اعجاز حسین
آل احمد سرور
ابواللیث صدیقی
محی الدین زور
احتشام حسین
مسعود حسن رضوی
شاہد احمد دہلوی
حامد حسن قادری
ڈاکٹر عابد حسین
مولانا عبدالحق
سید وقار عظیم
عبدالقادر (سروری)
ممتاز شیریں
ڈاکٹر شوکت سبزواری
غلام جیلانی برق
قاضی عبدالودود

ان سارے ہی قلمکاروں نے نقوش میں لکھا ہے اور مسلسل لکھتا ہے

اب

ادارۂ نقوش اپنے دس سالہ کارناموں کا نچوڑ

ادبِ عالیہ

کے نام سے پیش کر رہا ہے جو انہی تمام قلمکاروں کی نمائندہ تخلیقات پر مشتمل ہوگا اور
یہ شمارہ نقوش کا آئندہ نمبر ہوگا

نقوش پریس اردو بازار - لاہور